رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹرایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹرایٹ لا آگرہ

دارالاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد وضوابط

۱ - رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲ - ۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳ - قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴ - ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک ۱۰ ار ہے ممالک غیر سے عہ ر۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہوسکتا ہے۔

۵ - تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہوسکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶ - رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت وترسیل زرچندہ واجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ سے ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷ - مضامین و خطوط متعلق مضامین آڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ - چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔پی منگواکر واپس نہ فرمائیے۔

شرح اُجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چھ ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]

المشتہر:- منیجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

نمبر ۱	فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۵ء	جلد ۲

تصویر جناب مولینا شیخ احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی مرحوم

اطلاع

افسوس ہے کہ جون نمبر میں مولوی محمد معین الدین انصاری صاحب کینٹب بیرسٹرایٹ لا کے مضمون "رسم الخط کی اصلاح" میں کتابت کی چند غلطیاں رہگئی ہیں۔ علاوہ دیگر غلطیوں کے صفحہ ۱۷ پر "اصول موضوعہ" کے بجائے "اصول موضوع" لکھہ گیا ہے اسی طرح صفحہ ۵۷ کی تیرہویں سطر میں "دکان" کا لفظ بجائے مذکر کے مونث چھپ گیا ہے۔

ہمارے بعض کرمفرما رسالہ کے وی۔پی کا نوٹس ڈاکیہ سے لے لیتے ہیں اور وی۔پی کو ڈاکخانہ میں جمع کرا دیتے ہیں ڈاکیہ دوبارہ وی۔پی لیکر نہیں آتا ہے اور بالآخر واپس ہوجاتا ہے۔ ان حضرات کو چاہئے کہ وی پی کا نوٹس نہ لیا کریں بلکہ ڈاکیہ سے ہدایت کر دیا کریں کہ فلاں تاریخ کو وی۔پی لے آنا۔ نوٹس دینے کے بعد ڈاکیہ پارسل کو ڈاکخانہ سے لانیکا مجاز نہیں رہتا ہے۔

گذشتہ جون سے شمع کا حجم ۱۲۰ صفحے ہے اور ہرماہ ایک یا دو تصاویر کا بھی انتظام ہے یعنی علاوہ تصاویر کے قریب چودہ سو صفحات کی دو جلدیں صرف سے رمیں ہدیہ ناظرین ہوتی ہیں جو کسی طرح گراں نہیں ہیں۔ یہ حجم محض امتحاناً ہے اور اس کو قائم رکھنا قارئین کرام کی دلچسپی پر منحصر ہے استدعا ہے کہ رسالہ کی ترتیب مضامین واشاعت کے متعلق ہمارے عنایت فرما بلاتکلف اپنے خیالات سے آگاہ فرمادیا کریں۔ تاکہ ہم کو ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہونیکا موقع ملتا رہے۔ اور ہم ان کی ضیافتِ طبع کا بہتر سے بہتر انتظام کرسکیں۔

منیجر شمع

حسن منزل۔ شاہ گنج۔ آگرہ

بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۵ء

اُمّیدِ ناکام

(از جناب مولوی محمد سبطین احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی)

"محمود! بچے تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ میری گودوں کے پالے ہو۔ میرا ایک کہنا مان لو"

"اماں! تمہیں معلوم ہو۔ میں نے کبھی تمہاری بات ٹالی ہے؟"

"نہیں بیٹا! کبھی نہیں۔ میں کئی دن سے موقعہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس وقت تم خوب آگئے۔ سُنو بیٹا! ہم غریب آدمی ہیں مگر آبرو ہم بھی رکھتے ہیں۔ اس گھر میں تمہارا آنا جانا اب لوگوں کو کھٹکتا ہے۔ ماشاء اللہ شاہد جوان ہے۔ محلہ والے انگلیاں اُٹھاتے ہیں" فیروزی یہ کہتے تو کہہ گئی۔ مگر فوراً خیال آیا کہ محمود اگر خفا ہو گیا تو سارا

کھیل بگڑ جائے گا۔ روٹیوں کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ فوراً لہجہ بدل کر کہنے لگی یہ بیٹا میں تم سے باہر نہیں۔ ساری عمر تم لوگوں کا نمک کھایا ہے۔ مگر کیا کروں دُنیا کی لاج بھی اک چیز ہے۔ کسی کا مُنہ کیسے بند کر دوں "

محمود اِس تقریر کے متضاد پہلو باہم مربوط کرنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ مگر وہ سمجھ نہ سکا کہ فیروزی کا اصل مُدّعا کیا تھا آخر اس نے کہا۔

" امّاں! صاف بات یہ ہے کہ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا واقعی تم یہ چاہتی ہو کہ دو زندگیاں ہمیشہ کے لئے برباد کر دو"

"نہیں! نہیں!" فیروزی نے جلدی سے کہا "خدا نہ کرے، تمہارے دشمن برباد ہوں" اِس وقت فیروزی محمود کی محبت سے زیادہ شاہو کی ماتا سے متاثر تھی۔

" امّاں تم برا نہ مانو تو میں صاف صاف کہہ دوں۔ میری زندگی شاہو بغیر اب ناممکن ہے " اِس جملہ سے فیروزی کی عزت کو اِک ٹھیس سی لگی۔ لیکن وہ خاموشی کے ساتھ سُنتی رہی، " میری پہلی شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی۔ میری ماں نے میری کچھ نہ سُنی۔ گو اب وہ اپنی غلطی پر پشیمان ہیں۔ ورنہ اُس وقت بھی ممکن تھا کہ یہی ہوتا جو انشاء اللہ ہونے والا ہے "

آخری جملہ کی معنی خیزی فیروزی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ بیٹی کو اِک دولتمند نوجوان کی دلہن بنانے کی آرزو اُسے بے چین رکھتی تھی۔ وہ محمود کا عزم سُنکر دل ہی دل میں مسرور ہوئی اور خوشی کا نور اُس کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔

"خیر" فیروزی نے کہا، "جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تم لوگوں میں تو کسی کو اپنے برابر کا سمجھتے ہی نہیں۔ اور میاں! شرافت غریب امیر پہ کیا موقوف ہے۔ جس کے چلن اچھے ہیں اصل میں تو وہی شریف ہے۔ پر اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟ جوان لڑکی میں کب تک کنواری بٹھائے رکھوں؟"

بے اختیار تبسّم کی اک موج لرزاں محمود کے زیر لب دوڑ گئی۔ لیکن فیروزی چھالیاں کاٹنے میں ایسی مصروف تھی کہ دیکھ نہ سکی۔ آخر محمود بولا۔

"میرے پاس اِس سوال کا کچھ جواب نہیں"

"مگر میاں! سوچو تو۔ کوئی اُمید ہو تو انسان بیٹھا بھی رہے"

"میں کب کہتا ہوں بیٹھے رہنے کی ضرورت ہی نہیں"

"پھر کیا ہو؟" فیروزی نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"نکاح" محمود نے زیر لب جواب دیا۔

"نہیں میاں، مجھے ایسا نکاح منظور نہیں" سوکن کا جلاپا بُرا ہوتا ہے۔

"تو بتاؤ میں کیا کروں۔ بی بی کو طلاق دے نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو یہ کتنی معیوب بات ہے۔ کل ہی کو مہر کی نالش ہو گی اور میری دولت کا بڑا حصّہ چھین لیا جائیگا"

"سچ ہے! یہ خطرہ تو دوسری شادی میں بھی ہے"

"ہاں ہے۔ مگر شادی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میاں کچھ دیوانے ہو۔ شادی نہ ہوئی کلھیا کا گڑ ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو"

"یہ آخری تدبیر تھی،" محمود نے جواب دیا۔ "اور یہ میں اطمینان دلاتا ہوں

کہ جب کبھی اِس تعلق کے اظہار کا موقعہ آئے گا میرے گھر والے چنداں تعرض نہ کریں گے"

"خیر۔ میں تو تدبیر نکال لوں گی"، یہ کہہ کر فیروزی نے خاصدان بڑھایا۔ محمود نے بیڑا منہ میں رکھا اور رخصت ہو گیا۔

اس واقعہ کو دو روز گذر گئے۔ دونوں روز فیروزی کا یہ معمول رہا کہ صبح سے برقع اوڑھکر نکلتی اور شام کو گھر میں قدم رکھتی۔ تیسرے دن حسب معمول فیروزی نے صبح اُٹھ کر برقع سنبھالا اور شاہو کو آواز دی۔ شاہو اُٹھ کر سامنے آئی۔ فیروزی نے اُس سے کہا۔

"آج شام کو بھی تم میرا انتظار نہ کرنا اگر میں نہ آؤں تو دروازہ بند کر کے سو رہنا"

"اماں۔ خیر ہے۔ پرسوں سے تمہارے پاؤں کو قرار نہیں"

"چل نگوڑی۔ خبردار جو کسی کے سامنے منہ سے نکالا"

کہا اور فیروزی سر پر برقع ڈال گھر سے نکل گئی۔

ہنگام سحر کی دلکشی ابھی تمازت خورشید کی نذر نہ ہوئی تھی، ہواؤں میں شگفتگی اور تازگی ہنوز باقی تھی کہ زبیدہ گھر والوں کے بوقلموں مباحث سے اُکتا کر اُٹھی اور اپنے کمرہ کی تنہائی میں معتکف ہو گئی۔

سکینہ سایہ کی طرح اُس کے ساتھ آئی اور دل ہی دل میں موقع تلاش کر رہی تھی کہ خود زبیدہ بولی۔

"سکینہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ...."

اتنا کہہ کر نازنین زبیدہ کی زبان رُک گئی، اُس کی حیا پرور آنکھیں نیچے جھک گئیں۔

اور اُس کے بلند و بالا سینہ میں جہاں شباب کے صدہا ولولے آسودہ تھے خفیف سا اُبھار پیدا ہوا اور جزر دریا کی طرح پھر اُتر گیا جس کو سکینہ نے بھی محسوس کیا۔

"اچھی آپا،" یہ کہہ کر سکینہ نے اپنی بانہیں زبیدہ کے گلے میں ڈالدیں۔ وہ اس وقت اُس جوش خلوص سے لبریز تھی جو ایک عورت کو مصیبت زدہ ہم جنس کے ساتھ یک لخت پیدا ہو جاتا ہے "اچھی آپا!" اُس نے پھر کہا، "خدارا اپنی جوانی پہ رحم کرو،" یہ کہہ کر سکینہ آنچل سے وہ آنسو پونچھنے لگی جن کی قیمت دنیا میں صرف ایک شخص ادا کر سکتا تھا اور وہ زبیدہ کا لاپروا، ناانصاف، سنگدل، زبیدہ کا محبوب، مگر زبیدہ سے نفور خاوند تھا۔

اِک آہِ نیم کش کے ساتھ زبیدہ کی آنکھیں زمین سے اُٹھ گئیں۔ اُس نے دروازہ کیطرف دیکھا۔ سامنے اِک شکل کمرہ کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اب اُسے اپنی وارفتگی کا احساس ہوا۔ اُس کا سر پھر جھک گیا۔ اور شرم کا ارغوانی گلگونہ ابھی اُس کے رخساروں پر جھلکنے بھی نہ پایا تھا کہ فیروزی کمرہ میں داخل ہو گئی۔

"فیروزی اماں۔ تم خوب آنکلیں۔ ذرا زبیدہ آپا کو تو سمجھاؤ۔"

"بیٹی۔ بہت سمجھایا۔ اِسے تو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا ہے مگر کیا کریں،"

یہ کہتی ہوئی فیروزی قریب کی چوکی پر بیٹھ گئی۔

سکینہ یہ سوچ کر کہ فیروزی زبیدہ کے سسرال والوں میں بہت بارسوخ تھی، شاید کوئی پیام سلام لائی ہو، کسی بہانہ سے باہر چلی گئی۔ اور فیروزی، اور زبیدہ کمرہ میں تنہا رہ گئیں۔

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ آخر فیروزی بولی۔

"بیٹی زبیدہ! میں تیرے واری۔ کیوں اپنی جان ہلاک کرتی ہے؟"

"اماں تمہیں بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں بیٹی۔ مگر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کل میں نے تجھ سے کہا تھا۔ خدا چاہے تو آج ہی شام سے رُخ بدل جائے گا۔"

"اماں! میں نے کہہ تو دیا تھا۔ چلی جاؤنگی۔ مگر کچھ دل کو یقین نہیں آتا۔"

"وائے ہَے۔ بیٹی۔ کیوں کفر کے کلمے منہ سے نکالتی ہے۔ فریبی ہوتے تو مخلوق کیوں ٹوٹتی۔ پھر کسی سے سوال نہیں کرتے۔"

"اماں۔ کچھ میرا دل ڈرتا ہے۔"

"ہاں بانو! کیوں نہیں، غیر جگہ جانا۔ تم نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ شریف گھر کی بھیلی بیٹی۔ دیدہ پھٹا ہوتا تو ڈرنے لگتا۔ مگر بیٹی ڈر کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ کسی کی مجال ہے جو آنکھ اٹھا کے دیکھ لے؟ میں نے عمر بھر تمہاری سُسرال کا نمک کھایا ہے۔ بھلا اپنے جیتے جی تم پر آنچ آنے دونگی!"

"تو آج چلنا چاہئے کل جمعہ ہے۔ تم نے کہا تھا نا کہ جمعہ کی شب ضروری ہے۔ مگر اماں! بوا سے تم پوچھ لینا۔ مجھ سے نہیں کہا جائے گا۔"

یہ اسقدر عاشن کر فیروزی پر حیرت سی چھا گئی۔ وہ ابھی تک سمجھتی تھی کہ زبیدہ چھپکر جانے کے لئے راضی تھی۔ اُسے اچانک معلوم ہوا کہ واقعات توقعات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اُس کی بے نظیر قوت تحریص چندے معطل رہی۔ آخر کانوں پہ ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا۔

"اے ہے بانو۔ کیا مجھ دکھیاری کا سر منڈواؤ گی۔ ایسی تو نادان نہیں ہو۔ بھلا تمہاری بوا اجازت دیدیں گی۔ مجھ پوچھنے والی کو زندہ نہ گاڑ دیں گی۔"

"تو اُن کی اجازت بغیر کیسے جاسکتی ہوں" اس وقت زبیدہ کے لہجہ میں اک حسرتناک اضمحلال تھا۔ اور امید کی وہ بہشت بریں جو ابھی اس کے نزدیک تھی اس سے دور ہوتی جاتی تھی۔

"بیٹی! کام ہمت سے نکلتا ہے" فیروزی کا یہ فقرہ نہایت برمحل تھا۔ زبیدہ کو امید سے دست کش ہو جانا شاق گزر رہا تھا فیروزی کی ہمت افزائی سے اس کی مایوس حسرتوں میں تازگی پیدا ہوگئی۔ لیکن ابھی وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ اس معاملہ میں اُسے اپنی جرات کا استعمال کیونکر کرنا ہوگا۔ وہ فیروزی کی تقریر خاموشی کے ساتھ سنتی رہی" موت پڑے اس چاہت پر۔ تمہاری بپتا نہیں دیکھی جاتی۔ مجھ کم بخت کو کیا دولت مل جائے گی۔ ہاں تم سکھ میں رہو گی۔ میرا بھی کلیجہ ٹھنڈا ہوگا"

"اماں۔ خفا نہ ہو۔ مگر بتاؤ تو اُن کی اطلاع بغیر کیسے جاسکتی ہوں؟"

فیروزی نے دیکھا کہ اس کے دلنشین جملے اپنا کام کر رہے تھے چنانچہ اس نے نہایت نرم لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"بانو!" اس نے آواز بھی بہت آہستہ کر دی، "تدبیر میں بتاتی ہوں۔ کرنا نہ کرنا تمہارے اختیار ہے۔ سنو۔ پاخانہ میں بھنگی کے آنے جانے کی کھڑکی ہے۔ پڑوس کی مسجد میں جب رات کی اذان ہو تم کھڑکی سے نکل آؤ۔ اس وقت تمہارے گھر میں سوتا پڑ جاتا ہے۔ میں کھڑکی کے باہر مل جاؤں گی پہر بھر بعد لوٹ آئیں گے۔ کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔"

اِس تقریر سے زبیدہ حیرت زدہ ہو گئی ۔ یہ اِک ایسے امکان کا انکشاف تھا جس کو وہ اب تک محال سمجھتی تھی ۔ فیروزی نے پھر کہا ۔

"اور بی بی میں پھر کہتی ہوں، تمہارا جی چاہے تو چلیو ۔ مگر کسی سے کہہ نہ بیٹھیو ۔ نہیں فیروزی کی ناک چوٹی کٹ جائے گی ۔ تمہاری بُوا اور تمہاری ساس مجھے جیتا کھا جائیں گی"۔

"نہیں، نہیں ۔ اب اطمینان رکھو ۔ میں سمجھی نہیں تھی ۔ بھلا تم دُکھیا تو میری ہمدردی کرو اور میں تمہاری فضیحت کراؤں"۔

"ہاں بیٹی ۔ ہمیں تو بس یہ حسرت ہے کہ تمہارا گھر آباد دیکھ لیں ۔ اللہ وہ دن کرے کہ تم سُہاگن بنو"۔

اِن آخری دُعاؤں نے پھر زبیدہ کے جذبات میں حشر برپا کر دیا ۔ اُس نے یک لخت تمام وسوسوں کو ٹھکرا دیا اور فیصلہ کر لیا کہ فیروزی کی رہبری میں گوہر مقصود ضرور تلاش کرے گی ۔

"تو میں شام تک تیاری کر لوں ۔ اماں بھول نہ جانا"

"نہیں بیٹی ۔ بھولوں گی کیوں ۔ آج رات اذان کے وقت کھڑکی کے باہر" یہ کہا اور خدا حافظ کہتی ہوئی فیروزی کمرہ سے باہر چلی گئی ۔ فیروزی کے ساتھ وہ سحر بھی رخصت ہو گیا جس نے زبیدہ کے جنونِ آرزو کے ساتھ سازش کر کے اُس کے عزم میں دلیری اور عقل میں کوتاہی پیدا کر دی تھی ۔ کمرہ کی خاموش فضا میں وہ اپنے تازہ فیصلہ پر نظر ثانی کرنے لگی ۔

"گھر سے رات کو چھپ کر جانا ——— مگر سچ ہے کسی کو کیا خبر ہو گی ۔ فرض

کیا بُوا کو معلوم بھی ہو گیا تو وہ کیوں کسی سے کہنے لگیں "

زبیدہ اپنے فیصلہ پر آخری مُہر ثبت کرنا چاہتی تھی کہ بجلی کی طرح اک وسوسہ اس کے خیال میں گزرا " اور یہ شاہ صاحب کوئی دغاباز بدمعاش نکلے تو........" اس کے سکون کا خرمن پھر تاراج ہو گیا " میں اور فیروزی کیا کرلیں گے ؟ ....." ایک بار نگاہوں نے اس بدنصیب شباب کا طواف کیا اور لمحہ کے لئے بند ہو گئیں۔

" نہیں مجھے نہیں جانا چاہئے " دل کی بیتاب خواہشوں کو عقل کا آخری فتویٰ سُنا دیا گیا۔ اُمید کے ساتھ زبیدہ کی توانائی بھی رخصت ہو گئی۔ اور وہ نڈھال ہو کر مسہری پر لیٹ گئی۔

" آہ! اُن کی محبت شاید میری قسمت میں نہیں ہے " اک برقی رَو پھر اس کے جسم میں دوڑ گئی " اُن " کے خیال نے پھر عقل مصلحت اندیش کو معطل کر دیا اور یاس کا وہ دیوانہ وار عزم جو ابتلا کی آخری منزل میں انسان اور بالخصوص عورت کے قلب کو پنولین اور ہنی بال کا جنون عمل عطا کر دیتا ہے، زبیدہ کے نازک قلب میں پیدا ہونے لگا " ہاں! ناموس جان دے کر خریدی جا سکتی ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔ اِس زندگی سے موت بہتر ہے "

عورت اپنے نفس کو فریب دینے کے لئے بہت سے دلائل ڈھونڈ لیتی ہے اُسکی ذہنی ساخت دُنیا کی سخت ٹھوکریں برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ جب کبھی، تلخ و ناگوار واقعات اس کے طلسم تخیّل کی فردوس برباد کرنا چاہتے ہیں تو وہ واقعات سے قطع نظر کر کے اپنی دنیا الگ بنا لیتی ہے۔

شام سے پہلے ہی زبیدہ غسل سے فارغ ہو گئی تھی۔ نو بجے کے قریب گھر کے لوگ کھانا کھا کر اپنے بستر پہ پہنچ گئے۔ اب اس نے اپنا بہترین ملبوس اور گراں ترین زیور زیب تن کیا اور یہ وہ شرائط تھیں جن کی تعمیل فیروزی نے ضروری بتائی تھی۔ آخر وہ معززہ ساعت آپہنچی۔ گیارہ بجے اذان کی آواز آئی۔ زبیدہ چور کی طرح کمرہ سے نکلی اور نسیم کی طرح مقررہ راستہ سے باہر چلی گئی۔ فیروزی حسب وعدہ کھڑکی کے باہر موجود تھی۔ آدھ گھنٹہ کے اندر کمسن نازنین اور پیرانہ سال ضعیفہ دونوں اک مختصر سے مکان کے صحن میں چٹائی کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔

آخر بہار کی شب ماہتاب اپنی نورانی دلفریبیاں جہاں آب وگل کی آرائش میں صرف کر رہی تھی۔ ہوا میں اک خفیف اہتزاز اور فضا میں اک خوشگوار خنکی تھی، جس کی اثر آفرینیاں پیکرِ خاکی سے گزر کر روح کی نادیدہ گہرائیوں تک پہنچتی تھیں۔ اور زبیدہ شباب سے معمور و لبریز زبیدہ اس عالمِ سکون و سرور کی فرمانروا معلوم ہوتی تھی۔

پندرہ منٹ تک، بالکل خاموشی رہی۔ آخر زبیدہ نے فیروزی سے کہا۔

"مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔ یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا"

"نہیں بانو سامنے حجرہ ہے، شاہ جی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ٹھیک آدھی رات گئے باہر نکلیں گے"

آدھ گھنٹہ اور گذر گیا۔ اب زبیدہ مضطرب ہونے لگی۔ اس نے تنگ آکر پھر کہا۔

"رات زیادہ جارہی ہے۔ اماں! دیکھ تو لو۔ حجرہ میں ہیں بھی یا نہیں"

"نا۔ بی بی۔ میرا ایسا دیدہ نہیں ہے۔"

اس حوصلہ شکن جواب نے پھر زبیدہ کو خاموش کر دیا۔

آخر ٹھیک بارہ بجے کھڑاؤں کی آواز سنائی دی اور حجرہ سے اک بزرگ برآمد ہوئے، میانہ قد، چھریرا جسم گندمی رنگ، لانبے لانبے بال۔ گیروا ساری آدھی باندھے۔ آدھی لپیٹے۔ معصوم زبیدہ یہ سراپا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی، اور کسی ان دیکھی طاقت نے اس کی گردن جھکا دی۔

شاہ صاحب کے ہاتھ میں مٹی کا ایک آبخورہ تھا۔ وہ سامنے چٹائی پر رونق افروز ہو گئے۔ آبخورہ پاس رکھ لیا۔ اور گلے سے ایک طویل تسبیح اتار کر دانہ شماری شروع کر دی۔ چاروں طرف اک ہیبت ناک، سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کی خاموش فضا گاہے گاہے ضرب الا اللہ سے گونج جاتی تھی۔ یا، اک مضطرب قلب کی ناتوان دھڑکن اٹھتی تھی اور قرار و سکوت کے محیط ماحول میں گم ہو جاتی تھی۔ آخر فیروزی نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"میاں صاحب۔ یہی وہ کم نصیب لڑکی ہے۔ حضور کوئی ایسا عمل کر دیں کہ اس کا وارث راضی رہے۔"

شاہ صاحب نے اک طولانی "ہوں ہوں ہوں" سے جواب دیا اور زبیدہ کو اک غلط انداز نگاہ سے دیکھ کر پھر گردن جھکا لی۔

کامل ایک گھنٹہ تک پھر سکون قائم رہا۔ زبیدہ چاہتی تھی کہ خود عرض مطلب کر دے مگر زبان یاری نہ کرتی تھی۔ اس طولانی مدت میں نوخیز نازنین کا سینہ کن جذبات کا محشرستان

بنا رہا بیان نہیں ہو سکتا۔ آخر شاہ صاحب نے پہلو بدلا تسبیح دوہری کرکے گلے میں ڈالی، پھر آبخورہ ہاتھ میں لے کر دیر تک پھونکا کیے۔ اس کے بعد فرمایا۔

"بیٹی زبیدہ"، یہ مشفقانہ تخاطب ناتجربہ کار زبیدہ کو مسخر کرنے کے لئے کافی تھا" تیرے واسطے ہم نے یہ شربت دَم کیا ہے۔ اس کو پی جا۔ آج سے تیرا شوہر مطیع رہے گا"

"اس کو پی جا" یہ جملہ ایسے تحکمانہ انداز اور فرطِ اعتماد کے ساتھ کہا گیا کہ بڑے سے بڑا قوی الارادہ انسان مشکل سے سرتابی کر سکتا تھا۔ پھر زبیدہ تو اِک اہلِ غرض سادہ لوح لڑکی تھی جس کے قوائے فکری پہلے ہی معطل ہو چکے تھے۔ تاہم اس کے قلب میں انحراف کی اک خفیف سی لہر پیدا ہوئی۔ لیکن اس نئی کیفیت کا ہنوز اُسے احساس بھی نہ ہوا تھا کہ شاہ صاحب کے آخری جملے نے شوہر سے مصالحت کا محبوب خیال پیش نظر کر دیا اور یہ اُس کی دُنیاءِ حیات کا وہ مرکزِ ثقل تھا جس کی جانب وہ بار بار کھنچ جاتی تھی، اور جب ایک بار کھنچ جاتی تھی تو پھر دل اسی کی طرف مائل رہتی تھی۔ اس نفسی ہنگامہ سے ابھی زبیدہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ آبخورہ لبوں سے لگا دیا گیا، اور اس نے بالارادہ یا بلا ارادہ تحفۂ درویش نوش کر لیا۔

"بیٹی۔ زبیدہ۔ شاہ صاحب نے پھر اسے مخاطب کیا، ہم تہجد سے فارغ ہو کر تیرے لباس اور زیور پر بھی کچھ پڑھ کے دَم کر دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ اب پہلی بار جب تو شوہر کے سامنے جائے تو یہی لباس اور زیور پہنے ہو۔ اسی روز سے سمجھ کہ تیری مراد پوری ہے۔ ہاں کل جمعہ کو تجھے روزہ بھی رکھنا چاہیئے۔ اور ظہر و عصر کے درمیان اکتالیس بار اک عمل پڑھ لینا جو ہم ابھی دیں بتائے گے"

یہ کہہ کر شاہ صاحب نے تہجد کی نیت باندھ لی۔

زبیدہ تھوڑی دیر اور صامت و ساکت بیٹھی رہی۔ وہ اپنے اندر اک

بے سبب اضطراب پاتی تھی۔ لیکن گھر سے چھپ کر آنے کا خیال اگر دامنگیر نہ ہوتا تو شاید شوہر سے عنقریب ملنے کی اُمید میں وہ ایسی بہت سی راتیں گزار سکتی تھی۔

اب شراب کا اثر شروع ہوا۔ زبیدہ کو کچھ امتلائی کیفیت اور سر میں چکر محسوس ہوا۔ اب وہ پریشان ہوئی۔ اس نے مڑکر فیروزی کی طرف دیکھا۔ مگر فیروزی کہاں تھی۔ اب تو اس کی وحشت جنون سے بدل گئی۔ اس نے سوچا کہ شاہ صاحب کو نماز میں مصروف چھوڑ کر تنہا نکل جائے۔ وہ اُٹھی۔ مگر اس کے پاؤں اپنا خرام ناز بھول چکے تھے۔ وہ بہ دقت دروازہ تک پہنچی یہاں امید کا آخری سہارا بھی شکست ہوگیا۔ دروازہ مقفل تھا۔

زبیدہ کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ اس کے بدن میں اب کس بالکل نہ تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اب اسے کئی شخصوں کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ اک نالۂ یاس اس کے منہ سے بلند ہوا۔ اور یہ اس سراپا موسیقی کی آخری نوائے درد تھی جو خاموش رات کی فضائے بسیط میں منتشر ہوگئی۔ وہ پھر نہ بول سکی۔ اک رومال اس کے منہ میں ٹھونس دیا گیا۔ اب اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔ لیکن اس کو برابر محسوس ہوتا رہا کہ اس کا زیور ایک ایک کر کے اُتار لیا گیا۔ وہ تڑپنا چاہتی تھی۔ مگر اعضا اسیر پاتی تھی۔ آخر کسی نے اس کی ریشمی چادر اور دوپٹہ بھی سر سے کھینچ لیا۔ اس وقت اتنا ہوش تھا کہ اس نے گردن جھکا لی اور ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا۔

اب اس کو محسوس ہوا کہ وہ کسی کی گود میں ہے۔ اس کے بعد اسے ایک تاریک گڈھے میں اُتار دیا گیا۔ اس وقت شعور اور ارادہ دونوں قریب قریب رخصت ہو چکے تھے۔ مگر سعیٔ للبقا کے اضطراری تقاضہ نے اس کا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ جس کی ناتمام کوششیں

کسی سہارے کی تلاش میں صرف ہوتی رہیں۔ آخر چاروں طرف سے گرنے والی مٹی نے تنفس کی راہ بند کر دی۔ اب ہاتھ کی جنبش بھی رُک گئی۔ پانچ منٹ کے اندر گڑھا سطح فرش کی برابر بھر گیا اور اک طویل و عریض صندوق نے اِس سفاکانہ بے رحمی پر پردہ ڈال دیا۔

موجِ صبا کے مستانہ اہتزاز میں قربِ سحر کی لطیف کیفیات ہر لحظہ افزوں ہوتی رہیں۔ چرخِ مینائی کے بے شمار محفل نشین، عالمِ اسفل کے واقعات سے بے خبر یا لاپروا، بہ دستور جلوہ فروشیوں میں مصروف رہے یہانتک کہ مشرق کے اُفق پر سیلاب نور نمودار ہوا اور دُنیا پہ محیط ہو گیا۔

دوسرے روز سارے شہر میں مشہور تھا کہ مولوی اکرم کی صاحبزادی، زبیدہ، کہیں فرار ہو گئی اور میاں محمود نے فیروزی کی لڑکی، شاہو، کے ساتھ نکاح پڑھ لیا۔

تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج ہر ماہ مطلع کرتے رہیں تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور اُن کو شوق کے ساتھ خریدیں اِس لحاظ سے کہ اِس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں رسالہ کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ حضرات مصنفین و اہلِ مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا اپنا ضروری فرض تصوّر فرمائینگے۔

(مینیجر)

احسن الکلام

(از حضرت احسن مارہروی)

حسن سے ربط نہ کم اے دلِ ناداں ہو جائے ‏ — یوں بڑھے رشتۂ الفت کہ رگِ جاں ہو جائے

اسطرح زندگیٔ عشق کا ساماں ہو جائے — جسکو چاہوں وہ مری جان کا خواہاں ہو جائے

کیا کروں آہ، کہ ڈرتا ہوں ہوا خیزی سے — جوشِ دل سرد نہ لے سوزشِ پنہاں ہو جائے

سخت دشوار ہے دنیائے ہوس کا جینا — زندہ ہو جاؤں جو مرنا مرا آساں ہو جائے

زحمتِ حشر ہو رحمت جو یہ محنت ہو وصول — مری فریاد سے پہلے وہ پشیماں ہو جائے

آج یوں گردشِ چشم اے نگہِ مہر دکھا — صبحِ امید ہماری شبِ ہجراں ہو جائے

خودنمائی سے غرض کیا ہے کوئی کیا سمجھے — وہی سمجھے جو اُنہیں دیکھ کے قرباں ہو جائے

جال میں وعدہ فریبی کے ذرا پھانس تو لے — میرا ذمہ ہے جو پھر کوئی پریشاں ہو جائے

آہِ غمّاز کو اے پاسِ وفا منہ نہ لگا — رازِ پنہاں نہ کہیں دل کا نمایاں ہو جائے

غیر کے شورِ تبسم سے جگر ہے مجروح — زخم بھر جائے جو خالی یہ نمکداں ہو جائے

نہ رہیں خار کھٹکتے ہوئے ارمانوں کے

احسن ایسا ہو تو دل رشکِ گلستاں ہو جائے

پھول

موجودہ سائنس کی روشنی میں

(۱)

نوشتہ پروفیسر رفیق احمد خاں صاحب۔ ایم۔ ایس۔ سی علیگڈھ۔ ترجمہ از مسٹر عبدالشکور صاحب، بی۔ اے
بی ٹی۔ علیگڈھ

حریص انسان نے خود ستائی اور ظلم آرائی کے نشہ سے سرشار ہو کر یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ، اور عالم کا گوشہ گوشہ اسی کی آرام و آسایش کے لئے تخلیق کیا گیا ہے، پہاڑوں کی فلک نما چوٹیاں اس کو باد سموم کے جھونکوں سے مامون و مصئون رکھتی ہیں، دریاؤں کا صاف و شفاف پانی اس کی تشنگی رفع کرتا ہے، حیوانات اس کے کام و دہن کو لذائذ پہنچاتے ہیں اور اس کے لئے پوستین کی آرام دہ قبا مہیا کر دیتے ہیں جن سے وہ موسم کی گستاخ دستوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، درختوں کے ثمر ہائے نورس اس کی گرسنگی اور ماندگی رفع کرتے ہیں، اور گلہائے رنگا رنگ اس کی شامہ نوازی کے لئے کمر بستہ نظر آتے ہیں، مگر یہ ایک فاش غلطی ہے جس میں حقیقت کا کوئی عنصر موجود نہیں۔

خوف ہے اردو داں طبقہ کے خیالات، جذبات، اور عقائد میں ایک ہلچل برپا ہو جائیگی اگر ہم اس حقیقت کا اعلان کر دیں کہ پھول اپنے دلکش خط و خال کے باوجود محض اسی لئے پیدا نہیں کئے گئے کہ ان کو دیکھ کر ہم وجد میں آجائیں اور پکار اٹھیں ع

"اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری!"

انسان اشرف المخلوقات ضرور ہے، مگر یہ یقین کرنا کہ اس عالم کا ذرہ ذرہ اسی مرکز کی جانب گردش کرتا ہے، اور اسی کی خدمت گذاری اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا ہے، ایک شدید مغالطہ ہے، چونکہ انسان کو ہم خونخوار شیر کا خوشنا لقمۂ طعام تصور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اسی وجہ سے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ عالم نباتات کے وجود کی علت غائی صرف یہ ہے کہ بھوکا انسان اُس کی جانب دستِ اندازی بڑھائے، اور اپنا پیٹ بھر کر مسرور ہو، اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم وسعت نظر کے ساتھ فطرت کا مطالعہ کریں، اور اُن دقیانوسی خیالات کو بیخ و بن سے اکھاڑیں جو روایات قدیمہ کے استحکام کی بدولت ہمارے دلوں میں ذہن نشین ہو گئے ہیں، اور جن سے عہدہ برآ ہونا بہت دشوار ہے، ڈاکٹر میکاش کا یہ خیال ہے پودے اسلئے دنیا میں روائے وجود سے مزین کئے گئے ہیں کہ حیوانات اور انسانات اُن کو اپنی غذا بنالیں اور ہرے بھرے پھولوں کی خوش رنگی اور باصرہ نوازی سے مستفیض ہوں سراسر تنگ نظری پر مبنی ہے، اور انہیں خیالات کی بنا پر جہلا تو درکنار، تعلیمیافتہ طبقہ بھی یقین کرنے لگا ہے کہ ہم دنیا کے مالک ہیں، اور اس کی ہر شے پر ہمیں تصرف کا کامل اختیار حاصل ہے،

بہت سے دلکش و دلفریب لہلہاتے ہوئے مرغزار ایسے موجود ہیں جہاں قدم قدم پر خوشنما پھول اپنی دل آویزی، اور عنبر بیزی سے فردوس ارم کا نمونہ پیش کرتے ہیں، بہت سی سر بفلک پہاڑی علاقے پائے گئے ہیں جن کو فطرت کے فیاض ہاتھوں نے سبز مخمل کے فرش سے مزین کیا ہے اور جن کے برفستانی جھیلوں پر آفتاب کی زرین شعاعیں گر گر کر قوس قزح

کا دہو کا دیتی ہیں، بہت سے ساحل ایسے دلربا دیکھے گئے جہاں میلوں تک کیوڑے کے ہزار ہا
پھول منتشر ہیں، اور چشم نیم باز کی طرح محو نظارہ ہوتے ہیں .... مگر ان تمام
خطوں میں انسان کا گزر نہیں، پس اگر پھول صرف انسان کی خدمت گذاری کے لئے پیدا کئے
جاتے تو شاید فطرت اس غیر ضروری فیاضی کو جائز نہ رکھتی، اور ان مرغزاروں کی بیکار زیبائش
وآرائش کا درد سر مول نہ لیتی، علاوہ ازیں اس زمانہ کی محیر العقول علمی انکشافات نے یہ بھی ثابت
کر دیا ہے کہ پیدائش انسان سے قبل بھی اس کرۂ خاکی میں پھولوں اور پودوں کا وجود پایا جاتا
تھا، لیکن یہ نہیں یقین کیساتھ کہا جاسکتا کہ آیا اُس زمانہ میں بھی خودرو پھول اسی کثرت کیساتھ
قلب صحرا میں پھلتے پھولتے تھے جیسے کہ آجکل، اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے ہماری پاس کافی شہادت
موجود نہیں، مگر امید ہے کہ سائنس کی میدان میں جو تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے وہ مستقبل
میں اس معاملہ پر کچھ روشنی ڈال سکے،

ناظرین یہ سُنکر محو حیرت ہو جائیں گے کہ پودوں میں بھی انسانوں اور حیوانوں کی طرح فرقۂ
اُناث و فرقۂ ذکور موجود ہے، جس طرح ذی حیات افراد کی تعداد میں افزایش ہوتی ہے اسی طرح
پودوں کی نسل جاری ہے - جس طرح حیوانات میں بقائے نسل کے لئے دونوں فرقے کے
نمایندوں کا متحد ہونا ضروری ہے، عالم نباتات بھی اسی قاعدہ کی پابندی پر مجبور ہے، اور
اُس کی جماعت فنا ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکتی جب تک اس اتصال باہمی پر کاربند نہ ہو،
تخم کی پیداوار بالکل ناممکن ہے جب تک دونوں نوعیت کے پودے کسی وسیلہ سے متحد
نہ ہو جائیں چنانچہ ایسے پھول کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں ساتھ ساتھ عضو التذکیر اور
عضو التانیث ایک ہی سطح پر موجود ہوتے ہیں، بعض پھول صرف ایک ہی صفت سے متصف

ہوتے ہیں یعنی وہ اول الذکر فرقے کے رکن ہوں گے یا آخر الذکر فرقے کے، مگر ایسے پھولوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، لیکن حیوانات کے برخلاف پھول اور پودے نقل و حرکت کے اہل نہیں ہوتے، اور اس لئے آزادانہ اتصال باہمی ناممکن ہے، پس اس اجتماع کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے، وہ یہ کہ کوئی ایسا وسیلہ تلاش کیا جائے جس کی معرفت مواد ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہو سکے، چونکہ پودوں اور پھولوں کے لئے حرکت کرنا ناممکن ہے، اس لئے اُن کو چار و ناچار اسی صورت پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے،

وہ پھول جن کے لئے یہ وسیلۂ ذی حیات مخصوص ہے ضرور ہے کہ ایسے دلکش ہوں کہ جاندار افراد کو اپنی جانب ملتفت کر سکیں، اور بقائے نسل کی مہم سر کر سکیں، اُن کی خوشبو دل آویز اور عطر ریز ہونا چاہئے، اُن کا رنگ حسین اور دلفریب ہونا چاہئے کہ پرند اور کیڑے اُن پر پروانہ وار فدا ہوں، اور اس ضمن میں ایک اہم خدمت انجام دے سکیں۔ علاوہ ازیں اُن میں خوش ذائقہ رس ہونا چاہئے، اور مقناطیسی کشش ہونا چاہئے کہ ذی حیات نفوس دور و دراز فاصلہ سے اُن کی جانب آسکیں، اور سامان تفریح و تر و تازگی پا سکیں، ہم باغ میں جاتے ہی خوش وضع تتلیوں کو پھولوں کے گرد رقص کرتے اور جھومتے ہوئے پاتے ہیں، شاذ و نادر ہی کوئی ایسی کلی ہوگی جس کے متصل کیڑوں کا ہجوم نہ ہو، اور مشکل سے کوئی گلِ نوشگفتہ ایسا نظر پڑے گا جسکو ان ذی روح ذروں نے اپنے ناچنے اور تڑپنے کا جولانگاہ نہ بنا لیا ہو، کسی روز صبح کو آفتاب کی صاف روشنی میں جا کر دیکھئے کہ مکھیاں، پرند، تتلیاں، اور کیڑے مکوڑے کس ذوق و شوق میں پھولوں اور کلیوں پر جان دیتی ہیں، اور شہد و رس کی جستجو میں ہمہ تن رقص بجاتے ہیں۔ گو اُن کو رس کی اصلا خبر نہیں ہوتی کہ چابک دست فطرت اُنسے کیسا اہم فرض انجام دلاتی ہے اور

کس طرح پھولوں اور پودوں کی بقائے نسل میں مدد حاصل کرتی ہے، اس فرض کی ادا کرنے کے بعد اُن کو شہد انعام میں ملتا ہے، جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور جو اُن کی حیات کا ایک جزو لاینفک بنا دیا ہے، صرف ایک ہی موسم میں پھولوں کو ان مہمانوں کی دست برد سے محفوظ رکھ لو، یا پھولوں کی دل آویزی اور عنبر بیزی چند ماہ کے لئے مفقود کر دو، یقین ہے کہ عالم نباتات اپنی وسعت میں نصف رہجائیگا، پودوں اور پھولوں کی نسلیں مردہ ہونے لگیں گی اور نظام عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا،

ہم نے اس کا بھی غور کیساتھ مطالعہ کیا ہے کہ وہ پھول جو دن میں شگفتہ ہوتے ہیں بہت خوشنما رنگ حاصل کر لیتے ہیں، مگر اُن کی خوشبو ضعیف ہوتی ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دن کی روشنی میں وہ اپنے دلپسند رنگ کی بدولت تیلیوں اور کیڑوں کو اپنی جانب مائل کر لیتے ہیں، اس لئے خوشبو کی مزید کشش کی حاجت باقی نہیں رہتی، اسکے برخلاف وہ پھول جو غروب آفتاب کے بعد کھلتے ہیں اسقدر حسین وجمیل نہیں ہوتے، مگر اُن کی خوشبو دور دور تک اپنا افسوں پھونکتی رہتی ہے، مثلاً چمپا کا پھول، اس کی صورت میں کوئی خاص دل آویزی نہیں پائی جاتی مگر صرف ایک پھول کا وجود کل باغ کو معطر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے، اس کے برخلاف سورج مکھی کا پھول اپنی جمال آرائی کے ساتھ خوشبو سے معرا ہوتا ہے، چنانچہ شب کے وقت محض خوشبو کی تلاش میں کیڑے جوق جوق چمپا کے پھول کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں، شب کے وقت والے پھولوں کو رنگا رنگ لباس میں مزین کرنا غیر ضروری ہوتا اسی لئے فطرت نے اس کی اجازت نہیں دی، فطرت کا کوئی شعبہ بیکار نہیں، ہماری فہم و فراست کا قصور ہے کہ ہم اُس کی علت

غائی تک نہ پہونچ سکیں، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شب کے پھول جو مغرب کے قریب کھلتے ہیں بالعموم سفید ہوتے ہیں، مثلاً بیلا، چنبیلی، اس میں بھی ایک لائق توجہ نکتہ مخفی ہے، شب کی تاریکی میں صرف سفید رنگ کی دور سے بہ آسانی شناخت کیجا سکتی ہے، اور تیلیاں اُن کو دور سے دیکھ کر اُن کی جانب لپکتی ہیں، اور اُن کی خوشبو سے مست و بیخود ہو جاتی ہیں۔

اس موقعہ پر یہ کہدینا ضروری ہے کہ درخشاں رنگ اور تیز خوشبو، آفتاب کی شدید روشنی اور ہوا کی نمی کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں، مگر ان اوصاف سے پودے اپنے مقاصد کی تکمیل میں مدد لیتے ہیں، دنیا کے وسطی خطہ میں جہاں آفتاب کی روشنی اور بارش کثرت سے ہوتی ہے ایسے بھی پھول پائے جاتے ہیں جن میں اسقدر تیز خوشبو ہوتی ہے کہ ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے اور نازک دماغوں کو پریشان کر دیتی ہے۔

اب ہمیں اُن پھولوں کی جانب متوجہ ہونا چاہئے جن کی حیات و ممات کا انحصار تمام تر ہوا پر ہے، مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ ایسے پھول نہ اپنی چمک دمک میں ممتاز ہوتے ہیں، نہ رنگ و روپ سے آراستہ ہوتے ہیں، اور نہ اُن میں کسی قسم کی مہک پائی جاتی ہے حالانکہ وہ پھول جن کی زلیست اور روز افزوں ترقی کیڑوں مکوڑوں اور پرندوں پر ہوتی نہایت حسین و جمیل بھی ہوتے ہیں اور نہایت خوشبودار بھی، اول الذکر طبقہ کے پھولوں میں مادۂ حیات نہایت کثرت اور بہتات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہوا کے ذریعہ سے تبادلہ میں ہمیشہ نقصان کا خطرہ پیش نظر رہتا ہے، مگر آخر الذکر پھول جو

پرندوں اور کیڑوں کو اپنی جانب مائل کرسکتے ہیں یہ مادہ کثرت کے ساتھ پیدا نہیں کرتے کیونکہ ان ذی حیات افراد کی معرفت وہ صحیح مقام تک پہنچ جاتا ہے اور برباد نہیں ہوتا، معمولی گھاس، گیہوں، چنے اور جوار کے پودوں میں ایسی ہی پھول پائے جاتے ہیں جو ہوا کے مرہون احسان ہوتے ہیں، اور جو دلربائی اور رعنائی سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، اور اسی وجہ سے ہر نظر کو اپنی جانب مائل کرنے پر قادر بھی نہیں ہوتے،

اس قدر عرض کرنے کے بعد مجھے اُمید ہے کہ ناظرین اس امر سے کما حقہ واقف ہوگئے ہوں گے کہ پھول کے حسن اور دلکشی کی علّت غائی محض یہ نہیں ہے کہ وہ ہماری آنکھوں کو بھلا معلوم ہو، اور ہمارے احساسات لطیف میں صرف ارتعاش پیدا کردے، فطرت کا مفہوم اصلی نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہوتا، اسی سلئے بہت سے حضرات اس تہ تک نہیں پہونچ پاتے، مگر یہاں ایک اور لطیف نکتہ پیدا ہوتا ہے جس کی وضاحت کرنا نہایت ضروری ہے،

یہ پیشتر عرض کیا جاچکا ہے کہ بعض پھولوں میں تذکیر و تانیث دونوں کیفیتیں یکجا موجود ہوتی ہیں، اس سلئے اسکا امکان ہے کہ دونوں میں اتحاد اور ارتباط پیدا ہوجائے، لیکن اگر یہ وصل باہمی بغیر بیرونی امداد کے حاصل ہوجائے، تب پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت نے پھولوں میں یہ رعنائی اور دلکشی پیدا کرنے کا دردسر کیوں مول لیا، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر نہایت استعجاب ہوتا ہے کہ فطرت اسی باہمی وصل کو جائز نہیں رکھتی، چنانچہ دو مختلف پھولوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے فطرت نے بڑی محیر العقول حکمت عملی سے کام لیا ہے، فطرت کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی پودے کے دو مختلف پھولوں، یا ایک ہی نوعیت کے

مختلف پودوں کے پھولوں میں ارتباط پیدا ہو، فطرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ایک ہی پھول کے دو مختلف النوع حصص میں وصل و اتحاد پیدا ہو، چنانچہ پودوں اور پھولوں پر بے شمار تجربے کئے گئے، اور متمدن دُنیا باور کرچکی ہے کہ دو نہایت قریبی اعزا میں شادی ہونا صحت اور توانائی کو خیرباد کہدینے کے مرادف ہے، اور اس کی مثالیں آئے دن ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں، اور اس کلیہ میں استحکام اور تقویت پیدا کرتی ہیں۔ وہ پودے جو ایسے تخم سے پیدا ہوں جن کو وصل بعید سے حاصل کیا گیا ہو اُن پودوں سے بہت زیادہ طاقتور، توانا، اور پھولوں و پھلوں سے لبریز ہوں گے جو وصل قریب کی تخم ریزی کا نتیجہ ہیں، یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ملک کے بہی خواہوں، اور سوشل ریفارمروں کو اس معاملہ میں پودوں سے سبق لینا چاہئے، اور سوشل خامیوں کا سدِّ باب کرنا چاہئے، اگر ہمیں دماغی اور جسمانی عروج کی انتہائی بلندی پر پہونچنا ہے تو ہمیں ایسے قوانین بنانا چاہئے جن سے بہت قریبی عزیزدں میں باہم شادی نہ ہوسکے، اور ملک کے نمایاں اصحاب ہلاکت اور تباہی سے محفوظ رہیں۔

بیالوجی کے مطالعہ نے ہمیں سب سے زیادہ اہم درس یہ دیا ہے کہ کارگاہِ حیات میں تربیت سے زیادہ اثر ڈالنے والی شئے خود فطرت ہے، خود پھول ہمیں یہی سبق دیتے ہیں، گملے میں سجے ہوئے پھولوں کو صرف آرایش و زیبایش کا طرۂ افتخار تصور نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک اسرارِ حقیقت کا گنجینہ حسین ہیں جن کے رموزِ سربستہ سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔

دُنیا کے ہنگاموں کی عمُر

(از جناب مولانا عبدالودود صاحب بی اے دَرد)

جس قدر ہے نوعِ انسانی میں جوش و انہماک
جسقدر دُنیا میں آتی ہیں نظر سرگرمیاں

جس قدر ہنگامہ آرائی ہے بزمِ دہر میں
جس قدر ہیں طبعِ انسانی کی بوقلمونیاں

دیکھتے ہو جس قدر دنیا میں تم جوش و خروش
ہو رہی ہیں جس قدر عالم میں بزم آرائیاں

پا رہا ہے جسقدر وسعت کہ انتشار و ادب
اور سیاست کی ہیں جتنی یہ قیامت خیزیاں

ہیں یہ سب اہلِ نظر کے واسطے وقتی سوال
چند عرصہ کے لئے ہوتی ہیں سب سرگرمیاں

مبدءِ فیاض سے ملتی ہے ان کو عُمر کم
یہ ہوا کرتی ہیں ہنگامی تلاطم خیزیاں

تم اگر دیکھو کہ ہے مخلوق اک جذبہ میں غرق،
منہمک شدت سے ہیں اس امر میں خورد و کلاں
سب کے احساس و تخیل پر ہے طاری اک اثر
اور مستغرق ہے اس احساس میں سارا جہاں
کچھ اہمیت کی اس کے حد و غایت ہی نہیں
ٹوٹ کر گرنے کو ہے دم بھر میں گویا آسماں

جب یہ حالت ہو تو تھوڑے صبر سے تم کام لو
چند ہفتے یا مہینے یا کہ تا سال رواں
کچھ زمانہ جب گذر جائے گا اس تحریک پر
یہ حقیقت تم پہ ہو جائے گی پھر خود ہی عیاں

ہر زمانہ میں اٹھا کرتے ہیں کچھ شور و شغب
جن میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں سب پیر و جواں
کچھ دنوں رہتا ہے بے اندازہ اک جوش و خروش
ختم ہو جاتی ہیں آخر وہ بلند آہنگیاں
جب گذر جاتی ہے اس پر اور کچھ مدت مزید
اس سے ہو جاتے ہیں پھر نا آشنا گوش و زباں

اس کی تمثیلیں تمہارے حافظہ میں کم نہیں
یاد کرلو کوئی بھی گذری ہوئی تم داستاں

ہے خلاصہ ساری اس تقریر کا بس اس قدر
مخمصہ کوئی نہ ہونا چاہئے سوہانِ جاں
قدرتاً ہوتی ہے کم دنیا کے ہنگاموں کی عمر
ان سے کچھ ہوتا نہیں ہے مستقل سود و زیاں
غیر معمولی تردد ان کے باعث ہے عبث
ان بکھیڑوں میں کرو کیوں عمر اپنی رائگاں
ذمہ داری مختصر ہو، مختصر مسؤلیت
ختم کس سے ہو سکا ہے آجتک کارِ جہاں؟
"مختصر گیرید" فی الواقع ہے اک زریں اصول،
"کل یوم شان" کی انسان کو طاقت کہاں؟

درد

کسی ملک میں نظام تعلیم کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے

نوشتہ

جناب نواب سید محمد حسین جعفری صاحب۔ بی۔ اے (آکسن) ڈائرکٹر آف
پبلک انسٹرکشن۔ حیدر آباد دکن

عنوان مضمون سے ظاہر ہے کہ مضمون طول چاہتا ہے۔ اگر اس کے مختلف شعبوں پر بہ تفصیل بیان کیا جائے تو ایک چھوٹا سا رسالہ اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا ہے بلکہ مضمون کتاب کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور اسپر بھی تشنہ رہجانے کا امکان ہے ایسے بسیط مضمون کو اسقدر مختصر کرنا اور چند صفحات میں اس کے تمام اہم امور کا بیان کرنا آسان نہیں۔ اور ہر شخص اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہم کوشش کرتے ہیں کہ حتی الوسع مضمون مختصر ہو اور پھر چند مفید اور دلچسپ امور کا ذکر ہو جائے اگر ہماری یہ کوشش ناکامیاب رہے تو ناظرین اس کو ہماری کم بضاعتی سمجھ کر در گذر فرمائیں۔

کسی خاص ملک سے بحث نہیں ہے بلکہ مضمون عام ہے کہ کسی ملک میں بھی نظام تعلیم کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے خواہ وہ ملک مغرب میں ہو یا مشرق میں۔

کسی ملک کی تعلیمی کامیابی کا معیار اگر محض مدارس کالجوں طلبہ کی کثرت۔ عمارات

مدارس کی تعداد۔ اور نتائج امتحانات کو قرار دیں تو مشرق اور مغرب میں کئی ملک ہم ایسے پائیں گے جہاں نظام تعلیم کامیاب نظر آئیگا لیکن اگر تعلیم کے حقیقی معنی اصلی مفہوم اور واقعی مقصود کا حاصل ہونا معیار کامیابی قرار پائے تو یورپ ہو یا ایشیا ہم کو ان میں ایک بھی ملک ایسا نہ ملے گا جو نظام تعلیم میں کامیاب ہونے کا فخر کر سکے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا حقیقی نصب العین کیا ہے جس کے حاصل ہو جانے سے تعلیمی کامیابی کا تمغہ اس ملک کو مل سکتا ہے اس سوال کے جواب میں ہم چند مشاہیر علما، اور مبصرین کے اقوال پیش کرتے ہیں جن سے اصل مقصد تعلیم معلوم ہو جائے گا اور پھر ناظرین غور فرما سکیں گے کہ کتنے ممالک اس نصب العین کو پورا کر سکے اور کتنے کامیاب رہے۔

معلم اول سقراط کہتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس کو پہچان لے اور پھر اپنے رب کو۔ یہ قول اس حدیث کے بالکل مطابق ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ عَرَفَ رَبَّهُ" یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

سقراط کے شاگرد افلاطون کا قول ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے جسم اور نفس کو ممکنہ حسن و کمال کو پہنچا دے۔

متاخرین سے فروبل کی تعریف قابل بیان ہے کہتا ہے کہ حقیقی تعلیم وہ ہے کہ جو انسان کو اس قابل کر دے کہ وہ خدا اپنے نفس اور ماحول کو پہچان لے۔

فرنگ کہتا ہے کہ تعلیم کا صحیح نصب العین تربیت نفس و جسم ہونا چاہیئے۔

مشہور فلاسفر اسپنسر کہتا ہے کہ

تعلیم وہ اچھی ہے جو ہم کو کامل زندگی کے لئے تیار کرے اور کامل زندگی جب ہی ممکن ہے جب ہم جان لیں کہ ہم جسم سے کیا کام لے سکتے۔ دماغ کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ اہل و عیال کی پرورش کیونکر کیجا سکتی ہے اپنے معاملات دینی و دنیوی کو کیونکر حسن کے ساتھ جاری و ساری رکھا جا سکتا ہے۔ جمہوریا ملک کے اچھے افراد کس طرح بن سکتے اور نعمات الٰہی سے کیونکر متمتع ہو سکتے اور اپنے قوائے دماغی اور دیگر ذرائع سے دوسروں کو کس طرح فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

رسکن کا قول ہے کہ صحیح تعلیم وہ نہیں جو نوجوانوں کو نیک کام کرنے والے بنائے بلکہ وہ ہے کہ جوان کو نیکی کا عاشق کردے۔ محنتی، جفاکشی نہ کرے بلکہ محنت اور جفاکشی سے محبت حقیقی پیدا کر دے۔ صرف عالم نہ بنائے بلکہ علم دوست کردے منصف مزاج نہ کرے بلکہ عدل و انصاف کا دیوانہ اور مجنون بنا دے۔

یہ تو اہل مغرب کے بعض اقوال ہوئے۔ اب ہم اہل مشرق میں سے ایک ایسی اعلیٰ ہستی کے بعض ارشاد لکھتے ہیں جس کی شان میں اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا آیا ہے۔ حضرت علیؑ علم کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا الْعِلْمُ ثَلٰثَۃٌ۔ اٰیَۃٌ مُحْکَمَۃٌ۔ فَرِیْضَۃٌ عَادِلَۃٌ۔ اَوْ سُنَّۃٌ قَائِمَۃٌ۔

یعنی علم تین چیزیں سکھاتا ہے۔ خداشناسی۔ خودشناسی۔ عالم شناسی یہ وہی تعریف ہے جو صدیوں بعد فروبل کو سجھائی دی۔

دوسرا ارشاد ہے جو روحانیت کا رنگ رکھتا ہے اور اس کو وہی سمجھ سکتا ہے

جس نے کچھ بھی فضائے روحانی کی سیر کی ہو۔ فرماتے ہیں۔

لَیْسَ الْعِلْمُ بِکَثْرَةِ التَّعْلِیمِ وَالتَّعَلُّمِ وَلٰکِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ یَّقْذِفُ اللّٰهُ فِیْ قَلْبِ مَنْ یَّشَاءُ یعنی حقیقی علم وہ نہیں ہے جو پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہو سکتا ہو بلکہ ایک نور ہے کہ جس کے قلب میں خدا چاہتا ہے ڈالدیتا ہے۔

اب ناظرین کرام غور فرمائیں کہ ممالک دنیا سے کس کس ملک نے صحیح مقصد تعلیم حاصل کیا ہے۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہماری نظر میں ایک ملک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو تعلیم کے حقیقی نصب العین کو سمجھا ہو اور اس کے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ دول یورپ اور امریکہ باوجود کثرت دولت و ثروت دعوے نہیں کر سکتے کہ انہوں نے تعلیم کے یہ اصلی اور اعلیٰ مقاصد حاصل کر لئے بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کا حقیقی نصب العین اب ان کی سمجھ میں آرہا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

تعلیم کے مذکورہ بالا نصب العین کو مدنظر رکھ کر اب ہم ان اسباب کا فرداً فرداً ذکر کرتے ہیں جو نظام تعلیمی کو کسی ملک میں کامیاب بنانے کے لئے لازم ہیں۔ کسی ملک کی تعلیمی حالت کی اصلاح و ترقی کے لئے سب سے پہلے اس ملک کی سیاسی حالت کا درست اور اچھا ہونا ضروری ہے۔

اسٹیٹ مجموعہ ہے کثیر چھوٹے چھوٹے سماجی گروہوں کا یا افراد کا یعنی کئی افراد اور گروہ کے اجتماع سے (دولت) اسٹیٹ بنتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ اسٹیٹ اور ہر فرد اسٹیٹ کا تعلق کیا ہونا چاہئے۔ (اس بات کو بیان کرنے سے قبل یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اسٹیٹ سے ہمارا مقصود جمہوری اسٹیٹ ہے) ہر جمہوری اسٹیٹ

میں ہر ایک فرد ایک حق رکھتا ہے اور ایک فرض۔ اس کا حق حکومت پر یہ ہے کہ حکومت اس کو کامل زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے یعنی ایسی تدابیر اختیار کرے اور ایسے مواقع پیدا کر دے کہ اسٹیٹ کا ہر فرد بشر خود کو کامیاب اور کامل انسان بنا سکے۔

اس کا فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام اسباب سے فائدہ اُٹھائے جو اس کی نشو ونما اور ترقی اور کامیابی زندگی کے لئے اسٹیٹ کی جانب سے مہیا کئے گئے ہوں تاکہ وہ اسٹیٹ کو اس دولت کا نعم البدل دے سکے جو اس کے لئے اسباب زندگی پیدا کرنے میں صرف ہوئی ہو۔ جیسا کہ ہر فرد اسٹیٹ کا ایک حق اور فرض ہوتا ہے ویسا ہی اسٹیٹ کا ایک حق اور ایک فرض ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ وہ ہر فرد سے وفاداری۔ اطاعت اور ایثار کی توقع کرے اور اسکا فرض یہ ہے کہ اپنے ہر فرد اور ہر ایک باشندہ کے کامل نشو ونما کے لئے اپنے بہترین ذرائع ووسائل صرف کر دے۔

اب کامیاب جمہوری حکومت وہ سمجھی جائے گی اور اس اسٹیٹ کی سیاسی حالت اطمینان بخش خیال کیجائے گی جہاں اسٹیٹ اور اس کے افراد کے اغراض میں تصادم نہ ہوتا رہے۔ حکومت اپنے حقوق کو ہر ایک فرد سے پورا کرا لے اور اپنے متعلقہ فرایض کو برابر انجام دیتی رہے اس طرح افراد اپنے حقوق کو سمجھیں اور فرایض پورے کریں جب ایسا نہیں ہوتا تو حکومت اور افراد حکومت کی اغراض میں تصادم واقع ہو جاتا ہے اور اس تصادم کا نتیجہ سیاسی ہیجان ہے جس سے ملک میں امن وامان نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب سکون اور امن نہ رہے تو اسٹیٹ کے جملہ امور میں برہمی واقع ہو گی اور اس کا برا اثر اسٹیٹ کے ہر شعبہ پر پڑیگا اور نظام تعلیم بھی لازماً متاثر ہوگا۔ ملک کی سیاسی حالت کا

بگڑ جانا گویا اس ملک میں تعلیم کا خاتمہ ہونا ہے ۔ جرمنی اور روس کی مثالیں لیجئے ۔ جنگ یورپ کے پہلے جرمنی بہ لحاظ تعلیم کے نہایت اعلیٰ اور ممتاز سمجھی جاتی تھی ۔ اور یورپ اور امریکہ امور تعلیمی میں جرمنی کو رہنما اور ہادی تصور کیا کرتے تھے ۔ جنگ کے بعد اس ملک میں ایسے انقلابات واقع ہوئے کہ ملک سے سیاسی سکون جاتا رہا ۔ جس سے نظام تعلیم ایسا بگڑا کہ اس وقت تک نہ سنبھل سکا اور اب تعلیمی امور میں اس کا نام بہت کم سُننے میں آتا ہے ۔

(۲) اس کے بعد ملک کی اقتصادی حالت ہے ۔ ملک کی اقتصادی حالت کی بہتری سیاسی حالت پر منحصر اور مبنی ہوتی ہے ۔ اگر کسی ملک کی سیاسی حالت خراب ہو تو ممکن نہیں کہ اس ملک کی اقتصادی حالت اچھی ہو سکے ۔ جب تک ملک کی مالی حالت درست نہ ہو تعلیم جاری ہی نہیں رہ سکتی ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تعلیم زبانی جمع خرچ سے نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ تعلیم کے لئے چند لوازم کی ضرورت ہے مثلاً مدارس ۔ کالج ۔ یونیورسٹیاں وغیرہ ۔ پھر ان کے لئے مدرسین ۔ عمارات ۔ آلات تعلیمی وغیرہ ضرور ہیں ۔ یہ سب چیزیں مفت مہیا نہیں ہو سکتیں ۔ ان کے لئے زر کثیر چاہئے ۔ زمانہ حال میں بھی بعض اس خیال کے لوگ موجود ہیں جو تعلیم پر رقم کثیر صرف کرنا ضرور نہیں سمجھتے اور موجودہ مصارف تعلیم کو اسراف جانتے اور کہتے ہیں کہ زمانہ سلف میں نسبتًا روپیہ کم خرچ کیا جاتا تھا ۔ یہ خیال اور اعتراض بالکل سطحی کہا جا سکتا ہے اور امور تعلیمی سے لاعلمی پر مبنی ہے ۔ ایسے خیالات رکھنے والوں کو معلوم کر لینا چاہئے کہ زمانہ سلف میں دنیا کی اقتصادی حالت کیا تھی اور اب کیا ہے مثلاً تھوڑی دیر کے لئے ہمارے ملک کو بطور مثال لیا جائے ۔ آج سے پچاس سال قبل ارزانی اسقدر تھی کہ مزدور کی اجرت برائے نام ہوا کرتی تھی ایک شخص ماہانہ پچیس تیس روپیہ

میں جس قسم کی زندگی بسر کرتا تھا آج اس کے لئے اقلاً سو ڈیڑھ سو روپیہ چاہئے ۔ مزدور پیشہ کی یہ حالت کہ جو معمار یا نجار آج ڈیڑھ روپیہ لیتا ہے اور خوش نہیں ہوتا اس کا دادا روزانہ چھ آنہ کماتا اور مگن رہا کرتا تھا ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ زمانہ سلف میں ہر چیز ارزاں تھی اس لئے تعلیم بھی نسبتاً سستی ہوگی ۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ اس وقت کی اقتصادی حالت کے لحاظ سے زمانہ سلف میں جو روپیہ خرچ کیا جاتا تھا وہ کم نہ تھا بلکہ بسا اوقات اس زمانہ کے بعض سلاطین نے بیحد فراخ دلی سے کام لیا ہے ۔ اندلس کو لیجئے اس کی آمدنی اس وقت ممالک محروسہ کی موجودہ آمدنی سے کم نہ تھی لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں پر بہت روپیہ صرف کیا گیا مثلاً جامع قرطبہ اور غرناطہ کے حالات تاریخ میں دیکھے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ کسقدر دریا دلی سے روپیہ صرف کیا گیا ہے ۔ بغداد اور مصر کا یہی حال رہا ۔

سلطان محمود غزنوی سالانہ چار لاکھ دینار شعرا اور علما میں تقسیم کیا کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ رقم کثیر صرف کرکے یونیورسٹی اور میوزیم قایم کئے تھے ۔ اس کے پاس راجہ نند رائے نے ایک قصیدہ اس کی تعریف میں روانہ کیا تھا اس کے اشعار ایسے پسند آئے کہ پندرہ قلعوں کی حکومت دیدی ۔ تغلق اور خلجی سلاطین نے لاکھوں روپیہ کے خرچ سے مدارس قائم کئے مثلاً فیروز شاہ تغلق سالانہ ۳۶ لاکھ روپیہ علما کے لئے صرف کرتا تھا ۔ ۱۸ ہزار غلاموں کو تعلیم دیجاتی تھی جس میں سے بارہ ہزار کو صنعت وحرفت کی تعلیم دیجاتی اور اُن کی رہائش و آرام کا خیال رکھا جاتا تھا ۔ ۳۰ کالج اس نے قائم کئے جس کے ساتھ مساجد ملحق تھیں اور ان میں تعلیم پانے والے نادار طلبا کو وظائف دیے جاتے تھے اور

انکے سب اخراجات کی کفالت حکومت کرتی تھی۔ جہانگیر نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ اگر کوئی شخص بے وارث جا
اور مالدار ہوتا تو اسکا متروکہ تعلیم میں صرف ہوتا تھا۔ اسنے ایک کتاب کے قلمی نسخے کیلئے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیئے
اورنگ زیب نے توسیع واشاعت تعلیم کیلئے متعدد پروفیسر مامور کئے نادار طلبا کی امداد کی
فن زراعت کی تعلیم کے لئے متعدد مدارس قائم کئے محمد شاہ بہمن نے گلبرگہ۔ بیدر۔ دولت آباد۔
قندہار میں یتامیٰ کے لئے مدارس کھولے۔

قطب شاہی دور میں محمد قلی قطب شاہ نے کئی کالج کئی دارالاقامہ اور ابتدائی مدارس قائم
کئے۔ ان تاریخی واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد بھی کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ زمانہ سلف میں اسوقت کے اقتصادی
حالت کے لحاظ سے کثیر رقومات تعلیم پر صرف کی گئیں اور یہ کہنا کہ اب اسراف کیا جاتا ہے غلط ہے۔

دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ زمانہ حال کو زمانہ ماسبق سے مقابلہ کرنا اصولاً صحیح ہوگا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا
اقتصادی۔ معاشرتی حالات میں بیّن فرق و تفاوت ہوگیا۔ طرز تمدن جدا ہوگیا۔ حالات بدل گئے۔
قاعدہ کلیہ ہے کہ محکوم اقوام حاکم قوم کی پیروی کرتی ہیں۔ اسلئے ہم بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ یورپ اگرچہ
ہمسے کوسوں دور ہے لیکن اسکے اثرات سے ہم محفوظ نہ رہ سکے۔ طرز معاشرت۔ لباس۔ خیالات وغیرہ
میں ہم یورپ کے پورے مقلد ہوگئے اور اب سب کچھ ہوجانے کے بعد یہ کہنا کہ ہم آزاد ہیں یا خود کو آزاد
کرسکتے ہیں خام خیالی ہے۔ البتہ اب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو صرف یہی کہ باہر کے تمدن کو اصلاح و ترمیم
کے ساتھ قبول کیا جائے۔ اس کی اندھی تقلید نہ کی جائے۔ .. .. ..

جاپان جو ایشیا کی اقوام میں ایک ممتاز اور کامیاب قوم سمجھی جاتی ہے اسکو بغیر یورپ اور امریکہ کے مدد کے ترقی
نصیب ہوئی اور بیشمار امور میں اسکو انکی تقلید کرنی پڑی لیکن اسنے عمل یہ کیا کہ خذ ما صفا ودع ما کدر۔ جاپان
نے جو کچھ عمل کیا وہ اپنے ملک کی بہبودی اور فلاح کیلئے کیا جاپان پر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ
وہ اہل ملک کا دشمن تھا یا یہ کہ وہاں کے ذمہ دار عہدہ دار خود غرض اور دغاباز تھے۔ تعلیم میں جاپان
جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسقدر اظہر ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ کیا جاپان کو تعلیمی ترقی بلا روپیہ
صرف کرنے کے حاصل ہوئی یا یہ کہ جاپان حکام نے بخل سے کام لیا اور تعلیم پر روپیہ صرف
کرنے میں پس و پیش کیا۔ ذیل میں چند جاپانی درسگاہوں کے سالانہ اخراجات ہم بتلاتے

ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ جاپان میں کس قدر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ جاپانی قوم ایسی جاہل نہیں ہے کہ کسی بے نتیجہ اور مہمل کام پر افراط سے روپیہ صرف کرے یقیناً انھوں نے اس کو ناگزیر سمجھا۔ جب ہی تو اسقدر دریا دلی سے کام لیا۔ جاپان گورنمنٹ نے سمجھا اور خوب سمجھا کہ آج کل کی ضروریات تعلیمی بلا رقم کثیر خرچ کرنے کے پوری نہیں ہوسکتیں اور کوئی درسگاہ کوئی ایسوسی ایشن جب تک کہ اُس کے لوازمات اور ضروریات کی پوری تکمیل نہ کی جائے کامیابی کے ساتھ اپنے قیام کے اغراض و مقاصد کو پورا نہیں کرسکتا۔

جاپان میں کاناکاوا بری فکچر کا رقبہ (۹۷۰) مربعہ میل ہے۔ اس کی مردم شماری ۱۳ لاکھ ۲۳ ہزار ہے۔ اس کی جملہ آمدنی ایک کروڑ چھیالیس لاکھ تینتیس ہزار اور اسکا سرکاری خرچ تعلیمی ۱۷ لاکھ ۶۵ ہزار ہے اور اس میں (۶۶۶) تعلیم گاہ ہیں۔

جاپان میں

(الف) ایک مدرسہ تحتانیہ درجہ اول کا خرچ ۹۰ ہزار روپیہ ہوتا ہے۔

(ب) مدرسہ وسطانیہ کا خرچ ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔

(ج) مدرسہ فوقانیہ پر سوا لاکھ صرف ہوتے ہیں۔

(د) ٹوکیو کی یونیورسٹی کا خرچ سالانہ ستاسی لاکھ چھبیس ہزار ہے۔

(ھ) ٹوکیو کے نارمل اسکول پر سالانہ تین لاکھ سینتالیس ہزار روپیہ صرف ہوتے ہیں۔

(و) ٹوکیو کے مدرسہ السنہ غیر ملکی کا سالانہ خرچ ایک لاکھ چھپن ہزار ہے

(ط) مدرسہ فنون لطیفہ پر سالانہ دو لاکھ چار ہزار صرف کئے جاتے ہیں۔

(ح) مدارس نابیناں کا سالانہ خرچ تین لاکھ پچاس ہزار ہے اور بہرے اور گونگوں کے مدرسہ پر سالانہ تین لاکھ اسی ہزار صرف ہوتے ہیں۔ (ہم نے یہ اعداد نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کی کتاب سے لئے ہیں اور یہ صرف ٹوکیو کے لئے ہیں)

ناظرین اس سے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اگر تمام جاپان کے تعلیمی انسٹیٹیوشنس کے اخراجات جمع کئے جائیں تو کیا ہوں گے ان اعداد کے دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی کہے کہ اچھی تعلیم کے لئے روپیہ کی ضرورت نہیں تو وہ یقیناً ان بدیعات سے عمداً اغماض کرتا ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جاپان کی اقتصادی حالت ایسی اچھی ہے اور ملک اسقدر تونگر ہے کہ اتنے کثیر اخراجات کا بار اُٹھا سکتا ہے یہ درست ہے اور ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ کسی ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے سیاسی حالت کے بعد اقتصادی حالت کا درست ہونا لازم ہے۔ ہر ملک کا فرض ہے کہ وہ اپنی اقتصادی حالت کو درست کرے اور اقلاً اس قدر ترقی دے کہ اپنی ضروریات تمدن کو پورا کر سکے۔

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جاپان میں تعلیم کا بار صرف گورنمنٹ ہی نہیں اُٹھاتی بلکہ نصف سے زاید بار پبلک پر پڑتا ہے میونسپل ٹکس اور لوکل فنڈ سے ابتدائی تعلیم کے اخراجات ادا کئے جاتے ہیں اور گورنمنٹ کا روپیہ زیادہ تر اعلیٰ تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور یہی کیفیت ممالک یورپ اور امریکہ کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ملک کیسا ہی دولتمند کیوں نہ ہو وہاں کی گورنمنٹ تنہا اخراجات تعلیم کی کفیل نہیں ہو سکتی کیونکہ سوار

تعلیم کے اور دوسرے مدات پر بھی اس کو خرچ کرنا ہوتا ہے بلکہ پبلک بھی گورنمنٹ کا ہاتھ بٹاتی ہے اور بوجھ ہلکا کرتی ہے۔

ہماری اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی ملک کی تعلیمی حالت درست ہونے کے لئے رقم کی ضرورت ہے اور رقم کی برآمد کے لئے ملک کی اقتصادی حالت کا اچھا ہونا لازمی ہے۔ اگر ملک کی اقتصادی حالت اچھی ہوگی تو گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی مالی حالت درست ہوگی اور ہر ایک بقدر ضرورت عمدگی سے اس کام میں حصّہ لے سکے گی۔

ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت کے بعد جسمانی حالت کا درست ہونا بھی لابد ہے جب تک کسی ملک کے باشندے صحیح اور تندرست نہ ہوں ان پر اور ان کے بچوں پر تعلیم کا اثر اچھا نہ ہوگا۔ یہ امر مسلمہ ہے۔ اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ تندرست جسم قوی دماغ رکھتا ہے یعنی اگر کسی شخص کی عام جسمانی حالت اچھی ہو تو اس کا دماغ بھی صحیح ہوگا۔ قوائے حافظہ۔ فہم و ادراک حالت کمال میں ہوں گے۔ دماغ کی تازگی اور نشو و نما کے لئے خون کی روانی کی ضرورت ہے۔ تازہ خون اگر دماغ میں چکر لگاتا رہے تو دماغ میں تازگی پیدا ہوتی اور قوت پہنچتی ہے اور خون جسم کے ذریعے سے دماغ کو پہنچتا ہے۔ اگر جسم تر و تازہ ہو تولید خون کافی ہوتی ہو تو جسم دماغ کو کافی خون پہنچائیگا۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ مرض کی حالت میں اور مرض سے صحت ہونے کے چند روز تک انسان کا دماغ برابر کام نہیں دیتا معمولی مشقت برداشت نہیں کر سکتا اس کی وجہ یہی ہے کہ حالت مرض میں تولید خون کی کمی ہو جاتی ہے اور دماغ کو کافی خون نہیں پہونچتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں کمزوری محسوس ہوتی ہے اور قوائے دماغی

کمزور ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی ملک کے ذکور اور اناث کی صحت جسمانی میں انحطاط پیدا ہو جائے
اور اس کے ازالہ کی فکر نہ کیجائے تو اس کا اثر نسلاً بعد نسل قایم رہتا اور بُرے
اثرات پیدا کرتا ہے۔ جو ماں باپ ضعیف ہوں اُن کی اولاد قوی اور تندرست نہ ہوگی اور
پھر ان کی اولاد ان سے نحیف تر ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوائے جسمانی کے
ساتھ قوائے دماغی بھی ضعیف ہوتے جائیں گے۔ اور قبول استعداد۔ حصول علم کی صلاحیت
کم ہوتی جائے گی۔ اس بحث پر طولانی بیان کی ضرورت نہیں۔ ہر مدرس جانتا ہے کہ کمزور
طالب علم کو تعلیم دینا کسقدر مشکل ہوتا ہے۔ ہم دو تین ماہرین کے اقوال بیان کرکے مضمون
کو ختم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ووڈ لکھتے ہیں کہ زود فہمی اور اچھے حافظہ کا مدار جسمانی صحت پر
ہوتا ہے جس کی جسمانی حالت صحیح ہوگی اس کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ زود فہم ہوگا اچھی
صحت نتیجہ ہوتی ہے کافی اور زود ہضم غذا کا۔ ایسی غذا جو جزو بدن ہو سکے۔
ڈاکٹر سر جارج نیومن طبیب خاص بورڈ آف ایجوکیشن انگلستان لکھتے ہیں کہ انہوں
نے اپنی تحقیقات میں چھ لاکھ طلبہ کو تعلیم میں گھٹے ہوئے صرف اسلئے پایا کہ کافی غذا نہ
ملنے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو گئے تھے۔
مسٹر گورسٹ انگلستان کے بچوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ” اکثر طلبائے مدارس فاقہ
زدہ و کملائے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک کثیر تعداد ایسے امراض میں مبتلا پائی جاتی ہے کہ
جس کا انسداد معمولی توجہ اور کوشش سے ممکن ہے ایسے بچوں کو تعلیم دینا ان پر ایسا
ظلم کرنا ہے جیسا کہ ایک بھوکے اور کم قوت گھوڑے سے کام لینا۔
اقوال بالا سے ناظرین معلوم کر سکیں گے کہ افراد ملک کی صحت جسمانی کا اچھا

ہونا ترقی تعلیم کے لئے کسقدر ضروری ہے۔ اگر بہتر سے بہتر مدارس قائم کئے جائیں اور مدرسین مامور ہوں تو بھی جب تک کہ متعلمین صحیح و تندرست نہ ہوں مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور سوائے روپیہ کی بربادی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ہر ملک کی حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کے نونہال ملک کے بیش بہا جواہر کے معدن ہیں اور ملک کے مرد اور عورتیں اس کی بیش قیمت دولت ہے ہر حکومت کو چاہیے کہ اپنے نونہالوں کی تربیت اور پرورش کے لیے ممکنہ کوششیں عمل میں لائے اس بارے میں ذرا بھی بخل سے کام نہ لے ورنہ ایک روز اس کو نقصان عظیم برداشت کرنا ہوگا۔

میں نے سطور بالا میں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی ملک میں بھی نظام تعلیم کامیاب ہونے کے لئے پہلے اس کی سیاسی حالت پھر اقتصادی اور اس کے بعد جسمانی حالت کا درست ہونا ضروری ہے ممکن ہے کہ میرے بعض خیالات غلط ہوں۔ اگر ناظرین کرام اس عنوان پر مزید روشنی ڈالیں اور میرے خیالات کی اصلاح اور توضیح فرمائیں تو میرے لئے باعث مسرت ہوگا۔ فقط

اعلان

مندرجہ ذیل مضمون جشن جوبلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۵ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء) کے موقع پر آل انڈیا قومی مشاعرہ کے لئے تجویز ہوا ہے۔ امید ہے کہ شعرائے کرام اس پر طبع آزمائی فرمائیں گے اور شرکت کے لئے تشریف لائیں گے۔

"اسلام کی اخلاقی اور علمی فتوحات اور انکا احیا علی گڑھ میں"

خاکسار سید محمد احسن مارہروی سکریٹری جوبلی مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

فدائے حریت

(از جناب محمد یوسف صاحب اسرائیلی سنبھلی)

خون آزادی پہ یورپ نے جو باندھی تھی کمر　　اہل ہسپانیہ تھے فوجِ ستم کے رہبر
رفتہ رفتہ گئی افریقیہ کے صحرا پہ نظر　　چر گئے مزرعہ آزادی کو سب پوپ کے خر
حریت کے لئے صحرا کا بھی دامن نہ بچا
ٹوٹی جب برق ستم امن کا خرمن نہ بچا

حبش کا امن تہ خنجر آزار آیا !　　حُریت لٹ گئی اور قید میں سردار آیا
گردشِ چرخ سے طالع پہ جو ادبار آیا　　ہو کے پابند رسن بر سر بازار آیا
دامنِ دشت تھا احرار کے خوں سے گلگوں
علمِ حریت حبش تھا صحرا میں نگوں

ابروئے صید ستم غصہ سے بل کھاتے تھے　　دیکھ کر اس کو تماشائی بھی گھبراتے تھے
نام سُنتے تھے کبھی اُس کا تو تھراتے تھے　　آج وہ ایک تماشا تھا گھرے آتے تھے
اس اسیری میں بھی خلقت کو ہراس آتا تھا
سہم کر دور کو ہٹتا تھا جو پاس آتا تھا

حبشی ساخت کے مضبوط و قوی تھے اعضا　　تیرہ بختی میں مگر اُن سے نہ کچھ کام بنا
گردش چرخ نے اس کو جو نگوں سر تھا کیا　　نگہِ یاس سے تھا روئے زمین کو تکتا

باغ احرار کا وہ غنچۂ رعنائی تھا
طوق و زنجیر میں اک ضیغم صحرائی تھا

گو شجاعت کو کیا اس نے، نہ ہرگز بدنام — سختی بخت میں پر آئی نہ ہمت کچھ کام
جس کی تلوار نے دیکھا تھا نہ ہفتوں سے نیام — جس کی پامردی پہ کرتے تھے نہ دشمن بھی کلام

دور تھا ملک و وطن قید بزنجیر تھا وہ
پر طمانیت و خودداری کی تصویر تھا وہ

یک بیک اپنے وہ صیاد سے یوں کہنے لگا — طوق و زنجیر کو گردن سے ذرا میری ہٹا
شاہ ہے بھائی مرا اس کا تو لے مجھ سے پتا — اس تلک لے کے تو چل حال کہوں اُس سے ذرا

زرِ فدیہ بھی تجھے خوب سا دلوا دونگا!
دانت ہاتھی کے بھی میدانوں سے منگوا دونگا

سُن کے بیدرد مسیحی نے دیا اُس کو جواب — جس کے ہر لفظ نے بیکس کے کیا دل کو کباب
یہ ترا پیکرِ آہن یہ ترا حسُن و شباب — اک مسیحی کے غلامی کے اُٹھائے گا عذاب

تیرے ہاتھوں میں ہرگز کبھی نیزہ ہوگا
زینت تاج نہ آیندہ یہ چہرہ ہوگا

سُن کے اس ظلم کو وہ صید ستم رونے لگا — دُھن کے پھر رنج میں سر اُسنے مسیحی سے کہا
زلف مشکیں کو مرے سر سے تو کر دور ذرا — سُن کے بیدرد نے یہ ہاتھ میں قینچی کو لیا

سر سے پھر اُسنے کیا کاکلِ مشکیں کو جدا
کھا کے بل ناگ نے من اپنا دہن سے اگلا

حبشی اقوام میں ہے ایک پُرانا دستور　　سونا کچھ رکھتے ہیں بالوں کی جڑ ومیں مستور
اس مسیحی کو نہ تھا اس کا ذرا علم و شعور　　شکل زر دیکھ کے ظالم ہوا بیحد مسرور
شکل اُمید جو مایوس کو آئی ہی نظر!!!
تھی یہ ہی بس کہ مسیحی کو ہو کچھ خواہش زر

پارۂ زر اسے دکھلاکے کہا رو رو کر　　صرف اس دن کے لئے میں نے چھپایا تھا یہ زر
اس پہ قانع ہو نہ وا اب دہن آز کو کر　　چھوڑ دے ظلم کی حد ہوتی ہے رحم بھی کر
گو زر فدیہ نہیں نذر کی تیرے قابل
بیکسی میری ہے پر رحم کی تیرے سائل

کچھ تو سوچ آہ کہ ملکہ مری خانہ برباد!　　دشت میں زیر شجر کرتی ہے کیا کیا فریاد
چھوٹے چھوٹے مرے معصوم جو ہیں ای جلاد　　چھوڑ کر کھیل کو پھرتے ہیں وہ کیسے ناشاد
ماں سے ضد کرتے ہیں وہ مجھ کو بلانے کیلئے
دل تڑپتا ہے گلے اونکو لگانے کے لئے!

سن کے مظلوم کی فریاد ستمگر بولا　　چکنی باتوں سے خبردار نہ مجھ کو پھسلا
ایسے چکموں میں تو بندہ نہیں آنے والا!　　ایسے موہوم خیالات تو دل میں بھی نہ لا
رحم کیا چیز ہے ہم اس سے خبردار نہیں
اپنی تہذیب کو کچھ اس سے سروکار نہیں

آتش زر سے نہ ہو نرم یہ زنجیر تری　　سعی بیکار ہے زاری مری نخچیر تری
کام آئیگی نہ کچھ اب تری تقریر تری　　زر پوشیدہ بھی کھویا ہے یہ تقدیر تری

ایک عیسائی سے یہ طرز تکلم کیا خوب
ایک درندہ سے اور امید ترحم کیا خوب

شاق بیوی کو بہت تیری جدائی ہو گی — شکل اولاد نے کیا تیری بنائی ہو گی
پاس تک اُنکے نہ پر تیری رسائی ہو گی — تا دمِ مرگ نہ اب تیری رہائی ہو گی

قوم ہے گو تری آزاد مگر تو ہے غلام!!
تیری قسمت ہی میں لکھی تھی اطاعت کی لگام

بحر غم میں دل بیکس کے جو طوفان اُٹھا — قلزم شوق وطن چشم سے خوں ہو کے بہا
ابر ساں درد فراق اس کے جگر سے جو اٹھا — موجۂ یاس میں امید کا گھر بہ نکلا!

طائر روح تن زار سے باہر نکلا
توڑ کر کنج قفس بلبل بے پر نکلا

تھے نہ الفاظ مسیحی کے تھا پیغام قضا — ناوک ظلم نے مضطر کے جگر کو چھیدا
اس کی آزاد طبیعت پہ تھی یہ قید بلا — جسم کو قید کیا روح پہ کچھ بس نہ چلا

ہاتھ آیا نہ مسیحی کے بجز حسرت کے سوا
لاشہ جنگل میں درندوں کیلئے پھینک دیا

(ترجمہ)

بیادگار شوق قدوائی

(۱۸۵۲-۱۹۲۵)

{اذکروا موتاکم بالخیر}

(جناب مولوی محمد معین الدین انصاری صاحب (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا)

یوں تو کسی کے مرنے جینے سے نہ دنیا کا کام بگڑتا ہے نہ بنتا ہے۔ لیکن ہماری نظر کوتاہ اور ہمارا مفاد محدود ہے جس کی وجہ سے عالم کے ادنیٰ ادنیٰ تغیرات بھی ہمارے لئے بعض اوقات آسمان ٹوٹ پڑنے سے کم نہیں ہوتے۔ منجملہ اُن اغراض کے جن کے لئے ہم نے ایک عالم کو توڑ پھوڑ کے بہت سے عالم بنا لئے ہیں ہماری ایک غرض زندگانی تغذیہ روحانی بھی ہے جس کے لئے ہم نے ایک ادبی دنیا تعمیر کی ہے۔ اُس کو طرح طرح سے سجتے اور سنوارتے ہیں اور جب اس کی عمارت کو کوئی صدمہ پہنچ جاتا ہے تو اپنے شغف کے لحاظ سے خود بھی صدمہ محسوس کرتے ہیں۔

منشی احمد علی شوق قدوائی کی وفات بھی ہماری ادبی دنیا کے لئے ایک زبردست حادثہ ہے۔ بہت سے قابلیت والے لوگ پیدا ہوئے اور پھر پیدا ہونگے۔ بہت سے شاعراب موجود ہیں اور رہیں گے۔ محقق زبان اور نئی شاعری کو بڑھانے اور پھیلانیوالے بھی برابر آتے جائیں گے۔ مگر شوق کہاں جنہوں نے ساٹھ برس اس رہگذار ادب کی خاک چھانی تھی!؟ ہم اُن کے سے ارباب ادب کو اگلوں پچھلوں کے درمیان ایک کڑی

سمجھتے تھے اُنھوں نے لکھنؤ میں آمانت اور وزیر کی انتہا دیکھی۔ رام پور میں امیر اور داغ کا عروج دیکھا اور اب وہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے جدید شاعری کی صبح کو دیکھ رہے تھے کہ اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ چنانچہ اُن کی ذات اگرچہ فی الواقع استبداد سے الگ تھی مگر پھر بھی ایک ایسی ذات تھی جس کی موجودگی سے ماضی اور مستقبل میں کم وبیش ایک قسم کی یکسانی کسی حد تک باقی رہتی خاص کر اس وجہ سے کہ اُن کی وقعت پُرانے طرز کے شعرا اور نئی روشنی کے سخن فہموں میں برابر تھی۔ وہ تنقید اور اظہار رائے سے بہت کم چوکتے تھے۔ اُن کا مطالعہ وسیع معلومات وافر اور تجربہ بہت بڑھا ہوا تھا جس کا اثر اُنھوں نے طرح طرح سے دور حاضرہ کے ادبیات پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اب افسوس کہ ان حیثیات سے اُن کی جگہ لینے والا کوئی نہیں۔

زبان اُردو میں چاہے اور جس چیز کی کمی ہو مگر شعرا کی کمی نہیں۔ لیکن جس قسم کے شعرا کو اس زبان کی آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اُن کی کمی قابل شرم ہے۔ حال میں ایک بزرگ حالی گذرے جنھوں نے اور جن کے ہمخیالوں نے جادۂ رسم ورواج سے کچھ الگ ہوکر ایک نئی راہ نکالی۔ "ایک شاعر" کی حیثیت سے خواہ یہ لوگ اچھے تھے یا برے، اون کی زبان اور عروضی قابلیت اعلیٰ پایہ کی تھی یا نہ تھی، سردست یہ سوالات درپیش نہیں ہیں۔ اُردو کا مورخ اور بے تعصب ادیب اگر اُن کو داد دیتا ہے تو کم ازکم اُن کی جدت پسندی اور اخلاقی جسارت کی کہ اُنھوں نے قدیم صحبتوں کے محدود دائرہ سے الگ ہوکر اپنی راہ لی۔ حاسد اون کے پیچھے پڑے محض اس لئے کہ وہ پُرانی لکیر کو کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ یا اس لئے کہ قدامت کا اقتدار کیوں گھٹایا جاتا ہے۔ مگر ان نئے خیال والوں کی باتیں بہت

قرینِ فطرت اور ایسی لگتی ہوئی ہیں کہ باوجود اُن کی خامیوں اور لغزشوں کے دلوں میں گھر کرنے لگیں۔ اور جب ایک بار یہ راہ کھل گئی تو بزم سخن کی یہ نیرنگیاں عجیب لطف دکھانے لگیں۔

اسی نظر سے ہم اکبر اور اقبال کے مدح سرا ہیں۔ اسی بنیاد پر شبلی اور شوق کو مجددین اردو میں شمار کرتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا مذاق سخن، رنگ مضامین، معیار خوبی، طرز ادا الگ الگ تھا۔ اگر ایک مزاحیہ کہتا تھا تو دوسرا قومیت کا رنگ لیے ہوئے اگر ایک مورخ کی بے تکلفانہ شان رکھتا تھا تو دوسرا مصور اور محرم راز کی۔ یہ محض انفرادی تفریقیں ہیں۔ مگر ان چار پانچ شعرا میں خدمت علم اور حسن نیت کے لحاظ سے جو جوہر مشترک تھا اور جس کی بنا پر یہ ارکان بزم سخن مجددین اُردو میں مانے جائیں گے وہ یہی ہے کہ انہوں نے روایتی شاعری کو بُت بنا کر نہیں پوجا۔ بلکہ اپنا قبلہ الگ بنایا جس کی طرف اب ساری دنیائے اُردو کا سرِ نیاز جھکتا ہے۔

حالی اور اقبال وغیرہ کی طرح شوق مرحوم بھی شروع میں اپنی جدتوں کی بدولت بہت مطعون ہوئے۔ سخن فہموں کا رجحان اُنکی طرف دیکھ کر حاسد بھی نکل آئے۔ بعض رسائل اور اخباروں کے فائل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مدتوں مرحوم کے جدید طرز کے کلام پر، بلکہ اس کی لپیٹ میں اُن کے روایتی طرز کے کلام کی چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ موافقین شوق نے بھی جوابات کے تار باندھ دیئے۔ فی الجملہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے والے کے جوہر اور بھی چمک گئے۔ اور اس ضمن میں جو ہرزہ سرائی ہوئی تھی اس کا اثر کچھ دیرپا نہ تھا۔ قاعدہ ہے کہ لوگ تنقید بھی اسی پر کرتے ہیں جو کسی لائق ہوتا ہے اور جس کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے۔ مگر

تنقید۔ اور نکتہ چینی کو ہمیشہ کسی کی اہمیت گھٹنے کی علامت نہ سمجھنا چاہیے۔ علمی دنیا میں یہی تو ایک انوکھا پن ہے کہ جو ایک مرتبہ بڑھ جاتا ہے وہ پھر نہیں گھٹتا۔ وہ ہزار لغزشیں کرتا ہے تب بھی اپنے اُن جوہروں کی وجہ سے ہمیشہ مانا جاتا ہے جو ایک مرتبہ فی الواقع چمک چکے ہوں۔ اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم مورخین ایسے شخص کو مرنے نہیں دیتے۔

ان نکتہ چینیوں کو حضرت شوق کا سا شخص (جس کی پرورش ابتدا ہی سے مشاعروں کی جا و بیجا واہ واہ میں ہوئی ہو) اگر بردباری کے ساتھ برداشت کر لے تو یہ ایک بڑی بات ہے۔ اونھوں نے جب سے "نئی شاعری" کی زمین پر قدم رکھا روایتی مشاعروں والی توقعات کو واقعی بہت کچھ بالائے طاق کر دیا۔ بلکہ وہ اس پر مجبور تھے۔ کیونکہ زمانہ بدل رہا تھا اور ہر قسم کے کلام کی اشاعت نسبتاً وسیع تر پیمانہ پر ہونے لگی تھی۔ مگر اون کو جدید مذاق کے تمام شعرا میں یہ بہت مؤثر فوقیت حاصل تھی کہ جب اُنھوں نے نئی شاعری اور جدید مسلسل نظموں کی طرف رخ کیا اُس وقت وہ شاعری کے قدیم اور روایتی میدان میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے اور ان کے کلام سے کہنہ مشقی اور فنی قابلیت آشکار تھی۔ اس لئے پُرانے مذاق کے لوگوں کو اُن کی نئی روش پر اعتراض کرتے بن نہ پڑتی تھی۔ اب رہے نئے سخن فہموں کے اعتراضات تو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک خیالات اور خیالات کی ترتیب کا تعلق ہے وہ قابل تسلیم ہوں یا نہ ہوں مگر زبان اور فن کی حیثیت سے اگر اعتراضات ہوتے بھی تھے تو نہایت کمزور۔ ہمنوایانِ شوق نے ان معترضین کو ہر لحاظ سے وقتاً فوقتاً معقول جوابات بھی دئیے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اب دور وہ شروع ہو چکا ہے کہ شعرا میں عام لوگ وہ تمام اوصاف نہیں

ڈھونڈھتے جن کے بغیر کچھ عرصہ پیشتر شاعر شاعر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کی علت ایک حد تک نئے دور کی جلد بازی کی عادت اور بے پروائی کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ مگر حضرت شوق ایسا مزاج اور ایسی عادتیں رکھتے تھے کہ خواہ وہ فضول مہمل اور زاید از ضرورت بھی کہنے کی کوشش شاید کرلیتے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ غلط اور ناقص کلام پیدا کرتے۔ وہ اپنی تربیت سے مجبور تھے۔ اور یوں تو غلطی بشر ہی سے ہوتی ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جن چیزوں کو ہم جدید شاعری یا "فطری" شاعری قرار دیتے ہیں (بلکہ قرار دینا چاہتے ہیں) یعنی جس کی تقلید دنیا کی ترقی یافتہ اور آزاد زبانوں میں یاد اور ہماری زبان میں کم پائی جاتی ہے وہ چیزیں ہمارے ہاں ابھی صرف معرض ارتقا میں ہیں۔ پایہ کمال کو نہیں پہونچی ہیں۔ ابھی ہمارے مختلف ادبی حلقوں کے مذاق پسندیدگی میں یکسانیت کا شائبہ بہت کم ہے۔ ان چیزوں کی خوبی پر رائے قائم کرنے کے لئے معیار مشترک کی سی کوئی شے ہم میں نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ابھی تک ہم نہ اس کے عادی ہوئے ہیں کہ نئے خیالات کو پرانی روایات کی پابندیوں کے ساتھ دیکھ کر اس سے پورا حظ نہ اٹھا سکیں .. .. نہ اس لایق ہوئے ہیں کہ نئے خیالات کو بالکل آزادانہ اور خود ساختہ اصول و طرز ادا کے ساتھ شاعرانہ انداز سے ظاہر کرکے داد پائیں۔ اور جب تک ایک طرف عام طور پر مذاق شاعری قدیم روایات شاعری سے قدرے بے نیاز نہ ہونے لگے اور دوسری طرف انھی روایات کی ردو قدح اور بے لگام شعراء کی روک تھام کے بعد کسی مستقل تر اور عمومی معیار قایم ہونے کے آثار پیدا ہوں اس وقت تک اس نئے طرزوں میں ایک شاعر کو

دوسرے شاعر پر کسی حیثیت سے فوقیت دینا ممکن نہیں۔ مختلف ادبی حلقوں میں مختلف شعرا کی عظمت اور عزت قائم رہے گی اور ہر شاعر کے کلام میں نقایص اور عیوب نکلنے کے بکثرت مواقع پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس وقت تک ہمارے ہاں سخن فہمی بھی تقریبًا تمام تر ایک خاص قسم کی تربیت پائے ہوئے دماغوں کی میراث ہے۔ اور موجودہ دور کی اصلاح میں ایک نصب العین یہ بھی ہے کہ جہاں تک بنے ہر کس و ناکس کو مخاطب کرنے کی کوشش کی جائے یعنی شعر کا جادو صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود نہ رہے۔ اس مقصد نے اس جدید سرزمین سخن میں اعتدال اور توازن قایم رکھنے کو اور بھی دشوار کر دیا ہے۔ اور ابھی تو توازن ہی اصل چیز ہے۔ کیونکہ اردو کی شاعری اُتنی آزاد نہیں ہوئی ہے جتنی کہ انگریزی یا عربی وغیرہ کی۔

دوسری وجہ حضرت شوق کی اہمیت کو دلوں میں جگہ دینے والی یہ تھی کہ وہ نواح لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے[۵۱] اور دستور کے مطابق جائز طور پر لکھنوی کہلائے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کی ابتدائی شاعرانہ تربیت بھی لکھنؤ کی مخصوص فضا میں اور لکھنؤ ہی کے لوگوں میں ہوئی۔ یہ مشہور شہر جو اپنی نفاست پسندی شیفتہ مزاجی اور نزاکت پرستی کی بنا پر "پیرس ہند" کا لقب پا چکا ہے اُس زمانہ تک اپنی خصوصیتوں کا اور بھی متوالا تھا۔ اودھ کی سلطنت مٹ چکی تھی مگر امارت اور حکومت کی آن بہت کچھ باقی تھی اور اس مرکز تہذیب و تمدن کی شان معاشرت میں چنداں فرق نہ آیا تھا۔ حفظ مراتب علم مجلس اور باہمی تعلقات کے قدیمی پہلوؤں پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ ہر کس و ناکس اپنے معزول بادشاہ

---

[۵۱] قصبہ جگور آپ کا آبائی وطن آپ کی جائے ولادت ہے جو لکھنؤ سے دس میل ہے۔

کی طرح اپنی زبان کی خوبیوں پر اتراتا تھا۔ لکھنؤ کے ضرب المثل اور شاندار مشاعرے ہی وہ چیز تھے
جو ہر خاص و عام کو متوجہ کرتے تھے۔ بجز اس کے کوئی مشترکہ مشغلہ سیر حسینان لکھنؤ کے لئے نہ تھا۔
اور خاص کر سیاست کی ہوا اس خطۂ پاک کی طرف اس وقت تک ہو کر بھی نہیں گذری تھی۔
اسی طرح سرزمین رام پور بھی اپنے تاجداروں کے زیر سایہ شعرا کی قدردانی کر رہی تھی اور لکھنؤ
والوں کی بارگاہ وہاں بھی چڑھی تھی۔ گویا رام پور دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا ایک اکھاڑا تھا۔ تدبیر الدولہ
مدبر الملک نواب منشی مظفر علی خاں آسیر لکھنوی کا عروج خاص کر قابل ذکر ہے۔ گویا انھی
کے نام سے لکھنؤ کا نام تھا۔ آخر میں مرزا غالب کی سی شخصیت کے لوگ بھی اُن کو ماننے لگے
تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ مرزا کی وفات کے بعد نواب یوسف علی خاں ناظم بھی اوستاد آسیر
سے اصلاح لینے لگے تھے۔ شوق مرحوم اوائل سن میں عرصہ تک رامپور میں رہے تھے
اور زمانہ طالب علمی ہی سے آسیر کے معتقد ہو چلے تھے۔ بالآخر انیس برس کے سن میں اپنی تعلیم
ختم کرنے پر جب مرحوم کو مستقلاً لکھنؤ میں قیام کرنے کا موقع ملا تو کچھ دنوں بعد حضرت
آسیر کے شاگرد ہو گئے۔ مگر شوق مرحوم کی شاعری اُن کے چودہ برس کے سن سے شروع
ہو چکی تھی۔ اور اسی وقت سے انھوں نے بڑے بڑے اوستادوں کی صحبت پائی اور
ذوق سخن کو ترقی دینا شروع کیا۔ گویا وہ شاعری ہی کی دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ رامپور
میں جلال۔ منیر۔ عروج۔ حیا۔ وغیرہ کے سے شعرا کی صحبتیں تھیں۔ اور لکھنؤ میں انیس۔
دبیر۔ برق۔ قلق۔ اُنس۔ مونس کے سے اساتذہ سکہ جمائے ہوئے تھے۔ خاص کر حضرت
قلق ہمارے مرحوم پر بطور ایک بزرگ کے مہربان تھے جنھوں نے مرحوم کو صرف زبان
سیکھنے کے لئے خاص خاص صحبتوں میں پہنچایا اور اگرچہ اوستاد کی حیثیت سے نہیں مگر ایک

مخلص اور ہم نشین کی حیثیت سے ٹھیٹھ اُردو سے واقف کرا دیا۔

جناب شوق کی ابتدائی شاعری کا زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ میں اوستاد آمانت کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ لیکن اسیر اور قلق وغیرہ کے سے باکمال اساتذہ اور اُن کے حلقہ کے با اثر لوگ اپنی قوت سے آمانت وغیرہ کے غیر فطری رنگ کو مٹا کر لکھنؤ کو پھر جذبات کے رنگ اور اصلی شاعری کی طرف مائل کر رہے تھے۔ موجودہ زمانہ میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ آمانت کے سے شعرا کے مذاق کو تمام تر دہلی والوں نے فنا کر دیا ہے۔ اور بعض لوگ لکھنؤ کے مخصوص رنگ کو آمانت وغیرہ کے رنگ کا مرادف قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں باتیں محض کوتاہ نظری پر محمول ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس قبل تک لکھنؤ میں پرستاران آمانت کی کمی نہ تھی۔ اس رنگ کی شاعری اب تک لکھنؤ کے بعض مخصوص شعرا میں جھلک دکھا رہی ہے۔ لکھنؤ نے کم از کم پچہتر سال تک ایک بے حسی کے عالم میں آمانت والے مہمل استعارات اور خشک لفظی رعائیوں پر داد دی ہے۔ مگر یہ کہنا کہ لکھنؤ سے مذاق سلیم اور فطری کلام کسی زمانہ میں بھی معدوم رہا ہے اور امانت وغیرہ کے دور میں سچی شاعری کا وجود مفقود تھا محض بہتان ہے۔ وہی زمانہ اوستاد تعشق لکھنوی کا ہے جو اس فضول استعارہ بازی اور رعایت لفظی سے الگ رہتے تھے اور بہت سچے اور دلکش کلام کے بانی ہوئے ہیں۔ اور اونہی دنوں میں میر کلو عرش (آفتاب سخن میر دہلوی کے فرزند) کا عروج تھا ایک بڑی حد تک امانت کے پیرو تھے اور روش میر کے گویا دشمن تھے۔ مشاعروں میں اگرچہ آمانت کے رنگ کے شعر بہت پھیلتے تھے

۵؎ مرحوم اس زمانہ کے ایک بہت ضعیف العمر شاعر متخلص بہ ثنا شاگرد آتش کا ذکر کیا کرتے تھے اور اُن کا یہ مقطع "دل ہیں" اور "قاتل ہیں" کی طرح میں مثالاً پیش کرتے تھے:-

تعجب کیا جو میرے سخن میں اس قدر گرمی ۔۔۔ بھری ہیں حضرتِ آتش کی میں نے اے ثنا چلیں!

لیکن ترجمانی جذبات اور معاملہ ادابندی کے اشعار بھی کچھ کم نہیں رہتے تھے۔ گویا لکھنؤ میں پھر بھی
اتنی صلاحیت باقی تھی کہ اسیر وغیرہ اور اُن کے شاگردوں نے جس رنگ کی بنیا ڈالی وہ خواہ
قابل تعریف تھا یا نہ تھا مگر ان لوگوں نے امانت والا غیر فطری مذاق اپنا رنگ جما کر لکھنؤ سے
تقریبًا بالکل مٹا دیا۔ نئی روشنی کے لوگ بعض شاگردان اسیر مثلًا امیر مینائی مرحوم کے مذاق
سخن پر جا و بیجا حرف زنی کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ اور
جو خدمت اونھوں نے یا اون کے زمرہ کے لوگوں نے کی ہے اُس کی اہمیت پر بالکل پردہ
پڑجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عام طبائع کا میلان آج کل اندھا دھند غالب کی نقالی کی طرف
ہے۔ نیز میر دہلوی کا نام بھی (برائے نام؟) یاد کرلیا گیا ہے۔ اور زمرۂ امیر کے گذشتہ
اثر سے موجودہ شعرا کی طبیعت اب تک متاثر ہے جس کی وجہ سے مرزا دبیر کے بحر سخن
سے (ہمارے ان سخن فہموں کی مرضی کے مطابق) اردو کی شاعری استفادہ نہیں کر رہی
ہے۔ لیکن تاریخی حیثیت سے رنگ امانت کے بعد اگر کوئی رنگ لکھنؤ میں قائم ہوا ہے تو
واقعی وہ امیر ہی کا ہے۔ اور امانت کے رنگ سے مسلمہ طور پر بہت بلند اور بہتر ہے۔ چنانچہ
امانت کی بیخ کنی میں امیر کا اثر شامل تھا جو ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس کو مورخین ادب
کبھی نہیں بھول سکتے۔ اور یہ بھی ایک امر ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے ابتدائی اسباب
خاص کر حضرت اسیر اور اون کے معدودے چند ہمعصر اساتذہ کی تعلیم نے پیدا کئے
تھے۔ اس میں شاگردان اسیر نے واقعی ایک بڑا حصہ لیا اور مدتوں کی کوشش سے
اُس غیر فطری رنگ کی مضبوط بنا کو پامال کیا۔ ورنہ کیا اس سے پہلے امانت کے خلاف
زبان کھولنا آسان تھا؟

حضرت اسیر کے بعد نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں امیر مینائی کا عروج رام پور میں ہوا اور وہ وہیں کے ہو رہے۔ شوق مرحوم اکثر اُن کی رامپور کی صحبتوں کا لطف بیان کیا کرتے تھے۔ شوق اور امیر میں کچھ رشتہ داری بھی تھی اور باہم بنتی بھی خوب تھی۔ رامپور میں امیر کا مسکن مختلف مذاق اور مختلف مقامات کے شعرا کے لئے گویا ایک جائے ملاقات تھا۔ اور اس سے بہتر مبادلہ خیالات کی جگہ کوئی نہ تھی۔ شوق مرحوم نے اس مجلس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مرحوم کا ابتدائی زمانہ شاعری کا کلام مدت ہوئی تلف ہو گیا۔ بلکہ اُس حصہ کلام کا بھی کوئی جزو باقی نہیں ہے جس پر اوستاد اسیر نے اصلاح دی تھی۔ لیکن مرحوم کے وسطی زمانہ کا کلام تقریباً کل محفوظ ہے۔ مرحوم کے رنگ شاعری میں اسی دور کے اندر بہت نمایاں تغیرات ہوئے ہیں۔ اور آخری زمانہ کا مذاق اسقدر جدا ہو گیا تھا کہ وسطی زمانہ کے بعض اجزا کلام سے اُس کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ بلکہ بعض حصے اس پرانے کلام کے ایسے ہیں جنھیں وہ اب بالکل ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ تلف کر دینا چاہتے تھے۔

مرحوم کے بالکل ابتدائی زمانہ شاعری کی یادگار فقط ایک مثنوی "ترانۂ شوق" باقی ہے۔ یہ مرحوم نے اُنیس[19] بیس[20] برس کے سن میں لکھنا شروع کی تھی۔ جناب اسیر کو یہ مثنوی جا بجا سے سنا تو ضرور چکے تھے مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ یہ اُن کی اصلاح سے رہگئی۔ اور پھر جناب شوق کی خودداری اور غیرت نے گوارا نہ کیا کہ کسی اور سے اصلاح لیتے۔ غرضکہ وہ اسی حالت سے بار ہا چھپی۔ آخری وقت میں بعض معترضین نے اُن کے اس ابتدائی کلام کا حوالہ دے کر اُن کے زمانۂ پیری کی مسلمہ اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی اور چاہا کہ شوق مرحوم

جو ابتدا میں اسی مثنوی کی بعض بے مثل خوبیوں کی بدولت بام شہرت پر آئے تھے اپنے آخری
زمانہ میں لوگوں کی نگاہ سے گر جائیں۔ لیکن مرحوم کی شخصیت کو ان کوششوں سے کوئی صدمہ
نہیں پہونچ سکا۔ کیونکہ اس میں کچھ شائبہ بعض لوگوں کے رشک وحسد کا بھی تھا اور جس چیز
کو وہ تنقید کے نام سے موسوم کرتے تھے وہ ایک قسم کی رکیک نکتہ چینیاں تھیں۔ تاہم جناب شوق
نے جب آخر بار ۱۹۱۲ء میں اپنی اس قابل قدر نظم کو چھپوایا تو ایک غائر نظر ڈال کر اس میں
کچھ ترمیم بھی کردی۔ اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ جو اعتراضات اُن پر ہوئے تھے
اونکو مرحوم نے تسلیم کرکے یہ نظر ثانی کی ہے۔ کیونکہ ان اکثر اعتراضات کو اونہوں نے محض جہالت
پر مبنی قرار دیا ہے اور اگر وہ صحیح ہیں تو اس ترمیم کے بعد بھی عائد ہو سکتے ہیں۔ مرحوم کی یہ عادت
تھی کہ جب کبھی اون کی کوئی تصنیف دوبارہ چھپنے گئی تو حتی الامکان اونہوں نے اس میں
ترمیم کرکے اوسکو بہتر بنانے کی کوشش کی خواہ اُس تصنیف پر کوئی تنقید نکلی ہو یا نہ نکلی
ہو۔ یہ مثنوی تو ترمیم کے قبل بھی اگر ایک بے مثل چیز نہ تھی تو کم از کم اردو کے بلند پایہ کلام
کی مثال ضرور تھی۔ اور اگر مصنف کے سن و سال کا لحاظ کیا جاتا تو بقول امیر مینائی کے
ایک "کارنامہ" تھی۔ اس میں زبان محاورات اور روزمرہ کا جو لطف پایا جاتا ہے یہ لکھنؤ
کی مخصوص صحبتوں میں بیٹھے بغیر کوئی پیدا نہیں کرسکتا۔ ٹھیٹھ اردو اسی زبان کو کہہ سکتے
ہیں۔ اور اس کو شاعری میں استعمال کرنا ہر ایک کے لئے آسان نہیں ہے۔

"ترانۂ شوق" "گلزار نسیم" کے طرز پر ہے۔ بحر اور سلسلۂ کلام نسیم کا سا ہے افسانہ بھی
اُسی قسم کے دیو زاد پریوں اور شہر لحدون کا ہے۔ یہانتک کہ موضوع بیان بھی جزئی حد تک جا بجا
"گلزار نسیم" کا سا نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر بعض معترضین نے طنز یہ کہا ہے کہ شوق نے

اپنا ترانہ اپنے نزدیک "گلزارنسیم" کا جواب لکھا ہے۔ لیکن مرحوم نے ایک جگہ نہایت دیانتداری کے ساتھ بلکہ فخریہ تسلیم کیا ہے کہ میں نے اس کو "گلزارنسیم" کے جواب کے طور پر نہیں بلکہ نسیم کی اتباع کر کے نظم کیا ہے اور اس اتباع کی کوشش میں مجھ کو واقعی خون تھوکنا پڑا ہے۔ اس سے مرحوم کی نیت ظاہر ہے۔ اور ان کو اپنی سعی میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس کا اندازہ اسی سے ہوگا کہ ترانہ شوق کو جس جگہ سے کھول کر پڑھیے سلاست اور قوت شاعری کا کمال نظر آتا ہے۔ چند ساقی نامے یہ ہیں جن سے طبیعت کے جوش اور کلام کی روانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شیشے کی پری کو ساقیا لا — پھر بادۂ عیش سے پیالا

آئے پیمانہ۔ آئے مینا — ناچے پیمانہ گائے مینا

ساقی تیرے آگے ہاتھ پھیلا — چھینٹوں کی نہیں بدی ہے ملا

بھر دے بھر دے پیالہ بھر دے — دل سرد ہے خوب گرم کر دے

کس نے ابتک نباہی توبہ ؟ — کیسی توبہ۔ الٰہی توبہ !

فاقے افلاس کے ہیں ساقی — پھر رند نہیں جو دم ہے باقی

ایک جگہ عاشق و معشوق کے باہمی دیدار اور ناز و نیاز کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ عاشق نے معشوقہ کو باغ میں تنہا پا لیا۔ یہ پہلی ملاقات تھی پھر کیا گذری ؟ ——

چتون کی ادا نظر سے گذری — برچھی کی انی جگر سے گذری

یاں جھک کے نگہ زمیں پہ پہونچی — واں چشم ہوس جبیں پہ پہونچی

یاں موئے مژہ نظر پہ چلمن | واں دست ہوس کو شوقِ دامن
شہزادہ تھا ولولوں سے پرجوش | جیسے مے کی ہوس میں مے نوش

منہ سے جادو نکالتا تھا | ڈورے باتوں سے ڈالتا تھا

قسموں سے بناوٹوں کی باتیں | نظروں سے لگاوٹوں کی باتیں
ہاتھ اُسکے بڑھے تو ہٹ گئی یہ | آنچل کی طرح سمٹ گئی یہ
کھٹکی۔ جھجکی۔ زبان کھولی، | بل ڈال کے تیوریوں پہ بولی!
دیکھے کوئی ان کے شوق کا حال | ٹپکے پڑتے ہیں جس طرح رال!!
دن اور اندھیر اس بلا کا | تم ڈالنے آئے مجھ پہ ڈاکا؟!

اُف اپنی زباں پہ لائے کیوں تم | تھا در کہیں تو آئے کیوں تم؟
کچھ خیر ہے۔ گفتگو ہے یہ کیسی؟ | بندی نہیں بے تکلف ایسی!
ایسے کچھ پاک دل نہیں تم | آنچل مرا چھو نہ لو کہیں تم
کیونکر؟ ہاں! پھر تو ہاتھ جوڑو | قدموں کی نہیں بدی ہے چھوڑو!!
آپے کو تجے ہوئے ہو کیوں تم | کچھ پی تو نہیں کہ ہوش ہیں گم؟
مجھ پر ابھی حق نہیں تمہارا | کیا غیر پہ غیر کا اجارا؟

کھٹکا تھا کہ بھید کھل نہ جائے　　ایسا نہو پھول کھکھلائے

نرگس دیکھے تو کیا عجب ہے　　سوسن نہ کہے یہ کیا غضب ہے

بیدار نہ سبزہ باغ کا ہو　　شمشاد نہ تاک میں کھڑا ہو

غنچے نہ چٹک کے گل کھلائیں　　بو پاکے نہ لے اڑیں ہوائیں

خاص کر آخری شعر کے الفاظ ملاحظہ ہوں "چٹکنا" "ناراض" ہونا کے معنی بھی کھتا ہے "گل کھلانا" دوسرا محاورہ کس قدر موزوں ہے۔ دوسرا مصرع بھی برابر کا ہے سادگی اور سلاست ادابندی مصنف کی مشاقی اور باریک بینی کی داد دے رہی ہے اسی کے ساتھ خیال رہے کہ موضوع بھی بہت شوخ اور نازک ہے۔

اس مثنوی کو اور مرحوم کی بعض دوسری نظموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہ نسبت غزل کے اپنی مسلسل نظموں میں زیادہ کامیاب رہے۔ ابتدا ہی سے رجحان کچھ سلسلہ دار مضامین کی طرف زیادہ تھا۔ لیکن روایتی شاعری اور غزلیں لکھنا مرحوم نے مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔ گو آخر زمانہ میں غزلوں سے متنفر ہو گئے تھے اور اگر غزل کہتے تھے تو گویا ضرورتاً یا وضعداری کے طور پر۔ بالکل آخری زمانہ میں انہوں نے اپنا نیا دیوان مرتب کیا جس کا منشاء زیادہ تر اونہوں نے یہ قرار دیا تھا کہ زمانہ آیندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ادن کے نتائج کتب بینی اور پنجاہ سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اور ضمناً وہ کلام بھی محفوظ رہجائے جو انہوں نے اپنے شاعرانہ جذبات دکھانے کے لئے رکھہ چھوڑا تھا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد مجھے اس داد کی ہوس نہ ہوگی جو ایک شاعر کو اپنی ہمت افزائی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ شاعروں کی واہ واہ سے اُن کی طبیعت بھر گئی تھی۔ آسیر کی وفات

کے بعد شاذ ہی مشاعروں میں جاتے تھے ۔ اور آمیر کے بعد تو شاید کسی باقاعدہ مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے ۔ البتہ نج کی صحبتوں میں شوق سے داد لیتے تھے ۔

غرض کہ اس دیوان[۵۱] کو مرحوم کے کلام کا کوئی معتد بہ حصہ نہ سمجھنا چاہیئے ۔ اس میں آخری زمانہ کی تقریباً کل غزلیں ہیں اور وسطی زمانہ کے کلام کا صرف انتخاب ہے ۔ باقی کلام جو موجود ہے وہ مختلف گلدستوں رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کے یکجا شائع ہونے کی توقع فی الحال نہیں ہے ۔ اس کا اکثر حصہ مرحوم کو خود پسند نہ تھا اور وہ اسے شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے ۔ منجملہ ان غزلیات کے جنکو مرحوم نے شامل دیوان نہیں کیا ہے اور مسترد کر گئے ہیں ایک غزل درج کیجاتی ہے جس میں انکے وسطی زمانہ کی ابتدا کا کچھ رنگ نظر آئے گا ۔ یہ ایک ایسی غزل ہے جس کے بعض اشعار کم از کم تیس برس تک زبان زد خلق رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عامۃ الناس کو یہ رنگ کس قدر بھاتا تھا ۔

میں اس کی آنکھ پہ مائل ہوں دل کاکل پہ مائل ہے
قضا کے سامنے میں ہوں بلا کے سامنے دل ہے
نباہ الفت کا ان دو نازکوں میں سخت مشکل ہے
ادھر نازک مزاج یار ادھر نازک مرا دل ہے

---

[۵۱] یہ زیر طبع ہے ۔ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر ایٹ گونڈا اپنے زیر اہتمام مرحوم کی دوسری تصانیف کے ساتھ اس کو بھی عنقریب شائع کرنے والے ہیں ۔

سیہ بختی بھی رنگ حسن لاتی ہے حسینوں میں
ٹمر ہے تو سر یہ کاکل ہے گھٹے تو گال کا تل ہے

ہمارے وصل کا وعدہ پڑا ہے سخت جھگڑوں میں
جوانی کہتی ہے آسان حیا کہتی ہے مشکل ہے

خدا پوچھے جو میرے قتل کو یہ عذر کر دینا
کہ میں قاتل نہیں ہوں بلکہ میرا حسن قاتل ہے

ادہر میں خوش ادہر وہ ترک خوش اپنے تصور سے
میں سمجھا تیر ہے دل میں وہ سمجھا تیر میں دل ہے

جنوں کے لطف پر پانی پھرا آنکھوں کے رونے سے
نہ کانٹوں میں خلش باقی نہ گرد اڑنے کے قابل ہے

شجر حیرت میں غنچے تنگ دامن چاک پھولوں کے
چمن کیا موسم گل میں یہ دیوانوں کی محفل ہے

ادہر وہ شرم سے چپ ہیں اُدہر میں خوف سے چپ ہوں
یہ صورت ہے کہ آئینہ سے آئینہ مقابل ہے

وہ کہتا ہے کہ توڑوں گا میں کہتا ہوں کہ جوڑ اسکو
وہ کہتا ہے کھلونا ہے میں کہتا ہوں مرا دل ہے

زمیں نے ہم کو پیدا کر کے کیا اے شوق پھل پایا
کہ اُس کے منہ کو ہم سے ایک مشت خاک حاصل ہے

اس غزل کے قریبی زمانہ کی ایک غزل اور نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے جسے مرحوم نے نئے دیوان میں بعض اشعار کو حذف و اضافہ کے بعد داخل کیا ہے۔ اس کا رنگ کسی قدر مختلف ہے اوپر کی غزل کو دیکھتے ہوئے اس میں آورد زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسا نمونہ ہے جس کی بابت اندازسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُس زمانہ کے عوام کو نہیں بلکہ شاید خواص کو زیادہ پسند ہوگا۔ مگر یہ بھی مرحوم کے آخری دور کے کلام سے بہت مختلف ہے۔ یاد رہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب آمیر اور داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور ان شاہی اساتذہ کے آگے رنگ جمانا بہت دشوار ہوتا تھا۔ دنیا کا رنگ یہ تھا کہ جب تک شعر میں آمیریت یا داغیت نہ ہو لوگ شعر کی داد مشکل سے دیتے تھے۔

مارے غصہ کے غضب کی تاب رخساروں میں ہے
کل تو تھی پھولوں میں گنتی آج انگاروں میں ہے

یا گھٹے کچھ عشق میرا یا بڑھے دنیا میں حسن
یہ تو ناکافی ہے جتنا ان دل آزاروں میں ہے

مسئلہ کثرت میں وحدت کا ہوا حل تم سے خوب
ایک ہی جھوٹھ اور تمھارے لاکھ اقراروں میں ہے

دیکھتے ہیں ہم ادھر ہیں اور وہ کھڑے ہیں سامنے
حشر کیا ہے عید کا دن ہم گنہگاروں میں ہے

چاند ہی کہدے جو دیکھا ہو کوئی تجھ سا حسیں
اس نے بھی دیکھی ہے دنیا یہ بھی سیاروں میں ہے

کفر نے اسلام کو شاید کہیں مارا کہ شوق
ماتمی پوشاک سے کعبہ عزادار دہیں ہے

اُسی زمانہ کا کچھ اور رنگ ملاحظہ ہو۔ یہ بھی صرف نمونہ ہے۔ انتخاب نہیں ہے :۔

اذاں حرم میں ہوئی ہے خدا خدا کر کے
چلو وہ چیز پئیں اب نماز ادا کر کے

چلا ہوں تیسرے فاقہ میں آج پینے کو
حرام مجھ پہ تو اے شیخ اب شراب نہیں

نہ جس میں آہ نہ دیوانہ پن نہ دامن چاک
وہ زندگی کے لئے رنگ ہی شباب نہیں

یہ ہے جذب الفت کہ میری رگوں میں
لہو بن کے دوڑی ہے رنگت تمہاری

تحیر کی اے شوق کچھ انتہا بھی
ہزار آئینے ایک صورت تمہاری

آخری زمانہ کا کلام یہاں اس کو کہا گیا ہے جو زیادہ تر پچھلے پچیس سال کے اندر کا ہے اور دیوان میں تماماً شامل ہے۔ مرحوم کی نئی طرز کی زبردست نظمیں بھی زیادہ تر اسی آخر زمانہ کی ہیں۔ غزلیات اس زمانہ کی عموماً وہ ہیں جو اونہوں نے مشاعروں کے لئے نہیں بلکہ زمانہ کے مقبول عام رنگ سے ہٹ کر گویا اپنے لئے کہی تھیں۔ غزلیات میں اس دور کے اندر جس چیز کو ہم جناب شوق کا خاص رنگ قرار دینا چاہتے ہیں یعنی وہ حصہ کلام جسے اونہوں نے رائے عامہ سے بالکل آزاد رہکر اور اپنی پسند کے مطابق مرتب کیا تھا اس کا پایہ اپنی عام شعریت کے لحاظ سے اُن کی مسلسل نظموں کے مقابلہ میں بلند نہیں ہے۔ مگر اس میں

شک نہیں کہ یہ حصّہ کلام مشاقی اور فنی قابلیت کو بدرجہ اتم ظاہر کرتا ہے۔ زبان اور سلاست کا لطف تو اُن کے ہاتھہ سے شاذ ہی چھوٹا ہوگا۔ اور تحقیق سخن کے لحاظ سے محاورات و اصطلاحات ضرب الامثال وغیرہ اور الفاظ کو صحت کے ساتھہ نظم میں لانے کے لئے اس حصّہ کلام میں ایسی ان تھک کوشش کی گئی ہے کہ جس کی نظیر ہماری زبان میں کوئی اور دیوان اپنی جگہ پر نہیں ہو سکتا۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو شاید یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ یہ دیوان نہیں بلکہ زبان اردو کی ایک غیر مرتب لغت ہے۔ صدہا اشعار محض اسی قسم کی تحقیقات کو محفوظ کر دینے کے لئے کہے گئے ہیں یہانتک کہ بعض اوقات اس کوشش میں شعر کی شعریت زائل ہو گئی ہے مگر اس مقصد کیلئے کوشش کرنے میں کمی نہیں آئی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ لغت لکھنے والے اکثر شعرا کے کلام سے استناد کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ان لوگوں کو مدد دینے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی ہو۔ اور فی الواقع حال میں جو لغتیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جا رہی ہیں اُن میں جناب شوق کے کلام سے کافی حد تک سند لی گئی ہے۔ مثال کے لئے کچھہ اشعار اس مذاق کے درج کئے جاتے ہیں۔

وہ بدخو ہے اور ٹھکانا ڈھونڈھیں دل بہلانے کا

اب سے آئے گھر سے آئے۔ نام نہ لیں پھر جانے کا

وہ زلف دیکھہ کے جینا محال ہوتا ہے　　　کہ سانپ سونگھ گیا یہ خیال ہوتا ہے

دل کھوٹا ہے اس سے ہم کو راز عشق نہ کہنا تھا

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اتنا سمجھے رہنا تھا

سینک نہیں سکتے۔ آنکھیں بھی عاشق اُن کے گالوں کے

نام بڑا اور درشن تھوڑے اچھی صورت والوں کے

ضعف سے کچھ کہا نہیں جاتا ہل کے پانی پیا نہیں جاتا

یہ افلاس اور سبز خطوں سے حُسن پرستی سوجھی ہے

گھر میں بھونی بھانگ نہیں اور باہر مستی سوجھی ہے

گھر میں جنوں نے خاک اُڑا دی دشت میں دل بہلانے دو

اُجڑے گاؤں کا ناتا کیا ہے ذکر اس کا اب جانے دو

محشر میں فریاد پہ مجکو آنکھیں وہ دکھلائیں تو

داد کہاں کی اُلٹی آنتیں میرے گلے پڑ جائیں تو

آپ میں آئے تو وہ لطف ملاقات بھی ہو رگ چڑھی ہے جو اتر جائے تو کچھ بات بھی ہو

بڑھی یہ بیری حیرت اب کہ بات میں کلام ہے   جو ایک چپ میں صبح ہے تو ایک چپ میں شام ہے

وہ ظالم ہے تو در گزرے ہم اس الفت کے کرنے سے

جان بچی اور لاکھوں پائے۔ توبہ ہے اب مرنے سے
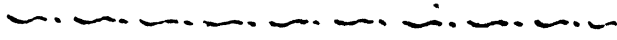
دل کو تھاموں ہاتھ سے لیکن دل ہی پر کیا جوش کا حصر

آنکھوں کو میں کوں کیونکر عشق کا پانی بھرنے سے

کہنہ مشقی قادر الکلامی اور فن خشک دکھانے کے لئے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان کو صرف اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ لیکن جا بجا ان میں لطف بھی ہے :-

محشر میں وہ گئے تو اُلٹ پھیر ہو گیا

ایسی تھی چال جس سے قیامت بدل گئی

مضمون پُرانا ہے۔ مگر طرز ادا نیا ہے۔ کہنا صرف یہ تھا کہ اصل فتنہ قیامت تو معشوق کی چال ہو گئی "الٹ پھیر" دراصل اسی قدر ہوا ہے کہ قیامت قیامت نہیں رہی۔ باقی شاعرانہ ابہام ہے جو سلاست اور روانی سے مل کر ایک لطف پیدا کر رہا ہے۔

منہ پر اس گل کے کلی کس لئے تو آتی ہے

تیرے ہونٹوں سے ابھی دودھ کی بُو آتی ہے

طرز بالکل قدیم ہے مگر پھر جدت پیدا کی ہے "منہ پر آنا" "مقابل آنے" کے مرادف ایک محاورہ ہے۔ صنعت یہ ہے کہ تمثیل (ANALOGY.) کو شاعر نے

کتنی دور سے جا کر چھوڑا ہے۔ محاورہ میں "منہ" کا لفظ آگیا ہے جس سے کئی فائدے اُٹھائے ہیں۔ اسی سے کلی کے ہونٹوں کا ذکر اور بھی آسان ہوگیا۔ "دودھ کی بو آنا" گویا مدہیچ ہونا ہے۔ اور کلی کی ابتدائی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔

کب کہیں اور غنی ہم سے گدا نکلیں گے
گھونسلے گھر کے جو ڈھونڈھو تو ہما نکلیں گے

بادی النظر میں شعر کچھ بھی نہیں۔ مطلب صاف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس شعر میں کتنی قوت صرف ہوئی ہوگی۔ کلام کی جو پختگی ظاہر ہوتی ہے ہر ایک کو میسر نہیں۔ مضمون بالکل خشک ہے اور معمولی اخلاقی بیان ہے جو ایک آمد کے ساتھ نظم ہوگیا ہے۔

روح کو میری ناز ہے اپنا وقار دیکھکر
اُس سے چڑھائیں تیوریاں میرا مزار دیکھکر

مشاقی اور فن والوں کے لحاظ سے یہ مطلع بڑے اوستادوں کا مطلع کہا جائے گا۔ آجکل عموماً ایسے اشعار کو سمجھنے کی کوشش کم کیجاتی ہے۔ مضمون میں ایک دوررس استعارہ کی جھلک ہے۔ ماتھے پر جب شکنیں پڑتی ہیں تو گویا شہر خموشاں کے فرش کا نقشہ ہوتا ہے۔ روح کا وقار صرف اس وجہ سے نہیں بڑھا کہ اُس نے قبر کو دیکھکر تیوریاں چڑھائیں جو گویا متوجہ ہونے کا طریقہ ہے۔ بلکہ یہاں آثار مزار کا نقشہ بھی معشوق کی پیشانی پر ہے۔ جس سے روح خوش ہورہی ہے۔ اس قسم کی تشبیہ ہمارے شعرائے متقدمین کے یہاں ملتی ہے۔

قادر الکلامی کی مثال میں ایک خشک سا شعر ایک خاص قسم کا شغف پیدا کرکے دیکھنا چاہیئے۔

سرو کو دے سزائے پامالی   قد ترا مدظلہٗ العالی

آخری تین لفظ اس سرعت اور صفائی سے لائے گئے ہیں کہ جملہ مطالب پر غور کرنے کے لئے توقف کرنا سُننے والے کو بھی مشکل ہوتا ہے۔ شعر کا ایک ایک لفظ اوستادی ظاہر کر رہا ہے۔ ایک اوستادی کا شعر اور ملاحظہ ہو جو ہر مذاق کے سخن فہم کو چونکا دے گا۔

دنیا وہ عشق کی ہے جس میں   مرنا جینے سے پیشتر ہے

مضمون بالکل سامنے کا ہے اور پھر کسی اور کو نہیں سوجھا۔ کس قدر سچا شعر ہے جسے زبان زد عام ہو جانا چاہیئے۔ دیوان میں اس مذاق اور اس پایہ کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔

اس آخری زمانہ میں مرحوم نے میر کی تقلید کی بہت کوشش کی ہے اور میر حسن دہلوی سے بہت اعتقاد ظاہر کیا ہے۔ بعض مقطعوں میں بھی اپنے اس نصب العین کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں۔

خدا بخشے بہت ہی شوق ہم کو یاد آتا ہے
وہ دل والا تھا درد اُس میں جناب میر کا سا تھا

میں دل سے کانوں کے بدلے اُسے سنوں اے شوق
اگر سخن کسی شاعر کا ہو حسن کا سا

ذیل کے انتخاب سے ظاہر ہو جائے گا کہ جناب شوق اس مسلک میں کہاں تک کامیاب رہے۔

کیوں ہنستے ہو میں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گذرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

جیتے جی نخوت سے سر عرش بریں پر رہتا تھا
مر کے لحد میں پہنچا ہوں تب مجھ کو پستی سوجھی ہے

کون کرے گا دعوے تجھ پر خوف نہ کر تو محشر کا
ہو نہیں سکتے حشر تک اجزا جمع ترے پامالوں کے

سوز غم میں پوچھتے کیا ہو ان اشکوں کی روانی کو
عشق بدن میں آگ لگا کر دوڑ رہا ہے پانی کو

لطف جنوں کے ساتھ نکالی صورت حسن پرستی کی
لڑکوں کے دروازوں پر میں ڈھیروں پتھر دھر آیا

سات سمندر پار ہے کعبہ سو چو اسے مسجد والو
آؤ چلیں بھی چار قدم ہے دروازہ میخانے کا

مرحوم نے بحریں بھی میر کی اختیار کی ہیں۔ اور بعض بحریں ایسی ہیں جنھیں موزوں پڑھنا
آج کل شاید ہر تعلیمیافتہ شخص کا کام نہیں۔ مثلاً

مجھی پہ ستم مجھی سے گلہ کہ شکوہ ستم کا کرتے ہو تم
یہ طنز ہے پھر کہ عشق غلط یہ کہتے ہو کیوں کہ مرتے ہو تم
(بحر وافر سالم)

اگر آرہا ہے ستم کی مشق سے لطف اُسے
تو ہمیشہ وہ مری زندگی کی دعا کرے
(بحر کامل)

ذیل میں مختلف رنگ کے کچھ اشعار قلمی دیوان سے لیکر درج کیے جاتے ہیں تاکہ مرحوم
کی عام شاعری کا بھی اندازہ ہو جائے۔

آنکھوں میں شکل جاناں گھبرائی ہے جو آکر   بہلا رہی ہیں پلکیں چٹکی بجا بجا کر

وہ ترس کھا کر جو دل سے مجھ حزیں کی سی کہیں
لب نمک پہ درد وہ اُن کے ہیں او نہیں کی سی کہیں
گالیوں میں اُن کے لب اُن کی زباں سے مل گئے
بات پڑنے پر سب اپنے ہم نشین کی سی کہیں

تمہارے بال بھی اچھے تمہاری مانگ بھی اچھی
یہ شہرِ حسن ہے اس کا سوادا چھا گلی اچھی

خاک میں مل کے بھی پکڑیگا تجھے خون مرا　　　میری مٹی سے بہت نخل حنا نکلیں گے

آنا ترا آفت دلِ مضطر کے لئے ہے　　　یعنی یہ کرم جور مکرر کے لئے ہے
بے عہد وفا فرض کیا کیوں کہ تمہیں ہو　　　مانا کہ مرا دل کسی دلبر کے لئے ہے

بگاڑ میں بھی ادا سے لُبھائے جاتا ہے　　　وہ لڑ رہا ہے مگر مسکرائے جاتا ہے

ہوئی ہے اُس سے محبت میں تازگی پیدا　　　مناؤں گا تمہیں سو بار میں خفا کر کے
گرفت اُسنے بڑھا دی سمجھ کے کم جرات　　　خطا ہوئی کہ میں نادم ہوا خطا کر کے
جواب شکوہ بیجا سے لطف اُٹھتا شوق　　　خجل کیا اُسے کیوں شکوہ بجا کر کے

اشک پر اشک جو آنکھوں سے گرا پڑتا ہے　　　منہ چھپا لیتا ہوں میں جب کوئی آپڑتا ہے
کتنی افلاس زدہ ہے مرے گھر کی حالت　　　خاک ملتی ہے جدھر ہاتھ مرا پڑتا ہے

ترے کوچہ میں امید اثر کیا آہ سے مجھ کو　　　یہاں میں زہر بھی کھاؤں تو بے تاثیر ہو جائے
بتا زاہد وہاں کیا ہو گا حکم شرع جس گھر میں　　　یہ صورت ہو کہ جو آئے وہی تصویر ہو جائے

دامن کو ذرا بچائے رہنا　　　دینا نہیں۔ گرد ہے سفر کی

رنج صدمے درد سب دیکر وہ بولا طنز سے
جائے جو محفل سے وہ ساتھہ ایک محفل لیکے جائے

بے خود ہوں تو مانوں گا نہ یوں ہوش میں آنا
مانوں گا جو دامن کی ہوا دوگے تم آکر

اس دیوان کی مزید خصوصیات یہ ہیں کہ کوئی غزل آٹھہ نو اشعار سے زیادہ کی نہیں۔ طرحیں بھی اکثر نئی ہیں۔ مشاعروں کی طرحیں بہت کم ہیں۔ مرحوم اپنی ہر تصنیف کو نہایت احتیاط کے ساتھہ اپنے قلم سے مرتب کیا کرتے تھے اس لئے تحریف کا اندیشہ اون کے کلام میں بہت کم ہے۔

مسلسل نظموں میں سب سے بلند پایہ اور مجددانہ کلام مرحوم کی مثنوی "عالم خیال" ہے۔ یہ اردو میں واقعی ایک نئی چیز ہے جس میں اردو شاعری سے اکثر ہندی شاعری کا کام نہایت متانت اور قابلیت سے لیا گیا ہے اس کا موضوع یہ ہے کہ ایک فراق زدہ نو عمر عورت اپنے شوہر کے عشق میں بے چین ہے اور اپنی ہی زبان میں اپنے بے لوث خیالات کا اظہار کر رہی ہے۔ آخر کار عین حالت انتظار میں اُس کا شوہر پردیس سے واپس آجاتا ہے اور فراق کی مصیبت دُور ہوتی ہے۔ پوری نظم میں فارسی کی اضافت ایک جگہ بھی نہیں ہے۔ اس سے زبان کی صفائی اور سلاست ظاہر ہے۔ یہ ہماری خانگی زندگی اور نہ محو ہو سکنے والی قدیم معاشرت کی ایک دردناک تصویر ہے جس میں حقیقی جذبات نسوانی

اور طبقہ نسواں کی بے لبسی فرائض خانگی اور رسم و رواج کی صعوبتیں بڑی ہمدردی کے ساتھ اور دلکش پیرایہ میں دکھائی گئی ہیں۔ یہ نظم شروع ہی سے اتنی مقبول ہوئی کہ چند سال میں پانچ سات مرتبہ طبع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اسی طرح کی ایک دوسری نظم "نیرنگ خیال" ہے۔ یہ بھی ایک فرضی قصہ ہے کہ ایک نوجوان لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا کہ کسی ٹرین میں اُس کو ایک دوشیزہ نازنین نظر پڑی۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ دونوں کے دل ہاتھ سے جاتے رہے۔ لیکن ایک دوسرے سے ناواقف رہے اور ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اس میں بھی طرفین کے جذبات کی مصوری خوب کی ہے مگر یہ اُس قسم کا ٹھیٹھ ہندوستانی عشق ہے جس کو کبھی کامیاب نہیں دیکھا اس کا موضوع اگرچہ "عالم خیال" کا سا دلچسپ نہیں اور شاعری کے لحاظ سے بھی اس کا پایہ وہ نہیں۔ تاہم یہ اپنی جگہ پر قابل قدر اور ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ اس نظم کے مختلف حصے مختلف پرچوں میں ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر حال میں اس پر اور نیز "عالم خیال" پر مصنف مرحوم نے بڑی جانفشانی سے نظر ثانی کر کے ان دونوں کو خیالات اور شاعری دونوں کے لحاظ سے گویا بالکل نیا کر دیا ہے۔ آجکل دونوں زیر طبع ہیں اور افسوس ہے کہ اسی وجہ سے ان نظموں سے اقتباسات کرنا فی الوقت ممکن نہیں ورنہ یہاں کچھ نمونہ ضرور پیش کیا جاتا۔

گنجینۂ شوق (مطبوعہ سعیدی پریس۔ رامپور) جناب شوق کی چند بلند پایہ اور عالمانہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے بعض حصے مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اسی میں ایک مثنوی موسوم بہ "حسن" ہے جس میں حسن کی تصویر ایک جگہ پر یوں کھینچی ہے۔

تحریر میں آئے تو تیسہ دشوار   حرفوں میں سمائے تو یہ دشوار
لازم نہیں منحصر نہیں تو   بند ایک ہی شکل پر نہیں تو
اور اس سے کشش ہو کیا زیادہ   دل آتا ہے تجھ پہ بے ارادہ
وہی تجھ میں جمال تیرا   ظنی ہم میں خیال تیرا
کیا پست ہے کیا بلند ہونا   ہے "حسن" فقط پسند ہونا

پہلے تو حسن کو ناممکن التعریف قرار دیا ہے اس کے خارجی ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور شاعری سے کام لیکر دکھایا یہ ہے کہ حسن کا ذہنی ہونا ہی گویا حسن کی خوبی ہے۔
پھر آخری مصرعوں میں اس کی امکانی تعریف الفاظ میں کر دی ہے۔ اس کے بعد خالی شاعری اور اپنی قادرت کلام یوں دکھائی ہے۔

حد سے روشیں تری زیادہ   چالیں تری ہیش پا فتادہ
ابھرا ہوا رخ پہ گال بن کر   بکھرا ہوا سر پہ بال بن کر
چھوٹا ہوا چھوٹ کھیلنے پر   لپکا ہوا لوٹ لینے کو گھر
بھکا ہوا مثل نشہ مُل   بھڑکا ہوا مثل آتش گُل
فطرت تری ہنس کے بولنے کی   عادت تری دل ٹٹولنے کی
جو تجھ پہ مرے وہ کام کر جائے   زندہ دنیا میں نام کر جائے!

اس مجموعہ میں "سائنس اور مذہب" بھی ایک نظم ہے جسمیں ثابت کرنا یہ ہے کہ سائنس کی ترقی سے مذہب کو متزلزل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس میں معلومات اور مباحث کا ایک سنجیدہ طومار ہے۔ شاعری سے زیادہ منطق اور منطق سے زیادہ شاعری

ہے۔ طلبائے مدارس کے لئے بے شک یہ ایک مفید چیز ہے۔ اور اپنی جگہ پر ایک قابل قدر تصنیف ہے۔

مرحوم نے جو کچھ کہا اور لکھا ہے کسی نہ کسی حیثیت سے وہ اشاعت بھی پا چکا ہے۔ مگر اس کی مقدار اس قدر کثیر ہے کہ سب چیزوں کا حوالہ دینا کسی ایک جگہ پر مشکل ہے۔ غزلیات اخلاقی، سیاسی اور فطری نظمیں، قطعات۔ رباعیات، ڈرامے مثنویاں بعض مشہور رسالوں مثلاً الناظر۔ ادیب۔ زمانہ۔ نقاد وغیرہ میں برسوں چھپتی رہی ہیں۔ نئے طرز کی مسلسل نظموں میں طرح طرح سے جدتیں دکھائی گئی ہیں اور موضوع نظم کے لحاظ سے نظم کی بحروں کا انتخاب اور صنف سخن کا لحاظ بھی اُن کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ مثلاً "نیرنگ جمال" کے مختلف اجزا اختلاف موضوع کے لحاظ سے مختلف بحروں میں رکھے ہیں۔ اور اگر ایک حصہ اُسکا بطرز مثنوی ہے تو دوسرا بہ طرز مثلث ہے۔ اور تیسرا ایک نئے قسم کا مخمس ہے جس میں پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع اور دوسرے کا قافیہ چوتھے مصرع میں ہے[۱]۔ جیسے!

میں نظر بچا کے روؤں میں چھپاؤں درد لیکن مرا اضطراب بڑھکر جو مرے جنوں کو شہ دے؟
مرے ہاتھ پونچھ ڈالیں مرے رخ کی گرد لیکن مرا منہ جو بول اُٹھے تو؟ مرا رنگ کچھ جو کہدے؟
که کوئی خیال بن کر مرے دلمیں آگیا ہے

ہماری شاعری میں مثلث کوئی نئی چیز تو نہیں ہے لیکن متروک ہے۔ مرحوم نے کئی نظمیں اس صنف سخن میں لکھہ کر سخن کی نیرنگیوں کا لطف بڑھایا ہے۔ ایک پر از تغزل

---

[۱] یہ مصرعے الناظر کے ایک پرچہ سے محض صنف سخن دکھانے کے لئے نقل کر لئے ہیں۔ بعد کو مصنف نے ان میں ترمیم کی ہے جو اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔

نظم "سیر دریا" کے چند مصرعے مثالاً پیش کئے جاتے ہیں۔

نگاہ لوٹ ہے دریا کی اس روانی پر کسی جبیں پہ شکن ہے کہ لہر پانی پر

بھنور سے گردشِ چشمِ حسیں نظر آئی

شعاعِ مہر سے پانی ہے آب زر گویا ہے مچھلیوں کے رخوں پر نقابِ زر گویا

فلک سے دھوپ جو آئی تو لے کے زر آئی

اقتباسات بالا اور ان چند تصنیفات کے حوالہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شوق مرحوم کی زندگی خدمت علم میں کس قدر سرگرم تھی۔ اور وہ کسقدر جفاکش اور کس قابلیت کے بزرگ تھے جو لوگ اون کو جانتے تھے وہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ پیری میں بھی جسقدر دماغی کام اور مسلسل محنت وہ کرتے تھے ہمارے اکثر نوجوانوں سے بھی ممکن نہیں۔ اونہوں نے ناقص ترین حالات میں پرورش پائی اور ہمیشہ فکر معاش میں مبتلا رہے۔ اس پر جس قدر ترقی اونہوں نے کی اور جتنا ادبی مواد اونہوں نے چھوڑا ہے اوس کی نظیر اس زمانہ میں ملنا بہت مشکل ہے۔ صرف ڈہائی برس کا سن تھا جب باپ کا سایہ سر سے اٹھہ گیا۔ ابتدائی تربیت آپ کے آبائی وطن میں آپ کی والدہ محترمہ نے شروع کرائی تھی کہ آپ کی آبائی جائداد کا اکثر حصہ ہنگامہ غدر میں تلف ہو گیا۔ اس وجہ سے آپ کے بہنوئی شیخ بدر الزماں صاحب صدیقی نے آپ کی تعلیم کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی اور اپنی ملازمت کے سلسلہ میں اناؤ۔ رام پور۔ اور ضلع بدایوں میں رکھہ کر فارسی اور عربی علوم کی تکمیل کرائی۔ اور بعد کو بدایوں کے انگریزی ہائی اسکول میں انٹرنس تک پڑہایا۔ ابھی انٹرنس کا امتحان نہ دینے پائے تھے کہ بعض خانگی مشکلات نے مرحوم کے خاندان کو آ گھیرا اور مرحوم مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے۔ لکھنؤ میں

اپنے پھوپھی زاد بھائی منشی امتیاز علی صاحب کاکوروی (سابق وزیر بھوپال) کی مشہور کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ سن اس وقت اُونیس سال سے زیادہ نہ تھا اور یہی زمانہ تھا جب کہ مرحوم کو شعر و شاعری میں پڑنے کا موقع آزادی سے ملا۔ اس مذاق کو فروغ دینے کا موقع رامپور اور بدایوں کی صحبتوں میں کافی مل چکا تھا۔ اور پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ فکر سخن کرتے رہتے تھے مگر ابتداءً اپنی شاعری کو ظاہر کرنے سے بہت گھبراتے تھے کچھ مدت تک لکھنؤ میں رہنے کے بعد بسلسلۂ ملازمت پھر ترک وطن کرنا پڑا۔ فیض آباد میں کچھ عرصہ تک تحصیلدار رہے مگر مشغلہ مرضی کے موافق نہ تھا اس لیے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے آئے اور "آزاد" نامی ایک اخبار نکالتے رہے۔ یہ اخبار اودھ کے باکل ابتدائی اخبارات میں تھا اسکے فائل جہاں کہیں ہیں بہت قدر کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں کیونکہ ان میں سیاسیات سے زیادہ ادبیات کا مواد محفوظ ہے۔ چند سال کے بعد مرحوم کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ مشغلہ بھی ترک کرنا پڑا اور پھر رامپور اور بھوپال میں ملازمتیں قبول کیں۔ بھوپال میں عہدہ نظامت (کلکٹری) پر تھے کہ پنشن لے لی اور رامپور آئے جہاں مرحوم کے چھوٹے بھائی منشی شیخ واحد علی صاحب آبر اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں اعلیحضرت نواب رامپور نے مرحوم کو ایک ایسا منصب پیش کیا جو مرحوم کی طبیعت کے موافق تھا یعنی تحقیق و ترتیب لغات کا کام جو مرحوم نے دس بارہ سال نہایت انہماک اور محنت کے ساتھ انجام دیا۔ ریاست کے مشہور کتب خانہ میں اکثر وقت کٹتا تھا اور اس زمانہ میں اون کو نخ کے طور پر بھی ادبی خدمات جاری رکھنے کا کافی موقع ملتا تھا۔ بالآخر ضعف پیری اور علالتوں کے سلسلوں نے مجبور کر کے یہ مشغلہ ترک کرا دیا اور تقریباً ڈیڑھ سال سے آپ ضلع بارہ بنکی میں آکر

خانہ نشین تھے کہ مرض الموت (استسقاء) نے گھیر لیا۔ کچھ روز بیمار رہکر جب زندگی سے مایوس ہو گئے تو اپنی صاحبزادی (اہلیہ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب بیرسٹر) کے پاس گونڈہ چلے گئے اور گذشتہ ماہ مئی میں وہیں انتقال کیا۔ مزار بھی وہیں ہے۔ آپ کے صرف ایک صاحبزادہ شیخ طاہر علی صاحب (بی۔ ایس۔ سی۔ علیگ) ہیں جو خواہاں ہیں کہ مرحوم کا جملہ کلام بہترین اہتمام کے ساتھ شائع ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدردانی شوقؔ کا وقت اب ہے جب شوقؔ نہیں رہے۔ گویا شوقؔ کی زندگی اب شروع ہوئی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔

نہ نیا وہ عشق کی ہے جس میں
مرنا جینے سے پیشتر ہے!
شوقؔ

ایک بیوی کی نقد قیمت

امریکہ کے ایک ایڈیٹر نے اپنے اخبار بینوں سے سوال کیا کہ "ایک بیوی کی نقد قیمت کیا ہے" ایک خاتون نے جواب میں لکھا "میں نے ۲۳۵،۴۲۵ کھانے دسترخوان پر چنے ہیں۔ ۳۳۱۹۰ پاؤ روٹیاں پکاتی ہیں۔ ۵۹۳۰ کیک بنائے ہیں اور ۷۹۶۰ بار سموسے پکائے ہیں۔ ۱۵۵۰۰ کوارٹس (QUARTS.) توڑے ہیں۔ ۷۶۶۰ انڈوں سے مرغی کے بچے نکلوائے ہیں۔ ۵۴۵۰ پونڈ مکھن بلویا ہے۔ ۱۶۴۶۱ گھنٹے تک جھاڑو دیتی اور کپڑے دھوتی رہی ہوں۔ میں اپنی محنت کی قیمت کا تخمینہ ۱۱۵،۴۸۵،۵۰۰ ڈالر لگاتی ہوں اور ان میں سے ایک ڈالر بھی مجھے اب تک نہیں ملے۔

ایک بیوی جس کے ایسے اوصاف ہوں بیشک نقد قیمت کے لحاظ سے اپنے شوہر پر بے انتہا فوقیت رکھتی ہے۔

(سنڈے ٹائمز)

مترجم محمد اظہر صدیقی (علیگ)

نوٹ :۔ اگر کوئی ہندوستانی شوہر اس کا جواب دے سکیں تو ہم شکریہ کے ساتھ شائع کریں گے۔

مدیران شمع

مطلع سیاسی

(جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی تعلقہ دار۔ بیرسٹرایٹ لا۔ ممبر لیجیسلیٹو اسمبلی)

کٹتی ہے رات جو رو رو کے مشیر

پھر وُہی صبح بلا آتی ہے

بادل اٹھتے ہیں۔ گھٹا چھا جاتی ہے کہیں کہیں پانی کی بھی چند بوندیں پڑ جاتی ہیں پھر بھی ہندوستان کا سیاسی مطلع کچھ ایسا گرد آلود ہے کہ صفائی نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی قوموں کا باہمی نفاق ہندوستان کی سیاسی پستی کا باعث ہے۔ لیکن ابھی چند ہی سال ہوئے کہ ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک شخص کی جے کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے راگ گائے جاتے تھے۔ مگر بدنصیب ہندوستان باوجود اس اتفاق اور اتحاد کے آج بھی اسی طرح آزادی سے دور ہے جس طرح تھا۔ آج بھی اسکے باشندے اسیطرح حریت کو ترستے ہیں جسطرح ترستے تھے اسیکو قسمت یا تقدیر کہتے ہیں۔ دنیا کا ہر کام اپنے وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔ تدبیر کا زور قسمت پر نہیں چلتا ہے۔ ابھی انسان۔ یعنی کوئی انسان یا قوم اس کارخانہ کے ہر پرزہ پر قادر نہیں ہے مگر پھر بھی اپنی کوششوں میں لگا رہنا۔ جد وجہد جاری رکھنا ہر انسان اور ہر قوم کا فرض ہے۔ اب بھی ہندوستان کے مطلع سیاسی کو صاف کرنے کی تدبیریں سوچنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح کہ ہمنے دہلی میں کوشش کی۔

جس طرح چند سال پیشتر ہر جگہ ہندو و مسلم اتحاد کا چرچا تھا بدقسمتی سے آج کل ہر جگہ ہندو و مسلم کا ہنگامہ ہے محض زبانی گالی گلوچ سے بڑھ کر خون خرابے کی نوبت آجاتی ہے لیکن مجلس قانون (لیجسلیٹو اسمبلی) اس سے بری رہی - وہاں کوئی قضیہ ہندو و مسلم کا نہیں اٹھا - لیکن کیا؟ وہاں اگر ہندو و مسلم کا جھگڑا نہیں ہوا - تو پارٹیوں کی باہمی مناقشوں نے معاملات کو خراب کر دیا - اس مرتبہ اسمبلی نے زود حس دلوں کے لئے نہایت دردناک نظارے پیش کئے سوراج اور انڈپینڈنٹ پارٹی کے سرغناؤں نے طفلانہ انداز سے عین اجلاس میں تو تو میں میں کی - مسلمان مسلمان نے گالی گلوچ کی - ہندو ہندو نے باہمی اختلاف ظاہر کیا نتیجہ یہ شرمناک ہوا کہ ایک بحث پر سرکاری ممبر یہ کہہ کر بیٹھ گیا کہ آپ میں سے ایک دوسرے نے بحث کر کے ایک دوسرے کے استدلال کی تردید خود کر دی ہے اس لئے مجھے کچھ کہنا باقی نہیں رہا اس طرح حکومت اپنے قریب قریب ہر مقصد کو - ہر تجویز کو پورا کرتی رہی اور ہم ایک دوسرے کے استدلال کو رد کرتے رہے - ایک دوسرے کی پالیسی اور طریقہ کار کو برا کہتے رہے اور لطف یہ کہ یہ حال اس وقت ہوا جب اصلاح کی کمیٹی کی رپورٹیں شائع ہو چکیں اور وائسرائے غور و خوض کے لئے انگلستان طلب کئے گئے - جیسا اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا - یہ موقع اس کا تھا کہ ذاتی اور پارٹی کے مناقشات کو دور کر کے مذہبی اور معاشرتی اختلاف کو قابو میں لا کر ہندوستان سے متفقہ آواز اٹھنی چاہیے تھی کہ ہم کو یہ چاہیئے - یہ چاہیئے! .... مگر کہاں؟

اصلاحی کمیٹی کی ایک رپورٹ قلت (مائی نوریٹی) کی رپورٹ کہلاتی ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان حالات میں جس میں کہ وہ ممبر اس کمیٹی کے بنائے گئے

تھے اُس سے بہتر رپورٹ لکھنی دشوار تھی۔

اُس رپورٹ میں نو ممبروں میں سے چار ممبروں نے واضح طور پر لکھدیا ہے کہ موجودہ نظام کامیاب نہیں ہوا۔ نہ اُس نظام میں کامیاب ہونے کی اہمیت ہی باقی ہے۔ اس لئے اس کا تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اس رپورٹ پر دستخط کرنے والے ایک شخص خود نہ صرف اسیمبلی میں موجود ہیں بلکہ ایک پارٹی کے سرغنہ اور خود زبردست شخصیت کے آدمی ہیں۔ لیکن پارٹی بازی کے چکر میں وہ بھی اس طرح آگئے کہ انہوں نے اس کوشش میں سوراج پارٹی کا ہاتھ نہ بٹایا کہ ہر شخص پر یہ عیاں کردیا جائے کہ نہ صرف صوبوں میں بلکہ مرکز پر بھی اس بات میں شک کی گنجایش نہیں ہے کہ موجودہ نظام کامیابی سے نہیں چل سکتا۔

موجودہ اسیمبلی سوا ایک ڈبیٹنگ سوسائٹی

ہونے کے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ موجودہ حالت میں بھی استبدادیت میں شخصیت سے رنگ میں مطلق فرق نہیں آیا۔ بلکہ نادرشاہ اور زارِ روس کی طرح ہندوستان میں اب بھی ایک شخص کا حکم قانون پر غالب ہے۔

وہ جمہور کی رائے پر غالب ہے، اور مبعوثین کی رائے پر غالب ہے۔ یعنی اسیمبلی میں بھی موجودہ نظام کی رُو سے بلا ہر معاملہ کو سرٹیفائی (   ) کرنے کے

کام نہیں چل سکتا۔ اور جس طرح صوبوں میں دو عملی حکومت "ڈائرکی" (   )

ناکامیاب رہی اُسی طرح بلا ذمہ داری کی حکومت مرکزی ناکامیاب رہی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے سرغنہ نے اپنے اور اپنی پارٹی کے عمل سے یہ دکھادیا کہ موجودہ نظام مرکزی مجلس میں حسب مقصد واضعین کام دیتا ہے اور وائسرائے نادرشاہی احکام کو بہت

کام میں لانا ضروری نہیں سمجھتے ۔ اگر بفرض ممالک متوسط یا بنگال کی طرح یہ ثابت بھی ہو گیا کہ ڈائرکی د) نہیں چل سکتی پھر کیا وجہ ہے کہ مرکز میں کوئی تبدل و تغیر کیا جاوے ۔ جس رنگ پر ہم چل رہے ہیں ۔ جو ہوا اور فضا انگلستان میں آجکل ہے اُس سے مجھے تو یہ ڈر ہو رہا ہے کہ کہیں حالت بد سے بدتر نہ ہو جائے اور چند فرضی اصلاحات دے کر کانسرویٹو پارٹی آیندہ کے لئے بھی اصلاحات کے حصول میں سخت رُکاوٹیں نہ پیدا کر دے ۔ اور ۱۹۲۹ء میں بھی اصلاحات پر اضافہ کا موقع نہ رکھا جاوے ۔ یعنی بفرض اگر کانسرویٹو پارٹی انگلستان میں بدل بھی دی جاوے تب بھی دوسری پارٹی اپنے کو کشادہ دست نہ پاوے ۔ اور جو ہندوستان کے بدخواہ انگلستان میں پہونچ کر ہندوستان کی غریب رعایا کے روپیہ سے پنشنیں وصول کر کے ہندوستان کو غلام رکھنے اور اپنے ہم وطنوں کو دھوکہ میں رکھنے کی سعی کیا کرتے ہیں اُن کو موقع مل جاوے کہ ۱۹۲۹ء میں اصلاح کے خیال کو یہ کہہ کر روک دیں کہ ابھی حال ہی میں تو اصلاحات پر غور ہو چکا ہے اور فلاں فلاں تبدیلی کی جا چکا ہے ۔

انگریزی قوم کی گھٹی میں یہ بات ہے کہ وہ بلا دباؤ پڑے کسی سیاسی اصلاح پر رضامند نہیں ہوتی نہ صرف غیروں کے لئے بلکہ خود اپنے یہاں اُس کا طریقہ عمل یہی رہا ہے ۔ عورتوں تک کو ووٹ کا حق بلا عورتوں کے دباؤ ڈالنے کے حاصل نہیں ہوا ہمارے پاس اب یہاں کون دباؤ باقی ہے ؟ اور دباؤ کا ہم کو خیال ہی کب ہے ؟ بلکہ ہم نے تو خود اپنے دباؤ کے ناقابل ہی سمجھ لیا ہے ۔ ایسی حالت میں ہم محض فرمانروایان کی مرضی پر ہیں کہ وہ ہماری غلامی اور قید کے کچھ اور بند کاٹیں یا نہ کاٹیں ۔ بدقسمتی سے

ہمارے فرمانروا کہنے کو تو ایک جمہوری قوم یا اُس کی پارلیمنٹ ہے مگر واقعی چند نفوس کا ایک جتھا ہے جو اپنی روٹیاں اس طرح پاتا ہے کہ ہم غلام بنے رہیں۔ اُس کی کوشش یہ ہے کہ ہندوستان میں موجودہ طریقہ جاری ہے۔

میں نے سیاسی حالت پر کافی غور کیا ہے اور روزانہ غور کرتا ہوں لیکن میں اب بھی اس خیال پر ہوں کہ اگر کوئی قوت سیاسی مطلع کی صفائی میں بلا خون پاشی کے مدد دے سکتی ہے تو وہ جماعت لیبر (لیبر پارٹی) اور کارکنان (ورکرز) ہے اسی کی تنظیم کو ہاتھ میں لینے سے اقتصادی دباؤ پڑ سکتا ہے۔ اس سے باہمی اتحاد بھی پیدا ہو سکتا ہے اس لئے کہ جو غریب مزدوری اور مشقت سے دن بھر دانتوں سے پسینہ نکالنے کے بعد کھانا کھانے کو پاتے ہیں اُن کو ذرا ذرا سی باتوں پر باہمی جنگ و جدل کی فرصت کہاں۔ کسی مل میں ہندو مسلمان کا سوال نظر نہیں آتا۔ لڑائی جو ہوتی ہے ہر دو کے بے فکروں۔ ناکاروں کے درمیان شروع ہوتی ہے۔ اور پھر بعد کو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

وہ وقت آئے گا اور آئے گا کہ کارکن (ورکر) خود ہوشیار ہو کر اپنے حقوق کو مضبوط پکڑیں گے۔ اگر اس وقت ان کی مدد نہ کی گئی۔ ان کی ہمدردی نہ کی گئی۔ اور وہ اپنے اختیار میں نہ لائے گئے تو بہت ممکن ہے کہ روس کا خونیں منظر ہندوستان میں بھی نظر آوے۔ اِس لئے نہ صرف اِس غرض سے کہ ہندوستان میں سوراج حاصل ہو۔ اور سیاسی مطلع سے گرد و غبار دفع ہو۔ کسانوں اور کارکنوں کو تنظیم کر کے تعلیم اور اخلاق سے اُن کو آراستہ کرنا چاہیئے

بلکہ اس لئے بھی کہ جو سواراج یا حکومت خود اختیاری حاصل ہو وہ راہ راست پر رہے اور روس کے ایسے مناظر ہندوستان میں نظر نہ آویں۔ کارکنوں اور کسانوں کی ابھی سے فکر کرنی چاہیئے۔ کسان اور کارکن ہی ہم کو سواراج دلا سکتے ہیں۔ انہیں کی تعلیم اور اخلاق سے آراستہ ہونے پر سواراج امن و امان سے چل سکتا ہے۔ موجودہ تجارتی حکومت پر دباؤ بھی ان ہی کے ذریعہ سے ڈالا جا سکتا ہے۔

فصل گل آئی چلیں ٹھنڈی فزائیں دلفزا
گوشہ گوشہ بنگیا ہے باغ کا جنت نما

صحن گلشن کی ہوائیں پھر معطر ہو گئیں
طائروں کے سُنکے نغمے خود بھی شاخیں سو گئیں

یہ روش پر پھول ہیں یا حسن فطرت منتظر
ذرّہ ذرّہ لے رہا ہے باغ کا جس سے اثر

ہاں مگر اک دل ہی میرا جو ہے اس سی بیخبر

شام کی دلچسپیاں ہیں کیف پرور کس قدر
صبح کی رنگینیاں ہیں جنتِ اہلِ نظر

رات تیری جوشِ کیفیات سے لبریز ہے
عاشقوں کو چاندنی تیری جنوں انگیز ہے

آہ یہ ایام گل بھی کسقدر ہیں خوشگوار
یعنی ہر ذرے سے دُنیا کے خوشی ہی آشکار

ہے مگر میرا دلِ صد چاک اب تک بے قرار

وہ نسیمِ صبح گاہی وہ طیورِ خوشنوا
وہ روش پھولوں بھری اور کیف آوردہ ہوا

بلبلوں کے شور سے معمور ہے صحنِ چمن
بنگیا ہے گوشہ گوشہ باغ کا اک انجمن

چشمِ نرگس جوشِ گل سے مست ہے مخمور ہے
دیکھ کر جس کو دلِ غم دیدہ بھی مسرور ہے
ہاں مگر میرا دلِ ناشاد غم سے چور ہے

وہ تبسم تیرا اے دوشیزۂ فصلِ بہار
بھر دیا پھولوں سے تونے آکے سارا کوہسار

کردیا فیضِ قدم نے تیرے صحرا کو چمن،
بنگئی تو خود ہی آکر رونقِ ہر انجمن

تو نہ ہوتی تو نہ ہوتی رونقِ بزمِ جہاں
تو نہ ہوتی تو نہ ہوتے حسن کے جلوے عیاں
تونے ثاقب کو دکھائے حسنِ فطرت کے نشاں

(مولوی) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

متمردین کبار دورۂ خلفاء متوسطین

بنی عبّاس

از

آقا سید ہادی حسن صاحب بی۔ اے۔ (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا۔ چیرمین و پروفیسر شعبہ علم
نباتات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اظہارِ حیاتِ فاعلیۂ ادیانِ قدیمِ ایران (یعنی ادیان و مذاہب کہ قبل از ظہورِ اسلام رواجی داشتہ) علیحدہ از کفر و تمرّدی کہ در نقاب و پردۂ اسلام واسلامیت ورزیدہ شُدہ ولی اصلاً تجدیدِ افکارِ دورۂ ساسانیہ و نحالانشیہ بودہ بتوسطِ "بہ افرند" پسرِ "ماہ فُرُدزِین" کہ شرحِ حالِ مختصرِ او در "فہرست" و "الآثار الباقیہ" البیرونی ضبط و محفوظ است بعمل آمدہ۔ عینِ عبارتِ البیرونی بر قرارِ ذیل است در ایّامِ ابومسلم موسس سلسلۂ بنی عباس شخصی موسوم بہ اسمِ "بہ آفرید" ابنِ "ماہِ افروزین" خوانی کہ رُستاق از رسانیقِ نیشاپور است۔ درمقامِ سیراوند پیش آمد۔ "بہ آفرید" اہلِ "زوزن" بود۔ و در اوایلِ امرِ وش از انظار اشخاص غائب شدہ۔ مدتِ ہفت سال در مملکتِ چین مختفی و مُنزوی ماند۔ سپس مُراجعت نمود و با دیگر عجائب و غرائبِ چینی پیراہنِ سبز با خود آورد۔ و آں قمیصِ اخضر باندازۂ

دقیق و حنیف بود که درمشتی ترکس دمرتکم شدی - شبی "به آفرید" بکنشتی رفت . و صبحدمی چون از آنجا فرود آمد یکے از حراث و فلاحین که مذارع خود را شیار می کرد اورا در قمیصِ اخضر ملبوس مشاہدہ نمود - به آفرید، گفت که در ایامی که از انظار عوام غائب بودم به فلک الاقصی رفته در جنّت استقامت داشته ام و جنت و نار مرا نموده اند، و با لہامِ ربّانی مشرف و متعلّی گردانیده اند و خدا مرا قمیصی پوشانیده از سما به ارض فرستاده است و حالا از آن مقام مرفوع می آیم -

ر نجبر الفاظ واد عاش را تیقّن نمود و کافہ عوام را از ہبوط "به آفرید" از جنّت مستنجر گردانید - پس بسیاری از موبدان و آتش پرستان بر او ایمان آوردند و اورا به پیغمبری شناختند - و کار "به آفرید" بالا گرفت و اسافل و اضالیل اکاذیبِ اقوالش را گوش داده اشاعتِ مذہبش را داعی شدند -

"به آفرید" حامی و طرفدار اکثر رسومِ آتش پرستان بود ولی معتقدِ زردشت بوده است و ادعا نمود که وحی و الہام ربّانی سرًا بر او نازل می شود - و اتباع را به ہفت نماز امر کرد یکی در تمجید باری و توحیدِ الٰہ دیگری راجع به خلق نمودن سما و ارض - سوم راجع بمرگ و ممات - چہارم راجع به رستخیز و یوم العدل - پنجم راجع به خلق نمودن ارزاق و حیوانات - ششم دربارۂ اہل جنت و نار و ہفتم در خصوص تحسین و تحمید اصحاب الجنت -

سپس کتابی برای شان در فارسی تصنیف نمود و امر عبادت مادۂ آفتاب یعنی "الشمس" کرد و اینکه یک زانو زده رخ به آفتاب بیارند - ہر کجاش که باشد و صلوات کنند و نہی کرد به تراشیدن مو و ذوایب (شعور و الجمم) و خواندنِ زمزمہ در اوقات سفره و قربانی

انعام صغیر مگر آنکہ ضعیف باشد و نہی کرد بہ خوردنِ خمر و لحم الحیوانات کہ بمرگ عجلہ مردہ و بہ آئین مذہب ذبحہ نہ شدہ باشد و بہ نکاح و تزویج اُمّہات و بنات و اخوات و بنات الأخ و بہ زاید از چہار صد درہم صداق کردن و بہ نگاہ داشتن مسالک و جبایہ و تعمیر الطرق و اصلاح القناطر از یک سباع املاک و اموال و کسب الاعمال خود شان۔

امّا ابو مسلم چوں بہ نیشاپور رسید موبدان و ہربدان (رہبان درجۂ ثانی و ثالث مذہب زردشتی۔ رہبانِ درجۂ اعلیٰ را دستور خوانند) بہ ہیئت اجتماعی در خدمت او رسیدہ گلہ نمودند کہ این مرد ہم مذہب زردشتی را و ہم دینِ اسلام را تخریب نمودہ است پس عبداللہ بن شعبہ مامور شد تا "بہ افرید"، را دستگیر نماید۔ مثال را امتثال کرد و "بہ افرید"، و بعضی از اتباع را از جبالِ بادغیس دستگیر نمودہ پیشِ ابو مسلم آوردہ بہ امرش بقتل رسانید۔

امّا اتباعش کہ منسوب بہ اسم "بہ آفریدیہ" باشند تا یوم الحال احکام و فرامین و آئین و قوانین موسسِ شان را اطاعت نمایند و زمزمۂ موبدان را مقاومت۔ و میگویند کہ چاکر نبیِ شان اینہا را خبر دادہ کہ نبیِ شان سوارہ سمندِ زردونی شدہ و بہ سما صعود کردہ است و از ہمان راہ ہبوط کردہ از اعدا و مخاصمین انتقام خواہد کشید۔

از شرح حالِ مختصر "بہ آفرید"، کہ در "فہرست"، ضبط و ثبت است اطلاع داریم کہ وی از دستِ دو داعیانِ ابو مسلم موسوم بہ اسم "شبیب بن داح"، و "عبداللہ بن سعید"، اسلام آوردہ بود و لباس سیاہ رسمی خلفای بنی عباس را نیز اتخاذ

کرده ولی چوں بعد مجدداً کافر شد او را به قتل رسانیدند۔ موسس و موید ایں قول ابراہیم بن العباس الصولی است و گویا الی یوم الحال در خراسان اہل "به افرندیہ" بسیار باشند۔ "شہرستانی" ایں طایفہ را سیسانیہ خوانند و میگوید که ہیچکدام از مخلوق خدا آں مخاصمت به موبدانِ زمزمیہ که "به افرندیہ" دارند ندارد در صورتیکه اینها معترف پیغامبری و نبوتِ زردشت باشند و آں ملوک را که زردشت محترم داشته احترام نمایند۔

اطلاعاتِ بسیار مختصر راجعه به "به افرندیہ" که ما دایم بارا می گذارد که از اصول و فروع مذہبش سخن رانیم۔ ظاہرا اہمیت دادن به عدد ہفت و تیقن در غیبت و رجعت مقتدای و موسس مذہب و محکم ترین و مہم ترین شقوق مذہب "به افرندیہ" بوده است در بارهٔ اہمیت فوق العاده که به بعضی اعداد مثلاً عددِ ہفت و دو از ده وغیره داده شده و در خصوصِ استمرار و اصرارِ اعتقادِ قدیم راجعه به رجعتِ مشاہیر و کبارِ قاعدین امثالِ کثیر یابیم۔ عین عبارت شہرستانی راجعه بدیں غُلات این است۔

اینها حسنِ ظن غُلو در بارهٔ ائمه دارند۔ حتی ایشان را منزلتی فوقِ حصر و حد مخلوقات داده به صفاتِ ربوبیہ نسبت دہند یا یکی از ائمه را بخدا مشابہت نمایند و یا خدا را به بشریت و بدیں علت یا به غُلو و یا به تقصیر مرتکب شوند۔ ایں افکارِ تشبیہ شان از طوایف و فرقِ حلولیہ (آنانکه اعتقادِ حلول یعنی گذشتن رب در جسدِ الانسان دارند) و تناسخیہ (آنانکه اعتقادِ تناسخ دارند)۔ وجود ان و

نصاری مستنبط شده زیراکه جهودان خالق را به مخلوق و نصاری مخلوق را بخالق مشابهت نمایند۔ وهمچو افکار در خواطر غلات سرایت کرده باندازهٔ که بعضی از ائمه اطهار را به داشتن صفات خدا منسوب کرده اند۔ غلات چهار اصول و فروع دین دارند۔

اولاً تشبیه ثانیاً بدا یعنی تبدیل مشیت الٰهی،

ثالثاً رجعت یعنی مراجعت امام

رابعاً تناسخ۔ اهل غلات را در هر بلدی اسمی دیگر است۔ در اصفهان به اسم خرمیه وکدیه۔ در ری به اسم مزدکیه وسنبادیه۔ در اذربیجان به اسم دهقولیه در بعضی مواضع به اسم محمره (یعنی کسانیکه لباس احمر پوشند) و در ماوراالنهر به اسم مبیضه یعنی کسانیکه لباس ابیض پوشند) موسوم اند۔

پس همین احزاب اهل غلات که حالا مذاکره شان خواهیم نمود مملکت ایران را در ضلالت و اقتدار سنباد مجوسی والمقنع نبی کذاب محجوب خراسان وبابک وغیره وغیره به هرج ومرج در انداختند واهالیش را بجوش وخروش وایهاما نند احزاب اسماعیلیه وباطنیه واهل قرامطه وحشیشان حروفی سایر شان اصلاً یک عقیدهٔ دانستند یعنی عقیدهٔ تشبیه وحلول ورجعت وتناسخ وگویا همچو عقیدهٔ جزو خاک ایران است ومحجوب و مکشوف بودنش منحصر به غیبت وظهور محرکی پروفسور بردن انگلیسی فرماید که در دورهٔ حالیه اکتشاف همچو عقیدهٔ بتوسط بابیان مظهر بوده واز شرح احوال ووقایع شان واضح است که اولاً در اوائل تحریک بابیه جوهر دین شان همان عقیدهٔ قدیم وکهنه اهل غلات بوده ولی در اواخر بتوسط بهاالله بالخصوص (که در سنه ۱۸۹۲ وفات یافته)

وپسرش عباس افندی الغصن الاعظم۔ (The most mighty branch)
که در نظر اتباعش (مخصوصاً اتباعش که در ممالک متحده امریک دارند به حیث
رجعتِ حضرتِ مسیح منزلتی دارد) این عقیده گویا متروک شد یعنی در کتب بهائیه مسائل
تشبیه وتناسخ وغیره را آن اهمیتی داده نشده که سابقاً در کتب بابیّه داده شده بود
مشابهت مابین این مِلَل وفِرَقِ مختلفه متعدده مشابهتِ امروزه نیست بلکه اوراقِ
تاریخ دوازده قرونِ ماضیه بدین طرف مشابهت بلکه مساوات اصلی وفرعی را واضح
وآشکار نماید مثلاً مساوات دقایقِ تفصیلاتِ اسمی ولفظی وانتخابِ الوانِ رسمی بابیان
متقدمین مانند اہلِ مبیضه که ذکرِ شان حالا مورد بحث است لباس ابیض پوشیده
ودر انتخاب مرکبِ قرمضی در موقع استنساخِ کتب گویا لونِ احمرِ اہلِ محمّره را طرفداری
نموده اند۔ این مسئله بسیار جالب علاقه است (ولی اخلالش به واسطهٔ کمی معلومات و
اطلاعات ما دشوار است۔ آیا در ایران ساسانیه نیز عقیدهٔ اہلِ غلاتِ رواجی داشته
یا خیر؟ نویسندگانِ متقدمین ومعتبرترینِ اسلام بالعموم بر آن اند که عقیدهٔ اہلِ غلات
جلوهٔ مذہب مزدک می باشد۔ شاید این ادعا طرف احتمال باشد ولی متاسفانه اطلاعات
ما راجع به اصول مذہب مزدک بغایت معدود وانگشت شمار است وهیچکدام نتیجه از
او مستنبط نمی شود۔

ولی صاحب مصنف فهرست که در سنه ۸۷۰ مسیحی وشهرستانی که در سنه
۱۱۲۷ سخن میراند ووزیرِ اعظم سلجوق یعنی نظام الملک توسی واشخاص دیگر همچو آن
دو مورخین کبار جناب لسان الملک ورضا قلی خان ونیز خانم شیل وپرفسور نالدکی

به جملگی بر آں اند۔ که عقیده اہل غلات محض تجدید مذہب مزدک می باشد۔

ابومسلم را اتباعش به احترام بلکه به اعتقاد پذیرائی کردند و قتلش حسب الامر المنصور فی الفور باعثِ فتنه و فسادِ سنباذِ مجوسی طاغی شد که یکی از رفقا و طرفداران ابومسلم بود۔ این واقعه بسیار جالب وقت است زیراکه بر واضح می شود که فرطِ تعصب آں داعی کبیر به آں اندازه بود که گبرگان را از مراعاتِ حمیتِ او منصرف و منحرف کند۔ خلاصه اینکه سنباذ مجوسی از مسقط الراسش یعنی از نیشاپور به عزم جزم کشیدنِ انتقام و خواستن کینه از قاتلین ابومسلم خروج کرد و در اندک مدتی مجمع کثیری بر او گرد آمدند و شهرها "قومس" و "ری" را ضبط کرد و خزاین که ابومسلم آنجا نهاده بود۔ تاراج و عزم التسخیرِ حجاز و تخریب و اعدامِ کعبه را اظهار نمود۔

مجوسیانِ طبرستان و رافضیان و اہل شبیه انبوه بر او جمع آمدند موج موج ز فوج فوج و اینها را درس داد که ابومسلم وفات نیافته است۔ بلکه چون المنصور به قتلش تهدید کرده وی اسم اکبر خدا را خوانده و خود را به فاخته سفید مبدل کرده پرواز نموده است و آورده اند که صد هزار نفرِ مسلح داشته که تمام شان از لوازم جنگ آراسته بودند و اگر ادعای الفخری طرف وثوق باشد تقریباً شصت هزار نفر ازین مردان سنان دار و عنان دار در میدان حرب در راه او جان دادند و فتحی که سپهسالار عباسیان جهور بن مرار را میسر شد بعد از شکستها بسیار دست داد۔ این فتنه گرچه مهیب و سهمگین بود ولی چندان حیاتی نداشته و حسب الاقوال الثقات از هفتاد روز بیشتر تطویل نکشید و آنچه نظام الملک می گوید که تا هفت سال آتش این فتنه بالا بوده بکلی

سہو و باطل است۔

دیگر از معتقدین وسقاتِ قوی دست اسحاق تُرک بوده ۔ وی نیز از اعیان ابومسلم بوده است و بعداز قتل قاعدش منزوی شد وفرار نمود متوجها الی مادراالنہر و عوام را تدلیس کرد بدیں معنی کہ ابومسلم وفات نیافتہ است بلکہ در نزدیک " ری " در جبل پنہان شدہ و بہ مصلحت وقت از انجا خروج خواہد کرد حسب صاحب فہرست وی خلقت زید علوی بودہ و از محبوب القلوب بودن ابومسلم افادہ و استفادہ بردہ خود را بہ اتباع ابومسلم اقتراح کردہ است اما ارباب تاریخ دربارہ اسحاق حکایت دیگرہم دارند۔ اینکہ اسحاق از طبقہِ پستِ عوام بودہ و جاہل محض وروحی داشتہ کہ بدو مشورتی میکرد واین روح خبر میداد کہ ابومسلم پیغمبری بودہ فرستادہ زردشت واینکہ زردشت وفات نیافتہ بلکہ درحیات است وبمصلحت وقت برائے تجدید تشکیلِ مذہب ظہور نماید۔ مصنف گوید کہ البلخی وبعضی از دیگران اتباع ابومسلم را مسلمیّہ یا خرمیہ دینیہ خوانند واینکہ دریکی از قریہ ہای بلخ مجمع کثیر شان مختصی می باشد۔

ظہور دیگر مشتبہہ در سنہ ۷۵۹ - ۷۵۸ بودہ ۔ جناب " دوزی " میفرماید۔

جاہل تر آں مردمان متعصب بودہ اند کہ از تتبع افکار ہند وایران پادشاہ را خدا نامیدہ ۔ تا جنیکہ انجام جنگ مشکوک بود عباسیان ہمچو تمردی وکفر را بہ چشم اغماض نگریستند ولی چوں فتح مبین یافتند اغماض بہ ہمچو کفر نمودن ممکن نہ بود۔

زیراکه اگر همچو کاری می کردند اهل سنّت و شریعت را بلکه سایر قبایل و اقوام اعراب را به منازعت بر می انگیختند - ولی در مقابل حمایت و حُبّ ایرانیان را سلب نمودند زیراکه خداشان نمی شدند - ظاهر است که عباسیان را چاره نبود بجز اینکه اباالاهیت نمایند و ایرانیانِ بیچاره که در حقِ عباسیان نیک عقیدتی داشتند و از طیبِ خاطر و صمیم قلب بهی و منفعت اینها را خواستار بودند - گول خوردند در نوک تیغ جلاد - پیمانهٔ وصل چشیدند - اهل راوندیه (راوند مقامیست نزدیک اصفهان) فریب خوردند و این نکته را دیر ملتفت شدند - اینها به حضور المنصور برای پیشنهاد اطاعت شان در آمدند - المنصور را خدا و حاکم مکه را جبرئیل و صاحب منصب قشون شخصی المنصور را آنکه در و روح آدم حلول کرده خواندند - سودی نداشت - المنصور تردید اطاعت شان کرده صاحب منصبان شان را بزندان فرستاد - از همان زمان المنصور دیگر در انظار راوندیه خلیفه نماند -

خلیفه با حق بودن و خدا بودن در نظر شان از یکدیگر لایفوت بوده و پادشاه که اباالهیت کند - غاصب است و باید مخلوع شود پس در صدد اتمام این خیال افتادند - به زندان رفتند و تا استقصا و دقت عوام را تشحیذ نه دهند - تابوت تهی را در جلو خود بردند و چنان نمودند که گویا بدفن کردن میتی میروند - چون به زندان رسیدند در ها محبس شکستند و مقتدیان را خلاص دادند و بعد بر قصر خلیفه تاخت و تاز آوردند -

و در بحرانِ این موقع جان خلیفه هم در مخاطره بود تا بالآخره قشون دولتی رسیدند و فتنه راوندیها را فرو نشاندند ولی گویا این قضیه کلی از میان نرفت زیراکه هزارها

ایرانیان ہمعقیدہ راوندیہا بودند و خلیفہ را خلیفہ ندانستند - چوں خلیفہ بہ بودنِ خدا
راوندیہا راضی نمی شد و بہ آرزومندی ہائے شان تن نمی داد۔

تعداد راوندیہا کہ طوافِ قصرِ خلیفہ واقعہ در حاشمیّہ (زیرا کہ بغداد آں زمان
معمور نہ شدہ بود) مینمودند - در حالتیکہ غوغا "ہذہی قصر الرّبی" بلند بود از شش
صد نفر بیشتر نبود ولی چنانچہ طبری مذاکرہ نماید این طایفہ راوندیّہ تا اوایلِ قرنِ
دہم مسیحی باقی بود۔ علاوہ بر اجابت و تصویبِ مسئلہ حلول و تناسخ ہمعقیدہ مزدک در
بارۂ اشتراکِ ازدواج بودہ اند و خود شان را دارای قوۂ فوق العادہ معجزیّہ یعنی
اصحاب المعجزہ پنداشتند بقسمیکہ بعضی شان از مواضعِ مرفوعہ و جایہای بلند خود را
پایان انداختند دریں تیقن کہ قوۂ پرواز دارند و چنانچہ کہ ظاہر است ہلاک شدند۔

دین آور سی گوید کہ راوندیہا بدون ہیچ شک و ریب پیوستگی بہ ابومسلم داشتہ و کین
خواستنِ قتلش قطعاً یکی از مقاصدِ عظام شان بودہ و بعلت آں کہ حیاتِ خلیفہ المنصو
بہ قلیل مدتی بواسطہ نابودن اسپی در مخاطرہ بود اسم فرس نوبہ (اسپ نوبتی) رواج یافت
یعنی اسپی با زین و لگام و ساز تمام باید لیلاً و نہاراً بردمِ دروازۂ خلیفہ حاضر باشد
تا خلیفہ بہ وقت ضرورت محتاج بہ دعا و صلوات نباشد۔

در سنین ہفتصد شصت و شش تا ہفتصد شصت و ہشت مسیحی ہم در عہد سلطنت
المنصور ایرانی موسوم بہ اسم اُستاذسِ ادعا باطلِ نبوت کرد و سر از ربقۂ اطاعت
بپیچید و در ہرات و بادغیس و سیستان فتنہ برانگیخت و سہ صد ہزار نفر از برنا و پیر
و صغیر و کبیر ہمعقیدہ خود ساخت و بغایت و نہایت دولت عباسیہ را آسیبی برسانید۔

بالآخرہ خازم بن خزیمہ آتش این فتنہ را فرونشانید و اُستاذس را شکست عظیم داد چنانکہ از اتباعش ہفتاد ہزار نفر مقتول شد و چہار دہ ہزار دیگر دستگیر و این اسرا را ہم در میدان جنگ بقتل رسانیدند۔ کمی بعد ازین واقعہ استاذِس خود را تسلیم نمود پس اورا بہ زناجیر و اغلال بہ بغداد بردند و انجا بردار کردند۔ سی ہزار نفر از اتباعش کہ خودشان را تسلیم نمودہ بودند خلاصی یافتند و جان بسلامت بردند۔

اُلخَزیرَان زوجہ المہدی و مادر الہادی و ہارون الرشید باتفاق سخن سرویلیم میور بنتِ اُستاذِس بودہ ۔ والثعلبی در لطایف المعارف مذاکرہ نماید کہ از سہ خواتین کہ مادر دو خلیفہ بودہ اند یکی بنت اُستاذِس بودہ است و از آں دو دیگر یکی نیز ایرانانی بودہ است۔ اعنی شاہ پرَند نوادہ یزدگرد آخرین بادشاہ ساسانیہ۔ شاہ پرند زوجہٗ خلیفۂ ولید بن عبد الملک بود و مادر یزید ثالث و ابراہیم۔

دو سال بعد از قضیّہ اُستاذِس در اوائلِ سلطنتِ المہدی شعلۂ فتنۂ المقنع بنی محجوب خراسان بالا گرفت۔ در خصوص این متمردِ مشہورِ کذاب البیرونی در اثار الباقیہ سخن ہمی راند بدین قرار۔

اما بعد ہاشم بن حکیم المعروف بالمقنع از قریہ مرو موسوم باسم "کاوہ کیمردان" پیش آمد۔ وی خود را مبرقعِ حریرِ اخضر می پوشانید برای انکہ عوَر بودہ است۔ اعنی بہ یک چشم کور۔ وی ادعا الاہیت تجسّد می کرد چون پیش از تجسد کسی خدا را نمی تواند بیند۔ و از جوی مولیان عبور کردہ بہ نواحی کش و نسف نزدن و با خاقان مکاتبت و مکالمت اغاز کرد و استعانت و استمدادش می خواست و اہل مبیضہ

واتراک بروی جمع آمدند والمقنع اشیان را املاک واموال اعدا بخشید ومخالفین را قتل وغارت نمود جمیع احکام وقوانین وآئین مزدک را بر ایشان واجب گردانید وافواج المهدی را منتشر ساخت ومدت چهارده سال مطلق العنان می بود۔ اما بالاخره محصور ومقتول شد درسنہ ۷۸۶ - ۷۸۵ مسیحی وچون از ہمہ اطراف واکناف محصور شد خود را آتش زده خواست تا جسدش را تماماً بسوزاند چنانکہ اثری باقی نماند۔ تا فنا شدنش دلیل قوی الاہیتش شود۔ ولی در فنا کردن جسمش کامران شد۔ جسمش را در دیگی یافتند۔ سر بریده شش را بہ حضور المهدی بہ حلب فرستادند۔ تا حال ہم در ماوراء النہر طایفہ باقی است کہ سرا اطاعت مذہب وی کنند ہرچند جہاراً مومن ومسلم باشند۔

از اشہر مشاہیر اشیا المقنع حجاب طلا۔ وی (وبعبارت دیگری۔ برقع حریر اخضر) کہ پیوستہ لیلاً ونہاراً وسراً وجہاراً می پوشید تا طلعت متجلیش ومردق رویش وشعاع وانوار لامع رخش انظار ابصار عوام را لسوزاند۔ این ادعای بود ولی دشمنانش گفتند کہ این محجوب بودنش بعلت آن است کہ او کریہ المنظر وملعون الطلعت بوده واین مسئلہ بسیار جالب وقت است زیرا کہ چنانچہ بکرات ومرات سابقاً مذاکره شده اتباع جمال بہ اسم وبہ رسم ہمیں اقوال واشعار درحق بہاء اللہ سروده اند بدین قرار۔

لمعات وجہک اشرقت وشعاع طلعتک طلع

زچہ رو الست بربکم نزنی بزن کہ بلی بلی،

این حال قرة العین است ولی بنبیل ملک الشعرا بها الله نیز ہم اشعار بہ ہمیں نہج وقرار گفتہ مثلاً

شب ہجر گرچہ طویل شد چو سیاد موت بہا بہا
خلک اللقا کہ تمام شد ز بروق ردت بہا بہا

دیگر

ملول گشتم ز زندگانی کرابگویم غم نہانی
نگار جانی بیاز مانی نقاب بفگن ز روئے زیبا

دیگر

کہ تا بزمیت بر آسانی کہ کس ندارد زدی نشانی
بہ پیزد آنجا ز ناتوانی روان سیمرغ جناح عنقا
بہ بینی انجا جمال مہ وش کہ از جمالش درخشد آتش
دگر بلوح سخن قلم کش کہ سوز دانیجا زبان گویا

برویم بر سر مطلب :۔ از مشاہیر اشیا المقنع یکی حجاب طلائی بودہ چنانکہ اشارت شد دیگر مہ باطل بودہ است۔ کہ ہر شب از چاہ "نخش آب" طلوع میکرد بنا براین المقنع را ماہ سازندہ نیز خوانند وسہ دیگر چیزی کہ المقنع بدو معروف ومشہور بودہ خودکشی وی واتباعش بودہ است تا بدیں حیلہ زرق تزویر خاک درچشم اعدا انداختہ خود را چناں جلوہ دہد کہ گویا غائب شدہ است۔ ودیگر باز ظہور ورجعت خواہد کرد برائے استخلاص دوستان واعدام دشمنان۔

دربارہ قمر باطل القزوینی کہ در اوّل نصف قرنِ سیزدہم مسیحی حیات داشتہ در آثار البلاد بقرار ذیل سخن میراند۔

نخش آب۔ شہریست مشہور در خراسان و از آن مقام زہاد و فقہا کبار بسیار برخواستند الحکیم المقنع بدیں شہر نسبتی در والبطی داشتہ زیراکہ انجا چاہ می کند چنانچہ کہ ازاں چاہ ماہ بر می آمد مانند ماہ سماوی۔ واین خبر چوں با طراف واکناف آفاق شہرت یافت عوام بہ نخش اب ہجوم آوردند و ماہ را عیناً مشاہدہ نمودند و متحیر و متعجب ماندند۔ جمہور ناس بہ سحر نسبت دادند ولی اصلاً آن کار ریاضی و انعکاس شعاعِ قمر بودہ۔ زیراکہ بعد در قعرِ چاہ طشت آب پُر از سیماب یافتند۔ فی الجملہ این کار بسیار تحسین و تمجید یافت و شہرتش در آفاق منتشر گردید و صغار و کبار دی را در ابیات و اشعار سر دادند و نامش در سفاین نوشتند و در مدائن بخواندند۔

ضروری گذارش

آج کل اشتہار دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر اشتہارات جھوٹے اور فریبی ہوتے ہیں۔ ایسے اشتہارات کی اشاعت افسوس ناک ہے۔ اس لئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ صرف معزز اور معتبر تاجر اور دوکانداروں کے اشتہارات شمع میں شایع کئے جائیں تاکہ ہمارے ناظرین دھوکہ اور نقصان سے محفوظ رہیں اور خوش معاملہ اور ایماندار تاجروں کے کاروباری تعلقات اچھے لوگوں سے پیدا ہو جائیں لہٰذا اطلاعاً گذارش ہے کہ غیر معتبر اشتہارات کی اشاعت سے ہم کو قطعی معذور سمجھا جائے اور اصرار نہ کیا جائے۔

منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

تم جو چاہو تو کیا کرے کوئی

مولوی سید قمر حسن صاحب قمر بی۔ اے (علیگ) سابق تحصیلدار حیدر آباد (دکن)

امتحانِ وفا کرے کوئی　　یا الٰہی جفا کرے کوئی

مستعد ہوں میں جان دینے پر　　اسکو تیغ آزما کرے کوئی

تم نہ چاہو تو موت ممکن ہے　　تم جو چاہو تو کیا کرے کوئی

جامِ آبِ بقا جو پینا ہو　　خضر کو رہنما کرے کوئی

آزمانا ہو گر محبت کو　　ان سے عہدِ وفا کرے کوئی

داستانِ وفا سُناتا ہوں　　میں کہوں اور سُنا کرے کوئی

گر ہے تسکین مدعائے دُعا　　کیوں خدا سے دُعا کرے کوئی

میں نہ روؤں ہزار بار قمر
دل ہی روئے تو کیا کرے کوئی

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

انسانی تخیل بھی خوب چیز ہے۔ اس کارخانہ عالم میں تخیل انسانی سے زیادہ کوئی چیز عجیب نہیں ہے۔ ایک ہی چیز۔ ایک ہی شعر۔ ایک ہی لفظ سے کیسے کیسے مختلف تخیلات پیدا ہوتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ ایک درخت پر ایک چڑیا سُریلی آواز سے بول رہی تھی ایک سائیس ادھر سے گذرا تھوڑی دیر سُنتا رہا اس کے بعد کہنے لگا کہ "گاڑی گھوڑا جوت رکھ" کہہ رہی ہے۔ ایک باورچی کا بھی اُدھر سے گذر ہوا اُس نے بھی چڑیا کی بولی سُنی اور کہا "واہ! یہ تو صاف کہہ رہی ہے "ہلدی پیاز ادرک" ایک مالی نے قطع کلام کرکے کہا "نہیں! وہ تو سیب۔ انار۔ کمرک کی یاد میں ہے" سائیس، باورچی۔ اور مالی میں بحث ہو ہی رہی تھی کہ ایک مولوی صاحب حافظ قرآن وہاں پہونچے۔ انھوں نے چڑیا کے پڑھنے کو بغور سُنا اور آخری فیصلہ یہ صادر فرمایا کہ "طائر قران پاک کی تلاوت میں مشغول ہے اور کہہ رہا ہے" اذالسماءُ فطرت"

بعض اشعار کا بھی بعینہ یہی حال ہوتا ہے حتیٰ کہ لوگ اپنی طباعی سے بے معنی اشعار میں بھی کچھ نہ کچھ معنی پہنا ہی لیتے ہیں۔ کتابوں اور دیوانوں کے شارح قریب قریب ہمیشہ اپنی جولانی طبع دکھاتے ہیں۔ غالب کے شارح کو تو اپنے ذہن رسا

سے اکثر کام لینا پڑتا ہے۔ اپنی طباعی سے مرحوم عبدالرحمن بجنوری نے تو تمام جرمن اور فرانسیسی اور انگریزی فلسفہ کا نچوڑ دیوان غالب کے چند اوراق کو بنادیا ہے۔ ایک صاحب نے غالب کو ملکی سیاسی شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے کا مضمون "مرزا غالب کی شاعری" پر نہیں پڑھا۔ کل جو رسالہ "شمع" آیا اس میں اس کی تنقید دیکھی۔ میں جانتا ہوں کہ غالب کو خود صوفی ہونے کا دعویٰ تھا۔ ان کا شعر ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب،
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر پھر بھی حاشا! غالب کو تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا نہیں سمجھتا ہوں نہ ان کو عطار۔ سنائی یا حافظ کا ہم مذاق سمجھتا ہوں۔ یوں تو ایسا کوئی ایشیائی شاعر نہیں ہے جس نے دو ایک شعر تصوف کے رنگ میں نہ کہے ہوں گے۔ خود عطار۔ سنائی۔ حافظ اور شمس تبریز وغیرہ کے بھی کل اشعار تصوف میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔

بہرکیف غالب کے مرقومہ بالا مطلع کو تصوف کا رنگ دینا اور "ہستی مطلق" وغیرہ کی طرف اس کے رخ کو پھیرنا مجھے تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس سے شعر کا لطف ہی کچھ بڑھتا ہے نہ مطلب ہی صاف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ ایک سادہ عاشقانہ شعر ہے جس کے پرشوکت اور مناسب الفاظ غالبیت کے مظہر ہیں۔ ورنہ مضمون میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے۔ جو معنی الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں اور

جو غالب کے مذاق کے موافق ہو سکتے ہیں وہ تو یہ ہیں کہ عاشق اپنے معشوق سے (خواہ مخواہ معشوق حقیقی سے مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے) کہتا ہے کہ بس تو ہی ایسا ہے جو میرے "نواہائے راز" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ اور محرم نہیں بنتا ورنہ اور تو سب ہی واقف ہیں کہ میں تیرے عشق میں نواسنج ہوں۔ باوجود میری کوشش پردہ داری کے میرے عشق کا راز عیاں ہو ہی گیا بلکہ جسطرح ساز کے پردے آواز کا ذریعہ ہوتے ہیں اسی طرح میرے راز عشق کے چھپانے اور پس حجاب رکھنے کی کوشش اور بھی اعلان کا باعث ہوگئی جس جس قدر میں نے اپنے غم اور درد کو چھپانا چاہا اسی قدر وہ اور آشکارا ہوتا گیا۔ سمجھنے والے سمجھ ہی گئے (سوائے خود معشوق کے) کہ یہ "نواہائے راز" کس کی بدولت ہیں نہ محرم بنا تو خود وہ ظالم نہ بنا۔ نہ بنا۔

کوہ و صحرا نے ہمنوائی کی　　　نہ ہوئے تم ہی آشنا نہ ہوئے

مشیر حسین قدوائی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی (بیرسٹر ایٹ لا)

---

(۲)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس شعر کی شرح میں جہاں صاحب مضمون (مرزا محمد عسکری صاحب) سے فروگذاشت ہوئی ہے وہاں قابل نقاد (ص) نے بھی معانی کو زیادہ واضح نہیں کیا۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں "سب پردے تو ٹھیک بول رہے ہیں تجھی کو کم بخت کیا ہوا ہے کہ صحیح سُر نہیں دیتا"! (ص) صاحب فرماتے ہیں وہ میری زندگی (جو بہ ظاہر پُر معصیت معلوم ہوتی ہے) ساز (وجود

باری تعالیٰ) سے وہی مناسبت رکھتی ہے جو اس کے ساتھ پردہ کو ہے" یہ شرح شاعر کے مفہوم سے قریب تر تو ضرور ہے مگر اس میں بھی غالب کی اس وسعت خیال کو محدود کر دیا گیا ہے جو ۔۔۔یاں ورنہ جو حجاب ہے .... سے نمایاں ہے۔ غالب اپنی زندگی کے متعلق ذکر نہیں کرتا ہے۔ اور نہ اُسکا مخاطب کوئی اجنبی معترض ہے۔ وہ آپ ہی معترض ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اگر دنیا حسنِ ازلی کا آئینہ ہے تو اسمیں مکروہ اشیا کیوں نظر آتی ہیں؟ یہ "خیر اور شر" کا تضاد کیوں ہے؟ یہ سوال زندگی میں کبھی نہ کبھی قریبًا ہر صاحب فکر کے سامنے آتا ہے اور شاعر اور فلسفی کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے طرز سے اس تخالف کو مٹائے اور نغمۂ کائنات کی ہر لے کو ایک قانون میں باندھ کر دکھائے۔ کارلائل کا مشہور مقولہ ہے۔

See deep enough and you will see musically.

غالب بھی یہی کہتا ہے کہ پردہ (پنبہ در گوش۔ نامحرم راز) معترض کی عقل پر پڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی "پُرمعصیت زندگی" نہیں بلکہ معصیت کے متعلق لکھ رہا ہے اور معصیت کی اضافی حیثیت کو اُس نے جا بجا نظم کیا ہے۔" فقط محمد دین تاثیر۔ ایم۔ اے۔

مولینا حالی کی شعر فہمی ضرب المثل تھی خود مولینا شبلی کا بیان تھا کہ "حالی جس شعر کی بُرائی کر دیتے ہیں وہ شعر ہماری نظروں سے بھی گر جاتا ہے"۔ حالی مرحوم نے جو معنی بیان کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"راز کے نغموں سے تو تو خود ہی ناآشنا ہے۔ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں" خود غالب مرحوم ایک رقعہ میں اس شعر کا مطلب بیان فرما چکے ہیں۔ اور انہوں نے بھی یہ مضمون ایک مشہور ایرانی شاعر سے لیا ہے۔

جعفری

شذرات

اگرہ کو اکبر سے جو تعلق ہے اسکی بنا پر ہمارا فرض ہے کہ اکبر اور عہد مغلیہ کے متعلق مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں - اُمید کہ قارئین کرام اس خصوصیت کو پسند فرمائیں گے -

---

ہمارے عزیز دوست نواب سید محمد حسین صاحب جعفری - آکسن - ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشنز حیدرآباد دکن نے ایک نہایت دلچسپ اور مفید مضمون مرحمت فرمایا ہے جو یقین ہے کہ خاص توجہ کیساتھ پڑھا جائیگا - آپ کو تعلیم سے خاص شغف ہے اور ملک کی ممتاز ہستیوں میں آپکا شمار ہے - ہم اُمید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی آپ کی قلمی اعانت سے رسالہ شمع کو مفتخر ہونیکا موقع ملتا رہیگا -

---

ہمارے دوسرے عزیز دوست سید ہادی حسن صاحب (کینٹب) کا فارسی مضمون ہمارے رسالے ایک نعمت ہے آپ نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے حقیقی بھتیجے ہیں اور نہایت علم دوست اور مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں - فارسی آپکی مادری زبان ہے اور ذہانت و ذکاوت و علم دوستی ددھیال اور ننھیال سے ورثہ میں ملی ہے یقین ہے کہ فارسی داں حضرات آپکی شیریں بیانی اور عالمانہ تحریر کی حلاوت سے لطف اندوز ہونگے آیندہ نمبر میں بھی آپکا مضمون شائع ہوگا جو اسی مضمون کا ایک حصہ ہے -

---

غالباً ہماری توقع غلط نہو گی کہ جناب رفیق احمد خانصاحب ایم - ایس - سی کا "پھول" بہت سے دماغوں کو تر و تازہ کردیگا ہمارے احباب اس نعمت سے قطعی محروم رہجاتے اگر جناب عبدالشکور صاحب بی اے - بی - ٹی اس کا ترجمہ نہ فرماتے -

واقعہ ہے کہ حضرت مترجم نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے - انشاء اللہ آیندہ بھی یہی سلسلہ جاری رہیگا

"امید ناکام" جناب مولوی محمد سبطین احمد صاحب بی اے۔ بی۔ ٹی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون اسلئے اور بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا کہ جس واقعہ کا اس میں ذکر ہے وہ بالکل سچا ہے مولوی صاحب نے جابجا ڈراما کی شان پیدا کردی ہے طرز بیان لایق ستایش ہے۔

ہمارے لایق دوست جناب مولوی حسین الدین انصاری صاحب (کنیٹب) بیرسٹر ایٹ لا نے حضرت شوق مرحوم و مغفور (جن کی تصویر ہدیہ ناظرین ہے) پر خوب مضمون لکھا ہے جو اردو داں اور اردو نویس حضرات کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔ کاش کہ اردو زبان میں اس طرز کی تقلید کیجائے اور ٹھوس مضامین لکھنے کی عادت ڈالی جائے۔

نظم کے حصہ میں احسن الکلام جناب مولینا احسن مارہروی شاگرد حضرت داغ دہلوی کے حسن افکار کا نمونہ ہے۔ آپ کہنہ مشق اور مشہور شاعر اور مصنف ہیں۔

جناب مولینا عبدالودود صاحب کی نظم خوب ہے۔ حضرت حالی کا اتباع اس سے بہتر ہماری نظروں سے نہیں گذرا ہے۔

جناب محمود صاحب اسرائیلی کی نظم ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جو سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ابھی آپ کی ابتدائی مشق ہے لیکن بعض بند حقیقت میں اچھے ہیں۔

جناب قمر کی غزل بہت پاکیزہ ہے جو شکریہ کے ساتھ درج کیجاتی ہے۔

تبصّرہ

Rupam.

روپم

جمالیاتی نقطہ نظر سے ہندوستان بدنصیب رہجاتا اگر آرٹ کے شعبہ کو مسٹر او۔ سی۔ گنگولی نہ سبنھالتے اور اپنے عدیم المثال سہ ماہی رسالہ "روپم" کے ذریعہ سے ہندوستان کے آرٹ کی ترویج نہ کرتے۔ "روپم" ایک انگریزی رسالہ ہے جو کلکتہ سے مسٹر گنگولی کی ادارت میں ایسی آب و تاب سے نکل رہا ہے کہ اسُ کی ظاہری و معنوی خوبی اور دلکشی کا اندازہ محض اس کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ مبالغہ نہیں ہے کہ ایشیا کا تو خیر کیا ذکر ہے یورپ کے ممتاز رسائل کا پہلو دباتا ہے۔ اور دنیا ر کے آرٹسٹ طبقہ میں عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے روپم کا اکیسواں نمبر ہے۔ اور ہم مسٹر گنگولی کے احسان مند ہیں کہ انہُوں نے اپنے بیش قیمت رسالہ کو بغرض ریویو مرحمت فرماکر موقع دیا کہ ہم قارئین کرام سے اس کا تعارف کرادیں تاکہ وہ آیندہ اس نعمت غیر مترقبہ کی شاداب و سدابہار دُنیا رت سے محروم نہ رہجائیں۔ روپم خالص دیسی اور ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر چھپتا ہے۔ چھپائی کی خوبیوں کے لئے صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ یہ خدمت کلکتہ کے مشہور پریس تھیکر اسپنڈ کو کے سپرد ہے۔ اس کی تصاویر زیادہ تر لندن کے مشہور کارخانوں میں تیار ہوتی ہیں۔ آرٹ کے نادر و نفیس نمونوں کا انتخاب مسٹر گنگولی کے کمال کا شاہد ہے۔ لیکن جو بات روپم کو اور بھی گرانقدر اور لایق توجہ بناتی ہے وہ اسُکے

مضامین ہیں جن میں آرٹ کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث کیجاتی ہے اور اس کے حسن و قبح پر بصورانہ دل و دماغ اور باریک محرک خیال استدلال کے ذریعہ سے نقادی کا فرض ادا کیا جاتا ہے۔

بدھ کے برنجی مجسمہ کی تصویر زیب سرورق ہے۔ یہ بت قد آدم ہے اور کچھ عرصہ سے برمنگھم کے عجائب خانہ کی زینت ہے اور عہد گپتا، کا کارنامہ ہے۔ چہرہ کی متانت اور صباحت اس کے مذہبی کمال اور معصومیت کو ظاہر کرتی ہے۔ شرافت اور نجابت بدرجہ غایت موجود ہے اور اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ گوتم شاہی خاندان کا چشم و چراغ تہا۔ زہد و تقویٰ کی بے بیان دلکشی۔ ہونٹوں پر خفیف مگر قدرتی تبسم آنکھوں کی ہمہ دانی، ایک نظر میں دکھائی پڑتی ہیں۔ ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدن جسمانی ورزش کا عادی نہیں سینہ کشادہ ہے۔ تمام بدن سڈول ہے۔ کندھوں پر گولائی ہے ہاتھ اور انگلیاں لانبی ہیں ہر حصہ میں تناسب ہے اور وہ نرمی ہے جو دنیا میں صرف مقدس اور پاک باز ہستیوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ غرض یہ بت صنعتی حیثیت سے نمونہ ہے ہندوستان کے مرحوم کمالات کا اور متین مگر ٹھوس دعویٰ ہے اس ہنرمندی کا جس سے آرٹ کی دنیا میں قدیم ہندوستان کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔

علاوہ دیگر تصاویر کے جو بنگالی اور کانگڑا قلم کاریوں کا نمونہ ہیں۔ ایک تصویر عہد مغلیہ کے کسی امیر کی ہے۔ اور عہد جہانگیری سے متعلق ہے۔ یہ دربار جہانگیری کے مشہور مصور منوہر کا عمل ہے۔ اسپر مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے " سہ فیل سفید کوشتی کیر عمل منوہر" آنکھوں سے استقلال اور قوت ظاہر ہے چہرے سے شجاعت عیاں ہے اور تمام جسم بالخصوص ہاتھوں سے اس کی قدرت اور طاقت کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن مخصوص دو تصاویر اس نمبر میں رنگین ہیں جن کی خوبی اور دلکشی ایسی نہیں ہے کہ
کسی عنوان ضبط تحریر میں آسکے یہ دونوں تصاویر انسانی قدرت قلم سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں
اور معجز نگاری کا اچھوتا نمونہ ہیں۔ عہد جہانگیری کے مرقعوں کی زیارت کو آنکھیں ترستی تھیں۔
اس کمی کو ان تصاویروں نے بدرجہ احسن پورا کردیا۔

پہلی تصویر دربار کا مرقع ہے۔ کسی تقریب کا موقع ہے جہانگیر تخت پر بیٹھا ہوا ہے
عمائدین مملکت حاضر ہیں۔ رامشگروں کا طائفہ موجود ہے انعامات و جاگیریں عطا ہو رہی
ہیں۔ درباری احکامات کو قلمبند کر رہا ہے۔ اللہ! اللہ! کیا رونق ہے! ہرچند سکوت
کا عالم ہے لیکن چہروں سے مسرت اور قلبی خوشی ٹپک رہی ہے۔ مصور کی قلمکاری
اُستادانہ ہے معمولی معمولی جزئیات تک پر اس کی نگاہ رہی ہے رنگ کی ترکیب اور پورے
مرقع میں ظاہری اثر حد درجہ متین اور سنجیدہ ہے۔

دوسری تصویر بھی رنگین ہے اس میں جہانگیر کے جلوس کا ایک حصہ دکھایا گیا ہے مرصع
ہاتھیوں پر شاہی نشان ہیں۔ گھوڑوں پر نقارے اور باجے ہیں پیدلوں کے پاس بندوقیں
ہیں گویوں اور طوائفوں کا مجمع ہے۔ ایرانی رقاصہ ناچ رہی ہیں۔ ہندوستانی اور کشمیری
طوائفیں گا رہی ہیں۔ ان کا انتظام اور ان کے لباس اور سجاوٹ کا صرف دیکھنے سے تعلق
ہے۔ یہ مرقع بھی فن مصوری کے لحاظ سے نادر ہے اور بیحد جاذب نگاہ ہے۔

یہ دونوں اصلی تصاویر حضور نواب صاحب رامپور کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں
یہ امر موجب مسرت و طمانیت ہے کہ یہ یگانہ روزگار مرقعے ہندوستان میں ایسے جوہر شناس
رئیس کے پاس ہیں کہ ان کے ضائع ہونے کا احتمال نہیں ہو سکتا ہے۔

میں فلسکیپ کاغذ کے دو صفحے لکھ گیا لیکن رُوپم پر ریویو نگاری کا حق ادا نہ ہوا۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مینگرم

تماشہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

افسوس شمع کا حجم اجازت نہیں دیتا ہے کہ رُوپم کے مضامین پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ اور ہم مجبوراً اس کو کسی دوسرے موقع کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔

یہ تبصرہ ادھورا رہجائیگا اگر میں بہ حسرت و افسوس اعلان نہ کردوں کہ روپم کے خریدار ہندوستان میں بہت کم ہیں لیکن یورپ امریکہ۔ جرمنی اور فرانس میں اسکی بہت مانگ ہے کیا یہ واقعہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے دولتمند اور خوش حال و تعلیمیافتہ جماعت کا بڑا حصہ ابھی غیر تربیت یافتہ اور بے حس ہے! چندہ سالانہ للعہ ہے۔ اور ایک کاپی کی قیمت عہ ہے۔

ملنے کا پتہ

O. C. Gangoly Esqe
Editor Rupam,
9, Hastings Street,
Calcutta.

جعفری

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب الحسن

بیرسٹر ایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حسن عابد جعفری الحسن

بیرسٹر ایٹ لا آگرہ

دار الاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد وضوابط

۱ - رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲ - ۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمایئے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳ - قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴ - ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک ۱۰/ ہے ممالک غیر سے عہ/ - نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا - چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہوسکتا ہے۔

۵ - تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہوسکتا ہے - خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶ - رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت وترسیل زرچندہ واجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ سے ذیل کے پتہ پر فرمایئے۔

۷ - مضامین و خطوط متعلق مضامین اڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمایئے۔

نوٹ - چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا۔ اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمایئے - اور وی - پی منگوا کر واپس نہ فرمایئے۔

شرح اجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	معہ/	مہ عسہ/	مہ عسہ/
چھ ماہ	عسہ/	دعسہ/	للعہ عسہ/
ایک سال	مہ عسہ/	سہ/	للعسہ/

المشتہر: - منیجر رسالہ شمع حسن منزل - شاہ گنج آگرہ

نمبر ۲	فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۵ء	جلد ۲

تصویر۔ جناب شیخ محمد مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر۔

اطلاع

محترمی جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا ممبر لیجسلیٹو اسمبلی و تعلقہ دار گدیہ (اودھ) کی تصویر زیب رسالہ ہے، آپ اپنی ذاتی وجاہت حب الوطنی اور ایثار کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں آپ کے سیاسی مضامین اور غزلین اکثر رسالہ شمع میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ادبی حیثیت سے آپ کا پایہ بلند ہے۔ اور یہہ کہنا قطعی مبالغہ نہیں ہے کہ آپ کا تمام وقت ملک قوم کی بے لاگ خدمت میں صرف ہوتا ہے۔ خدائے کریم آپ کی عمر میں برکت دے آمین۔

افسوس ہے کہ بعض مضامین کی کتابت میں غلطیاں رہجاتی ہیں اس کا خاص سبب یہہ ہو کہ ہمارے پاس اکثر مضامین نہایت بدخط پہونچتے ہیں لہذا التماس ہے کہ مضمون نگار حضرات اپنے مضامین کو صاف لکھوا کر بھیجا کریں اور کاغذ پر صرف ایک جانب لکھا کریں ورنہ ہم کتابت کی غلطیوں کے قطعی ذمہ دار نہ ہوں گے۔

چونکہ شمع مصور ہے اس لئے ہم ایسے مضامین بھی شائع کرنے پر آمادہ ہیں جن میں بلاک کی تصاویر کی ضرورت ہو۔ ایسی صورت میں مضامین کے ہمراہ تصاویر آنی چاہئیں مصوری کے اعلیٰ نمونے بھی شائع ہوں گے۔ جو حضرات سادہ یا رنگین تصاویر بغرض اشاعت مرحمت فرمائیں گے وہ بلاک بنوانے کے بعد شکریہ کے ساتھہ باحتیاط واپس کردی جائیں گی اور رجسٹری و بیمہ کے اخراجات کا رسالہ متحمل ہوگا۔

خادم

مینیجر شمع

بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۵ء

شاہان مالوہ

سنہ ۸۰۴ — ۹۶۸ ہجری

جناب مولوی منشی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ پی۔ سی۔ ایس رکن انجمن اردو لکھنؤ رکن دوامی انجمن اخوان الصفا کاکوری دسٹرکٹ مجسٹریٹ وجج نیمچ چھاونی سنٹرل انڈیا

مقدمہ

مالوہ کی خود مختار اسلامی سلطنت باعتبار رقبۂ حکومت اس منزلت کی نہ تھی کہ ہندوستان کے وسیع جزیرہ نما پر اس کا دیرپا اثر ہوتا اور اس کی آزادی کا عہد اتنا طویل تھا کہ دنیائے اسلام میں شہرت وعزت حاصل کرنے کا وقت ملتا۔ حدود مملکت میں وسعت دینے کی نہ تو زیادہ گنجائش تھی اور نہ خانہ جنگیوں سے کافی فرصت ملی۔ البتہ یہاں کے

تاجداروں نے علم وفضل کی سرپرستی کی۔ ان کا دارالحکومت "مانڈو" شیراز وسمرقند کا ہمسر بنا اور کئی صدیوں تک اُس کی علمی روشنی جزیرۂ نما ہند کے ہر گوشہ کو منور کرتی رہی انہوں نے محلات مساجد اور دیگر عمارات پر اس قدر دولت صرف کی کہ مدت تک اس اُجڑے ہوئے دارالریاست کے نقش ونگار ہندوستان میں بے مثل سمجھے گئے اکبر کے عہد میں یہاں کے عالیشان محل لاہور اور دہلی کے مسافروں کو شرمندہ کرتے تھے جہانگیر نے تین لاکھ روپیہ صرف کرکے یہاں کی عمارات کی مرمت کرائی اور اس حسرت کدہ میں ایک قابل یادگار جشن جمشیدی برپا کیا جس کی تفصیل سے تزک جہانگیری کے کئی صفحے رنگین ہیں۔ اُس کا قلعہ "مانڈو گڑھ" دنیا کے عجائبات میں شمار کئے جانے کے قابل تھا اور اُس کے کھنڈر آج تک اپنے بانیوں کی شوکت واولوالعزمی پر آنسو بہا رہے ہیں۔

وہ کسی وقت ہندوستان کی محفوظ ترین تجارتی منڈی اور دلی ودکن کے درمیان سب سے زیادہ پر رونق مقام تھا لیکن آج سنسان و ویران ہے۔ عمارتیں بہت کچھ باقی ہیں مگر اُن میں کوئی رہنے والا نہیں۔ بھول گیا! بھالو اور چیتے اُن میں رہتے بستے

لہ سنہ ۹۸۶ھ میں قاضی صدرالدین لاہور کے عہدۂ قضا سے تبدیل ہوکر بھروچ جاتے تھے راستہ میں مانڈو قیام ہوا تو مؤلف گلزار ابرار اپنے مہمان کو دارالسلطنت کے قدیم محلات دکھانے لے گیا۔ یہاں کی عمارات دیکھکر انہوں نے فرمایا کہ "جو چیزیں ہمنے چھوڑی ہیں وہ ان محلات کے کمترین ستون کی ایک سنگین کرسی کی قیمت کی بھی نہیں ہیں۔"

ملاحظہ ہو گلزار ابرار چمن چہارم۔ تذکرۂ قاضی صدرالدین لاہوری

ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں مانڈو کی عالی شان عمارات کی تعریف کی ہے۔ ۱۲

ہیں!! اگلے باشندوں کی بداعمالیاں درندوں کے قالب میں خانۂ خالی پر قابض ہیں شاہی محلوں میں قد آدم گھاس ہے اور قبرستان تو عبرت کے لئے بنائے ہی گئے تھے جہاں بادشاہ و گدا کو یکساں ہونا چاہئے۔

پردہ داری میکند بر قصر قیصر عنکبوت
چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

شمالی ہندوستان جو اردو زبان کا وطن اور ابھی تک اسلامی علوم کا گھر ہے۔ اس مٹی ہوئی سلطنت کے حالات سے بالکل بے خبر ہے۔ وہاں کے مدارس میں دہلی اور آگرہ کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے لیکن مرحوم مانڈو کا کوئی نام ہی نہیں لیتا۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت دلی کی بادشاہی کی مرادف تھی۔ "غزنی و غوری ہوئے بعدہٗ آئے غلام خلجی و تغلق سادات و لودی مغل پر اختتام"۔ اور یہہ واقعہ قریب قریب فراموش ہوگیا ہے کہ خاندان تغلق کے آخری زمانہ سے ہمایوں اور اکبر کے عہد تک جو طویل مدت گذاری ہے اس میں دہلی کی حکومت صرف موجودہ ممالک متحدہ اور پنجاب کے ایک حصہ تک محدود تھی۔ بنگال۔ بہار۔ مالوہ۔ گجرات اور دکن میں جداگانہ سلطنتیں قائم تھیں جو اس وقت کی سلطنت دہلی سے زیادہ شان و شوکت رکھتی تہیں اور اُس سے بہت زیادہ قومی خدمات کا فرض ادا کرتی تہیں۔ بلکہ کچھ عرصہ کے لئے جونپور اور ملتان نے بھی دہلی کی حکومت سے آزاد ہوکر کوس لمن الملکی بجایا تھا اور سادات کے عہد دولت میں دلی کی شاہنشاہی صرف نواح دہلی اور شہر بدایوں تک محدود تھی!!

بنگالہ کی "پوربیہ" سلطنت جو ایک فوجی سردار فخرالدین نے محمد تغلق سے باغی ہوکر ۱۳۳۸ء میں قائم کی اور ۱۵۷۳ء تک اس کا وجود رہا اُس وقت کی سلطنت دہلی سے بہت زیادہ

وسیع اور دولت مند تھی ریس کے ایک بادشاہ کے پاس خواجہ حافظ شیرازی نے اپنی وہ مشہور غزل بھیجی تھی جس کا شعر ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

مقطع نے سلطان کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رکھا۔

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث[1] دین ہو

غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود ہو

دکن میں سلطنت "بہمنی" جو علاء الدین حسن نے ۱۳۴۷ء میں قائم کی اور جس کا سلسلہ اورنگ زیب کے عہد تک بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کی صورت میں باقی تھا دولت حشمت۔ فوجی طاقت۔ بحری قوت اور مذہبی خدمات میں دہلی سے بدرجہا فائق تھی۔

جونپور کی "شرقی" حکومت جو خواجہ جہاں نے ۱۳۹۴ء میں قائم کی سکندر سوری کے عہد تک شہنشاہ دہلی کو شرمندہ کرتی تھی۔ گجرات کی سلطنت جس کو مظفر خان نے ۱۳۹۶ء میں قائم کیا اکبر کے عہد تک دہلی کی حریف مقابل تھی۔

مالوہ نے ان سب کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اس کا رقبہ بھی زیادہ وسیع نہ تھا جنوب میں سلطنت بہمنی کا سکہ رائج تھا اور اُس طرف آنکھ اُٹھانے کی مجال نہ تھی۔ مغرب میں گجرات کی شاندار ریاست تھی جس سے جنگ وجدال کا سلسلہ آخری سانس تک

---

[1] سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر بنگال کا پانچواں بادشاہ تھا۔ ۱۳۶۷ء سے ۱۳۷۳ء تک مسند نشین رہا۔ ۱۲

جاری۔ ہاں مگر قدم بڑھانے کی کوشش کامیاب نہ ہوئی شمال میں بادشاہان جونپور اور دہلی کے علاقے تھے جن کی ہوس کرنا خودکشی کی تمنا تھی۔ مشرق میں گونڈواڑہ یا بندیلکھنڈ اور شمال مغرب میں چتور گڈھ ہندو راجوں کی ملکیت تھی جن سے جہاد کا ارمان اور مال غنیمت کی آرزو پوری ہو سکتی تھی لیکن مستقل فتح صرف خواب کی تعبیر تھی !! غرض ہر طرف یہ صوبہ زبردست دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ بے فکری اور فارغ البالی کبھی میسر نہیں ہوئی۔ آزادی کی کل مدت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو برس تھی۔

جفاکش سلاطین تقریباً ہر سال جنگ میں سرگرم رہتے تھے لیکن باوجود افکار اور پریشانیوں کے ہجوم کی ترقی علوم و فنون میں کوشاں تھے اور وہ عالیشان عمارتیں بنواتے تھے جن کے کھنڈر آج تک دنیا کے سیاحوں سے خراج تحسین و آفرین وصول کرتے ہیں

بوئے الفت تمام پھیلی ہے

باقی اب قیس ہے نہ لیلےٰ ہے

مالوہ کی بادشاہی اور اس زمانہ کی دوسری اسلامی ریاستیں مرکزی حکومت کے ضعف سے عالم وجود میں آئیں لیکن اس میں شک نہیں کہ انہیں کے دم سے ہندوستان میں مسلمانوں کا نشاں باقی رہا ورنہ بابر اور ہمایون کابل اور بدخشاں میں تو شاید سلطنت کرتے مگر ہندوستاں کی ہوا بھی اُن کو نصیب نہ ہوتی اور یہاں کے راجپوت اپنا کھویا ہوا ملک واپس لیکر اس قدر طاقتور ہو جاتے کہ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی دوبارہ ضرورت پیش آتی ۱۱۹۳ء میں رائے پتھورا کو شکست دیکر سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستاں میں اسلامی پتھر گاڑا۔ اس کی وفات سے پہلے ہی قطب الدین ایبک نے تمام شمالی ہند اٹک سے بنگالہ تک فتح کر لیا۔ سندھ پر مسلمان پہلے ہی سے قابض تھے

مانڈو اور اجین کو فتح کرکے شمس الدین التمش نے مالوہ بھی ممالک محروسہ میں شامل کیا اور سنہ ۱۲۲۶ اور سنہ ۱۲۳۲ کے درمیان رتھنبور اور دو چار مقاموں کے سوا تمام شمالی ہندوستان شہنشاہ دہلی کا تابع فرماں ہوگیا۔ لیکن یہہ فتح ناکمل تھی مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیاں بیشک جگہہ جگہہ قائم ہوگئی تھیں۔ رعایا مرعوب تھی مگر مغلوب نہ تھی۔ مقامی راجا اپنے علاقوں میں قریب قریب خود مختار تھے اور جب موقع پاتے تھے علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔

ہندوستان کا عظیم الشان ملک آرام طلب شہنشاہوں کے بس کا نہ تھا۔ یہاں تو صرف التمش۔ بلبن اور علاءالدین خلجی کے سے جفاکش بادشاہ امن قائم رکھہ سکتے تھے۔ ہندو باشندے اپنے فاتحوں کے مذہب اور حکومت دونوں سے ناخوش تھے اور جب مرکزی حکومت میں کمزوری دیکھتے آزادی کی کوشش شروع کر دیتے تھے دلی کے بادشاہ رعایا کی دلجوئی کے زیادہ کوشاں نہ تھے اور رعیت اُن سے دل تنگ تھی ہمایوں نے ایک میدان میں شکست پائی تو سارے ملک میں کوئی جگہہ امن و عافیت کی نہ مل سکی۔ صوبہ دار دور دراز ممالک میں فوج اور خزانہ دونوں کے افسر اعلی ہوتے تھے۔ اگر عامل کمزور ہوتے تو مقامی باشندے بغاوت کرتے اور اگر وہ زبردست ہوتے تو شہنشاہ کو انپر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اس وقت نہ تو ریل گاڑی تھی نہ تار برقی جو مقامی حکومتوں کی مناسب نگرانی ہو سکتی۔ بعض صوبوں کی سڑکین بھی صاف و ہموار نہ تھیں رعایا سے مدد کی توقع نہ تھی۔ کوئی قانون اسلحہ جاری نہ تھا۔ بغاوتوں کو جلد فرو نہ کر سکتی تھی صوبہ دار کل لوازمات شاہی برتتے تھے اور فطرتاً خود مختاری کے آرزومند رہتے تھے۔

سلطان محمد تغلق کے آغاز سلطنت میں اسلامی حکومت۔ ہندوستان میں ایسی وسیع تھی کہ اُس سے پہلے یہہ دن دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا تھا لیکن اس کے بعد جو مختلف حصوں میں جلد اگانہ

سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں وہ اکبر اور اورنگ زیب کے عہد تک دہلی کا جزو نہ بنائی جاسکیں ہمایوں اور اکبر نے ان ریاستوں کو مٹانا شروع کیا اور عالمگیر نے خاتمہ کر دیا مگر کیا انجام ہوا جب یہ حکومتیں نہ رہیں تو دلی کی شہنشاہی بھی رخصت ہوگئی۔ راجے خود مختار ہوئے اور مرہٹوں کی سلطنت قائم ہوگئی۔

آج کل اورنگ زیب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو تباہ کرکے مرہٹوں کو قدم جمانے کا موقع دیا۔ لیکن درصل یہ غلطی ہمایوں اور اکبر نے شروع کی تھی جس کو شاہجہاں نے ترقی دی اور اُس کے فرزند نے معراج کمال کو پہونچایا۔ اگر مالوہ اور گجرات کی بادشاہیاں باقی ہوتیں تو عالمگیر دکن تک نہ پہونچ پاتا اور مرہٹوں کی طاقت نہ بڑھتی۔

جب رعایا سلطنت دہلی کی ہوا خواہ نہ تھی تو صوبوں میں خود مختار حکومتیں ہی مناسب تھیں۔ وہ درشتی اور نرمی کو سمو کر کبھی فصد لگاتی تھیں اور کبھی مرہم رکھتی تھیں اور انہوں نے دو سو برس تک اس وسیع ملک میں اسلام کا چراغ روشن رکھا۔ ان ریاستوں نے اکبر کی طرح رعایا کو انتظام مملکت میں شریک کیا اور عالمگیر کی طرح مذہب کے دبدبہ کو برقرار رکھا۔ یہاں نہ تو جہانگیر کا سا ہندوانہ راج تھا اور نہ اورنگ زیب کا سا مولویانہ تقشف۔ برہمن راجپوت اور کھتری حکومت کے ملازم تھے۔ لیکن امور مملکت میں مشیر نہ تھے ٹھاکروں کے بہادر فرزند فوج کے سپاہی تھے لیکن اُن کے افسر ہمیشہ مسلماں ہوتے تھے رعایا کے مذہبی عقاید کی عزت کیجاتی تھی اور ان کے رسوم و فرائض میں کوئی دخل نہیں دیا جاتا تھا لیکن مذہب سلطانی کا احترام ہر ایک باشندہ پر واجب تھا۔

ان سلطنتوں کی تاریخ بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے اور سلاطین دکن۔ گجرات

و بنگالہ کے کارنامے ایسے بیش بہا ہیں کہ اُن کو ہرگز فراموش کرنا نہیں چاہیے

ہم اس وقت بادشاہان مالوہ کی سرگذشت اپنے ہموطنوں کو سُنانا چاہتے ہیں اور اسی کے ضمن میں ریاست گجرات کا بھی تذکرہ کریں گے کیونکہ ان دونوں ہمسایہ حکومتوں کی رُوداد اس قدر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے کہ اُن کو جدا کرنا ناخن کا گوشت سے الگ کرنا ہے۔ بنگال اور دکن کی کہانی اگر زندگی ہے تو فردائی شب را !!!

پہلا باب

خود مختاری کا آغاز

مالوہ کی شمالی سرحد دریائے چمبل اور جنوبی حد نربدا ہے۔ مغرب میں گجرات و راجپوتانہ اور مشرق میں گونڈوارہ اور بندھیلکھنڈ اس صوبہ کے انتہائی کناروں پر واقع ہیں۔ یہاں کی قدیمی تاریخ تاریکی میں ہے لیکن راجہ بکرماجیت کا نام نیک اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمکتا ہے۔ اس کا سمبت جو ۵۷ء قبل مسیح سے شروع ہوا آج تک ہندوستان میں رائج ہے۔ اور اس کے جواہرات نورتن اُس وقت تک "اوجین" کا نام دنیا میں روشن کرتے ہیں۔ بکرماجیت کے بعد راجہ بھوج[1] نے اس دیس میں علم و فضل کی قندیل جلائی اور اُسکے

---

[1] مالوہ میں کئی راجہ اس نام کے گزرے ہیں مگر وہ راجہ بھوج جسکے مدرسہ کے کھنڈر اس وقت تک دھار میں پائے جاتے ہیں کرنل ٹاڈ مولف راجستان کی تحقیق کے مطابق ۵۶۷ء میں تھا۔ اسی زمانہ کے قریب حضرت رسول عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی تھی۔ مشہور ہے کہ راجہ بھوج اپنے محل کی چھت پر بیٹھا تھا یکبارگی اُس نے دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر مل گیا۔ اُس نے پنڈتوں سے اس راز کا انکشاف چاہا تو انہوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک اوتار عرب میں جنم لیگا اور وہ چاند کے ٹکڑے کریگا۔ راجہ نے ایک ایلچی عرب بھیجا اور بعد دریافت (بقیہ صفحہ گیارہ)

عالیشان مدرسہ کے کھنڈر آج بھی دہار میں پائے جاتے ہیں بڑے بڑے جاہ وحشمت کے راجہ اس خطہ پر حکومت کر گئے جن میں سے بعض کے نام سنسکرت کی قدیم کتابوں سے زمانہ حال میں دریافت کئے گئے ہیں لیکن بکرماجیت اور راجہ بھوج کے سوا کسی کا مفصل احوال معلوم نہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں ٭
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں ٭

اس صوبہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ۱۲۲۶ء و ۱۲۳۲ء کے درمیان ہوا اور سلطان غیاث الدین بلبن نے ۱۲۴۷ء یا ۱۲۵۰ء میں اس زرخیز علاقہ کو سلطنت دہلی کا باجگزار بنایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک شہنشاہان دہلی کے عمال اس ملک پر حکومت کرتے رہے اور اس طویل مدت میں مالوہ کی تاریخ دہلی کی داستان فتوحات کا ایک جزو تھی ۱۳۹۴ء میں بدقسمت محمود تغلق تخت دہلی پر متمکن ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مغربی کوہستان سے ایک زور شور کی آندھی آئی۔ جس نے دہلی کا چراغ جو بادشاہ فیروز تغلق کے عہد سے ٹمٹما رہا تھا خاموش کر دیا یعنی اقبالمند تیمور کے سیلاب ظفر نے بدنصیب محمود کو اپنا دارالسلطنت چھوڑنے اور گجرات میں پناہ لینے پر مجبور کیا اس وقت مالوہ کے صوبہ دار دلاور خان کو بھی غاشیۂ اطاعت اتارنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور وہ موقع پاکر راجہ بھوج کے دارالحکومت پر اپنا سکہ چلانے لگا۔

ایمان بھی اسی پر اسیاں لایا۔ سوانح الحرمین میں یہ قصہ لکھا ہے اور مولانا رفیع الدین نے بھی رسالہ شق القمر میں یہ قصہ نقل کیا ہے مگر ہنود اس افسانہ کو بے بنیاد بتاتے ہیں۔ دہار کے قریب ایک مزار عبداللہ شاہ کا ہے اور گمان کیا جاتا ہے کہ اس جگہ یا تو کسی صحابی کی قبر ہے خود راجہ بھوج کا مدفن ہے۔ واللہ اعلم۔ ۱۲

دلاور خاں کا نام "حسن" اور اس کا سلسلۂ نسب شہاب الدین غوری تک چند واسطوں سے پہونچا تھا۔ حسن کا باپ صاحب جاہ و منصب تھا اور امرار دہلی میں شمار کیا جاتا تھا۔ سلطان فیروز تغلق نے حسن کی پیشانی پر ستارۂ بلند کی روشنی دیکھ کر اس نوجوان کو خطاب و منصب سے سرفراز کیا اور بادشاہ محمدؐ تغلق نے اپنے عہد دولت میں اس بلند اقبال کو مالوہ کی صوبہ داری پر مامور فرمایا۔

اس زمانہ میں صوبہ داران مالوہ کا دار الحکومت "دہار" تھا۔ حسن نے بھی یہیں قیام اختیار کیا قرب و جوار کے ماتحت راجاؤں کو مغلوب کر کے اپنی ہمت و شجاعت کی دہاک بٹھادی۔ اور دہار کی قدیم جامع مسجد جو مرور زمانہ سے خراب ہو گئی تھی۔ از سر نو تعمیر[1] کی گجرات کا صوبہ دار مظفر خاں۔ جو دلاور خاں کا دوست تھا دہلی کی فوجی قوت کا اضمحلال دیکھکر ۷۹۹ھ (مطابق ۱۳۹۶ء) میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ شہنشاہ اپنے باغی عامل کی سرکوبی کے لئے شائد ہاتھ پانوں مارتا مگر امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور سلطان محمود تغلق دہلی سے فرار ہو کر گرتا پڑتا خود گجرات پہونچا۔ "مظفر شاہ" بادشاہ دہلی کا اپنے صوبہ میں پناہ گزین ہونا خطرناک سمجھا اور شہنشاہ کی خاطر مدارات کما حقہ نہ کی۔ بدقسمت بادشاہ متنفر ہو کر گجرات سے رخصت ہوا اور مالوہ آیا۔ دلاور خاں نے اپنے اعزا اور ارکان ریاست کو شہنشاہ کے استقبال کے لئے بھیجا اور جب شہر دہار صرف تین منزل رہگیا تو خود بھی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا

[1] زمانۂ حال میں ایک سنگین کتبہ مولانا کمال الدین کے مزار واقع دہار کے متصل دستیاب ہوا ہے جس پر تحریر ہے کہ ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۲ء میں دلاور خان صوبہ دار نے سلطان محمود شاہ تغلق کے عہد میں اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ۱۲

بڑی عزت و شوکت سے شہنشاہ کو دار الریاست میں لایا اور تمام نقد و جواہرات اُسکے حضور میں پیش کر کے عرض کی کہ وہ مع اپنے تمام خاندان کے شہنشاہ پر قرباں ہونیکو تیار ہے۔ محمود تغلق خوش ہوا اور اپنی برگشتگی طالع کا دور دہار میں گزارنے پر راضی ہوگیا۔

صوبہ دار مالوہ کا بلند حوصلہ لڑکا ''الف خاں'' باپ کی یہہ عاجزی اور فروتنی دیکھکر خفا ہوا اور دہار سے بھاگ کر ''مانڈو'' چلا گیا جو جنوب میں بند۔ ۵ بیس میل کے فاصلہ پر ایک کوہستانی قلعہ تھا۔ جب تک سلطان محمود دہار میں مہماں رہا یہہ رئیس زادہ مانڈو سے واپس نہ آیا۔ ۸۰۰ھ میں محمود تغلق عازم دہلی ہوا اور دلاور خان نے تمام ساز و ساماں شہنشاہی اپنے آقا و ولی نعمت کے لئے مہیا کر دیا جب بادشاہ دہار سے رخصت ہوگیا تو تقریباً تین برس کی غیر حاضری کے بعد الف خاں مانڈو سے آیا اور باپ سے اصرار کیا کہ وہ صوبہ داری کا ذلیل لقب چھوڑ کر خطاب شاہی قبول کرے۔

جس وقت سے کہ مظفر خان صوبہ دار گجرات نے خطاب شاہی اختیار کیا اور سلطنت دہلی اس کو کچھہ نقصان نہ پہونچا سکی دلاور خاں کی نیت بگڑی ہوئی تھی اب بیٹے کے اصرار کا بہانہ سمند ناز پہ تازیانہ ہوا۔ حسن نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ چتر سفید اور سراپردۂ سرخ جو بادشاہوں کے لئے مخصوص تھا استعمال کیا جدید سکہ تیار کرایا اور مساجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

کہتے ہیں کہ سلطان فیروز تغلق کا بیٹا محمد شاہ جب باپ سے خفا ہو کر دہلی سے فرار ہوا تو چار امیروں نے اُس کی رفاقت کی تھی وفا پرستی کی سختیاں جھیلی تھیں۔ محمد بادشاہ

ہوا تو اُس نے ان رفیقوں کو فراموش نہیں کیا۔ اول خواجہ سرور کو خواجہ جہاں خطاب دیکر وزیر سلطنت بنایا۔ دوسرے ظفر خاں بن وجیہہ الملک کو مظفر خاں خطاب دیکر گجرات کا صوبہ دار کیا۔ خضر خاں کو ملتان کی گورنری عطا کی اور دلاور خاں غوری کو مالوہ کی ریاست عنایت فرمائی۔

خدا کی شان ہے کہ اُن چاروں رفیقوں نے حق نعمت فراموش کر کے شہنشاہ سے بغاوت کی خواجہ جہاں نے جونپور پر قبضہ کیا اور حکومت شرقیہ کی بنیاد ڈالی۔ مظفر خان گجرات کا مظفر شاہ اول مشہور ہوا۔ خضر خان ملتان کا بادشاہ ہوا اور دلاور خاں نے مالوہ کی خود مختار اسلامی حکومت کا آغاز کیا دلاور بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنے افسران فوج اور اراکین دربار کو خطابات اور مناصب سے سرفراز کیا۔ ریاست کے انتظامات درست کئے لیکن کوئی نمایاں ملکی خدمت[له] ظہور میں نہ آئی تھی کہ چار سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۰۸ھ (مطابق ۱۴۰۵ء) میں دفعتاً مرگیا۔ مولانا کمال الدین کی درگاہ کے متصل ایک قبر محمود خلجی بادشاہ مالوہ کی بتائی جاتی ہے لیکن وہ تربت غالباً دلاور خان کی ہے کیونکہ محمود خلجی اول کی قبر مانڈو میں ہے اور اس کے متعلق ایک حکایت بھی ہے جو مناسب موقع پر درج کیجائیگی محمود ثانی بن ناصر الدین خلجی حوض دوہد کے قریب مالوہ کی سرحد پہ مدفون ہوا تھا اور یہ تربت اُس کی بھی نہیں ہوسکتی۔ سلاطین مالوہ میں سے صرف دلاور ہی ایک بادشاہ تھا جس نے دھار میں اپنا مستقر رکھا اور نہ اس کے عہد کے بعد دار الحکومت مانڈو ہوگیا تھا اور کسی دوسرے سلطان کا دھار میں دفن ہونا پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچا۔ والغیب عند اللہ۔

[له] دھار کی مشہور لاٹ مسجد اسی کی تعمیر کرائی ہے۔ شمالی دروازہ جینی وضع کا ہے۔ مشرقی پھاٹک پر ایک نظم کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلاور غوری نے جو مولانا نذیر الدین کا مرید تھا یہ مسجد بنوائی اور ۸۰۷ھ میں مکمل ہوئی اس مسجد سے (بقیہ صفحہ آیندہ)

شبہ کیا جاتا ہے کہ دلاور خاں کو اس کے بیٹے نے زہر دیا اور مالوہ کے بعض افسران فوج بھی الف خاں کو اس گناہ سے متہم کرتے تھے لیکن جب کوئی مرگ مفاجات واقع ہوتی ہے تو اس قسم کے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں کوئی دلیل اس بے بنیاد شک کی نہیں ہے۔

مظفر شاہ گجراتی جو کسی وقت میں دلاور خاں کا خواجہ تاش تھا اسی شبہ میں گرفتار رہا اُس نے الف خاں کے حقوق ریاست سے انکار کیا اور مالوہ پر فوجکشی کردی۔ معلوم نہیں کہ وہ کونسی منحوس ساعت تھی جس میں اپنے دوست کے خون کا عیوض لینے کو مظفر نے دھار پر پہلا حملہ کیا۔ کیونکہ اُس نامسعود گھڑی سے جو لڑائی کا سلسلہ ان دونوں ہمسایہ ریاستوں میں شروع ہوا وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ۱۲۶ برس تک قائم رہا یہانتک کہ مالوہ کی خود مختاری ختم ہوگئی اور چندہی سال کے بعد مالوہ کے مٹانے والے بھی مٹ گئے

..ہ فٹ کے فاصلہ پر ایک آہنی میل ہے جس کی بابت آئندہ اوراق میں لکھا جائے گا۔

سلہ مظفر شاہ ایک نومسلم خاندان کا رکن تھا۔ اور مرات اسکندری کی روایت کے مطابق سلطان فیروز تغلق کی سرکار میں شراب کھینچنے کی خدمت پر متعین تھا۔ اس کی تمیز اور سلیقہ کو دیکھکر بادشاہ نے جاہ و منصب سے سرفراز کیا۔ وہ ایام مصیبت میں محمد بن فیروز تغلق کا رفیق دشت نوردی رہا اور جب محمدؐ تخت نشین ہوا تو صوبہ داری گجرات کے معزز عہدہ سے سربلند کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ فرحت الملک سابق صوبہ دار گجرات نے ہندوؤں کو امور سلطنت میں بہت دخیل کر لیا تھا اور علماء اسلام نے ناراض ہوکر ایک عرضداشت اُس کے خلاف دہلی روانہ کی تھی۔ سلطان محمدؐ تغلق اپنے رفیق مصیبت کو عروج دینے کے لئے بہانہ کا منتظر تھا اُس نے مظفر خاں کو گجرات کا صوبہ عنایت فرمایا۔

مظفر نے گجرات پہونچکر فرحت الملک کو شکست دی۔ ایدر کے راجہ کو مغلوب کیا۔ سومناتھ پر جس کا نام سلطان محمود غزنوی کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیگا دوبارہ اسلامی پھریرا اڑادیا۔ ڈیو کا جزیرہ جو آج پورتگیز کے قبضہ میں ہے پہلی بار دارالاسلام بنایا اور صوبہ گجرات کے قریب قریب ہر ایک گوشہ پر متصرف ہوگیا۔

قطعات تاریخ

درتہنیت حصول خطاب "مہاراجہ" بحضور عالیجناب مہاراجہ سر محمدؒ علی محمد خان بہادر کے.سی.ایس.آئی. - والی ریاست عالیہ محمود آباد دام اقبالہٗ

گلبانگ طرب

سریرآرائی دولت را باقبال ۔۔۔ فروغ بزم شاہانہ مبارک
بزیر بینہ گلبانگ تاریخ ۔۔۔ زخدام وفاپیشہ مبارک

سربدیں قلم کردیم و گفتیم
خطاب نو مہاراجہ مبارک

۱۹۲۵ء

گل سرسید

ہوش اک گم گشتہ یوسف تھا سفر میں ناگہاں
خضر بن کر اک نوید تازہ آئی راہ میں

جس نے طالع کو جگہہ دی طارم اُمید پر
گرچہ وہ یوسف کی صورت گر چکا تھا چاہ میں

یعنی اک زینہ عروجِ بام عزّت بڑھ گیا
میرے شاہِ وقت کا دربار شاہنشاہ میں

پہلے راجہ تھے مگر اَب وہ مہاراجہ ہوئے
سچ ہے ثاقب کیا کمی اللہ کی درگاہ میں

ہو رہے ہیں پھول چہرے دوستوں کے کیوں نہوں
ایک کانٹا اور ڈوبا سینۂ بدخواہ میں

یہہ خطاب اچھا ہے لیکن اوجِ عزت دیکھ کر
کم نظر آتا ہے ہر اک چشمِ حق آگاہ میں

ماہ، بن جاتا ہے اک ادنیٰ تصرف سے مہاؔ
اَب بھی کیا ٹھوکر لگے گی حاسدوں کو راہ میں

میں مُہا سے ماہ کو اچھا سمجھتا لاکلام
ہاں مگر اُس وقت جب دھبا نہ ہوتا ماہ میں

قلب کہتا ہے کہ تم سمجھو مہا کو بھی ہُما
تاج بخشی کیا نہیں ہے قدرت اللہ میں

لاکھ اُمیدوں کو لیکر آ رہا ہوں اپنے ساتھ
وسعتیں پیدا ہوئی ہیں دامنِ کوتاہ میں

نیّرِ نیکوے اقبال اور بالا تر ہوا
شاہدِ رعنا ہے یہہ تاریخ بزمِ شاہ میں

توڑ کر ثاقب سرِ دشمن لکھو پھر بہرِ سال
ایک کوپل اور پھوٹی بوستانِ جاہ میں

سنہ ۱۳۴۳ھ

گل نوبہار

خطاب تازہ پیش ہوم ممبر ہُما بن کر بصد اقبال آیا
خدا رکھے مرادوں کے چمن میں کھلا جو پھول وہ اعلیٰ سے اعلیٰ
بہت شایانِ عز و مرتبت ہے یہ تشریف مبارک فال و زیبا
لکھوں تاریخ زیر و بینہ میں طبیعت کا ہی ثاقب یہ تقاضا
طرب افزائے جان ہی نغمۂ دل کہ راجہ ہے مہاراجہ اودہ کا

۱۳۴۳ھ

گل نشاط

جناب ہوم ممبر کو خطاب کے سی ایس آئی
حکومت سے ملا تھا جو باندازِ ملوکانہ
وہ اک تمہید تھی اس میمنت آثار مقصد کی
کہ ہے ممدوح پر تھی راج وکیخسرو کا ہم پایہ
مہاراجہ ہو یا خاقان معناً ایک ہیں دونوں
نہ وہ اس سے گران پایہ نہ یہ اس سے تنک مایہ
یہ دونوں لفظ ہم معنی تھے پھر ترجیح کیا معنیٰ
ہوا کیوں یہ لقب اک فرد اسلامی سے وابستہ
یہ ہے اک مسئلہ مبنی ہے جو ملکی مصالح پر
نظر آتی ہے وجہ تسمیہ معقول و سنجیدہ

کہ ملکی خدمتوں پر غور فرما کر حکومت نے

زبانِ ہند کو ملحوظ رکھا ہے ہر آئینہ

علو و مرتبت میں کس کو ہے انکار کی جرأت

کمالِ منزلت پر کب نہ تھا اقبال فرخندہ

وہی فرمانروا راجہ امیر الدولہ کا بیٹا

وہی ہے آسمان فضل پر خورشید کا جلوہ

وہی ہے شانِ خود داری وہی ہے حسن رعنائی

وہی ہیں شاہد تمکین کی زلفین اور وہی شانہ

اودھ کی سرزمیں کے جملہ سرداران ذی عزت

ہمیشہ سے اسی ڈیوڑھی پہ کرتے آئے ہیں سجدہ

مگر با این ہمہ پھر وجہ نازش ہے کہ یہ خلعت

حضور قیصر ہندوستان کا ہے پسندیدہ

وہ نجم باسعادت کیون نہ چمکے اوج گردون پر

بہم پر تونگن ہون جس پہ انوار خدا بارہ ۱۳۴۳ھ

مری جانب بھی اے ابر کرم رحمت کا ایک چھینٹا

کہ میرا گلشن ہستی ہے مدت سے خزاندیدہ

گلون میں رہ کے گلشن کی ہوا کھایا تو کرتا ہوں

مگر پامال آفت بھی ہوں جیسے باغ میں سبزہ

بنا کر محرم اسرار عالم مجھ کو قدرت نے

کچھ ایسے حال میں رکھا کہ سمجھا جاؤں دیوانہ
ملی اس شرط پر یہ جانشینی میر و غالب کی
کہ رکھا جائے میرے بھی مقدر کا ورق سادہ
مری رنگین نوائی کو ملی تشریف ناکامی
کہ دکھلائے بہار سعی لاحاصل مرا شہرہ
زمانہ قدر دانِ فن نہیں کیا خاک سمجھے گا
گزرتا ہے دمِ فکر سخن جو ر وح پر صدمہ
دلِ بلبل سے پوچھے کوئی فطری زمزمے میری
سرود چنگ کیا ہے اور کیا مطرب کا مرغولہ
ہنر کے قدر داں ہوں یا نہوں پروا نہیں مجھ کو
کہ استغنائے خاطر ہے بجائے خویش گنجینہ
مذاق بدمذاقی دیکھ کر اس دور گردوں میں
مجھے شعر و سخن سے واقعاً کرنا پڑی توبہ
ہزاروں رنگ کے نغمے بھرے ہیں قلب محزوں میں
مگر قید قفس میں ہوں مثال مرغ پر بستہ
قدح کش ہوں مگر اکثر گزر جاتی ہے فاقہ سے
وہ عالم دید کے قابل ہے جب ملتا نہیں بادہ
خمارِ نشۂ مے توڑے دیتا ہے رگین دل کی
جماہی پر جماہی ہے تو خمیازہ پر خمیازہ

ملیں تو میں چڑھا جاؤں کئی خم مجھ کو ڈر کس کا
بلا سے محتسب دیکھا کرے، بیٹھا رہے شحنہ

چلے آتے ہیں مستانہ ہوا میں جھومتے بادل
بھری برسات اور ترسا ہوا یہ رندبے مایہ

نہ اترے جس کا نشہ عمر بھر وہ مے پلا مجھ کو
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ

نہ تھا کچھ دامن امکان میں نذر شاہ کے قابل
مگر یہ ایک گلہائے وفا خوشبو کا گلدستہ

لکھوں تاریخ ثاقب ہمزباں سلطنت ہو کر
کہ ہے اس ہند کا وہ حکمراں تارا مہاراجہ

ثاقب این لآلی ثمین دعاگوے دولت و اقبال ۱۳۴۳ھ خاکسار میرزا ثاقب لکھنوی
بست و یکم ماہ جون سنہ ۱۹۲۵ء

بحر المحبّت شیخ غلام ہمدانی مصحفی

جناب مولوی سید محمد احمد صاحب وفا بی اے ڈپٹی کلکٹر

ادبی دنیا کو مولوی عبدالماجد صاحب کا نہایت مشکور ہونا چاہئے کہ اُن کی علم دوستی اور کوشش جمیلہ سے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی مثنوی بحر المحبت شائع ہوئی جس سے علم ادب کے ذخیرہ میں ایک اور نادر الوجود کتاب کا اضافہ ہوا۔

مصحفی مغفور کچھ ایسے بدنصیب واقع ہوے تھے کہ بچپن ہی میں دولتمند باپ کی امارت کو تباہ ہوتے ہوے دیکھا۔ اکتساب علم افلاس کی حالت میں کیا۔ علم و فضل حاصل کرنے پر یہ اُمید ہوتی تھی کہ نکبت و ادبار کی گھنگھور گھٹا ہٹ جائے گی اور آفتاب علم کی شعاعیں اُن کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو منور کر دیں گی۔ مگر بداقبالی ساتھ لیکر پیدا ہوی تھے وہ سایہ کی طرح ہمیشہ ساتھ رہی۔ اسی نے تکمیل علم کے بعد اُن کو شاعری کی طرف متوجہ کیا شاعر کے واسطے افلاس اور پریشانی ہمیشہ اُس کے کمال کے جوہر سمجھے گئے ہیں۔ شاعری نے مصحفی کو ادبار سے نکلنے نہ دیا یہ اُن کے لئے سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ مدت العمر شاعری کی مگر پیٹ کبھی نہ بھرا۔ زندگی ہی میں اپنی اولاد معنوی کو شکم پروری کے لئے بیچنا پڑا۔ پھر بھی ایک معتد بہ ذخیرہ مصحفی نے چھوڑا مگر زمانہ نے اس پر بھی گمنامی کی چادر ڈال دی جس شخص نے آٹھ دیوان چھوڑے ہوں تعجب ہے کہ اس وقت اس کا ایک دیوان بھی بازار میں دستیاب نہیں۔ اس زمانہ میں کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو مصحفی کے قلمی دوادین کے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں مصحفی کے قلمی

دواوین . . . .

کی زیارت سے مشرف ہوا اور اُن سے فیض حاصل کیا اس زمانہ میں جب کہ ہزار دس سال کے پُرانے شہروں اور قبروں کو کھود کر پرانی تہذیب کا پتہ لگایا جا رہا ہے ممکن ہے کہ علمی دنیا میں زندگی بسر کرنے والوں کو بھی اس سے ایک سبق ملے اور اپنے شعبہ کے مدفون ذخیروں کو گمنامی کی قبر سے کھود کر نکالیں اور ان جواہر ریزوں کو جو اِن میں بھرے پڑے ہیں علمی دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ انجمن ترقی اُردو نے چند پورانی کتابیں شائع کی ہیں مگر اُن کی کوشش نہایت سست رفتار رہی ہے[له]۔ افسوس ہے کہ باوجود مواقع اور ذرایع کے جو اس انجمن کو حاصل ہیں آج تک ایک دیوان بھی کسی پرانے شاعر کا شائع نہ ہو سکا۔

آج ستائیس اٹھائیس سال ہوے میں نے حالیؔ مرحوم کو دیوان غالبؔ کی تصحیح کے بارے میں لکھا تھا اور اُن کو حق شاگردی کا واسطہ دیا تھا مگر نتیجہ کچھ نہ ہوا ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر اس کا سہرا ایک نئے تعلیم یافتہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن مرحوم کے سر رہا۔ خدا مرحوم کو مدارج عالیہ عطا کرے جس کی کوشش سے نیم مردہ غالبؔ زندوں میں داخل ہو گیا۔ مسخ شدہ دیوان کی تصحیح کے علاوہ متروک اشعار کے اضافہ نے علمی دنیا پر ایک بڑا احسان کیا۔ نظم کے سلسلہ میں غالب کے بعد مثنوی بحر المحبت دوسری کتاب ہے جو سوا سو برس کی گمنامی کے بعد مولوی عبد الماجد صاحب کی کوششوں سے از سر نو زندہ ہوئی۔ بدقسمتی سے اول نسخہ نہایت کرم خوردہ اور غلط دستیاب ہوا۔ اس تین سو اٹھاون اشعار کی مثنوی کی

[له] یہ بھی قوم کی بدمذاقی کا مرثیہ ہے۔ انجمن کا اگر اس کی پہلی حالت سے مقابلہ کیا جائے تو ماننا پڑیگا کہ مولوی عبدالحق صاحب قبلہ بی اے نے اُس کو زندہ کر دیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ مولوی صاحب کئی دواوین شائع کرنا چاہتے ہیں مگر انجمن کی وہی حالت ہے کہ۔ بے زری کرد بہ من آنچہ بہ قاروں زر کرد۔ جعفری

صحت میں اُن کو نہایت زحمت اٹھانی پڑی - اسی پر انھوں نے اکتفا نہیں کی بلکہ دوسرا نسخہ ڈھونڈھ نکالا - اول نسخہ سے جو الفاظ مختلف پائے گئے اُن کی فہرست چھاپ کر علم ادب پر ایک مزید احسان کیا - جس قدر ایک علم دوست مولّف کی ایمانداری ہو سکتی ہے اُس کو کماحقہ پورا پورا برتا - بد نصیبی سے جیسا کہ تمام اردو فارسی تصانیف کی قسمت میں لکھا ہے یہ کتاب بھی بے ڈھنگے پن سے نہ بچ سکی جس سے اہل مطبع کی بد سلیقگی اور لاپرواہی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے -

اس سے آج تک کسی کو انکار نہیں کہ مصحفی کی شاعری "وہبی" نہیں تھی "اکتسابی" تھی انھوں نے اکتساب علم کے بعد فن شاعری کو بحیثیت علم پورے طور پر حاصل کیا - شعرا نے جو قواعد معایب و محاسن کے جانچ کے مرتب کئے تھے اُن سے پورے طور پر واقف تھے - تناسب الفاظ و ضلع جگت اور نادر ترکیبیں جو اُس زمانہ میں عام طور پر پسند کی جاتی تھیں اُن کو برتنے میں مشاق تھے - چونکہ فارسی کو اچھی طرح حاصل کیا تھا - جا بجا فارسی کے غیر مانوس الفاظ و محاورات اور انوکھی ترکیبیں اردو میں ٹھونستے تھے - نئی نئی سنگلاخ زمینوں کے ذریعہ سے اپنی شاعری کو آسمان پر چڑھانا چاہتے تھے - اس زمانہ کے مذاق کے مطابق اُن کے کلام کو جیسا بھی سراہا گیا ہو مگر در اصل اُن کا کمال یہی کوہ کندن و کاہ بر آوردن تھا - انوکھی ترکیبیں اور خاص طرز ادا جو مصحفی کے ساتھ مخصوص تھی سامعین سے خراج تحسین حاصل کر لیتی تھی مگر اثر کو جو دیکھیے تو کچھ بھی نہیں - شاعر کا کام مثل ایک فلسفی کے اصلیت کا انکشاف کرنا ہے نہ کہ اصلیت کو معمہ و چیستاں بنا دینا - اصلیت کا جوہر مصحفی کے یہاں مفقود تھا - دقت پسندی اور تکلف نے درد کو جو شاعری کی جان ہے اُن کے کلام میں نام کو بھی نہیں آنے دیا تھا - اس میں کلام نہیں کہ وہ ایک معمولی سی بات کو طرح طرح سے ادا کر سکتے تھے اور ایک بے جان مجسمہ کو انواع و اقسام کے رنگین لباسوں سے آراستہ کر سکتے تھے - مگر اگر کپڑوں کو

اتار کر دیکھئے تو سوائے ایک بے جان چیز کے اس کے اندر کچھ نظر نہ آئے گا۔ اصل شاعر وہی ہے جس میں قوت تخیل بدرجہ اتم پائی جائے۔ شاعری مصوری سے زیادہ مشکل کام ہے جس طرح مصور کے واسطے ضروری ہے کہ وہ نسخۂ کائنات کو بغور ملاحظہ کرے اور اُس کے ہر جزو کل کے جزئیات اور باہمی تعلقات سے واقفیت حاصل کرے اور بروقت ضرورت اُن کو مناسب موقع سے استعمال کرسکے اسی طرح شاعر بھی اپنے مشاہدات اور معلومات کے ذخیرہ کو کام میں لانے پر مجبور ہے۔ شاعری کی دشواریاں مصور سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اُس کو برخلاف مصور کے لفظوں سے رنگ کا کام لینا پڑتا ہے۔ لفظوں سے ایسا رنگ بھرنا جو مصور کے جھلکتے ہوئے رنگوں کو پھیکا کردے آسان کام نہیں اُس کے واسطے خون جگر کے صرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصور کا صرف عالم خارجی سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر شاعر اشیائے خارجی سے گزر کر جذبات اور خیالات سے ہی بحث کرتا ہے۔ جن کی صحیح تصویر کھینچنے کے لئے ہر قسم کی نہایت وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ شاعر کا دماغ اس موقع پر فلسفی سے جا لڑتا ہے ذہنی محسوسات اور اثرات کا جس قدر علم ایک ماہر علم الطبیعیات کو ہوتا ہے اُس سے زیادہ شاعر کو ہونا چاہئے فلسفی تو کیفیات مختلفہ کی نوعیت اور ان کے اثرات کی تشریح کرتا ہے مگر شاعر اپنی لفظوں کی ترتیب سے ان کیفیات اور اثرات کو دوسروں میں پیدا کر دیتا ہے۔ اُن خارجی اور باطنی محسوسات کی مصوری محض الفاظ سے کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ شاعر کو مصور و فلسفی کے درجہ سے بڑھ کر ماہر علم زبان ہونے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ چونکہ اُس کو تصویر لفظوں سے کھینچنی پڑتی ہے اس لئے ایسے الفاظ کا جو اس خیال کو دماغ میں پیدا کرسکیں استعمال کرنا لازمی ہوتا ہے۔ زبان پر کامل قدرت اور الفاظ کا صحیح مذاق استعمال شاعری کی جان ہے۔ ہزار وہ فلسفیانہ دماغ رکھتا ہو اور لاکھ قوت مشاہدہ مصور سے بڑھی چڑھی ہو مگر اگر صحیح

الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کرسکتا یا نامناسب موقع الفاظ ادا کرجاتا ہے تو اس کو صیحح معنوں میں شاعر نہیں کہہ سکتے اگر ایک عالم کی گفتگو کسی جاہل کی زبان سے ادا کیجائے یا عورت کے خیالات اور زبان کسی مرد کی زبان سے استعمال ہون تو شاعر کی بد مذاقی لطف شاعری کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ شاعر کے واسطے فلسفی کا دماغ مصور کی آنکھہ اور ادیب کی زبان درکار ہے۔ بقول ارسطو "شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے"۔ اس شاہد عالم فریب کی "فلسفہ یعنی اصلیت" اگر جان ہے تو مصوری اس کا جسم اور "موسیقیت" لباس

تعریف شعر بقول ملٹن شعر کی خوبی یہہ ہے کہ "سادہ ہو"[۱] "جوش سے بھرا ہو"[۲] اصلیت پر مبنی ہو[۳]

۱۔ سادگی۔ وہی کلام مقبول عام ہوسکتا ہے جو بلا کسی غور وخوص کے عوام کی سمجھہ میں فوراً آجائے اُس کے واسطے لفظون کی سادگی کے علاوہ خیالات کی صفائی۔ طرز ادا کی چستی اور زبان کی سلاست کی از حد ضرورت ہے۔ ایسے نازک و دقیق خیالات جن کا بار الفاظ نہ اٹھا سکین اور جو شاعر کی قوت اظہار کی ناقابلیت سے چیستان بنکر رہ جائیں اور عام طور پر فوراً سمجھہ میں نہ آسکین نظم کرنا شاعری کا خون کرنا ہے محسوسات کے شارع پر چلنا۔ بے تکلفی کے سیدھے رستہ سے ادہر اُدہر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے"۔ سادگی میں قیامت کی کشش وجذب ہے۔ مبالغہ اور تکلف میں صداقت مفقود ہوجاتی ہے۔ جہان سادگی رخصت ہوئی اثر بھی غائب اس لئے اصل شاعری کے واسطے سادگی اشد ضروری چیز ہے۔

۲۔ جوش۔ جب تک خود شاعر میں جوش پیدا نہ ہو وہ اس کیفیت کو دوسرے میں پیدا نہیں کرسکتا جس درجہ میں یہہ کیفیت شاعر میں موجود ہوتی ہے اسیقدر اثر اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اصل شاعر وہی ہے جو پہلی کیفیت خاص اپنے میں پیدا کرسکے۔ اس کے بعد اپنے جوش کو دوسروں میں اپنے الفاظ کے ذریعہ سے منتقل کرسکے۔ جب اصلی جوش پیدا ہوجاتا ہے۔

تو اس کو ادا کرنے کے لئے الفاظ بھی ویسے ہی مناسب موقع خود بخود بہم پہونچنے لگتے ہیں۔ اصلی غصہ محبت یا غم کی حالت میں جو الفاظ قدرتی طور پر بلا تکلف زبان پر جاری ہو جاتے ہیں وہ بحالت تصنع کبھی ادا نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ یہ جذبہ خود شاعر میں پیدا نہ ہو وہ دوسرے میں ہرگز منتقل نہیں کر سکتا۔

۳۔ اصلیت۔ جوش بغیر اصلیت کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور نہیں کہ واقعہ منظومہ خود شاعر پر گزرا ہو مگر وہ واقعہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو ممکن الوقوع ہو یا اس کا کچھ جزو مشاہدات پر مبنی ہو۔ شاعر کو اختیار ہے کہ دیو پری کا قصہ لکھے۔ سوائے اس کے کہ اُن کے پر لگا دیئے جائیں یا کچھ فوق العادت قوتیں عطا کر دی جائیں باقی اُن کے تمام حرکات وسکنات ہمارے علم مشاہدہ کے ماتحت ہوں گے۔ اگر کوئی شاعر پرستاں کے سمندر کا ذکر کرتے ہوئے بیاں کرے کہ بجائے پانی کی موجوں کے آگ کے شعلے اُٹھتے تھے تو اسی نظم میں خاک بھی اثر نہ ہوگا سبز پری کا گلفام سے عشق اصلیت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور محض اسی وجہ سے موثر ہے اگر اصلیت کو غائب کر دیجیئے تو اثر کو بھی غائب سمجھیئے۔ ایک دوسرے کے واسطے لازم وملزوم ہے

انتخاب الفاظ۔ مذکورۂ بالا تینوں باتیں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتیں جب تک کہ صحیح المعنی الفاظ برمحل نہ استعمال کئے جائیں۔ اگر مصور پتیوں میں سرخ اور پھول میں سبز رنگ بھرے تو تصویر کی تمام خوبی غارت ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر بے محل کسی لفظ کو صرف کرے تو خیال کی لطافت سامع کے دماغ میں آنے ہی نہ پائے گی۔ شاعر کا مقصد کچھ ہوگا اور سامع کے سمجھ میں کچھ آئے گا۔ پس خیال کو صحیح طور پر ظاہر کرنے کے لئے انتخاب الفاظ بیحد ضروری ہے جو بغیر فکر و کاہش ممکن نہیں۔ شاعر کو اظہار خیال کے لئے بعض مرتبہ صحیح لفظ کی تلاش میں گھنٹوں غور کرنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو یہ کھٹک دنوں باقی رہتی ہے۔ جس وقت صحیح لفظ ملجاتا ہے شاعر

اچھل پڑتا ہے اور اپنی تلاش کی کامیابی پر پھولے نہیں سماتا۔

مثنوی ۔یہان تک جو کچھ بیاں ہوا وہ عام شاعری کے متعلق تھا مگر مثنوی کے واسطے خصوصاً کچھ اور بھی قیدیں ہیں۔شاعری کے دیگر اصناف مثلاً قصیدہ ۔غزل ۔رباعی وغیرہم نہ اس قدر طویل ہوتی ہیں اور نہ ایسی مسلسل جیسے مثنوی۔اس لئے وہ اس قدر دشوار نہیں جس قدر کامیاب مثنوی کا لکھنا دشوار ہے ۔غزل یا قصیدہ میں شاعر پابند نہیں ہوتا۔ ایک شعر زمیں کا ہے تو دوسرا آسمان کا چونکہ اُن میں باہمی ربط و تسلسل ضروری نہیں دونوں اپنی اپنی جگہ لطف دیتے ہیں مگر مثنوی کی حالت بالکل جداگانہ ہے ۔چونکہ مثنوی میں کسی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے اس لئے تسلسل لازمی ہوجاتا ہے ۔مثنوی میں ہر بیت دوسری سے ایسی دست وگریباں ہونی چاہئے کہ اگر کسی بیت کو درمیان سے نکال دیا جائے تو فوراً معلوم ہونے لگے کہ یہاں کچھ نقص رہ گیا۔یہ ایک پھول یا گلدستہ کی تصویر نہیں بلکہ ایک بڑے باغ کا مرقع ہے کمال شاعری یہ ہے کہ واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ ہر بات اپنے موقع پر مزا دیجائے اور تسلسل کہیں ہاتھ سے جانے نہ پائے ۔شاعر کا کمال جسقدر مثنوی میں ظاہر ہوتا ہے وہ اور کسی صنف شاعری میں نہیں معلوم ہوتا۔

خصوصیات مثنوی ۔مثنوی کو کامیاب بنانے کے لئے شاعر کو حسب ذیل باتوں پر خاص طور پر توجہ کرنا لازمی ہے ان میں سے جس بات میں جس قدر زیادہ خامی ہوگی اسیقدر مثنوی پایہ اعتبار سے گری ہوئی متصور ہوگی۔

۱۔تسلسل و روانی مثنوی مثل ایک سونے کی زنجیر کے ہے جس کی ہر کڑی دوسری سے پیچیدہ اور جس کا ہر حلقہ دوسرے کے برابر نظر آتا ہے جس حلقہ یا جس کڑی کو جداگانہ دیکھئے بجائے خود مکمل معلوم ہوتی ہے ۔جو شان ایک میں ہے وہی دوسری میں نمایاں ہے جب سب کو ملاکر

دیکھیئے تو نہ کہیں کھانچہ نظر پڑتا ہے اور نہ کاواکی۔ لطافت زباں اور حسن معنوی کا ایک دریا ہے کہ بہتا نظر آتا ہے تسلسل کے ساتھ روانی جب تک نمایاں طور پر مثنوی میں نہ پائی جائے اس نظم پر صحیح معنوں میں مثنوی کا اطلاق مشکل ہے۔ اگر الفاظ اس طرح ادا کیئے جائیں جس کے پڑھنے میں موسیقیت پیدا نہ ہو اور کانوں کو گراں گزریں تو سارا مزا پھیکا پڑ جاتا ہے تسلسل اور روانی سے جو نظم عاری ہوگی وہ صحیح معنوں میں مثنوی کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔

۲۔ **سادگی** جس طرح شکوہ الفاظ و تصنع قصائد کے حسن ہیں اُسی طرح سادگی مثنوی کا زیور ہے کوئی مثنوی کبھی مقبول نہ ہوگی جب تک کہ سادگی کوٹ کوٹ کر اُس میں نہ بھری ہو جو کشش و تاثیر سادگی میں پائی جاتی ہے۔ وہ بناوٹ میں ہرگز نہیں ہوتی۔ مثنوی کی بہترین خوبی یہ ہے کہ روزمرہ کی بول چال اس طرح پر نظم کی جاوے کہ اگر اُس کی نثر کرنا چاہیں تو مشکل سے ہو سکے۔ نظم یہ معلوم ہو گویا نثر میں بات چیت ہو رہی ہے مثنوی کے پڑھنے میں غیر مانوس الفاظ کثرت مبالغہ و تصنع اُس کے سارے اثر کو زائل کر دیتے ہیں۔ اگر کہیں کسی شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے غور کرنا پڑا تو سارا ہی مزا کِرکِرا ہوگیا وہ مثنوی کیا ہوئی فلسفہ یا منطق کے مسائل کی کتاب ہوگئی۔

۳۔ **جیسا موقع ویسی بات** شاعر کو مثنوی میں گرگٹ کی طرح۔ طرح طرح کے رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ کہیں وہ معشوق کے جامہ میں جلوہ گر ہوکر اُس کی زباں سے اُس کے جذبات و خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ کہیں غمگین عاشق بن کر جامہ دری کرتا نظر آتا ہے اور اُن کیفیات کی تشریح کرتا ہے جو ایک عاشق کو انگاروں پر لٹاتی رہتی ہیں۔ کہیں دشمن جانی ہے تو کہیں دوست قلبی۔ کبھی جوان کا ولولہ بنکر آتا ہے۔ تو کبھی بوڑھے کی مایوسی۔ غرض جس شکل اور جس حالت کو ظاہر کرتا ہے ہو بہو اصل کی تصویر کھینچتا ہے۔ ہر شخص کے مقتضائے حال

خیالات اور جذبات کی تصویر اتارنا اور اس کے شایاں شان الفاظ ادا کرنا اصل شاعری ہے۔ جوانی کے ولولے اگر نوجوان ہی میں دکھائے جائیں تو اصلی ہوں گے ورنہ خلاف فطرت کہکر روک دیا جاویگا۔ ایک شہزادی کی گفتگو اور جذبات۔ ایک لونڈی کی گفتگو اور جذبات سے مختلف ہونگے اگر شاعر ہر شخص کے مناسب حال الفاظ و خیالات نہ ادا کر سکے تو وہ ہرگز لائق ستائش نہیں۔ الفاظ کا برمحل استعمال فصاحت کی جان ہے۔ شاعر ذرا اس میں چوکا اور طلسم خیال شکست ہوا۔

۴۔ **موافق فطرت و موافق عادت ہونا**۔ چونکہ مثنوی ایک مرتع ہے اس کا ہر منظر ہر خیال ہر جذبہ مطابق فطرت ہونا چاہئے۔ جہاں فطرت سے ہٹا اور رنگ بگڑا انسانی جذبات حیوانی افعال اور مناظر قدرت کو مطابق فطرت ظاہر کرنے کے لئے کائنات کو غور سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شاعر کا بڑا کام یہہ ہے کہ وہی کیفیت وہی حالت پیش نظر کردے جو کسی موقع پر قدرتی طور پہ ہوا کرتی ہے۔ مختلف حالتوں میں مزاج بدل جاتے ہیں کیفیات دوسری ہوجاتی ہیں۔ بادشاہ کے غضب کی جو کیفیت ہے وہ اُس کے مقید ہونے کی حالت میں ہرگز نہ ہوگی مگر ایک معمولی قیدی سے وہ مختلف ہوگی۔ ایک خطاکار قیدی کی حالت ایک بے خطا قیدی۔ سے جدا ہوگی۔ ایک عورت قیدی کے خیالات اور جذبات اور محسوسات مرد قیدی سے بالکل الگ تھلگ ہوں گے۔ شاعری کا فرض منصبی یہہ ہے کہ ہر شخص کے مدارج و حیثیت کا خیال رکھتے ہوئے اُن کے اصلی جذبات اور محسوسات کی تصویر کھیچے اگر امتیازی فرق کو شاعر ظاہر نہیں کر سکتا تو یہہ اس کی خامی کی دلیل ہے۔ اسی طرح اگر عرب۔ قصہ میں کوہ ہمالیہ کے مناظر اور بنارس کے گھاٹ کی دلفریبی دکھائی جاوے۔ یا ریچھ اور شیر یا اور ایسے ہی دیگر جانوروں کی موجودگی جو ہندوستاں کے ساتھہ مخصوص ہیں عرب میں دکھائی

جاوے تو شاعر کی جاہلیت کے علاوہ نظم کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ ایسی مثنوی کے متفرق ابیات خواہ کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں مگر ایک بالغ کی نظر کی نگاہ میں طفلانہ لایعنی بات معلوم ہو گی۔

۵۔ اثر۔ یوں تو کل شاعری کے واسطے اثر ضروری چیز ہے مگر مثنوی کو خصوصاً اثر میں ڈوبا ہوا ہونا چاہیئے۔ اگر رزمیہ مثنوی ہے تو پڑھنے کے ساتھ ہی ایک بزدل کے دل میں بھی ولولہ شجاعت پیدا ہونا چاہیئے۔ اگر عشقیہ نظم ہے تو مردہ سے مردہ دل پر بھی اثر کر کے چھوڑے اگر یہ باتیں نہیں تو نہ وہ رزمیہ نظم ہے اور نہ یہ عشقیہ۔ اثر اسیوقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ شاعر اصول شاعری سے پورے طور پر باخبر اور مشاہدۂ قدرت سے اس کا دماغ منور ہو یہ بات کسی نقال میں نہیں پائی جاتی صرف وہبی شاعر کو یہ بات نصیب ہوتی ہے۔

۶۔ رمز و کنایہ۔ شاعر کو بہت سی باتیں رمز و کنایہ میں بیان کرنی لازمی ہوتی ہیں اگر اونکی تفصیل کی جاوے تو لطف کلام ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ رمز و کنایہ کا جو ایک مصرعہ لطف دے جاتا ہے وہ دس صفحہ کی مفصل نظم سے حاصل نہیں ہوتا (اصل شاعر وہی ہے جو یہ تمیز کر سکے کہ کس چیز کی تفصیل کی جاوے اور کس کو رمز و کنایہ میں بیاں کیا جاوے) جہاں تفصیل کی ضرورت نہیں وہاں بلا ضرورت تفصیل کرنا نہ صرف طبیعت پر گراں ہوتا ہے بلکہ نظم کے اثر کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ ایک لفظ سے کل واقعہ کو پیش نظر کر دینا ہی اصلی بلاغت ہے۔

یہاں تک ان باتوں کا ذکر ہوا جن کی مثنوی میں اشد ضرورت ہوتی ہے اب کچھ وہ باتیں لکھی جاتی ہیں جن کا مثنوی میں پایا جانا عیب ہے۔

۱۔ صنایع و بدایع و مبالغہ۔ صنایع و بدایع و مبالغہ قصائد کی جان ہیں مگر مثنوی کے واسطے بد نما عیب ہیں اُن کا وجود مثنوی میں راہ کے کنکر و پتھر کے مثال ہیں جنسے قدم

قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔ بلندی خیالات کا یہ معیار نہیں کہ اصل حقیقت ہی سرے سے غائب ہو جائے۔ مثنوی میں جہاں شاعر نے بلند پروازی کی حقیقت رخصت ہوئی حقیقت کا رخصت ہونا اور اثر کا زائل ہونا ایک ہی بات ہے۔ مثنوی میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے واقعہ کے بیان کرنے میں ہمیشہ سادگی اور سچائی برتی جاتی ہے۔ صنایع و بدایع اور مبالغہ حقیقت سے دور لیجاتے ہیں۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو اُن سے مثنوی میں اجتناب کرنا چاہیئے۔

۲۔ تکذیب واقعہ۔ شاعر کے واسطے یہ بات بہی لازمی ہے کہ جو بات ایک مرتبہ بیان کر چکا ہے اس کے خلاف مثنوی بھر میں کہیں نہ بیان کرے اس کے خلاف کرتے ہیں۔ دروغ گو را حافظہ نباشد والی مثل صادق آتی ہے اس کے علاوہ جو کچھ اثر اس وقت تک پیدا ہو چکا ہوتا ہے وہ سب کافور ہو جاتا ہے۔

۳۔ خلاف تجربہ و مشاہدہ باتیں۔ کوئی بات خلاف تجربہ و مشاہدہ بیان کرنا سخت عیب ہے۔ یہ کہنا کہ گنگا میں موتی اور مونگے پیدا ہوتے ہیں خلاف واقعہ ہے اب اگر کوئی شاعر گنگا سے موتی اور مونگے نکالے تو سامع پر اس کا کیا اثر ہوگا سوائے اس کے اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ جو کچھ نظم کا اس وقت تک اثر ہوا ہو وہ سب زائل ہو جائے۔

مصحفی سے قبل میر مثنوی دریائے عشق لکھ چکے تھے میر کی عظمت کا سکہ ان کے دل پر بیٹھا ہوا تھا اور ان کے کسی ایک شعر کو دوبارہ پڑھوا لینے کو اس قدر باعث افتخار سمجھتے تھے کہ سرو قد کھڑے ہو ہو کر آداب بجا لاتے تھے۔ یہ مثنوی غالباً مصحفی کے آخر زمانہ میں لکھی گئی ہے جس زمانہ میں وہ اپنا مدمقابل کسی کو نہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کہ "وحصہ سن آمدہ لیلائے شاعری" اُن کے دماغ میں بس گیا جب ہی تو مصحفی کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے۔

تیری طراحیوں سے دور کھنچا　　کئی اہل سخن نے اُس کو لکھا
گرچہ ہے کلک میر نادرہ کار　　تو بھی قدرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا　　دے ذرا اور بھی تو حسن ملا
سطح کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر　　جس سے حیراں رہیں صغیر و کبیر

یا

جیسی میروں میں شان ہے کچھ اور　　ہم فقیروں میں شان ہے کچھ اور

مصحفی کے زمانہ میں مذاق شاعری حقیقت کے مرکز سے ہٹ کر تصنع کی طرف جھک گیا تھا شاید اسی وجہ سے مصحفی کا یہ خیال ہوا ہو کہ اُن کی مثنوی زیادہ مرصع ہے۔ خیر مصحفی یا اُن کے زمانہ والے جو کچھ خیال کرتے رہے ہوں مگر ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ بلحاظ اصلیت شاعری مثنوی بحر المحبت کا کیا رتبہ ہے۔ جس ترازو سے ہم سیفو۔ ہومر۔ گوئٹے۔ شکسپیر۔ امرالقیس۔ نظامی۔ فردوسی۔ غالب اور انیس کے کلام کو تولتے ہیں اسی کے ایک پلڑے میں مثنوی دریائے عشق کو رکھیں اور دوسرے میں بحر المحبت کو اور پھر دیکھیں کہ کس طرف کا پلڑا جھکتا ہے۔ جو فرق ان دونوں مثنویوں کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اُس سے زیادہ اُن کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک آمد ہے اور دوسری آورد۔ ایک ایک خاص محدود زمانہ کے مذاق کے رنگ کی ہے دوسری ایک مستقل صحیح مذاق کی تصویر ہے جو اپنا اثر ہمیشہ یکساں کرتی رہے گی۔ اس کو خواہ انگلستان کے معیار نظم سے جانچا جائے خواہ جرمنی کے خواہ ایشیا کے۔ یہ اپنی قول میں پوری اترے گی۔

ہم کو حیرت ہے کہ مولوی عبدالماجد سے تعلیم یافتہ فلسفیانہ دماغ کے شخص نے عام طور پر مصحفی کو میر کے برابر رکھا ہے مگر چند مقامات پر اُن سے بڑھا دیا ہے۔ ہم کو نہ میر کی طرفداری

منظور ہے نہ مصحفی کی۔ اگر کل مثنوی کی تنقید کی جائے تو مثنوی سے چوگنی ضخامت کی کتاب بن جائیگی۔ ہم صرف اُن ہی حصوں کو لیں گے جن کو مولوی صاحب نے میر سے بہتر ظاہر فرمایا ہے۔ دونوں شعرا کے تحت دل ناظرین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جو اصول مثنوی کی جانچ کے ہم نے تحریر کئے ہیں اُن سے غالباً مولوی صاحب کو انکار نہ ہوگا۔ ہم اسی معیار سے ہر دو مثنویوں کو جانچتے ہیں اور نتیجہ ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ قصہ کو سمجھنے کے لئے اوپر کا حال یہہ ہے کہ ایک عاشق مزاج راہ چلتے ایک کھڑکی میں کسی مہ جبین کو بیٹھا دیکھتا ہے آنکھیں چار ہوتے ہی تیر نظر سے دل ترازو ہوجاتا ہے عشق سے بے بس ہو کر اُسے گھر کے سامنے پانوں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے اُس راہ سے گزرنے والوں کو طرح طرح کے خیال ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ لڑکی کے باپ کو بھی اطلاع ہوتی ہے وہ ایک شریف غیرتمند ہے اس رسوائی کو دیکھکر سخت پریشان ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں۔

(میر)

وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے — درپئے دشمنیٔ جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں — دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں

پھر یہہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام — سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہہ جواں مارا — کس نے مارا۔ اُسے کہاں مارا

ہووے گر خونِ خفتہ یہہ بیدار — کھینچی ہووے خفت بسیار

کیجئے ایک ڈھب سے اُس کو تنگ — تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ

تہمتِ خبط رکھئے اس کے سر — کیجئے سنگسار اُس کو پھر

کی اشارت کہ کودکان شہر — اُسے لبریز غصہ و پُر قہر

دے کے دیوانہ اُس جوان کو قرار — ہوگئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا ایک روے دل اسکا ادھر تھا
محو تھا اُس کے خیال کے بیچ تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹ پر حسن کا بیان اُس کا تھا سرو سنگب آستان اُسکا

دیکھکر اُس کو بے خور دبے خواب جانا ہر اک نے عاشق بے تاب
منہ پہ اُسکے جو رنگ خوں نہیں عشق ہے اُس کو یہ جنون نہین
ہے نگہہ اُس کی جس طرف مائل اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
جب ہوا ذکر اقل واکثر میں چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا مضطرب کدخدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بیٹھ کر دفع رسوائی بیٹھ کر مشورت یہہ ٹھرائی
یاں سے یہہ غیرت مہ تاباں جا کے چندے کہیں رہی پنہان
شب محافہ میں اس کو کرکے سوار ساتھ دی ایک دایہ غدار
بار دریا کے جلد رخصت کی اس طرح فکر رفع تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مد نگاہ واں ہو ردپوش تا یہ غیرت ماہ
ہوے جب اس بلا سے خاطر جمع نور افزائے خانہ ہو جون شمع

مصحفی معشوق کا بھی عشق سے متاثر ہونا اضافہ کرکے اسی کیفیت کو ذیل کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

الغرض یوں ہی گزرے جب کئی ماہ ہوئی اس کے بھی دل میں اس کی راہ
اس کو بھی اک خیال رہنے لگا جی ہی جی میں ملال رہنے لگا
صاحب خانہ تھا زبس کہ غیور دیکھکر اس گلی میں یہ شر و شور
مشورت ہر کسی سے کرنے لگا مارے غیرت کے سخت مرنے لگا
خشم گاہ کہے کہ مار ہی ڈال جوں بنے اس بلا کو سر سے ٹال
لطف گاہ کہے تامل کر دیکھ ہوتا ہے کیا تامل کر
قتل عاشق روا نہیں ہرگز یہ کسی نے کیا نہیں ہرگز
وہ کرے گا تو ہوے گا بدنام اپنے مذہب میں جو برا ہے کام
آخر کار تھے جو محرم کار ایک دن ان کو جمع کر اک بار
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجے کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجے
کیونکہ سر سے ٹلے یہ رسوائی تب انہوں نے یہ بات ٹھہرائی
یعنے اوباش کوچہ و بازار کچھ نہ کچھ اُس کو دیویں آزار
اُس پہ گو سیکڑوں ستم ہوئیں پر نہ بدنام جس میں ہم ہوئیں
جب یہ ٹہری تو کو دکان شریر ساتھ لیکر کے اپنے جم غفیر
یک بہ یک اس جواں پہ ڈہائے لڑکے کیا آئے ایک بلا لائے

. . . .

قصہ مشہور ہو گیا اُس کا نہ رہا حسن و عشق میں پردہ
یعنی افشا ہوا یہ سینہ فگار ہے اسی نازنیں کا عاشق زار
نت موے غرفہ ہے نگاہ اُس کی برق سی کوندتی ہے آہ اُس کی

منہہ نہیں موڑتا جفاؤں سے — ربط ہے اُس کو دل کی چاہوں سے

وارث اس نازنیں کے دیکھہ یہ حال — لائے سو سو طرح سے دل میں خیال

جب نہ بن آئی اور کچھہ تدبیر — یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر

یاں سے لیجا کے اُس صنم کے تئیں — چندے پوشیدہ رکھیں اور کہیں

طور پر اپنے واں یہ زیست کرے — پھر یہ دلدادہ یاں جیے کہ مرے

پار دریا کے اک ٹھکانا تھا — اُن کا کوئی وہاں یگانہ تھا

اِن سے اور اُن سے تھی شناسائی — دوستی یکدلی و یکجائی

اعتماد یگانگت بہی تھا — اتحاد موانست بہی تھا

شاہد مہر جب ہوا روپوش — روز شب آئی ہو گلیم بدوش

اک محافہ میں کر سوار اُسے — ساتھ دایہ کے بھیجا یار اُسے

کہہ دیا یوں کہ یاں یہ رشک بہار — اِن دنوں رات دن ہے تھی زار

خود بخود اس کے دل پہ غم تھا کچھہ — بے جہت متصل الم تھا کچھہ

دن کو بستر پہ زار رہتی تھی — شب کو اختر شمار رہتی تھی

خواب اور خور میں آگیا تھا قصور — اُس کو تبدیل تھا مکان ضرور

اس لئے ہمنے اُس کو واں بھیجا — کہ بیابان کی راس آئے ہوا

مثل گل وا ہو اس کا غنچہ دل — ٹلے چھاتی سے اُس کے غم کی سل

لطف اوٹھا دے ہوای صحرا کا — دیکھے دامشد جناب دریا کا

میر صاحب نے جو کیفیت بیان کی ہے وہ بالکل موافق فطرت انسانی ہے عاشق جانباز کا مکان کے قریب بیٹھہ جانا اور لڑکی کے اعزا کو ناگوار گزرنا اس کے بعد کی جو

کیفیت ہے وہ میر کی علم الطبیعات سے پوری واقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔ پہلے تو جیسا کہ عام طور
پر اشتعال میں ہوتا ہے یہہ ارادہ کیا گیا کہ اُس کو جان سے مار کر اس قصہ ہی کو ختم کیا جاوے
مگر شریف کے واسطے پاس ناموس وننگ سب سے زیادہ ہوتا ہے قتل کے خیال کے ساتھ
ہی کہ کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا۔ کس نے مارا اوسے کہاں مارا" اس ایک شعر کے جواب
سے پوری رسوائی پیش نظر ہوگی۔ اور یہہ راے قرار پاتے ہیں کہ اس کو دیوانہ قرار دیکر
پریشان کیا جاوے اس میں لڑکوں کو جن کو قدرتاً دیوانوں کے ستانے میں ایک خاص
لطف حاصل ہوتا ہے بلا تکلف ڈھیلے مارنے اور ستانے کا موقع مل جائے گا اور عاشق
تکلیف اٹھاکر گھبراکر بھاگ جائے گا۔ سب سے بڑا خوف رسوائی کا تھا وہ دیوانہ قرار دینے
میں قطعاً نہیں رہتا۔ چنانچہ لڑکے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں اُس کے بعد میر صاحب
ایک دوسری تصویر دکھاتے ہیں عشق صادق کا مقتضا یہہ ہے کہ شدائد سے اور پختہ ہو
چنانچہ شدائد کا اثر برعکس ہوتا ہے۔ باوجود سنگ باری کے عاشق یا تو معشوق کے گھر کی
طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے یا عالم بیخودی میں اُس کے سنگ در پر ماتھا ٹیک دیتا ہے۔
جب جی زیادہ گھبراتا ہے تو معشوق سے غائبانہ گفتگو کرنے لگتا ہے۔ یہہ گفتگو نہایت لطیف
اور پُرتاثیر ہے مگر بخوف طوالت اور اس وجہہ سے بھی کہ عبدالماجد صاحب نے اُس کو چھوڑ
دیا ہے ہمنے بھی اس کو ترک کر دیا اس کے بعد میر صاحب پردہ اٹھاکر ایک اور کیفیت
دکھاتے ہیں گھر والوں نے اُس کو دیوانہ مشہور کیا تھا جس کی وجہہ سے لڑکے تنگ کرتے
تھے مگر تردید ہوجاتی ہے تین اشعار ۵ لغایتہ ۷ میں میر نے کمال دکھایا ہے اِن ہی تین
شعروں سے جنون کا نہونا عشق کا ہونا اور معشوق کا اسی گھر میں ہونا ثابت کر دیا ہے
یہ اشعار کیا ہیں۔ دریا کوزہ میں بند ہے اصلی بلاغت یہی ہے اول کے شعر میں وہ کیفیت

بیاں کی ہے جو عشق وجنوں میں مشترک ہے یعنی بے خور دبیخواب ہونا۔ یہہ کیفیت دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ بیخور دبیخواب رہنے کے علاوہ اس جوان کے منہ پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں۔ بجائے سرخی کے جو دیوانوں میں بھی پائی جاسکتی ہے منہ پر بسنت پھولی نظر آئی۔ اگر دیوانہ ہوتا تو منہ پر سرخی ہوتی یا سوداویت سے رنگ رسیاہ ہوجاتا ہے مگر منہ پر بجائے سرخی یا سیاہی کے زردی نمایاں تھی جو بدن میں خون نہ رہ جانے کی علامت ہے اس فرق سے لوگوں کو یقیں ہوگیا کہ مجنون نہیں بلکہ عاشق ہے۔ اور عاشق بھی اسی گھر کے کسی رہنے والی کا اس لئے کہ بار بار اسی گھر کی طرف دیکھتا ہے۔ جب سب لوگوں میں عشق کا چرچا ہونے لگا تو غریب باپ پریشان ہوا اور جیساکہ مقتضائے غیرت تھا۔ گھر میں گھس کر یہہ مشورہ کیا کہ چند دن کو اس کو ایک دوست کے یہاں دریا پار بھیجدیا جاوے ان تمام اشعار میں کوئی بات خلاف فطرت انسانی نہ پائیگا جو تصویر ہے وہ ہمہ وجوہ مکمل۔ مثنوی کے واسطے جس قدر قیود ہیں اُن سب میں یہہ ٹکڑا پورا اترتا ہے۔ اب ذرا مصحفی کی زور طبیعت کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مصحفی نے معشوق کے دل میں اول ہی سے آگ لگاکر ایک جدت کی مگر اس سے بجائے ترقی کے نظم پایۂ اعتبار سے گر گئی جس کا آئندہ بالتفصیل بیان ہوگا۔ بالفعل سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ عاشق کے واویلا کے شور سے صاحب خانہ تنگ آگیا۔ صاحب خانہ تھا زبس کہ غیور، مگر مشورت ہر کسی سے کرنے لگا،، کیا مقتضائے غیرت یہی ہے کہ ہر کس سے پوچھئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ مارے غیرت کے سخت مرنے لگا،، میں لفظ سخت بلحاظ زبان بالکل خلاف محاورہ ہے۔ باپ کا شرم سے یہہ خیال ہوناکہ اس کو ختم ہی کردیا جائے بالکل بجا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ "غیور" باپ کے دل میں ساتھ ہی ساتھ "لطف" بھی جاگزیں ہی

جو قتل سے باز رکھتا ہے ۔ ایک غیور کا ہر کسی سے مشورہ کرنا اور اپنے نام و ننگ کے
تباہ کرنے والے کے قتل سے "لطف" کے خیال سے باز رہنا خلاف فطرت ہے آٹھویں شعر کی
ترکیب ہی ملاحظہ طلب ہے ۔ یہ شعر مصحفی سے شاعر کے واسطے باعث ننگ ہے ۔ بدترین
تعقید کے علاوہ اس میں کوئی عمدہ خیال ظاہر کیا گیا ہے اور نہ اس شعر کی یہاں ضرورت تھی
میر نے قتل سے باز رہنے کی جو وجہ بیان کی ہے اُس سے مصحفی کے بیان کردہ وجہ کا موازنہ
فرمایئے تو معلوم ہو گا کہ ایک جواہر اصلی ہے دوسرا نقلی اسی کے ساتھ یہ رنگ اور کا داک
ذرا تسلسل کی خرابی ملاحظہ فرمایئے چوتھے شعر میں فرماتے ہیں کہ ہر کسی سے مشورہ کرنے لگا
نویں شعر میں پھر فرماتے ہیں ۔

"آخر کار تھے جو محرم کار ایک دن اُن کو جمع کر ایکبار"
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجئے کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجئے

لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ "اوباش" یعنی بدمعاش اُس کے تنگ کرنے پر مستعد کئے
جائیں تاکہ تم بدنام نہو ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اوباش کو تنگ کرنے کا کیا بہانہ مل سکتا تھا صلاح
تو اوباشوں سے تنگ کرانے کی ٹھرتی ہے اور آتے ہیں "کودکان شریر" ۔ کودکان شریر پر لفظ
اوباش کا ہرگز اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ لڑکے آکر "یک بہ یک اس جوان پر ڈہائے" ڈہانا
یعنی حملہ آور ہونا ۔ ٹوٹ پڑنا زبان اُردو میں رائج نہیں ۔ میر صاحب جس طرح افشاء راز عشق
کی توجیہ کرتے ہیں وہ مصحفی کے یہاں ندارد ہے ۔ راز عشق افشا ہونے پر یہی سمجھ میں آتا ہے
کہ اس کو کہیں بھیجدیا جاوے تاکہ ۔

"طور پر اپنے واں یہ زیست کرے پھر یہ دلدادہ یاں جئے کہ مرے"

اس شعر میں سوائے مناسبت الفاظ "زیست" "جئے" "مرے" کے اور کچھ لطف

نہیں اور بہ لحاظ تسلسل قصہ یہہ بالکل غیر ضروری ہے۔ میر صاحب کے ایک مصرع

"گھر تھا اک آشنا کا مد نگاہ"

کی بجائے تین شعر مصحفی نے لکھے ہیں۔

پار دریا کے اک ٹھکانا تھا ۔۔۔ اُن کا کوئی وہاں یگانہ تھا

ان سے اور اُن سے تھی شناسائی ۔۔۔ دوستی یکدلی و یکجائی

اعتماد یگانگت بھی تھا ۔۔۔ اتحاد موانست بھی تھا

یہہ تفصیل میرے خیال میں کچھہ حسن پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ برعکس پڑہنے والے پر بار ہے صاحب ذوق سلیم کو مثنوی میں یہہ مصرع "اور شب آئی ہو گلیم بدوش" نہایت گراں گزرتا ہے، رات ہو جانے کو ان الفاظ میں قصہ میں بیان کرنا کہاں تک زیبا ہے۔

محافہ میں سوار کر کے اُس کو پار روانہ کرتے ہیں۔ سات اشعار ۲۹ لغایتہ ۳۵ میں ایک غیور باپ کا دایہ کے ذریعہ سے دوست کو پیغام ہے۔ یہہ طوالت کے لحاظ سے مثنوی کی ضخامت کو تو ضرور بڑہاتے ہیں مگر مثنوی اور شاعر دونوں کی خامی کو اظہر من الشمس کر دیتے ہیں۔ اشعار نمبر ۱ اور ۲ میں مصحفی بیان کر چکے ہیں۔

الغرض یونہی گزرے جب کئی ماہ ۔۔۔ ہوئی اس کے بھی دل میں اُسکی راہ

اس کو بھی ایک خیال رہنے لگا ۔۔۔ جی ہی جی میں ملال رہنے لگا

اس خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان اشعار پر غور فرمائیے۔

کہدیا یوں کہ یا تیغ رشک بہار ۔۔۔ ان دنوں رات دن رہے تھی زار

خود بخود اُس کے دل پہ غم تھا کچھہ ۔۔۔ بے جہت متصل الم تھا کچھہ

دن کو بستر پہ زار رہتی تھی ۔۔۔ شب کو اختر شمار رہتی تھی

خواب اور خور میں آگیا تھا قصور — اُس کو تبدیل تھا مکان ضرور

اس لئے ہم نے اُس کو واں بھیجا — کہ بیاباں کی راس آئے ہوا

مثل گل وا ہو اس کا غنچۂ دل — ٹلے چھاتی سے اسکے غم کی سل

لطف اُٹھا دے ہوائے صحرا کا — دیکھے وا شد حباب دریا کا

یہہ بالکل خلاف فطرت ہے صحرا و بیاباں کی ہوا عشق کی رعایت کہلائی گئی ہے اور غنچۂ دل کی رعایت سے واشد حباب فرمایا گیا ہے مگر لطف کو جو دیکھئے تو ہوا ہے۔ اس حصہ نظم سے باپ کی انتہائی بے غیرتی ظاہر ہوتی ہے۔ نظم کے لحاظ سے بھی پایہ کچھہ بلند نہیں ہوتا۔ باپ کی زباں سے یہہ اشعار انمل بے جوڑ بات ہے۔

(باقی دارد)

ضروری گذارش

آج کل اشتہار دینے کا رواج عام ہو رہا ہے ظاہر ہے کہ اکثر اشتہارات جھوٹے اور فریبی ہوتے ہیں ایسے اشتہارات کی اشاعت افسوسناک ہے اسلئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ صرف معزز اور معتبر تاجر اور دُکانداروں کے اشتہارات شمع میں شائع کئے جائیں تاکہ ہمارے ناظرین دہوکا اور نقصان سے محفوظ رہیں اور خوش معاملہ و ایماندار تاجروں کے کاروباری تعلقات اچھے لوگوں سے پیدا ہو جائیں لہذا اطلاعاً گذارش ہے کہ غیر معتبر اشتہارات کی اشاعت سے ہم کو قطعی معذور سمجھا جائے۔ اور اصرار نہ کیا جائے۔

مینیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

خواجہ حسن نظامی

(ایک گمنام کے قلم سے)

چند سال ہوئے دہلی سے ایک ادبی سیاسی اخبار "رعیت" خواجہ حسن نظامی صاحب کی ادارت سے نکلتا تھا۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہہ تھی کہ ابتدا کے مضمون میں کسی مشہور شخص کی شکل وشباہت اور اس کی زندگی کا زمانہ پر تنقید کی جاتی تھی۔ یہہ مضامین خواجہ صاحب خود لکھتے تھے۔ ایک صاحب نے خواجہ صاحب کا حلیہ بھی انہی کے طرز میں لکھا جو شائع ہوگیا۔ لیکن چونکہ اخبار جلد بند ہوگیا اور اس کی پہنچ بھی دہلی تک محدود تھی اس لئے مضمون سے اکثر لوگ مستفید نہ ہو سکے۔

خواجہ صاحب کی انشا پردازی اور ادبی قابلیت پر اس مضمون میں خاص طور سے بحث کی گئی ہے اس لئے اصحاب ذوق کے واسطے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ باسی کڑہی کا ابال ضرب المثل ہے، شاید یہہ پرانا مضمون بھی کچھہ چٹخارہ دے جائے۔ جمیل حسین بی اے علیگ

نام ولقب۔ باپ دادا اور بزرگوں کا رکھا ہوا نام علی حسن، ادبی اور مذہبی دنیا میں داخل ہو کر خواجہ حسن نظامی لقب اختیار کیا۔ جو ان کے مشرب اور خاندانی تعلق کی وجہہ سے ہر طرح زیبا وموزون ہے۔ یہہ لقب بعض اصحاب کو ضرور ناگوار ہے جو شکایت کرتے ہیں کہ خواجہ صاحب سے اگر کوئی ان کے اصلی نام سے مراسلت کرے تو اس تحریر کے لینے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم کو تو خواجہ صاحب جیسے منکسر المزاج اور قدامت پسند شخص سے ہرگز اُمید نہیں کہ ایسی سبک حرکت اُن سے سرزد ہو۔

ولدیت، وطن، تعلیم والد کا نام عاشق علی، جلدیں باندھ کر گذارہ کرتے تھے حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کی آل میں ہیں، غیاث پور کی بستی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ بچپن میں اس ذکی الحس شخص پر وطن کی خصوصیات نے بہت گہرا اثر ڈالا علی الصباح اور شب ماہ میں درگاہ کا نورانی سماں، مسجد کے گنبد سے دل کے ہلانیوالی "اللہ اکبر" کی گونج جمعرات اور سترہویں کے موقعوں پر زائرین کی کشمکش۔ اعتقادی و بداعتقادی۔ خدام کی غرض آمیز اور غیرمخلصانہ وکالت، درگاہ سے باہر کھیتیں اور جنگل کے پرلطف مناظر، ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعہ کی حیرت خیز عمارات اندھیری رات میں قبروں کا سنسان اور عبرت ناک عالم ایسے عناصر تھے جن میں حسن نظامی پلے اور پروان چڑھے، اور جنہوں نے اوائل ہی عمر میں اُن کے رجحان، اُمنگوں اور جذبات کو خاص رنگ میں رنگ دیا۔ سن شعور کو پہنچکر خواجہ صاحب دہلی آئے اور علمارِ وقت سے دستار فضیلت حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد سیاحت کا شوق غالب ہوا۔ ہندوستان کے کے مختلف صوبوں میں دور دراز سفر کئے، تجربہ اور معلومات میں وسعت ہوئی لیکن اس عالم ہندی اور صوفی کی نیت سیر نہ ہوئی، آخر حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا جس نے بلاد اسلامیہ کے مذہبی، اخلاقی انحطاط اور سیاسی مشکلات کی پوری حقیقت واضح کردی۔

سن و حلیہ عمر چالیس سے زیادہ اور پچاس سے کم ہے۔ لمبا قد، چھیرا بدن چمپئی رنگ بھروان داڑھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، ناک ذرا مختصر ہے۔ سنت رسول ہیں سر کے بال شانوں تک چھوڑ دیئے ہیں۔ کنگھی کرنے اور سرمہ لگانے کا شوق ہے۔ ایک مرتبہ خواجہ صاحب ایک اسلامی شہر میں تھے۔ اُن کی سرمہ آلود آنکھیں اور شانہ زدہ داڑھی اور بالوں کو دیکھ کر بے اختیار ہمیں ایک بدوی عورت کا شعر ذہن میں آگیا، جو اپنے جوان بچے

کے کنگھی چوٹی کے شوق پر تعجب کرتی ہے اور کہتی ہے آج خدا نے اس "بے پر نکلے کبوتر کے بچے" کو اس قابل کیا کہ اپنی سج دھج دیکھتا ہے" خواجہ صاحب کا لباس سادہ لیکن نہایت خوش وضع عربی علما کے لباس سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ طبیعت میں پاکیزگی اور نفاست ہے۔

انشا پردازی اور ادبی حیثیت

خواجہ صاحب پاؤ صدی سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں طبیعت میں آمد بہت ہے، تخیل کے بادشاہ ہیں؛ زبان صاف ستھری دہلی کی ٹکسالی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں بہت سے رسالے اور اخبار اِن کی سرپرستی اور ادارت میں نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں۔ اپنے طرز کے آپ موجد ہیں، جس کو نوشق اور ندرت پسند اصحاب بیحد پسند کرتے ہیں۔ لیکن متین اور سنجیدہ طبائع بعض اوقات چین بہ جبین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مرد معقول بچوں کے کھیل کے لئے پٹاخوں کی گڈیاں کیوں چھوڑ رہا ہے۔ اصل پوچھو تو اس کمزوری میں خواجہ صاحب کا کچھ قصور نہیں بلکہ زمانہ کے مذاق کا قصور ہے۔ خواجہ صاحب نے جب مضمون نگاری شروع کی تھیٹر کے طرز نے صحیح ذوق کا خون کر دیا تھا۔ بے محل و برمحل پھبتی آمیز جملے، طفلانہ اظہار جذبات زبانی جلت پھرت لوگوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ہی اس عالمگیر بد مذاقی سے نہ بچے اور اُن کی مذہبی، سیاسی، ادبی تمام تحریرات میں، کڑک دھمک اور بازاری چٹخارہ موجود ہے۔

خواجہ صاحب کی رنگ برنگی قسمیں، اور دیا سلائی، مکھی .... وغیرہ سے باتیں گو اللہ پاک کے کلام کی تقلید میں ہوں لیکن ہر زبان کا مذاق جدا ہوتا ہے۔ عربی تخیل ہندی زبان میں ذرا بے جوڑ نظر آتا ہے۔ باوجود اِن کمزوریوں کے خواجہ صاحب کا رتبہ اردو ادب میں نہایت بلند اور وقیع ہے۔ اُن کے چیدہ کلام میں آسمانی موسیقی کا

لطف آجاتا ہے اور بعض اوقات تو یہہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم علوی کی پاک روح مقدس صحائف سازی ہے ۔

مذہبی رہنمائی دینی نقطۂ نظر سے بھی خواجہ صاحب کی خدمات کچھہ کم قابل لحاظ نہیں آپ کے معتقدین کا سلسلہ وسیع ہے اور ادنی سے ادنی، اعلی سے اعلی طبقوں کے لوگ اس میں شامل ہیں تعلیم ریا و تعصب کی آمیزش سے پاک ہے ذات پات اور مذہب کے تفرقوں کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہندو، مسلماں، عیسائی، موسائی۔ سب کو اللہ کا پرستار سمجھتے ہیں۔ دہلی کے رہنے والے اُن کی روحانیت کے زیادہ قائل نہیں۔ افسوس ہے اس خطہ میں تقلید کا مادہ بالکل نہیں۔ اگر خواجہ صاحب پنجاب میں ہوتے تو غلام احمد صاحب قادیانی سے زیادہ پجنے لگتے ۔

سیاسی حیثیت خواجہ صاحب کے سیاسی مضامین ہم کو بہت سطحی نظر آئے ہیں۔ اور گو زمانہ کی رواں کو پولیٹکل جدوجہد کے گھاٹ پر لے آئی ہو۔ لیکن یہہ اس فن کے مرد میداں ہیں۔ "توحید" وغیرہ اخبارات کی ادارت "اللہ اکبر" والے مضمون کی ضبطی اور بات ہے اور سیاسی رہنمائی دوسری شے۔ ہماری رائے میں تو خواجہ صاحب ادبی اور ہندی دائروں ہی میں اپنی کوششوں کو محدود رکھیں تو زیادہ مفید کام کرسکیں گے اور ان طبقوں میں اُن کی دعوت کو لبیک کہنے کے لئے بہت سی مخلوق آرزومند ہے ۔

مصورِ فطرت کا خطاب خواجہ صاحب کے کلام اور طرز عمل کے مدح سراؤں نے اور بہروپیے کی پھبتی نہ اُنہیں "مصورِ فطرت" کا خطاب دیا ہے اور یار لوگوں نے "بہروپیے" کی پھبتی اڑائی ہے۔ ہمیں تو دونوں میں کچھہ فرق نظر نہیں آتا، اور سچ پوچھو تو بہروپیے کا لقب "مصورِ فطرت" سے زیادہ بوجدار معلوم ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب

اس لقب سے چڑ نہ جائے گا کیونکہ سب میں بڑے بہروپئے تو وہ جگت گرو ہی ہیں جو اپنی پاک پوتھی میں اپنے آپ کو کل یوم ہو فی شان" کے لقب سے تعبیر کراتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سے خطاب۔ حسن نظامی! تم کو خدا سلامت رکھے!! تمہارا وجود اس زمانہ میں بہت مغتنم ہے دہلی والے تمہاری قدر کریں یا نہ کریں لیکن ملک میں اور بیرون ملک میں تمہارے قدردان موجود ہیں۔ اُردو زبان تمہاری مدد کی محتاج ہے اُس کے ادب کو وسعت دو۔ مذہبی حلقوں میں تمہاری تعلیم اور طرز زندگی مقبول ہوا ہے۔ خانقاہوں سے کاہلی اور بیکاری کو مٹاؤ، جفاکشی اور نیک نیتی اور مستقل مزاجی کا سبق پڑھاؤ۔ سیاسی رہنمائی کٹھن کام ہے، راستہ پیچ در پیچ ہے اور خطرناک گھاٹیاں اور دشوار گذار چٹانیں حائل ہیں، پھونک پھونک کر قدم رکھو۔ تمہاری منڈلی انجان ہے اور اُن کی جانوں کی ذمہ داری تم پر ہے۔

غزل

وہ جنون کیسا جو ہو محتاج احسان بہار

از ناخدائے سخن تاج الشعراء نوح ناروی جانشین حضرت داغ دہلوی

یہ چمن بندی یہ لُطفِ ساز و سامان بہار
اے زہے رنگِ گلستان اے زہے شان بہار

کیا ہمیں ہو اعتبارِ شوکت و شانِ بہار
آج مہمانِ خزاں ہیں کل تھے مہمانِ بہار

یوں ترقی ہو جنون میں وقت ہیجانِ بہار
اپنا دامن چھوڑ کر تھاموں گریباں بہار

محو حیرت ہو گئے ہم دیکھ کر شانِ بہار
یہ بہار بوستاں ہے یا گلستانِ بہار

جوش کھا کر خون کا دل کی رگوں میں دوڑنا
کچھ دنوں پہلے سے ہو جاتا ہے اعلان بہار

باغ میں آئی خزاں پہنچا پیام رخصتی
رہ چکے اتنے دنوں تک ہم بھی مہمان بہار

پتے پتے پر بنے ہیں مختلف قسموں کے نقش
یا خطِ گلزار میں لکھا ہے فرمانِ بہار

۴/۷۰۵ بنگلہ ایوب شاہ لاہور۔

مقتل غریب مغربی معمل خانے

یہہ ۵۰ صفحے کا رسالہ ہمارے عنایت فرما جناب سید طالب علیصاحب طالب الہ آبادی نے بے زبان مظلوم زندہ جانوروں کے چیر پھاڑ کے خلاف لکھا ہے اور ان مظالم کا اظہار کیا گیا ہے جو ان بے بس مخلوق کے اوپر تحقیقات کے پردہ میں آئے دن کئے جاتے ہیں دردناک واقعات کا اظہار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس بے رحمی کا تدارک کیا جاوے۔ سید طالب علیصاحب شاعر ہیں اُن کا قلب ان غمناک واقعات سے متاثر ہے جس طرز اور انداز میں یہہ کتاب لکھی گئی ہے اگر یورپ میں شائع ہوتی تو جناب مولف کو ہزاروں ہمخیال مل جاتے جو عملاً انکی حمایت کرتے معمل خانے میں غریب مینڈک کے ساتھہ جو سلوک ہوتا ہے ملاحظہ طلب ہے۔

"مخصوص مختصر ڈبہ سے ایک مینڈک نکالا جاتا ہے۔ مقرر اپنی جراحی سنگین کی تیز نوک یوں چبھو دیتا ہے کہ کھال اور کاسۂ سر سے ہوتی ہوئی مغز تک اتر جاتی ہے اور کہتا ہے کہ میں نے دماغ کو معطل کر دیا ہے۔ اب مینڈک کو کسی قسم کا درد محسوس ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد تیز قینچی لیکر (استخوان صلیبیہ) ریڑہ کے نازک چھلوں کا چنن ہار کاٹنا شروع کرتا ہے۔ مقراض کا سرا کھال میں چبھنا ہی تھا کہ بسمل تڑپ اُٹھا سمٹے ہوئے اعضا نہایت پھرتی سے پیچھے کی طرف پھیلا دیے گئے اور ننھے ننھے ہاتھہ پاؤں سے اس قینچی کو سرکا دینے کی کوشش کی گئی۔ مگر نازک دست دپا شل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کھر کھر کی حھین آواز آتی ہے اور ریڑہ مدور بدری چھلے دو نیم ہو کر ہلالی ہو جاتے ہیں۔

آپ نے خیال فرمایا ہوگا کہ مینڈک کے منے منے ہاتھہ پاؤں بھی شیر خوار بچوں سے کتنے ملتے

جلتے ہین اور حسرت نصیب آنکھوں سے کتنی رحم خیز نگاہ آپ سے دوچار ہوجاتی ہیں ؟ قیمت صرف ۴؍ ہے۔ الناظر بک اجنسی لکھنؤ سے ملسکتا ہے،

تحفہ خوشتر جناب خوشتر کی ادارت اور حضرت وسیم کی نگرانی مین گورکھپور سے جاری ہے رسالہ میں ایک دو مضمون اور عموماً طرحی غزلیں ہوتی ہیں۔ غزلیات زیادہ تر جناب وسیم کے شاگردوں کی ہوا کرتی ہیں۔ طرز قدیم کے ایک گلدستہ ہے جو غزل گوئی کو نصب العین قرار دے چکا ہے۔ بعض غزلین نہایت پاکیزہ اور بعض اشعار نہایت عمدہ ہوتے ہین۔ قیمت سالانہ عہ؍ ہے۔ یقینی بہت سستا ہی ملنے کا پتہ :۔ منیجر تحفۂ خوشتر گورکھپور

جام جہان نما اڈیٹر جناب محمد اسمٰعیل صاحب پانی پت پنجاب اخلاقیات کے تحت میں آنکھین سینکنا کے عنوان سے قابل اڈیٹر نظارہ بازی کی مذمت کرتے ہوئے ناظرین سے (غالباً خریداران رسالہ سے) مخاطب ہوتے ہیں۔ ناظرین مجھے معاف فرمائیں! آپ میں سے بہی بہت ہون گے جن کا محبوب ترین مشغلہ یہی خبیث عادت ہوگی..... کیا میں امید رکھوں کہ آپ یک قلم اس عادت بد کو ترک کردینے کی بہادرانہ جرارت فرمائینگے اگرچہ یہہ سچ ہے (ع) چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہہ کافر لگی ہوئی.........

...... کیا خوب کہا ہے جناب اکبر الہ آبادی نے

حُسن جس چیز میں ہو دیکھہ کے خوش کر دل کو ؎

بند کرلے مگر آنکھین۔ اگر انسان میں ہو ؎

اسی سلسلہ میں اس سے ذرا کچھہ اوپر فرماتے ہیں کہ عزت جانے۔ بدنام ہونے اور گنہگار

بننے کے علاوہ اس فعل قبیح میں اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں مثلاً سڑک پر نظر اٹھائے آپ جا رہے ہیں کہ یکایک ٹھوکر لگی گر پڑے سخت چوٹ آئی۔ چار دن تک پلنگ پر سوار رہے اور خدا نخواستہ گاڑی یا موٹر کی جھپٹ میں آ گئے تو جان ہی سے گئے"

اسی نمبر میں یہہ بھی اعلان ہے کہ آئندہ پرچہ نام بدل کر شائع ہوگا یعنی بجائے جام جہان نما کے "کائنات" کے نام کو اختیار کرے گا۔ اس فیصلہ کو ہم بھی پسند کرتے ہیں۔ قیمت بھی گھٹا کر بجائے ۲ کے ۱۲ کر دی ہے اس قیمت پر رسالہ نہایت ارزاں ہے۔ ملنے کا پتہ پانی پت مینیجر کائنات۔

طلیعہ جس کا انگریزی ترجمہ اسکاؤٹ ہے۔ اس نام سے جدید رسالہ علی گڑھ سے زیر ادارت جناب مکرمی عبدالشکور صاحب ایم اے۔ بی۔ ٹی علیگ اور جناب سید سبط نبی صاحب نقوی ماہ گذشتہ سے جاری ہوا ہے۔ شمع کی تقطیع پر خوشخط چھپائی حجم اردو ۵۸ صفحے اور دس صفحے انگریزی مضامین کے لئے مخصوص ہیں۔ زبان سلیس ہے اور مضامین دلچسپ اور مفید ہیں علم الطلیعہ اور اس کا طریق تعلیم بسراغ رسانی، بندشیں باندھنا اور انکا صحیح استعمال دلچسپ معلومات وغیرہ پڑھنے کے قابل مضامین ہیں۔ اس رسالہ کی ضرورت تھی افسوس ہے کہ اس کاؤٹس کی اہمیت کو ابھی ملک نے اچھی طرح نہیں سمجھا ہے یقین ہے کہ طلیعہ کے ذریعہ سے عام ناواقفیت رفع ہوگی اور اس کاؤٹس کے لئے ایک سچے رہبر اور دوست کا کام دے گا۔ اُمید ہے کہ رسالہ کامیاب ہوگا اور لائق اڈیٹران کی محنت، ور توجہ ملک مین عزت اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اس میں جابجا تصاویر بھی ہیں قیمت سالانہ للعہ ہے نمونہ کا پرچہ ۶ر پتہ اڈیٹر طلیعہ علی گڑھ۔

سرتاج

یہہ ریویو ادھورا رہجائیگا اگر رسالہ سرتاج کا ذکر نہ کیا جائے اُس کے آنریری اڈیٹر نواب قمر جہان بیگم صاحبہ تعلقہ دار ہیں اور اڈیٹری کے فرائض جناب امتیاز فاطمہ بیگم صاحبہ عرف حاجیہ تاج بیگم انجام دیتی ہیں جو ابتک ۷ نمبر ملتان سے دور افتادہ مقام سے بہ حسن وخوبی شائع فرما چکی ہیں۔ تقطیع بڑی لکھائی چھپائی روشن اور قیمت سالانہ للعہ ششماہی ۱۲؍ نمونہ کا پرچہ قیمت ۴؍ ہے۔ سرتاج تعلیم یافتہ خواتین کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے اور واقعی تعلیم یافتہ خواتین کے مطالعہ کے قابل ہے جس قدر مضامین ہیں وہ علاوہ عورتوں کی دلچسپی کے مردوں کے لئے بھی دلچسپ ہیں۔

سودمند علیگڈھ

جناب مولوی طفیل احمد صاحب نے مسلمانوں کی عسرت اور قرضہ کی زیر باری سے متاثر ہو کر رسالہ سودمند کا اجرا فرمایا ہے اور اس کی ادارت خان بہادر سید جعفر حسین صاحب پنشنر انجینیر کے سپرد فرمائی ہے واقعی سود کی بدولت ہندوستان میں لاکھوں خاندان برباد ہوگئے اور ابھی تک لاکھوں ہی اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ نہ ان کا دم نکلتا ہے اور نہ سود کی رسی ٹوٹتی ہے۔ ہم نے تینوں نمبر نہایت توجہ سے دیکھے ہیں اور بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ اپنی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے یہہ رسالہ افسوسناک کمی کو رفع کرتا ہے یقین ہے تمام ہندوستان میں مقبول ہوگا اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ لوگ سود کے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھہ لیں اور اپنے روپیہ سے فائدہ حاصل کریں اور خود سود کا شکار نہ ہوتے پائیں۔ مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ لائق مدیر فرماتے ہیں کہ چند سال میں جب قوم میں ان امور کا چرچا ہوجائے گا اور زیادہ قابل اصحاب اور قوم کے اعلی پایہ کے تجارات اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے تب اس رسالہ کا کام ختم ہوجائیگا۔ حجم ۳۲ صفحے

چندہ سالانہ چار روپیہ ملنے کا پتہ :- اڈیٹر صاحب رسالہ سودمند علیگڈھ۔

شذرات

اگست ۲۵ء میں صوبہ بمبئی کی مسلم خواتین کی کانفرنس پونا میں منعقد ہوئی تھی اس کی صدر شیخ عبدالقادر صاحب سابق جج ہائیکورٹ پنجاب و پریسیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی بیگم صاحبہ تہیں۔ کانفرنس کی روداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم خواتین بہی ترقی کے میدان میں قدم بڑہا رہی ہیں اور باوجود تعلیم نسواں کی بدنظمی و قلت کے ہمارے ملک میں ایسی بی بیاں موجود ہیں جو اپنے مستقبل اور اپنی صنف کی بہبودی کے لئے خود تدبیر سوچ سکتی ہیں ملک اور قوم کے لئے یہہ نیک فال ہے۔ سب سے زیادہ قابل قدر اُن کا پونا میں ایک مجلس کا قائم کرنا ہے جسکی اغراض میں نادار اور مفلوک الحال عورتوں اور بچوں کی امداد اور کمیٹی کے اسپتالوں اور مدرسوں کا معائنہ وغیرہ بہی شامل ہے۔ لائق ستائش یہہ امر بہی ہے کہ اس کمیٹی میں ہر قوم و مذہب کی ہمدرد بی بیاں ممبر ہو سکین گی

زنانہ اسپتالوں اور اسکولوں کا مسئلہ عظیم الشان قومی مسئلہ ہے اور جب تک مقامی خواتین مستعد ہوکر اس طرف متوجہ نہ ہوں گی اصلاح اور ترقی کی کوششیں مشکور نہ ہوں گی اب تو شہروں میں افلاس کا رونا ہے اور جس ضبط اور صبر کے ساتھ ہندوستان کی عورتیں شدائد افلاس اور امراض کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اُس کی نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتی ہے۔ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا فرض ہے کہ وہ پونا کی اسکیم کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہر شہر مین ایسی سوسائٹیاں

قائم کریں اور اپنی بدقسمت بہنوں اور اُن کے بچوں کی مصیبتوں کی تخفیف کا باعث ہوں بہترین اور مفید ترین خدمت انسانی یہہ ہے کہ مفلوک الحال اور پریشان انسان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ آئندہ وہ اپنی مدد آپ کر سکے۔

رزولیوشن ہائے پاس شدہ کے متعلق ہم آئندہ لکھیں گے جو خواتین نے کانفرنس میں خاص دلچسپی لی تھی اُن کے اسمار مبارک حسب ذیل ہیں:-

محترمہ شریفہ بیگم صاحبہ (مسز حامد علی صاحب) لیڈی ابراہیم رحمت اللہ۔ لیڈی عمر حیات خان مسز ہدایت اللہ صاحب۔ مسز دہلوی صاحب۔ بیگم صاحبہ اظہر علی مسز سلمان طیب جی۔ مسز کمال فیض صاحبہ۔ مسز امیر حسن صاحبہ۔ مسز ہمایوں مرزا۔ مسز جلال شاہ۔ نفیس دلہن صاحبہ۔ یہہ امر موجب مسرت ہے کہ محترمہ شریفہ بیگم صاحبہ نے جو کانفرنس مذکورہ کے استقبالیہ کمیٹی کی صدر تھیں اور خزانچی بھی ہیں اپنی روشن خیالی اعلیٰ دماغی قابلیت اور وسیع اخلاق سے کانفرنس کو نہایت کامیاب بنایا۔ آپ طیب جی خاندان کا روشن ستارہ ہیں اور علاوہ اردو فارسی کے انگریزی و فرانسیسی زبان میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ اور مصوری میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپکے جلیل القدر شوہر مسٹر حامد علی آئی۔ سی۔ ایس۔ سندھ میں کلکٹر ہیں۔ دلی دعا ہے کہ یہہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور جو رزولیوشن اُس نے پاس کئے ہیں وہ مستورات کی فلاح وبہبود کی شاندار ابتدا ثابت ہوں۔

ڈاکٹر سن یاٹ سین (ولادت ۱۸۶۶ء وفات ۱۹۲۵ء) جو چین کی ریپلک (جمہوریت) کے بانی اور اول پریسیڈنٹ صدر تھے اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں۔

"اپنے ملک کی خدمت میں زندگی گذارنے کے بعد میرے پاس بہت کم ذاتی اثاثہ بچا ہے میری ملکیت صرف ایک مکان چند کتابیں اور کچھ کپڑے ہیں جن کو اپنی بیوی سنگ چن لنگ

کے لئے بطور یادگار چھوڑتا ہوں۔ بچوں کو کچھ نہیں دیتا ہوں کیونکہ وہ پرورش پاکر بڑے ہوگئے ہیں اور اپنی مدد آپ کرسکتے ہیں کیا میں اُن سے توقع رکھوں کہ وہ اس نقصان کی تلافی کردیں گے اور میرے کام کو جاری رکھیں گے؟"

یہ اقتباس ہے دنیا کے مشہور و معروف ہستی کی وصیت کا جس نے تمام عمر طرح طرح کی تکالیف اور مصائب برداشت کرکے اپنے ملک کو طوق غلامی سے آزاد کیا اور بالاخر خدمت وطن کی نذر ہوگیا۔ ڈاکٹر موصوف کو دنیا مین ذاتی عروج حاصل کرنے اور دولت کثیر جمع کرنے کے بہت سے مواقع تھے۔ مگر اس قدیم تہذیب و تمدن کے سپوت نے اپنی عمر معمولی حیثیت سے گذاردی، اور بے نظیر ایثار سے نہ صرف اہل چین بلکہ تمام ایشیا کے لئے ایک روشن۔ منور اور پاک مثال قائم کردی!

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
حافظؒ

مولیناؔ صفی لکھنوی نے بھی خوب کہا ہے:۔

بنائے خیر قائم کرکے گہری نیند سو رہنا
اسی کو اہل ہمت ہمت مردانہ کہتے ہین

تحقیقات کی دنیا تنگ نہیں ہے۔ برسوں کی جد و جہد اور سالہا سال کے جھگڑوں کے بعد یورپ کے باشندوں کی بڑی تعداد تسلیم کرچکی تھی کہ انسان کے جدّ اعلیٰ ہونے کا شرف بندر کو حاصل ہے۔ لیکن حال میں پروفیسر وُڈ جونز نے بمقام میلبورن واقعہ اسٹریلیا دوران

لیکچر میں ڈارون کے قول کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ "فی الواقع بندر انسان کا مورث نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی اولاد ہے!"

سر آرتھر اسمتھ ووڈ ورڈ نے اس نظریہ سے اختلاف کیا۔ اور جواباً لندن کے مشہور اخبار مارننگ پوسٹ کے نامہ نگار سے بیان کیا کہ جو لوگ اس مسئلہ پر کافی غور کر چکے ہیں اُن کی رائے ہے کہ انسان اور بندر کا مورث ایک تھا۔ اس کی اولاد میں سے جو جنگلوں میں جا بسے بندر ہو گئے۔ اور جو میدانوں میں رہ آئے وہ انسان بن گئے"

بہرکیف پروفیسر ووڈ جونز کی جدید تحقیقات نے علمی دنیا میں ایک کھلبلی پیدا کر دی ہے۔ لیکن ہندوستان میں غالباً یہ اطلاع تعجب کے ساتھ نہ پڑھی جائے گی۔ کیونکہ یہاں کے بوڑھے بلکہ اُن کے بزرگ ایک نو وارد قوم کے متعلق شروع ہی سے یہ حکم لگا چکے تھے اور شاید ان خیالات کے بزرگوں کا اب بھی فقدان نہ ہو۔

ماہ جون کی سپلائی
۲۴۰۰ جوڑے
KROMO FOOT WEAR
REGD
KANWAR REGD BRAND
RS. 4/8
SHOES GET BY POST.
مردانہ
OFFICE REGD BRAND
RS. 7/4/-
کیا آپ یہی چاہتے ہیں کہ
تے مضبوط ہوں۔ ناپسند ہوں تو واپس کریں دوسرے بدل کر اپنے خرچہ سے
بھیجدیں۔
مرمت مفت کردیں۔
تیاری کے وقت آپ کی ہدایات متعلق رنگ اعلیٰ چمڑہ۔ شیپ۔ کٹ۔ سول ہیل
وغیرہ کا خاص طور سے خیال رکھیں۔
آرڈر دینے کے وقت پیشگی رقم نہ بھیجیں۔
جناب من ہم کو سب منظور ہیں آرڈر دیجیے حکم کی تعمیل ہوگی۔
مینیجر آگرہ شو سینڈیکیٹ۔ آگرہ۔
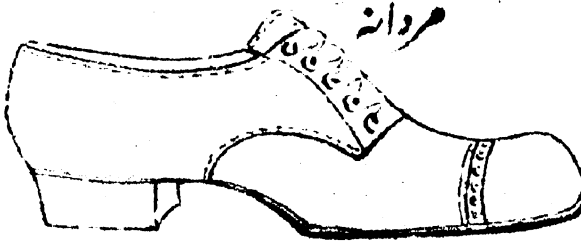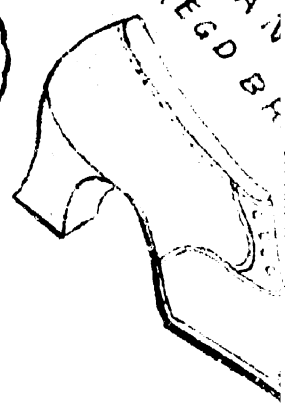
دی ٹرنکس کمپنی لمیٹڈ شاہ گنج آگرہ

ہمنے اس کارخانہ کو مختصر سرمایہ پر شروع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں ہمارے کارخانے نے اسقدر ترقی کی کہ لمیٹڈ فرم ہو گیا ہے۔

نہایت پائدار جوتے مردانے۔ زنانے و بچگانے ہر قسم کے اور ہر شیپ سائز کے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو نہایت کم قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں اور بلحاظ قیمت و پائداری کے ہم اپنی ذمہ داری پر فروخت کرتے ہیں۔

علاوہ جوتوں کے چمڑے کا ہر قسم کا سامان ہمارے یہاں بنتا ہے۔ مثلاً بستر بند۔ سوٹ کیس۔ اٹیچی کیس۔ کاڈکیس پیٹیاں وغیرہ وغیرہ جو اپنی خوبصورتی اور پائداری کے لئے مشہور ہیں۔

ہمارے یہاں آگرہ کی مشہور دریاں اور قالین بھی ہیں۔ ہر سائز اور ہر وضع کی دریاں جانمازیں و قالین تیار ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے نرخ پر آپ کو دوسری جگہ مال نہیں مل سکتا۔ ہر سامان ہماری ذاتی نگرانی میں تیار ہوتا ہے اور جو آرڈر آتے ہیں اُن کی سختی کے ساتھ پوری پابندی کیجاتی ہے۔

ہم آپکو یقین دلاتے ہیں کہ آپ ہمارے یہاں سے مندرجہ بالا سامان منگا کر بہت سی پریشانیوں سے بچیں گے اور ہمارے طریق کاروبار و مال کے آپ ہی ایک مستقل طور پر خریدار بنجائیں گے

المشتہر

سید حسن احمد جعفری منیجنگ ایجنٹ دی ٹرنکس کمپنی لمیٹڈ شاہ گنج آگرہ

باہتمام منشی عبدالعزیز خان عزیزی پریس آگرہ میں چھپا

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

سٹرایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹرایٹ لا آگرہ

دارالاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد وضوابط

۱۔ رسالہ "شمع"، ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے

۲۔ ۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمایئے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ ذیل روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک ۱۰؍ ہے ممالک غیر سے عہ؍۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہوسکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہوسکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت وترسیل زرچندہ واجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمایئے۔

۷۔ مضامین وخطوط متعلق مضامین اڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمایئے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اس لیے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمایئے اور وی۔ پی منگواکر واپس نہ فرمایئے۔

شرح اُجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	سعہ ؍	عسہ ؍	مہ عسہ ؍
چھ ماہ	عسہ ؍	عسہ	للعہ عمہ ؍
ایک سال	مہ عسہ ؍	سہ ؍	للعہ ؍

المشتہر: منیجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

نمبر ۳ — فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء — جلد ۲

اگست کے شمع میں غلط اطلاع کی بناپر مولانا گرامی صاحب کے حالات کے تحت میں لکھا گیا تھا کہ محترمی علامہ سر محمد اقبال صاحب قبلہ اُن کے عزیز شاگرد ہیں۔ ہم کو علامہ سر محمد اقبال صاحب نے جو تحریر اس بارے میں بھیجی ہے اُس کا اخیر جملہ درج کرتے ہیں "مولینا گرامی میرے نہایت عزیز دوست ہیں اور میں اُن کا ادب و احترام کرتا ہوں مگر تلمذ کا تعلق اُنسے مجھے کبھی نہیں ہوا شاگردی خواہ کسی کی ہو کوئی عار کی بات نہیں۔ مگر جو بات خلاف واقع ہو اس کی تردید ضروری ہے اسی واسطے میں نے یہ چند سطور لکھنے کی جرارت کی ہے"

ہم کو اپنی غلطی پر افسوس ہے اور علامہ موصوف سے خواستگار معافی ہیں ہمکو بہت زیادہ خوشی اس امر کی ہے کہ محترمی علامہ موصوف نے ہماری اس غلطی کا بُرا نہ مانا اور ان کی بزرگی کی یہ بھی ایک دلیل ہے۔ خطا از خورداں وعطا از بزرگان۔

شمع

بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء

ناکام آرزو

مسٹر محمد عبد الشکور ایم اے، علیگ

(۱)

ڈاکٹر۔ (نبض دیکھکر) داروغہ جی! آپ گھبرائین نہیں، آپ جلد اچھے ہو جائین گے!

رشید۔ اسوقت ٹمپریچر کیا ہے؟

ڈاکٹر نے آنکھ کے اشارہ سے رشید کو خاموش کیا، اور اس کے چہرہ سے وحشت برسنے لگی۔

مریض۔ اف، میں چلا...... اف، ظالم! مار ڈالا!

ڈاکٹر۔ نہیں داروغہ جی! آپ پریشاں بالکل نہ ہون، آپ بہت جلد اچھے ہو جائینگے

میاں رشید! یہہ دوا دو گھنٹہ بعد پلانا، اس کی ایک خوراک میں ابی پلاچکا ہون، میں ٹھیک چار بجے اُن کو دیکھنے آؤنگا۔ اس سے قبل اگر میری ضرورت ہو تو بے تکلف بلا لیجئے۔

مریض۔ مگر میری حالت تو ہر لحظہ خراب...... خراب...... ہوتی جاتی ......ہے،

ڈاکٹر۔ آپ شام تک اچھے ہوجائیں گے، یہہ کہکر ڈاکٹر رخصت ہوا، اور مریض بیہوش ہوگیا۔ ڈاکٹر یہہ تشخیص کر چکا تھا کہ مریض پر بیہوشی طاری ہونے والی ہے۔

ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد پردہ ختم ہوا، اور رشید کی ماں جس کا چراغ آرزو بادسموم کے خطرناک اور مہلک جھونکوں سے گل ہو رہا تھا بستر مرگ تک آئی، اور مریض کو بیہوش پاکر زار و قطار رونے لگی، ڈاکٹر کے مایوسانہ خیالات وہ ابی سن چکی تھی، اور اُس کے فضائے تخیل پر آنے والے اندوہناک مصائب و آلام کی وحشت ناک صورتین اپنا بھیانک اور تاریک پرتو ڈال رہی تہیں، رشید بھی اپنی ماں کو روتا دیکھکر نالہ و فریاد کرنے لگا، اور آن کی آن میں گُل گھرنے ایک ماتم کدہ کی صورت اختیار کر لی، پبلک ہیلتھ کے تمام سربرآوردہ اطبا اور ڈاکٹر ایک روز قبل یہہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اس مریض کیلئے غفلت اور بیہوشی موت کا پیام ہوگی، چنانچہ اس امر کی انتہائی کوشش کی گئی کہ ان پر غشی نہ طاری ہونے پائے، مگر آسمان کے بسنے والے اصحاب فکر و دانش، و ارباب حل و عقد کو بھی منظور تھا کہ غریب سکینہ کی لہلہاتی کھیتی یون تخت و تاراج ہو، اور اُس کی آرزوے حیات اسی طرح منقطع کیجائے، چنانچہ اس واقعہ کے دو روز بعد اُس غریب کی تمناؤں کا مجسمہ اور اُس بیکس کے ارمانوں کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا، اور موت کے ایک ہی مہیب اور خوفناک حملہ نے اس گھر کا عیش و آرام، سرور و انبساط، اور برکت

و راحت ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردئے کائنات کا گوشہ گوشہ سکینہ کی نظروں میں تیرہ و تار کیا، تھا جس کا اقبالمند اور رشاد کام شوہر قضا کے ایک اچانک حملہ میں آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے آغوش لحد میں جا سویا۔

(۲)

شیخ احمد حسین کا وطن مالوف خیر نگر تھا، مگر اُن کی ساری عمر ریاست نرائن پور میں بسر ہوئی، اُن کے والد اس ریاست کے پرانے نمک خوار تھے، مدت العمر اسی فضا میں سررشتہ دار رہے، اور پنشن لینے سے قبل ہی راہی ملک عدم ہوئے، شرفا نوازی اور غربا پروری کے خیال سے نواب صاحب نے اُن کے چھوٹے بیٹے احمد حسین کو اول اول نائب محافظ دفتر مقرر کر دیا تھا، ان کے بڑے بھائی نے انٹرنس پاس کرکے پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کرا لیا، کئی سال تک تھانہ دار رہے اور نیک نامی کیسا تھ اپنے خدمات انجام دیتے رہے، بہت ہوشمند اور کامیاب افسر تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور پہلی بھیت میں وبائی مرض میں مبتلا ہو کر تین چار روز کے اندر ہی اندر ابدی خواب غفلت میں محو ہو گئے،

شیخ صاحب بالطبع نہایت چالاک اور لسان تھے، ریاست کی آب و ہوا میں دو پشتیں گزر چکی تھیں، وہاں کے نشیب و فراز اور سیاسی چالبازیوں سے کماحقہ، واقف تھے، ترقی کرتے کرتے آٹھ دس سال میں مجسٹریٹ ہو گئے، اور حکام بالادست میں اُن کا شمار ہونے لگا، حضور پر نور بھی اُن پر خاص طور سے مہربان تھے، اور اُن کی قدر و منزلت فرماتے تھے، مگر نرائن پور کی پبلک ان کو نہایت حریص، خود پسند افسر شمار کرتی تھی جو بلا بہ پیش

اپنے ذاتی مفاد اور عارضی عیش و آرام پر اپنے احباب اور اعزا کے جائز حقوق اور ضروری مطالبات قربان کر دیتے تھے، اور شب و روز اپنی زیبائش و آرائش اور تن پروری میں مصروف رہتے تھے؛

بھائی کی علالت اور موت کی خبر سنکر شیخ صاحب چار و ناچار با دل ناخواستہ بیلی بھیت پہونچے، بھاوج کی تسلی تشفی کی، رشید کو پیار کیا اور بہلایا، اور غور و فکر کے بعد فرمانے لگے "اب سب کو خیر نگر چلنا چاہیئے، اور آبائی مکان کو آباد کرنا چاہیئے، وہ مدت سے خالی پڑا ہے، ہر سال مرمت کرانا ہوتی ہے، آپ کے رہنے سے ہم سب کو اطمینان رہیگا"

غریب سکینہ اس تجویز پر کیا لب کشائی کر سکتی تھی، اور اُسے خیر نگر جانے میں کیا عذر ہو سکتا تھا جہاں وہ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ اور جس کی لطیف آب و ہوا کو وہ فطرتاً نہایت محبت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی، مگر اُس کو اپنے بیٹے رشید کی تعلیم کی طرف سے تردد تھا، بیلی بھیت میں وہ انگریزی مدرسہ میں تعلیم پاتا اور خاطر خواہ ترقی کر رہا تھا، مگر خیر نگر جیسے پیش پا افتادہ کور دہ میں درس و تدریس کا کیا چرچہ ہو سکتا تھا، اُس نے چاہا کہ شیخ صاحب خود اس نکتہ پر متوجہ ہوں، یہہ اس کی حمیت اور غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہاں خود سائلانہ حیثیت سے ان کے سامنے یہہ معاملہ پیش کرے، اور احسانات کے وزنی بوجھ سے سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے، شیخ صاحب نے اُن کے اخراجات کیلئے پندرہ روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ کیا تھا، اور اُس کی مختصر سی جائداد بھی اسیقدر منافع کی حامل تھی، اس نے اپنی زندگی میں اُن کی حرص و آز کی داستانین اور حکایات اکثر سنی تھین، اس لئے وہ اس مسلہ پر بالکل خاموش رہی، اور نہ شیخ صاحب اس طرف متوجہ ہوئے۔

(۳)

مجسٹریٹ صاحب نہایت دنیا دار اور چالباز آدمی تھے، جن جن افراد خاندان کی امداد کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا اُن کی وہ نہایت ناکافی مدد کرتے، اور ہمہ وقت احسان جتاتے رہتے تھے، مثلاً ماں کو پانچ روپے ماہوار دیا کرتے، اور اس دریا دلی اور فیاضی کے راگ ہر جگہ گایا کرتے تھے، چنانچہ بھاوج وغیرہ کو خیر نگر پہونچا کر آئے اور اپنی رفیق زندگی سے اپنی اولو العزمی اور بلند حوصلگی کی داد لینے لگے اور اسی سلسلہ میں یہہ گفتگو بھی ہوئی

بیوی۔ "کہو! سب خیر سلا سے خیر نگر پہونچ گئیں"؟

مجسٹریٹ۔ "ہاں سب خیریت سے پہونچ گئیں"

بیوی۔ "بھلا سب کو پہلے یہاں لانا چاہیے تھا"؟

مجسٹریٹ۔ "اس میں بڑی دقت اور زیر باری ہوتی"

بیوی۔ "تو پھر مجھے جلد پہونچاؤ، وہاں جانا بہت ضروری ہے"

مجسٹریٹ۔ "بار بار رخصت کہاں مِلسکتی ہے۔ دو دن کو باہر چلا جاتا ہوں ریاست کا کل کاروبار درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اب کی پھیرے میں تمہیں لے چلونگا"

بیوی۔ "میں کہوں۔ اب رشید کیا پڑھتا ہے .... بڑا بھولا اور پیارا بچہ ہے باپ کے پیچھے بہت روتا ہوگا"

مجسٹریٹ۔ "اب وہ آٹھویں جماعت میں ہے۔"

بیوی۔ "خیر نگر میں تو پڑھنے کا سلسلہ نہیں ہوسکتا"

مجسٹریٹ۔ "ہاں! گاؤں میں کیا بند وبست ہوسکتا ہے!"

بیوی۔ "تو پھر اُسے یہاں بلا لو"

!! (خاموشی)

شیخ جی خاموش تھے، تیرہ برس ساتھ رہنے کے باوجود بیوی شیخ جی کے مزاج سے پورے طور پر واقف نہ ہو سکیں چنانچہ اکثر شیخ صاحب اپنی مخصوص ہوسناکی کی جولانگاہ میں اپنی شریک حیات کو بہت پیچھے پاتے تھے، اُن کا یہ قاعدہ کلیہ تھا کہ ہر اس شخص کی مدد کرنا چاہئے جس سے قریب یا بعید مستقبل میں منفعت کی توقع ہو، بھاوج کی ہمدردی صرف اس وجہ سے جائز کی گئی تھی کہ بھائی کی مختصر سی جائداد کے ولی وہ خود بن سکیں، مگر رشید کو نرائن پور بلاکر اپنے پاس رکھنا اور تعلیم دلوانا کس توقع کے وجہ سے گوارا کیا جاتا۔ ....

شیخ جی نے بیوی سے پان مانگا، پان کھایا، اور اس مسئلہ کے ہر پہلو پر خاموش غور و فکر کرتے رہے، ان کا زرخیز دماغ کام کر رہا تھا، مگر زبان بند تھی،

بیوی نے یہ دیکھکر سکوت اختیار کیا، تقریباً دس منٹ بعد یکایک چہرہ پر سرخی دوڑنے لگی، اور ہونٹوں پر برق تبسم جلوہ گر ہوئی، گویا دریائے فکر سے کوئی دُرِ شاہوار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

شیخ جی "رشید اب گیارہ برس کا ہے، اور محمودہ اب ساتویں میں لگی ہے"

بیوی "ہاں! محمودہ کی عمر سات سال کی ہے"

شیخ جی "رشید میرے خیال میں اچھا لڑکا ہے، اگر اس کی تعلیم اچھی ہوئی تو خوب ترقی کرے گا"

بیوی "ہاں! کیوں نہیں"

شیخ جی "سرکار رابد قرار میری بڑی عزت کرتے ہیں، اگر یہ کسی قابل ہو گیا تو سرکار ضرور اس کے ساتھ سلوک کریں گے"

[illegible] یہ عارضی جدائی گو اس عہد
رنج و محن میں سکینہ کو بہت شاق گذری، مگر دل کے اندرونی گہرائیوں میں سرور و انبساط
کی لہر موجود تھی۔ اُس کی اب اولین آرزو صرف یہ تھی کہ رشید پڑھ لکھ کر کسی قابل
ہو جائے۔

(۴)

ایک ہفتہ بعد رشید نرین پور میں آ گیا اُسکی اولین جد و جہد یہ تھی کہ وہ اپنے مزاج اور
افعال کو اس جدید ماحول کے مطابق بنائے اور بعد ازاں حصول علم میں سرگرم کار ہو
جو اُس کے قیام کا واحد مقصد تھا، رشید معمولی لڑکا نہ تھا اُس کی گفتار رشستہ اور
سنجیدہ تھی، اور اُس کے وجود میں ایک ایسی حسرت آمیز جاذبیت پنہاں تھی جو نامعلوم
طریقہ سے لوگوں پر افسون ہو سکتی تھی، اس کے کلام میں شیرینی اور حلاوت تھی اور اُسکے

میں آنا جانا بند کرادیا، لڑکی اب [illegible]
ہی لکھتا پڑھتا اور سوتا تھا، مگر یہ پابندی ایک ایسی کاری ضرب تھی جس نے یکایک رشید
کے ہوش وحواس میں فتور ڈالدیا، اور وہ بیمار ہوکر آغوش مادر میں جا پہونچا جس کے سایہ عاطفت
میں دنیا کی تمام کلفتیں راحتوں سے اور تمام زحمتیں رحمتوں سے تبدیل ہوجاتی ہیں، وہ کونسا
زریں موقعہ ہوگا جب جنس ارض خاکی کو "ماں" کے مذہبی اور علوی صفات نے اولیں
مرتبہ سرفراز کیا، اور ایثار وقربانی کی محیر القول اور لطیف ترین مثال خودغرض انسان
کے سامنے پیش کی،

اس جدائی اور مفارقت کے بعد محمودہ کو پتہ چلا کہ وہ کس شدت سے رشید کو
چاہتی ہے اور کیسے لاینحل گرداب بلا میں گرفتار ہوچکی ہے، وہ چاہتی تھی کہ وہ اس دام
ہلاکت سے نکل آئے، اور اس بار گراں سے سبکدوش ہوجائے، عقل کہتی تھی کہ ہاں

ایسا کر اور ضرور ایسا کر، مگر جذبات کے عظیم الشان تلاطم کو دیکھکر وہ بدحواس ہوجاتی تھی عقل اُسکو دہو کا دیتی تھی کہ تو اس دلدل سے نکل سکتی ہے، مگر اس کا ناتوان دل، اُس کا مجروح قلب اور اس کا دردمند جگر اس کی عقل کے نیصلہ کو رد کر دیتے تھے، اور وہ اس کشمکش پنہاں سے متاثر ہوکر جھنجھلا اٹھتی تھی، محمودہ پورے بیس گھنٹہ اس دار و گیر میں مبتلا رہی، اور آخر کار بسم اللہ مجریہا و مرساہا کہکر کشتی دل کو تلاطم خیز موجون کے سپرد کر بیٹھی، اور آنکھین بند کرکے رشید کے دامان خیال کو پکڑنے لگی،

اس اہم فیصلہ نے محمودہ کی زندگی میں ایک نئے دور کا افتتاح کیا، کچھ تو چڑہتی جوانی، اور کچھ دردعشق نے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اَب تک وہ ایک الہڑ اور بے پروا بچہ تھی، اس کی رفتار و گفتار میں ایک بے خبر سادگی پائی جاتی تھی، مگر اَب اس کے جسم لطیف پر بالیدگی اور نمو کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک نئی ہستی میں منتقل ہو رہی ہے، اُس کی چال میں بجائے طفلانہ سبک پن کے ایک قیامت خیز مستانہ انداز آگیا، وہ رات دن میں سینکڑوں مرتبہ اپنے آپ کو نہایت غور و خوض سے دیکھتی اور نئے نئے انقلابات پاتی تھی اس کی جوانی نہایت طوفاں خیز اور دلولہ انگیز جوانی تھی جس میں عشق کی صاعقہ ریزیاں اور شرربازیاں مخفی تہیں اور جس کی وجہہ سے اُس کی اُمنگیں اور تمنائیں اُبلنے لگی تہیں، ایک حسن عالم سوز اس کے گرد چہایا ہوا تہا جو ایک دنیا پر دیوانگی کا عالم طاری کر رہا تھا،

عورت دام محبت میں بڑے تامل کے بعد گرفتار ہوتی ہے، مگر اسیر ہوجانے کے بعد اس کی الفت کی گہرائیاں اور اُس کے عشق کی کرشمہ سازیاں ہوش ربا ہوجاتی ہیں، وہ اول تو کسی کو چاہتی نہیں مگر جب اُس کا طائر دل مائل پرواز ہوجاتا ہے تو اُس کی

قربانیوں کے لئے کل عالم بھی ناکافی نظر آنے لگتا ہے۔ محمودہ نے ہزار چاہا کہ اس مخمصے میں نہ پھنسے، مگر یہہ اُس کی قدرت اور اس کے دائرۂ امکان سے باہر تھا۔

(۵)

رشید "اماں! ایک دو تین۔۔ گھوڑے۔۔۔ ہاتھی۔۔۔ ریل۔۔۔۔۔۔ یکہ"

ماں "رشید۔۔۔ ہوش میں آؤ"۔۔۔ (آنکھوں سے آنسو پونچھکر) "بیٹا! کیا کہتے ہو؟"

رشید "محمودہ۔۔۔۔ اُف۔۔۔۔ سپاہی آرہا ہے"

ماں۔ (روکر) "بیٹا! میں واری جاؤں۔۔۔۔۔ تیرا کیسا جی ہے؟"

رشید "محمودہ۔۔۔ پیاری محمودہ۔۔۔۔۔ یہہ تو کنواں ہے!"

ماں۔۔۔۔ خاموش مگر نہایت مضطرب اور بدحواس۔

رشید "آسماں پر بادل آرہے ہیں۔ چلو مدرسہ چلو۔ چکردتی کا گھنٹہ آگیا۔ لاؤ سوال نکال لوں۔ مگر محمودہ کہاں چلی گئی۔ اُسے پہلے بلالاؤ۔ اُف" خیرنگر پہونچکر رشید کی حالت اول دل بہت خراب ہوئی۔ بخار کی شدت میں اُسے ہزیاں ہوگیا اور کرب و بے چینی میں دیوار و در سے سر پھوڑنے لگا غریب ماں کے زخمی دل پر بچہ کی علالت نے نمک پاشی کی، شوہر کا صدمہ از سر نو تازہ ہوگیا اور اپنی فلاکت اور عسرت کی بھیانک تصویر نظروں کے سامنے آگئی دنیا اس کی نگاہوں میں تاریک تھی، اور اس کے عالم خیال میں صورت یاس ہی بن بنکر بگڑ جاتی تھی۔ خیرنگر میں ڈاکٹر اور طبیب ملنا ناممکن تھا مسجد کے بنگالی پیش امام تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک میں مشہور تھے اُن کو بلایا گیا انھوں نے کچھ پڑھ کر پانی پر دم کیا جو رشید نے پیا، اور جو اس کے سر اور پیشانی پر ملا گیا۔ ایک شبانہ روز کی جھاڑ پھونک کے بعد رشید کی طبیعت سنبھلی، اور اس کا ہزیاں اور بخار دور ہوا، مگر نقاہت اور کمزوری

اس قدر بڑھ گئی تھی کہ پلنگ چھوڑنا دوبھر ہوگیا تھا، دو تین روز کے بعد رشید کی حالت روز زیادہ بہتر ہوئی اور ضعف بھی دور ہونے لگا۔ بیکس ماں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور اپنے لاڈلے بچہ کی ترقی عمر و دولت و علم و ہنر کے لئے درگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر دعائیں مانگیں اُسکے بعد وہ بیٹے کے پاس آئی۔

ماں :"رشید! اب تمہارا کیسا جی ہے؟"

رشید:"اب اماں! میں اچھا ہوں۔"

ماں۔ (غرور اور مسرت سے سرشار ہوکر) خدا کا شکر ہے، اب صرف کمزوری باقی ہے وہ بھی جاتی رہیگی...... بیٹا! تم نے دو تین روز بہت تکلیفیں اُٹھائیں"۔

رشید:"ہاں! اماں جاں! اَب میں کل تک چلنے پھرنے لگوں گا"۔

ماں:"نا بیٹا۔ ابھی چلنے پھرنے کا نام نہ لینا۔ ابھی ذرا اور جان آجائے"۔

رشید:"اماں! اَب مجھے جلد نرائن پور جانا چاہیے۔ پڑھنے کا بہت ہرج ہو رہا ہے، پندرہ روز میں ششماہی امتحان ہونے والا ہے"۔

ماں:"بیٹا صحت مقدم ہے۔ خدا تندرستی دے تو سب کچھ پڑھ لینا"۔

رشید:"اماں! اگر میں یہاں زیادہ قیام کروں گا تو امتحان میں شریک ہوسکوں گا"۔

ماں:"بیٹا۔ ابھی تو اس قابل کہاں ہے کہ سفر کرسکے اور وہاں پہونچکر پڑھ سکے"۔

رشید:"اماں۔ بس تم مجھے پرسوں روانہ کردینا ورنہ میری ساری محنت بیکار جائیگی"۔

ماں:"بچے! خدا سے ڈر۔ تو ابھی بھیجنے کے قابل ہے"۔

اس کشاکش میں رشید نے تین روز گذارے۔ اَب وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ

تھوڑی دور خود چل سکے، ماں کی محبت آمیز تیمارداری نے اس کے ساتھ وہی کیا جو موسم برشگال کی دھواں دھار بارش کسانوں کی اُمیدوں کے ساتھ کرتی ہے مگر اس کے باوجود اس کے دل کو کسی عنوان سے صبر و قرار نہ تھا، وہ مضطرب اور پریشان رہتا تھا اُسکی نگاہیں پُرنم اور چہرہ زرد ہو گیا تھا، اور بیخودی کے عالم میں وہ سرد آہیں بھرنے لگتا تھا۔ ماں نے اپنے بچہ کا ہر بیان در دگوش دل سے سنا، اور یہ ماجرائے عشق اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور سب کچھ سمجھ لیا، اُس نے کچھ یوں ہی چاہا کہ وہ اس ارتقائے محبت میں سدِّ راہ ہو جائے، مگر عملاً اُس نے خاموشی اختیار کی، اور رشید کو رخصت کرنے میں مصروف ہو گئی، وہ سنگین معاملات تو درکنار معمولی سے معمولی واقعات کے متعلق بھی رائے جلد قائم کر سکتی تھی وہ ابتک فیصلہ نہ کر سکی کہ اس معاملہ میں اُسکی کیا پوزیشن ہونا چاہیئے؟

رشید کی دلی مراد پوری ہوئی ایک اسیر محبت کی طرح اُس کے خیالات اور اسکے جذبات کوئے حبیب میں مدفون تھے جہاں اُس نے کسی کے حنائی ہاتھوں میں اپنا طائر دل قید ہوتے اور پھڑکتے دیکھا تھا، اور اُف بھی نہ کی تھی اُس نے جلد جلد اپنا اسباب درست کیا اور شاداں و فرحاں نرائن پور کی طرف عازم سفر ہوا۔

(۶)

شیخ جی۔ (اپنی شریک حیات سے) رشید آگیا، تم نے دیکھا۔

بیوی۔ ہاں میں نے گھر میں بلایا تھا۔ بہت کمزور اور دبلا ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری میں اُسنے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

شیخ جی۔ چہرہ بالکل پیلا ہے۔

بیوی۔ اَے ہے اُس کو دیکھکر بڑا جی کڑھتا ہے۔

شیخ جی۔ مگر مجھے ایک اور اسرار معلوم ہوتا ہے۔

بیوی۔ وہ کیا؟

شیخ جی۔ میرے خیال میں اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے۔

بیوی۔ اَے ہے!

شیخ جی۔ اور اسی ادھیڑبن میں اُس کی یہہ حالت ہوئی۔

بیوی۔ خدا سے ڈرو۔

شیخ جی۔ تمہیں تو آج تک عقل نہ آئی، گھر میں سارا فساد برپا ہے، اور تم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی ہو۔

بیوی۔ اے تو بتاؤ تو کیا ہوا؟

شیخ جی۔ جس روز سے رشید گیا تھا محمودہ نہایت نڈھال اور مضمحل ہو رہی تھی اُس پہ عجیب وحشت اور سراسمگی طاری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو سال کی بیمار ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم سب آئے، مگر کسی کو کچھہ پتہ نہ چلا۔ اب رشید آ گیا ہے، دونوں مسرور ہیں۔

بیوی۔ ہاں یہہ تو ٹھیک ہے۔

شیخ جی۔ مگر میں یہہ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے بال کہاں سفید کئے، اس عمر میں بھی عقل نہ آئی۔

بیوی۔ بھلا میں یہہ باریکیاں کیا جانوں؟

شیخ جی۔ ہاں یہہ نکتے تو ہم جانتے ہیں، ریاست کا سارا انتظام و اہتمام اِن ہاتھوں (اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرکے) سے ہوتا ہے،

بیوی۔ تو پھر اب کیا کرنا چاہیئے، نکاح کر دو،

شیخ جی۔ نکاح کی بھی تم نے خوب کہی، اول تو رشید نے انٹرنس بھی پاس نہ کیا دوسرے دونوں کم عمر ہیں، تیسرے میں ایک اور فکر میں ہوں، اگر وہ کام ہو گیا تو پھر ریاست کی مالک و مختار تم ہو جاؤ گی

بیوی، وہ کیا فکر ہے؟

شیخ جی۔ ابھی تمہیں کیا بتاؤں، میں خدا جانے کس سوچ میں ہوں۔ فی الحال میں رشید کو لاہور بھیجے دیتا ہوں۔ انٹرنس پاس کر کے وہاں کالج میں داخل ہو جائے گا، اور عشق کی نیرنگیوں سے ہمیں نجات ملجائیگی۔

اس فیصلہ پر بیوی نے صاد کیا، اور شیخ جی کپڑے پہن کر کچہری سدہارے مگر محمودہ اور رشید کو اس سازش کی مطلق اطلاع نہ ملی کہ ان کے درمیاں ایک وسیع خلیج حائل ہونے والا ہے،

(۷)

نواب صاحب نرائن پور اپنے شاہی شان و شوکت کے ساتھ دیوان خاص میں دلق افروز ہیں جو راز و نیاز کی باتوں اور خفیہ سیاسی مباحثوں کے لئے مخصوص ہے۔ اسوقت صرف شیخ صاحب ایک خاص حسن عقیدت کے ساتھ اُن کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں، مگر رعب شاہی نے اُن کی نگاہوں کو زمیں دوز کر دیا ہے اور وفاداری و اطاعت شعاری کے جذبات کی ایک خاص لہر ان کے دل میں موج زن ہے،

نواب صاحب! "شیخ صاحب! آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں، ہم آپ کے کام اور رویہ کو پسند کرتے ہیں"!

شیخ جی "سرکار ابد قرار کی دولت کو دعا دیتا ہوں۔ غلام کی خوش نصیبی ہے کہ سرکار والا تبار نے مجھے اور میرے کام کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ سرکار کی جو بخششیں مجھ ناچیز پر ہوئیں ہیں اُن کا شکریہ ادا کرنا میرے امکاں سے باہر ہے، استاد غالب نے یہ مصرع میرے ہی لئے لکھا تھا۔ ع

"تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے"

نواب صاحب "بیشک، آپ کی ذات پر ریاست کو کامل اعتماد ہے"

شیخ جی "سرکار کی نوازش خسروانہ، حضور پر نور کا نمک کھاتے کھاتے میں بڈھا ہوگیا اس وقت غلام کی صرف ایک آرزو ہے اگر سرکار کی عنایت ہو" ع

"تو مجھ پہ خواہش جنت حرام ہوجائے"

نواب صاحب "وہ کیا؟ فرمائیے"

غلام زادی کی عمر اب چودہ سال کی ہے، اس غلام کی ساری کمائی یہی ہے، اگر سرکار اُسے اپنی کنیزوں میں داخل فرمالیں تو میرے فخر و نازش کی کوئی حد نہ رہے، سرکار کے اقبال سے کوئی اور ایسی آرزو نہیں جو پوری نہ ہوئی ہو۔ بس ایک تمنا یہی باقی ہے کہ سرکار کے دامان دولت سے ایک قسم کی مستقل وابستگی ہوجائے۔

نواب صاحب "ہم اس امر کا سوچ کر جواب دینگے، مگر ہمیں آپ کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا خیال ہے"

شیخ جی "خدا تعالےٰ سرکار کو با اقبال رکھے۔ ہم جیسے خدام بھی سرکار کے سایہ رحمت میں میٹھی نیند سوتے ہیں اور جان و مال کو دعائیں دیتے رہتے ہیں"

شیخ جی نرائن پور میں درجہ اول کے درباریوں میں تھے۔ بچہ بچہ کو اُن کی عظمت اور

اقتدار کا پورا پورا احساس تھا اور خود نواب صاحب گو قدرے متلون مزاج تھے مگر انہوں نے شیخ جی کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوتا کہ نائب محافظ دفتری سے حاکم بالا دست ہوئے اور ہر قسم کے اختیارات اُن کو سپرد کیے گئے مگر شکم آزکو "یا قیامت پر کند یا خاک گور" چاہتے تھے کہ اور قربت حاصل ہو اور شاہی خاندان کی فہرست میں اُن کا نام نامی نظر آنے لگے اسی غرض سے انہوں نے چاہا کہ محمودہ کو اُن کی غلامی میں دیدیں اور نواب صاحب کی ذات مجمع الصفات سے ایک دائمی اور مستحکم تعلق پیدا کر لیں تاکہ آئندہ کسی قسم کا خطرہ اُن کے خرمن ہوش و حواس پر بجلی نہ گرا سکے،

(۸)

شیخ جی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ خطرہ ضرور ہے۔ مگر نا امید نہیں ہونا چاہیے۔

سکینہ۔ (چشم پرنم کے ساتھ) مگر حالت نازک ہوتی جاتی ہے۔ (آہ سرد بھر کر) جو خدا کو منظور ہو، مجھے رہ رہ کر وہم ہوتا ہے . . . . . (رونے لگتی ہے)

شیخ جی۔ اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے،

سکینہ۔ کسی کے سینہ پر آرے چلیں، کسی کے کلیجہ میں چھری بھونکی جائے۔ اُس سے یہہ کہنا کہ رو نہیں یہہ ایک اور ظلم ہے، میری آرزوں کا مرکز صرف رشید ہے، جب وہ یوں بیمار ہو اور ڈاکٹر حکیم اُس کی حالت خراب بتائیں تو میں نہ رووُں۔

یہہ دلدوز باتیں سنکر شیخ جی علحدہ ہو گئے اور بیکس سکینہ ایک اضطراب اور درد کی حالت میں اس پلنگ کی طرف بڑھی جہاں اُس کا لال، اُس کی بیکسی کا سہارا، اسکی آنکھوں کا نور پڑا تھا، اور انفلوئنزا کی شدید تکالیف میں مبتلا ہو کر رداے ہستی کو چاک

جاک کر رہا تھا،

سکینہ۔ رشید بھیّا! کیسا جی ہے؟،

رشید۔ تم کہاں تھیں (کچھ وقفہ کے بعد) مہ.......... مجھے........... ام

.........اماں.........ا.........آ کے...... اکیلا....

سکینہ۔ (بات کاٹ کر) میں تمہارے چچا سے باتیں کر رہی تھی،

رشید........ ڈا...... ڈاک...... ڈاکٹر... کیا... کہتا ہے؟

سکینہ۔ (ایک اضطراری آہِ سرد کے ساتھ) ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

رشید۔ (مسکرا کر....) اچ.... اچھا؟

(یہ برق تبسم اُس بھولے چہرہ کے افق پر آخری مرتبہ نمودار ہوئی جو تبسم زیرلبی کی طلعت ریزیوں سے ہمیشہ منور رہتا تھا۔)

سکینہ۔!!! (ایک طویل خاموشی جو انتہائی) یاس کی حالت میں طاری ہو جاتی ہے۔

....

رشید۔ پیاری ماں! مجھے.......... اپ..... نی..... حا..... حا..... لت

خو..... خوب........ ما........ لوم........ ہے، پے........ یا... یا۔ ر..... ری

ام..... ا..... ام...... اماں...... خد...... خدا...... تم... تم

... ہارا...... محا...... محا...... محافظ ہے...... ہم... ہم...... تو

رُخ...... رخصت...... صت...... ہوتے...... ہوتے ہیں...... رم

...... ع..... محمو...... دہ...... سے..... سلا......

سلام...... کہہ...... کہہ دینا......،

سکینہ فرط یاس و حرماں سے بیتاب ہوکر رونے لگتی ہے، دو تین منٹ تک رشید اپنی بے رونق اور وحشت انگیز آنکھوں سے اپنی پیاری ماں کے چہرہ پر مایوسانہ اور مظلومانہ نگاہیں ڈالتا ہے اور مکان کے در و دیوار پر ٹکٹکی باندھ لیتا ہے، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر زبان یاری نہیں کرتی، ماں اس درد آفریں کشمکش کو دیکھکر رشید کو گلے سے لپٹا لیتی ہے، اور روتے روتے بیہوش ہو جاتی ہے

شیخ صاحب نے یہ ماجرا سنا، اور فوراً آدمی بھیجکر ڈاکٹر کو بلایا۔

ڈاکٹر۔ (رشید کا معائنہ کرکے) ان کا قلب بیحد کمزور ہے،

شیخ صاحب۔ جی ۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر۔ (بات کاٹکر) مرض اپنا اثر کر چکا، مگر وہ مہلک نہیں ثابت ہوا، اس وقت ان کو انتہائی کمزوری ہے، دل بیٹھا جا رہا ہے، نبض غائب ہے، خوف ہے کہ کہیں ہارٹ (قلب) اپنا فعل نہ چھوڑ دے۔

شیخ جی۔ کوئی مقوی دوا کا استعمال ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر۔ میں ایک (محرک دوا) لکھے دیتا ہوں، اُس کو پلائیے،

شیخ جی۔ بہت خوب،

ڈاکٹر صاحب رخصت ہوئے نسخہ آیا۔ پلایا گیا، رات ہو چکی تھی، رشید پر غفلت کی حالت طاری تھی، رات کی سیاہی اور وحشت انگیزی بڑھتی گئی، سب لوگوں نے اپنے بستروں کو گرمانا شروع کیا، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت رات کے دو بجے ہیں، آسمان پر تھوڑے سے بادل پھیلے ہوئے ہیں، ہوا کے جھونکے ایک بھیانک آواز کے ساتھ چل رہے ہیں آسمان کی منتشر

قندیلوں کو گل کرتی جاتی ہیں، اور نہایت گہری تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، مظلوم سکینہ رشید کے پلنگ کے پاس بیٹھی ہے، بار بار مریض پر نگاہیں ڈالتی ہے، اور دعائیں دم کرتی جاتی ہے، یاس و ناامیدی کا ایک طوفان خیز دریا اس کے دل میں قیامت برپا کئے ہوئے ہے جسکی کوہ پیکر موجیں اس کے ہوش حواس اور صبر وسکوں کو درہم برہم کر چکی ہیں، اسی بیقرار کن حالت میں موت کا ظالم فرشتہ اپنا آہنی عزم اور سنگین قلب و جگر لئے ہوئے اترتا ہے، اور ایک ستم پروردہ اریں سکینہ کے اس حسین گلستاں کو اجاڑ کر وحشت کدہ بنا دیتا ہے جس کی چمن بندی دیکھ دیکھ کر وہ نہال ہوتی تھی، اور جس کی مشکبار آب و ہوا اُس کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی تھی،

افسوس! سکینہ کا یہ آخری چراغ آرزو خاموش ہو گیا اور اس کا صبر و شکیب ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے گیا

(۹)

محمود ہ۔ (سخت اضطراب اور کرب کی عالت میں اپنے دل سے) قلب نہایت کمزور تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا۔۔۔ اُف (آہ سرد بھر کر) مرض مہلک ثابت نہیں ہوا، نواب صاحب والی منحوس بات نے اُن کا کام ختم کیا کیسی کیسی آرزوئیں اُن کی منقطع ہوئیں۔ ہائے افسوس میں زندہ ہوں اور وہ پیوند خاک ہو چکے۔ کیسی بے حیا اور بے غیرت ہوں، (رو کر) ابا جان کا ظلم و ستم، اُن کی جان۔۔۔۔۔۔۔۔ (سر چکرانے لگا) یہ بیوفائی، اکیلے گئے، اور اس کنیز کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کنیز سے بات ہی نہ کی، مگر نہیں۔۔۔۔ آخر وقت بھی مجھے یاد کیا، میں ہی بے حیا ہوں،۔۔۔۔۔ بھلا ابا جان نے نواب صاحب والی بات اٹھائی کیوں،۔۔۔۔۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں اور زبان خاموش

ہو جاتی ہے)

میرٹھ کی آبادی سے دور شب تار میں دو خانماں برباد عورتیں جا رہی ہیں، رات زیادہ جا چکی ہے، آسماں پر اودے اودے بادل ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، ستارے ایک ایک کر کے سب روپوش ہو چلے ہیں، ہوا سائیں سائیں چل رہی ہے، اس مقام پر نہ کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد، جنگلی جانوروں کی خوفناک آوازیں ایک وحشت کا عالم پیدا کر رہی ہیں، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجلی تڑپ تڑپ کر اپنی آسماں دوز اور خار اشگاف کڑک سے کل فضائے آسمانی کو سراسیمہ اور لرزاں کر دیتی ہے، اور یہہ دونوں مسافر کیلے کے پتوں کی طرح تھرتھرانے لگتے ہیں، نظام عالم کے ترکیب عنصری میں ایک ہیجان عظیم برپا ہے، ملائکہ آسمانی عرش سے اتر کر فرش تک آگئے اور اس ماجرائے محبت کا دل وجاں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، خود کیوپڈ اپنی اضطراری حرکت پر خجل ہے، اور تیر و کمان پھینکے ہوئے ششدر کھڑا ہے، زہرۂ فلکی حیرت اور بےچینی کی نگاہیں ڈالتی ہے اور سہم سہم جاتی ہے

یہہ دونوں عورتیں (جن میں سے ایک شکستہ دل محمودہ اور دوسری اس کی ضعیف انا ہے) ایک وسیع قبرستان میں جا کر دم لیتی ہیں، محمودہ اس تودۂ خاکی کی جستجو میں دیوانہ وار چکر لگا رہی ہے جہاں اس کے دل وجاں کا مالک موت کی نیند سو رہا ہے، اور اس کے کرب و درد اور نالہ و فریاد سے غیر متاثر ہے، تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ جھپٹ کر ایک قبر سے لپٹ جاتی ہے، اور ایک آہ فلک دوز کے ساتھ ساتھ بیہوش ہو جاتی ہے،

انا نے اُس کے چہرہ پر پانی چھڑکا، پھول سنگھائے اپنے دوپٹہ کے پلے سے پنکھا کیا، اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا، بہ ہزار وقت محمودہ کو ہوش آیا مگر اُس کے جسم کی لطافت، اُس کی آنکھوں کا رس، اس کی رفتار کی فتنہ انگیزی اور اُس کے گفتار

کی گل ریزی سب ہمیشہ کے لئے مفقود ہوچکی تھیں، اس کے جسد خاکی میں روح ضرور تھی، مگر پریشان حال اور مضطرب، اُس کے پہلو میں دل ضرور تھا مگر شکستہ و مجروح، وہ ہمیشہ کے لئے اپنے لطیف قہقہے، اور اپنے آبدار آنسو کھو چکی تھی، اس کے بعد پھر کبھی وہ نہ ہنسی، اور نہ روئی، ایک مستقل مہر سکوت اُس کے لبوں پر ثبت تھا، اور تمام جذبات عرصہ ہوا آنسو بنکر کافور ہو چکے تھے،

محمودہ اب تک میرٹھ ہی میں مقیم ہے، اور اس کا عزم بالجزم ہے کہ وہ اپنی ساری عمر اُسی جگہ ختم کر دیگی، اُس کی بلوریں کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہیں، اُس کا رنگین جسم زیورات و جواہرات کی زیبائش سے معرا ہے، اور چشم فلک نے پھر کبھی اُسکی پیشانی پر مانگ نہ دیکھی،

ہفتہ میں دو بار وہ اُس قبر پر جاکر فاتحہ خوانی کرتی ہے، اور یہی اُس کا عزیز ترین مشغلہ ہے۔

نظم

منظر باغ جہان کیون آج غم انگیز ہے ۔ اشک خونین کا تلاطم کیون قیامت خیز ہے
زخم جتنے دل میں ہیں ہر ایک حسرت ریز ہے ۔ کیون ہلال آسمان خنجر کی صورت تیز ہے
یہ لہو کس کا بہیگا عالم ایجاد مین

کیا کرون بہلا کے دل کو وہ بہلتا ہی نہین ۔ اشک بیخود ہے سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہین
قلب مردہ ہے کہ کروٹ تک بدلتا ہی نہین ۔ غیر داغ دل چراغ شام جلتا ہی نہین
چھا رہی ہے تیرگی دنیائے بے بنیاد مین

درد لاکھون اٹھکے بیٹھے دل کی یہ حالت نہ تھی ۔ زندگی تھی بار لیکن اسقدر نفرت نہ تھی
خون دل پینے کو پیتے تھے مگر رغبت نہ تھی ۔ ہنسنے والے زخم کی روتی ہوئی صورت نہ تھی
کچھ خوشی کی ہی جھلک تھی خاطر ناشاد مین

غم وہ اگلے سے نہیں یہ سازو ساماں اور ہے ۔ ہوشیار اے وحشت دل یہ بیابان اور ہے
چشم محزوں سے جو اٹھتا ہے وہ طوفاں اور ہے ۔ رنج دنیا اور ہیں یہ درد پنہاں اور ہے
یہ بیان غم نہ ڈھونڈو قصۂ فرہاد میں

سیکڑون نالے کئے ہان رازدار غم ہون مین ۔ ذکر کیا رونے کا ہم آوازۂ شبنم ہون مین
زلف احباب عزا کی طرح سے برہم ہون مین ۔ جب سے ہوش آیا اسیر حلقۂ ماتم ہون مین
عمر ساری کاٹ دی نالون مین یا فریاد مین

میرزا ثاقب لکھنوی

شاہان مالوہ

جناب مولوی مفتی امیر احمد صاحب علوی بی اے بی سی ۔ ایس رکن انجمن اردو لکھنؤ رکن دوامی انجمن اخوان الصفا
کاکوری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و جج نیمچ چھاؤنی سنٹرل انڈیا

گذشتہ سے پیوستہ

دوسرا باب

سلطان ہوشنگ غوری

بلند ہمت الف خاں کے دماغ میں ہوائے شاہی بھری ہوئی تھی ۔ وہ اپنے باپ سے اس تصور پر آزردہ ہوا تھا کہ بادشاہ دہلی کو اپنے علاقہ میں پناہ دیکر مراسم مہمانداری کیوں ادا کئے اور اس کے سامنے اس قدر عجز و انکسار کا کیوں اظہار کیا کہ افسری اور ماتحتی کا شبہہ ہوسکے ۔ جب محمود تغلق مالوہ سے رخصت ہوا تو اس نے باپ کو خطاب شاہی قبول کرنے پر آمادہ کیا ۔ مگر دلاور خاں کو سلطنت راس نہ آئی ۔ وہ چار ہی برس مطلق العنانی کا لطف اٹھا کر دنیا سے راہی ہوا اور اقبال مند بیٹے کے ۔لئے جگہہ خالی کر گیا ۔

الف خاں ۸۰۸ھ میں سلطان ہوشنگ غوری کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا ۔ امراء مالوہ اور ارا کین سلطنت نے اطاعت کی لیکن اساس دولت ابھی مستحکم نہ ہوا تھا کہ مظفر شاہ کے حملہ کی خبر ملی اور گجرات کی فوج دہار کے قریب پہونچ گئی ۔ دار السلطنت کی دیواروں کے پاس مالوہ اور گجرات کی پہلی جنگ ہوئی ۔ سلطان ہوشنگ نے بڑی دلیری سے

ملہ ۸۰۸ھ

مقابلہ کیا۔ فریقین نے جی توڑ کر کوشش کی۔ منظفر زخمی ہوا اور ہوشنگ گھوڑے سے گر پڑا نسیم فتح گجرات کے پرچم پر چلی۔ ہوشنگ قلعہ دہار میں محصور رہا اور جب وہاں بھی امن کی صورت نظر نہ آئی تو سلطان نے منظفر شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔

بادشاہ گجرات نے سلطان کو حراست میں لیکر اپنے بھائی شمس خاں کو نصرت خاں خطاب دیکر مالوہ کا حاکم مقرر کیا اور ہوشنگ کو بطور شاہی قیدی کے ہمراہ لیکر گجرات کو واپس ہوا۔ مالوہ کی دولت مندی نے نصرت خاں کی حرص و طمع بڑھائی۔ رعایا پر جدید ٹیکس لگائے گئے اور اسکے مظالم نے ملک میں بد امنی پیدا کر دی۔ نصرت نے بدحواس ہوکر دہار میں اپنا قیام خطرناک سمجھا اور گجرات کی طرف پسپائی شروع کی۔ دہار کی فوج نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور نصرت کے لشکر کا ایک حصہ تباہ کر دیا۔

مالوہ والوں نے فوری جوش سے نصرت کو نقصان پہونچایا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد منظفر شاہ کے بدلہ لینے کا خوف سوار ہوا اور دہار کو چھوڑ کر قلعہ مانڈو میں پناہ لی۔ دلاور خان متوفی کا بھتیجا موسیٰ خان ان جانبازوں کا سردار بنا اور گجرات سے مدافعت کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔

جب اس واقعہ کی اطلاع گجرات پہونچی تو ہوشنگ نے ایک خط اپنے ہاتھ سے منظفر شاہ کو لکھا جس کا مضمون یہہ تھا کہ :۔

”خداوند جہان و جہانیاں اس فقیر کے باپ اور چچا کی برابر ہیں۔ اہل غرض نے میری شکایت جو آپ تک پہونچائی ہے وہ خدا گواہ ہے کہ بالکل غلط ہے۔ اس زمانہ میں سنا جاتا ہے کہ امراء مالوہ نے خان اعظم نصرت کے ساتھ بے اعتدالی کی ہے اور موسیٰ خان کو سردار بنا کر ریاست پر دست تصرف دراز کیا ہے اگر یہہ فقیر قید سے آزاد کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ملک پھر واپس مل جائے“

مظفر شاہ کے پوتے شہزادہ احمد نے بھی ہوشنگ کی سفارش کی بادشاہ نے اپنے قیدی کو حبس سے نجات دیکر سلطان کا خطاب، عطا فرمایا۔ چتر سفید اور سراپردۂ سرخ سے ممتاز کیا اور اپنے پوتے کو حکم دیا کہ وہ ہوشنگ کے ساتھ فوج لیکر مالوہ جائے اور سلطان کو دوبارہ مالوہ کے تخت پر بٹھا آئے۔

شہزادۂ احمد سلطان کے ساتھ گجرات سے ۸۱۱ھ میں چلا اور بغیر کسی مزاحمت کے دہار تک پہونچگیا۔ دارالسلطنت فتح کیا اور سلطان کو تخت مالوہ پر متمکن کر کے گجرات واپس گیا ہوشنگ چند روز تک دہار میں مقیم رہا اور سرداران مالوہ کو ہموار کرتا رہا۔ بیشتر اراکین سلطنت مانڈو میں تھے اور وہاں سے اطاعت کے پیام بھیجتے تھے لیکن اپنے اہل و عیال موسیٰ خاں کے احاطۂ اختیار میں چھوڑ کر علی الاعلان سلطان کا شریک حال ہونا خطرناک سمجھتے تھے۔

ہوشنگ نے فوجی قوت درست کی اور مانڈو کا محاصرہ کیا۔ آدمی بہت ضائع ہوئے اور فائدہ کچھہ نہ نکلا تو اُس نے اپنے لشکر کو صوبہ کے دوسرے مقامات پر تسلط کرنے کے لئے منتشر کر دیا اور خود تھوڑی جمعیت کے ساتھ مانڈو کے سامنے خیمہ زن رہا۔ ایک رات موقع پاکر سلطان ہوشنگ کا چچازاد بھائی ملک مغیث مانڈو کے ایک نامی سردار ملک خضر کو ہمراہ لیکر قلعہ سے نکل آیا اور سلطان کی رفاقت قبول کرلی اس خبر سے موسیٰ خان ایسا مایوس اور دل شکستہ ہوا کہ بغیر لڑے بھڑے قلعہ مانڈو سلطان کے حوالہ کر دیا۔ اَب ہوشنگ مالوہ کا باقاعدہ بادشاہ ہوا تمام ملک نے اس کی اطاعت کی۔ ملک مغیث وزیر سلطنت مقرر ہوا اور بادشاہ کے عدل و انصاف کی داستانیں کوچہ و برزن میں مشہور ہوئیں۔

اسی زمانہ میں مشرق کے ایک بزرگ مخدوم قاضی برہان الدین جن کو بقول مولف گلزار ابرار "سیادت - ولایت - فضیلت اور مقبولیت میں والانسبی اور عالی حسبی کا بڑا درجہ حاصل تھا" مانڈو تشریف لائے اور سلطان ہوشنگ آپ کا مرید ہوگیا - بادشاہ کا عدل و انصاف پہلے ہی شہرت پاچکا تھا اب اُس کی درویش پرستی بھی مشہور ہوئی اور علما و فضلا گردہ گردہ دارالسلطنت مانڈو میں آآکر بسنے لگے

سلسلۂ قلندریہ کے سرگروہ حضرت سید نجم الدینؒ غوث الدہر جن کے شجرِ معرفت کی شاخیں ابتک جونپور - اعظم گڈھ - الہ آباد - لاہرپور اور کاکوری وغیرہم میں موجود ہیں - مدتوں سے سیاحی کر رہے تھے - حج و زیارات سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس آئے تو مانڈو میں گذر ہوا[1] منصف بادشاہ کی درویش پرستی اور نیازمندی نے قدم پکڑے "قلعہ شاہی سے پانچ میل جانب شمال قصبہ نالچہ کے قریب ایک تالاب کے کنارے آپ نے سکونت اختیار کی - کرامات ریاضات کی خوشبوئیں تمام ہندوستان میں پھیلیں اور فقرا دور دور سے آکر دارالریاست کے گرد جمع ہونے لگے -

شیخ یوسف بدہا ایرجی الملقب بہ مقتول العشق جن کے بزرگوں نے خوارزم سے ہند آکر قصبہ ایرج کو منور کیا تھا مانڈو تشریف لائے - انہوں نے خواجہ اختیار الدین عمر سے

---

[1] صاحب نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ اپنی تالیف میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت نجم الدین کا سال وفات ۸۳۷ھ ہے لیکن گلزار   ابرار میں سنہ وفات ۸۱۲ھ لکھا ہے - دونوں کو تسلیم ہے کہ حضرت کا وصال سلطان ہوشنگ غوری کے عہد میں ہوا جو ۸۳۸ھ میں دنیا سے راہی ہوا ہے اسلیئے مقدم الذکر روایت زیادہ صحیح ہے حضرت کے مزار مبارک پر ایک گنبد سلطان غیاث الدین خلجی نے جو ۸۷۳ھ میں تخت نشین ہوا بنوایا تھا لیکن اب وہ منہدم ہوگیا صرف چاردیواری باقی ہے ۱۲-

کتابی علوم اور قلبی کمالات کی تکمیل کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ پھر شیخ جلال الدین بخاری اور شیخ راجو قتال سے بھی فیوض حاصل کئے تھے۔ امام غزالی کی منہاج العابدین کا ترجمہ آپ ہی کی تالیفات سے ہے۔ شعروشاعری سے بھی ذوق تھا۔ صاحب گلزار ابرار لکھتے ہیں کہ سنہ ۸۳۴ھ میں آپ کی خانقاہ میں قوالی ہو رہی تھی۔ صوفیوں کی جماعت پر حالت طاری تھی کہ یکایک آپ کی روح عالم لاہوت کو پرواز کر گئی۔ آپ کی قبر وہیں خانقاہ کے صحن میں بنائی گئی اور سلطان ہوشنگ کے نامور جانشین محمود خلجی نے آپ کی قبر پر ایک عالیشان گنبد تیار کرایا۔ خدا اش خیر دہاد آنکہ این عمارت ساخت۔ غرض ان بزرگوں کی ہمت اور انفاس سحر خیزان کی بدولت سلطنت مانڈو کو استقلال میسر آیا اور سلطان ہوشنگ کا نام دنیا میں زندہ رہگیا لیکن بے فکری اور فارغ البالی اس مجاہد کو نصیب نہ ہوئی تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مظفر شاہ گجراتی کا ۷ ربیع الثانی سنہ ۸۱۳ھ کو انتقال ہوگیا اور گجرات سے جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ مظفر شاہ نے اپنے انتقال سے پیشتر شہزادہ احمد کو اپنا وارث اور جانشین نامزد کر دیا تھا۔ صاحب منتخب التواریخ کی روایت ہے کہ مظفر نے احمد کو اپنی زندگی ہی میں تخت پر بٹھا دیا تھا اور اس رسم کے ادا ہونے کے پانچ مہینہ سولہ روز بعد مظفر شاہ دنیا سے رخصت ہوا۔ بہرصورت دادا کی نیت یہ تھی کہ احمد کی سلطنت میں تنزلزل واقع نہ ہو اور وہ بغیر اختلاف کے مسند آرا ہو جائے۔ لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ مظفر کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کے بہت سے دعویدار پیدا ہوگئے۔ انہیں مدعیان حکومت میں سے ایک شہزادہ فیروز مرحوم مظفر کا بھتیجا تھا۔ بعض ارکین سلطنت نے اُس کے دعوے کی تائید کی اور اسکی بادشاہی کا اعلان کیا۔ فوجی قوت شہزادۂ احمد کے ساتھ تھی فیروز نے

سلطان ہوشنگ سے مدد مانگی اور مالوہ کا بادشاہ مظفر کے احسانات فراموش کر کے اور احمد کی مہربانیاں اور عنایتین بُھلا کر صرف اس شرمندگی کو مٹانے کے لئے جو گجرات کی پہلی لڑائی سے حاصل ہوئی تھی۔ باغیوں کا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا بشرطیکہ اس کو ایک لاکھ تنکہ[لہ] یومیہ ہر ایک کوچ کے لئے بطور مدد خرچ کے دیا جائے۔

اوہر ہوشنگ گجرات کی طرف روانہ ہوا اور اودہر احمد شاہ نے فیروز خان کے پاس اپنے وکیل پیام صلح لیکر بھیجے تھوڑی فوج بھی اُسکے مغلوب کرنے کو روانہ کی۔ فیروز دلاوری کے نشہ میں ہوشنگ کی آمد کا انتظار کئے بغیر اس فوج سے دست و گریبان ہو گیا اور شکست پاکر بروچ کے قلعہ میں مُحصور رہا۔ احمد شاہ کے وکیلوں نے فیروز اور اُس کے بھائی ہیبت خان کو جنگ میں طوالت دینے سے منع کیا۔ فوج کی بد دلی اور اسباب جنگ کی کمی دیکھکر شہزادوں کے بھی ہوش درست ہو گئے اور انہون نے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی احمد شاہ نے مروت و رحم کا برتاؤ کیا اور اُن کی قدیم جاگیرین بحال کر دین۔ سلطان ہوشنگ ابھی گجرات کے مشرقی حصہ میں لوٹ مار کر رہا تھا کہ احمد شاہ کو اپنے عزیزوں کی بغاوت سے اطمینان ہو گیا اور اُس نے ایک زبردست فوج ہوشنگ کے زیر کرنے کو روانہ کی۔ جس نے بادشاہ مالوہ کو دہار واپس جانے پر مجبور کیا۔ اس فتح کی یادگار میں احمد شاہ نے دریا سابرمتی کے کنارے وہ مشہور شہر آباد کیا جو احمد آباد کے نام سے مدتوں تک گجرات کا دارالسلطنت رہا اور جس کی بابتہ فرشتہ کا دعویٰ ہے کہ وہ[لہ] نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت

لہ زمانہ حال کے مروجہ سکہ سے آٹھ دس آنہ کے برابر ہوتا ہے۔

لہ "اگر گفتہ شود کہ در تمامی ہندوستان بلکہ در کل جہاں بآن عظمت و آراستگی شہرے موجود نشدہ مبالغہ نبودہ باشد"

تاریخ فرشتہ۔ کیفیت بادشاہی سلطان احمد شاہ گجراتی۔ ۱۲

شہر ہے -

فیروز کی بغاوت فرو کرنے کے بعد احمد شاہ نے راجہ جلوارہ پر حملہ کیا اور اس راجہ نے بھی سلطان ہوشنگ سے مدد چاہی - مالوہ کا سلطان گجرات پر حملہ کرنے کو بہانہ ڈھونڈھتا تھا فوراً آمادہ ہو گیا اور گجرات کے مشرقی حصوں کو پھر لوٹنا شروع کر دیا - احمد شاہ اُس کے مقابلہ کو بڑھا تو صوبہ کچھ میں بغاوت ہو گئی - احمد نے اپنی فوج کے دو ٹکڑے کئے - ایک حصہ سلطان ہوشنگ کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور دوسرے کو کچھ کی طرف بھیجا ہوشنگ گجراتیوں کی طاقت سے آگاہ تھا اس فوج کے آتے ہی دھار کی طرف واپس ہوا اور یہ گجرات کے مقابلہ میں اُس کی تیسری شکست تھی -

گجراتی فوج کا دوسرا حصہ جو کچھ کی طرف گیا تھا اُس نے باغیوں کو زیر کیا لیکن دشمنوں کا سردار شیر ملک نام راجہ گرنار کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا - احمد شاہ کو گرنار کا حصار دیکھنے کا شوق تھا - یہاں کے حکمرانوں نے کبھی مسلمانوں کی اطاعت نہیں کی تھی - شیر ملک کی پناہ دہی کا بہانہ لیکر بادشاہ نے گرنار پر حملہ کر دیا - راجہ کو شکست ہوئی اور وہ جوناگڈھ میں محصور رہا - بادشاہ نے اب بھی پیچھا نہ چھوڑا تو محاصرہ کی سختیوں سے عاجز آ کر راجہ نے خراج دینا قبول کیا اور اس طرح گرنار کا راجہ پہلی بار مطیع الاسلام ہوا -

اس عرصہ میں حاکم خاندس کے لڑکے ملک نصیر نے اپنے چھوٹے بھائی کی جاگیر پر قبضہ کر لیا بھائی نے سلطان مالوہ سے مدد مانگی اور شاہزادہ غزنی خان پندرہ سواروں کے ساتھ اسکی اعانت کو بھیجا گیا - غزنی خاں نے مابہ النزاع قلعہ فتح کر کے مظلوم بھائی کو دلا دیا اور اسکے بعد سلطان پور پر جو گجرات کا ایک ضلع تھا حملہ کر دیا - احمد شاہ کو خبر ملی تو وہ سلطان پور کی مدد کو چلا اور اُس کی آمد کی خبر پاتے ہی شہزادہ مالوہ فرار ہو گیا - ادھر جا پانیر نندوٹ

اور ایدر کے راجاؤں نے احمد شاہ کو مہم سلطان پور میں مصروف دیکھکر سلطان ہوشنگ کو فتح گجرات کے لئے بلایا اور ایسے ہوشیار راہبر اُس کی ہدایت کے لئے بھیجے کہ مالوہ کی فوج یکایک وسط گجرات میں داخل ہو جائے اور احمد شاہ کو خبر بھی نہ ہو۔ سلطان کو تین بار گجرات سے زک مل چکی تھی۔ اپنی رسوائی دور کرنے کے لئے وہ فوراً حملہ کرنے کو تیار ہو گیا اور سنہ ۸۲۱ھ میں چوتھی بار اس ہمسایہ صوبہ پر چڑھائی کردی۔ اُنکی رہنماؤں کی چالاکی سے ایسا چپ چاپ گجرات میں آیا کہ جب احمد شاہ شہزادۂ مالوہ کو سلطان پور سے بھگا کر مطمئن ہوا تو دفعتہً خبر ملی کہ ہوشنگ مہراس تک پہونچ گیا ہے اور سارا ملک خطرہ میں ہے۔ بلند ہمت بادشاہ نے ایک منٹ کے لئے بھی پس وپیش نہ کیا اور باوجود سخت بارش کے ایسی تیزی سے ڈبل کوچ کرتا ہوا اپنے دارالسلطنت کے قریب تک واپس آیا کہ ہوشنگ حیرت میں رہ گیا۔ سلطان نے اتحادی راجاؤں کو بُرا بھلا کہا اور احمد شاہ کے کوچ مقام کی خبر نہ ملنے کا اُن کو ذمہ دار قرار دیا مگر گجرات کی پوری فوجی قوت سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لئے ان فتنہ انگیز راجاؤں کو اُنکی قسمت پر چھوڑ کر مایوسی اور ناکامی کا سہرا باندھ کر مالوہ کی طرف پسپا ہوا۔

اب احمد شاہ سلطان ہوشنگ کی متواتر بدعہدیوں سے عاجز آگیا تھا۔ فوج کو تھوڑا آرام دینے کے بعد اُس نے مالوہ پر دھاوا کر دیا اور اُجین کے قریب بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے پہونچ گیا۔ کلیادہ کے محفوظ مقام پر سلطان ہوشنگ اپنی فوج لئے پڑا تھا اور لشکر کے گرد حفاظت کے لئے خاردار جھاڑیاں لگا رکھی تھیں۔ احمد شاہ نے ان کانٹوں کی پروا نہ کرکے فوراً حملہ کر دیا۔ اقبال اس کے ساتھ تھا۔ گجرات کا ایک ہاتھی مست ہو کر دشمن کی لائن میں گھس گیا اور اُس نے کانٹوں کو کچل کر حملہ آور دستہ کیلئے

راستہ صاف کر دیا جنگ کے آغاز ہی میں عزنی خاں شہزادۂ مالوہ ایک تیر سے مجروح ہوا اور اس کے زخمی ہونے سے مالوہ والوں میں کھلبلی مچی ایک منٹ کی غفلت میں لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ مالوہ کی فوج کو سخت ہزیمت ہوئی اور سلطان ہوشنگ گجرات کے لشکر سے پانچویں دفعہ شکست پاکر مانڈو کی طرف بھاگا گجراتیوں نے نالچہ تک اُس کا تعاقب کیا۔ ہوشنگ مانڈو کے قلعہ میں پناہ گزین ہوا اور اس حصار کا فتح کرنا دشوار سمجھکر احمد شاہ نے دہار کی طرف کوچ کیا وہاں سے اوجین جانے کا ارادہ تھا مگر برسات شروع ہوگئی اور مشیران سلطنت نے مالوہ کی فتح سال آئندہ تک ملتوی رکھنے کی صلاح دی۔
احمد شاہ آغاز ۸۲۲ھ میں گجرات واپس گیا مگر سال ختم ہونے سے پہلے ہی اُس نے دوبارہ حملہ کیا اور سلطان نے مدافعت کی قوت نہ دیکھکر اپنے وکیل پیام صلح لیکر احمد شاہ کے پاس بھیجے اور نذرانہ دیکر عاجزی سے صلح کی۔

گجرات کے لشکر میں ہاتھیوں کی کثرت تھی اور سلطان کے پاس ہاتی بہت کم تھے۔ ہوشنگ نے متعدد بار گجرات سے لڑکر دیکھا کہ ہاتی میدان جنگ میں بہت کام دیتے ہیں۔ اور گجرات سے کلہ بہ کلہ لڑنے کے لئے ہاتھیوں کی ایک کثیر تعداد مالوہ کے لشکر میں ہونا ضروری ہے۔ لہذا اُس نے گجرات سے دبکر صلح کرلی تاکہ وقت فرصت میں مشرقی علاقوں سے ہاتی مہیا کئے جائیں اور آئندہ لڑائی اُن تمام شرمندگیوں کا معاوضہ کیا جائے جو پانچ بار گجرات سے مقابلہ کرنے میں حاصل ہوئی ہیں

غرض گجرات کی سرحد سے مطمئن ہوکر سلطان نے مشرق کی طرف آنکھ اٹھائی اور قلعہ کھرلا پر جو برار کے ملک میں واقع تھا حملہ کردیا۔ وہاں کا راجہ نرسنگھ رائے پچاس ہزار آدمی لیکر مقابلہ پر آیا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد مالوہ والوں کو فتح ہوئی۔ راجہ

قتل ہوا۔ چوراسی ہاتھی اور راجہ کا خزانہ بادشاہ کے تصرف میں آیا۔ نرسنگھ راے کا لڑکا کرلا سے فرار ہوکر دوسرے قلعہ میں چھپا۔ مگر وہاں بھی امن کی صورت نہ دیکھ کر سلطان مالوہ باج گزار بن گیا اور ہوشنگ مال غنیمت لیکر مانڈو واپس آیا۔ اس فتح نے سلطان کے مشرقی علاقوں میں دھاک بٹھادی۔ مال غنیمت کے انبار نے دارالسلطنت کو دولت مند بنادیا اور علماے وقت نے اس جنگ کو جہاد اور سلطان کو غازی سمجھکر ہوشنگ کی ہردلعزیزی میں چار چاند لگادیے۔

سلطان کا چچازاد بھائی ملک مغیث جو ابتدا میں ہوشنگ کے استحکام سلطنت کا ذریعہ ہوا تھا اس وقت تک ریاست مالوہ کا دست و بازو تھا۔ اس کا اقبالمند لڑکا ملک محمود جس کی صورت سے بلند اختری کے آثار ہویدا تھے سلطان کو بہت عزیز تھا۔ ۸۲۲ھ میں اس لڑکے کو خطاب خانی عنایت ہوا۔ اور یہ فرمان صادر ہوا کہ آئندہ سے یہ لڑکا لڑائی میں ہمرکاب رہا کرے اور اس کا باپ دارالسلطنت میں رہکر امور مملکت کو انجام دیا کرے۔ قلعہ کرلا کی فتح میں یہ شریک تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ راجہ کے مقابلہ میں ہوشنگ کی مہتم بالشان کامیابی اسی بااقبال کے یمن قدم کا ثمرہ تھی ورنہ اس سے پہلے کسی لڑائی میں سلطان مالوہ کو ایسی ناموری حاصل نہ ہوئی تھی۔

کرلا کی فتح نے سلطان کی ہمت بڑھادی اور ۸۲۵ھ میں اس نے ایک ایسی عجیب وغریب کارروائی کی جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں دریافت کرنا مشکل ہے۔

مالوہ سے بیسیوں منزل دور اوڑیسا کے جنگل میں ہاتھیوں کی افراط تھی اور مشہور تھا کہ جاجنگر[1] کے راجہ سے بہتر کسی والی ملک کی سرکار میں ہاتھی نہیں ہیں۔ ہوشنگ ایک

---

[1] جاجنگر اوڑیسا کا دارالحکومت تھا اب یہ ایک قصبہ ہے اور اس کو جاج پور کہتے ہیں۔

ہزار منتخب سواروں کو ہمراہ لیکر سوداگروں کے بھیس میں اس راجہ سے ہاتھی خرید کرنے گیا۔ مختلف قسموں کے گھوڑے اور بیش قیمت اجناس تجارت ساتھ لیکر یہہ مصنوعی تاجروں کی جماعت اڈیسہ پہونچی۔ دستور کے مطابق نووارد سوداگر کی آمد کی اطلاع راجہ کو پہونچائی گئی اور سرکار سے حکم ہوا کہ اسباب کا ملاحظہ راجہ بذات خاص کرے گا اور جو اجناس پسند ہونگی اُن کی قیمت یا تو نقد ادا کیجائے گی یا معاوضہ میں ہاتھی دئے جائینگے۔ ملاحظہ کے لئے ایک دن مقرر ہوا اور وقت معینہ پر اسباب تجارت زمین پر پھیلایا گیا۔ اتفاق سے آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا سلطان نے ملازمان ریاست سے کہا کہ اسباب سایہ میں رکھا جائے کیونکہ پانی برسا تو یہ بیش قیمت سامان خراب ہو جائے گا۔ نوکروں نے نہ مانا اور مصر ہوئے کہ جب تک مہاراج اجناس کا ملاحظہ نہ فرمالیں کل اسباب اسی طرح زمین پر پھیلا رہے اور گھوڑے زین کسے ہوئے صف بہ صف کھڑے رہیں خدا خدا کرکے مہاراج کی سواری آئی اور اسیوقت ایک پر شور آندھی چلنا شروع ہوئی جلوس کے ہاتھی بگڑ گئے اور سلطان کا اسباب پامال کر ڈالا ہوشنگ پہلے ہی سے غصہ میں تھا اب قیمتی اجناس کی پامالی نے دنیا اس کی آنکھوں میں سیاہ کردی اور اُس نے اپنے ہمراہیونکو گھوڑوں پر چڑھنے کا حکم دیا اور بغیر غور و فکر کئے ہوئے راجہ اور اُس کے درباریوں پر حملہ کر دیا۔ جاجپور والے سوداگروں کا تماشہ دیکھنے آئے تھے اور لڑائی کے لئے تیار نہ تھے سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگے اُن میں سے بیشتر قتل ہوئے اور راجہ گرفتار ہو گیا جب مہاراج قید ہو کر ملک التجار کے سامنے آئے تو ان کی ندامت و حیرت دیکھکر ہوشنگ نے مایا کا جال توڑ دیا اور اپنا مرتبہ ظاہر کیا اس صفائی اور دیدہ دلیری نے راجہ کی بدحواسی میں اور اضافہ کیا اُس نے بخوشی پچھتر ہاتھی سلطان کے نذر کئے اور اپنی جان بخشی کا خواستگار

ہوا سلطان عاقبت اندیش تھا اس نے راجہ کو دار السلطنت کے قریب حراست سے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ سرحد تک اپنے ہمراہ لے گیا اور وہاں کچھ اور خوبصورت ہاتھی بھاراج سے لیکر واپسی کی اجازت دی۔ خود مظفر و منصور مالوہ کی طرف راہی ہوا۔ یہ کل کارروائی چھ مہینہ کے اندر واقع ہوئی۔

سلطان کا چھ مہینہ دار الحکومت سے غایب رہنا دشمنوں سے کیونکر پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ خفیہ نویسوں نے احمد شاہ کو خبر پہونچائی اور اس نے میدان خالی دیکھکر مالوہ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ بھیسر کو فتح کیا۔ مانڈو کا محاصرہ کیا۔ اس کی فتح میں عرصہ دیکھ کر خود اوجین کی طرف چلا گیا اور لشکر کا ایک بڑا حصہ مانڈو کے سامنے چھوڑ گیا گجرات سے، منجنیقین اور دیگر ہولناک آلات حرب منگوائے اور جب کل سامان جمع ہو گیا تو مانڈو گڈھ کا محاصرہ بہت زور سے شروع کیا۔

ہوشنگ ابھی راہ ہی میں تھا کہ اُس کو محاصرہ کی خبر ملی اُس نے پہلے تو کہرلا کے باجگذار راجہ سے دار الریاست کی حفاظت کے لئے فوج مانگی اور پھر مصلحت وقت دیکھکر راجہ کو گرفتار کر لیا اور قلعہ کہرلا کو دار الاسلام بنا کر اپنا فوجی دستہ وہاں متعین کیا تاکہ مانڈو دشمنوں کے تصرف میں آجائے تو اس قلعہ میں پناہ مل سکے۔ اپنی پشت اس طرح مضبوط کرکے وہ مانڈو کی طرف بڑھا اور جنوبی پہاڑ سے (جو تارپور کا دروازہ مشہور ہے) جدھر محاصرین کی جمعیت کم تھی قلعہ مین داخل ہوا

مانڈو کا نام ان اوراق میں کئی بار آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قلعہ مانڈو کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے جو کسی وقت دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا اور آج تک اُس کی عظمت و شوکت کے سامنے بڑے بڑے ماہرین صنائع قدیمہ سر تسلیم

ختم کرتے ہیں۔ یہہ قلعہ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اٹھارہ کوس کے دائرہ میں بنا تھا۔ سلطان ہوشنگ غوری نے جبکہ وہ صرف الف خاں تھا اور اپنے باپ سے آزردہ ہوکر دہار سے جدا ہوا تھا اس قلعہ کی مرمت کرائی تھی اور اس کے استحکامات میں اضافہ کیا تھا جب وہ سلطان ہوا تو اُس نے اُسیکو اپنا دار الحکومت مقرر کیا اور اس کا نام ہندوستان کی تاریخ مین ہمیشہ کے لئے مشہور کردیا۔ یہہ قلعہ بہت قدیم زمانہ کا بنا ہوا تھا اور اس کی بابت ایک عجیب قصہ شہنشاہ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے جس کا یہاں پر نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

راجہ بکرماجیت کے عہد سے پہلے ایک راجہ جے سنگھ دیو اس ملک پر حاکم تھا اُس کے وقت میں ایک کاشتکار جنگل کو گھاس چھیلنے گیا جب گھاس کی گٹھری لیکر آیا تو دیکھا کہ کھرپی کا کچھہ حصہ زرد ہوگیا ہے۔ کسان کو تعجب ہوا اور کھرپی ایک لوہار کو دکھائی اس لوہار کا نام ماندن تھا۔ لوہار نے پہچان لیا کہ کھرپی کا پہل سونے کا ہوگیا ہے اُس نے سنا تھا کہ نواح کے جنگل میں کسی جگہہ پارس پتھر ہے جس کے چھونے سے لوہا اور تانبا سونا ہوجاتا ہے اُسکو شبہہ ہوا کہ یہہ کھرپی پارس پتھر سے مس ہوئی ہے۔ وہ کسان کو ساتھ لیکر اُس مقام پر گیا جہان کاشتکار نے گھاس چھیلی تھی اور خوبی تقدیر سے پارس پتھر اس لوہار کے ہاتھ آگیا ایسی قیمتی جنس اپنے پاس رکھنا خطرناک سمجھکر لوہار نے وہ پتھر راجہ کے نذر کیا اور خوش قسمت راجہ نے اس طلسمی تحفہ سے بہ افراط سونا بنایا اور بیشمار دولت اپنے خزانہ میں جمع کی پھر راجہ نے اس قلعہ کی تعمیر شروع کی جو بارہ برس کی طویل مدت میں تکمیل کو پہونچا اور ماندن لوہار کی یادگار میں مانڈوگڈھ اس کا نام رکھا گیا جب راجہ جے سنگھ دیو خوب عیش وعشرت کرچکا اور اُس کا دل دنیا سے سرد ہوا تو اُس نے نربدا کے کنارے برہمنوں کو

جمع کیا اور اپنی لاتعداد دولت اُن کے درمیان تقسیم کر دی جس برہمن کا وہ سب سے زیادہ معتقد تھا اس کو پارس پتھر عنایت کیا مگر تھی دستان قسمت راجہ سود از رہبر کامل "لالچی برہمن روپیہ اور اشرفی کی جگہ پتھر پاکر نہایت غمزدہ ہوا اور وہ دولت لازوال بغیر پوچھے گچھے نربدا میں پھینک دی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پتھر ابھی تک نربدا میں پڑا ہے۔ لیکن اُس کا صحیح مقام کسی کو معلوم نہیں "

اِس کا قصہ کا جھوٹھ سچ شہنشاہ جہانگیر کی گردن پر ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ بیشمار دولت اس قلعہ کی تعمیر میں صرف ہوئی ہوگی اور اگر بارہ برس کی مدت میں یہ مکمل ہوگیا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ جلد ہوا!!

اس قلعہ کے گرد بجائے خندق کے قدرتی وادیاں ہیں اور ان میں سے بعض اسقدر عمیق ہیں کہ اُن کو عبور کر کے قلعہ پر حملہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے قلعہ کے اندر پانی اور چارہ کی افراط ہے۔ زراعت[۱] کے لیئے بھی جگہ ہے۔ دائرہ اتنا طویل ہے کہ کسی دشمن کو ہر طرف سے سلسلہ رسد بند کرنا قریب قریب غیر ممکن سے ہے۔

---

[۱] سرجان ملکم نے جبکہ وہ انیسویں صدی کے آغاز میں بسر ملازمت مالوہ آئے تھے زمینداران مانڈو کے قدیم کاغذات سے ایک نقشہ تیار کیا تھا جس سے مانڈوگڈھ کی وسعت کا اندازہ ملتا ہے اُن کی "یادداشت مالوہ" مطبوعہ ۱۸۲۳ء کے مطابق مانڈوگڈھ کے اندر اراضی کی تقسیم اس طرح تھی:-

غیر مزروعہ - ۲۵۵۷ بیگہ	مساجد - ۷۰۵ بیگہ	لال باغ شاہی - ۲۰۰ بیگہ	آبادی - ۲۲۵۸ بیگہ
حمام - ۴۰ "	چاہات - ۱۴۰ "	بارہ بازارین - ۱۴۷ "	مزروعہ - ۸۴۵ "
چوٹی پہاڑیاں - ۳۵۰ "	محلات شاہی - ۵۰۰ "	بڑا تال - ۹۱۰ "	انعام معافی زمینداران - ۱۲۵ "
باغات - ۳۲۲ "	سرائین - ۳۰۵ "	چھوٹے تالاب - ۲۲۳ "	میزان = ۱۱۸۷۶ بیگہ

جنوب کی طرف قلعہ کا راستہ اس قدر ناہموار اور ڈھالو ہے کہ سوار اُس پر چل نہیں سکتا۔ ایک طرف دشمن کی فوج کاٹ ڈالی جائے تو دوسری سمت والوں کو جلد خبر بھی نہیں پہونچ سکتی جبتک سلطان ہوشنگ قلعہ میں نہ تھا گجراتی ہمت سے محاصرہ کئے رہے مگر جب سلطان کی واپسی کی اطلاع ملی تو قلعہ کے گرد اپنی فوج کا پھیلانا بیکار سمجھکر احمد شاہ نے گرد و نواح کے دیہات پر تصرف شروع کیا۔ اور فوج کا بیشتر حصہ اپنے ساتھ لیکر اوجین کے راستہ سے سارنگپور کی طرف چلا۔ سلطان بھی مقابلہ کے لئے سارنگپور کی طرف بڑھا اور بادشاہ گجرات سے پہلے سارنگپور پہونچکر اُس نے ایک خط حاکم گجرات کو لکھا کہ مسلمانوں کا خون ہم دونوں کی گردن پر ہوتا ہے۔ لہذا بہتر ہے کہ ہماری آپس میں صلح ہو جائے۔ آپ گجرات واپس جائیں اور میرے سفیر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرائط صلح پیش کریں گے تاکہ آئندہ کے لئے سلسلہ جنگ منقطع ہو جائے۔

احمد شاہ پر یہ داؤں چل گیا۔ اُس نے لڑائی ملتوی کی بلکہ دشمن کے ملک میں جو احتیاط اپنی حفاظت کے لئے کرنا چاہی اُس سے بھی غافل ہو گیا۔ سلطان نے اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر ۴ محرم ۸۲۶ھ کو گجرات کے لشکر پر شب خوں مارا اور گجراتیوں کی کثیر تعداد بغیر کسی مقابلہ کے قتل ہو گئی۔ احمد شاہ کے ڈیرہ پر راجپوتوں کا پہرہ تھا لیکن مالوہ والے شاہی خیمہ تک پہونچ گئے اور قریب قریب کل راجپوت محافظ اپنے آقا پر فدا ہو گئے۔ ان بہادروں کا خون رائگاں نہیں گیا۔ یعنی اُن کا آقا و ولی نعمت موقع پاکر رات کی تاریکی میں فرار ہو گیا اور کمپ سے باہر ایک جگہہ ٹھہر کر اپنے منتشر سپاہیوں کو جمع کرنے لگا صبح تک اُس کے جانبازوں کی جماعت اکھٹا ہو گئی اور انہیں سرفروشوں کی مدد سے اُس نے مالویوں پر حملہ کر دیا۔ ہوشنگ نے بہت بہادری دکھائی اور بڑی جوانمردی

سے لڑا۔ سلطان اور احمد شاہ دونوں زخمی ہوئے لیکن ہوشنگ کی قسمت میں گجرات پر غلبہ نہ تھا اس جنگ میں بھی سلطان ہی کو شکست ہوئی اور بدعہدی کا ثمر ملا۔ سلطان نے سارنگ پور کے قلعہ میں پناہ لی، احمد شاہ کو اپنا کل مال واپس مل گیا اور اُس کے علاوہ سلطان ہوشنگ کے ۲۰ ہاتھی بھی اُس کے قبضہ میں آئے جن میں سے سات ہاتھی جاج نگر کے تھے اور ان پر شاہی خزانہ لدا ہوا تھا۔

اس غیر متوقع فتح کے بعد احمد شاہ نے گجرات کی طرف پسپائی شروع کی اور سلطان نے اس واپسی کو اپنی کامیابی سمجھکر گجراتی لشکر کے پچھلے حصہ کو ستانا شروع کیا۔ احمد شاہ مجبور ہوکر دوبارہ مقابلہ پر آیا اور حسب دستور سلطان کو پھر شکست ہوئی۔ مالوہ کے چار پانچ ہزار آدمی اس لڑائی میں کام آئے اور احمد شاہ مظفر و منصور اپنی سرحد تک پہونچ گیا سلطان ہوشنگ مانڈو واپس گیا اور اپنی شکست خوردہ فوج کی آراستگی میں مصروف ہوا۔

جب فوجی قوت کچھ سنبھلی تو سلطان نے گنگرون کا قلعہ فتح کر کے گوالیار کا محاصرہ شروع کر دیا ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد معلوم ہوا کہ سید مبارک بن سید خضر خان بادشاہ دہلی راجہ گوالیار کی مدد کے لئے آرہا ہے تو سلطان نے اپنی فوج گوالیار کے سامنے سے ہٹائی اور سید سے مقابلہ کرنے کو دھولپور تک گیا۔ چند روز کے نامہ و پیام کے بعد سلطان مالوہ اور بادشاہ دہلی میں صلح ہوگئی۔ ہدایا و تحف کا تبادلہ ہوا اور فریقین اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوئے

سنہ ۸۳۲ھ میں احمد شاہ بہمنی بادشاہ دکن نے کہرلا کے قلعہ پر دھاوا کیا۔ یہاں کا قلعدار سلطان کا ماتحت تھا۔ بادشاہ مالوہ اپنے باجگذار کی مدد کو دوڑا دکنیوں نے اُس کی آمد سنکر محاصرہ اُٹھالیا اور اپنے ملک کی طرف پسپا ہونے لگے۔ مالوہ والوں نے تعاقب کیا

ایک گھمسان لڑائی ہوئی جس میں سلطان کو زک ملی۔ اس کی فوج بے ترتیبی سے بھاگی۔ تمام بھاری سامان اور سلطانی متعلقین دشمن کے ہاتھ آئے بادشاہ اپنی جان بچا کر مالوہ کی طرف فرار ہوا لیکن شاہ بہمنی نے سلطان کے اہل و عیال کے ساتھ نہایت شرافت اور مروت کا برتاؤ کیا اور پانچسو سواروں کی حفاظت میں جملہ متعلقین سلطانی کو مانڈو پہونچوا دیا۔

سلطان کو کئی برس تک اس شکست کا صدمہ رہا اور اس نے تین سال تک کسی جدید لڑائی کی ہمت نہ کی مگر ۸۲۵ھ میں اس کا جوش دلاوری پھر ہیجان میں آیا۔ اب نہ گجرات سے لڑنے کا دم تھا نہ دکن سے برسر پیکار ہونے کا یارا لہذا شمال کی طرف کالپی کا قلعہ فتح کرنے چلا۔ یہہ قلعہ اس وقت تک بادشاہ دہلی کے ماتحت تھا اور یہاں کا سردار عبد القادر نام شہنشاہ دہلی کا باجگذار تھا۔ سوئے اتفاق سے جبوقت ہوشنگ نے اس قلعہ کی تسخیر کا ارادہ کیا اُسیوقت ابراہیم شاہ شرقی بادشاہ جونپور کو بھی اس دور افتادہ قلعہ پر تصرف کرنے کا خیال آیا۔ دونوں بادشاہ اپنی اپنی فوجین لیکر کالپی فتح کرنے چلے اور جب مقام مقصود کے قریب پہونچے تو ایک کو دوسرے کی نیت معلوم ہوئی۔ اب قلعہ پر حملہ کرنے سے پہلے آپس میں بزور شمشیر تصفیہ کرنا ضروری ہوگیا۔ لہذا مالوہ اور جونپور کے لشکر ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن ہوئے تاکہ یہ دونوں فوجین باخود لڑ کر طے کرلین کہ ان میں سے کون کالپی کے فتح کرنے کا حق رکھتی ہے۔

قبل اس کے کہ یہ دونوں جنگجو بادشاہ لڑائی شروع کرین ابراہیم شرقی کو خبر ملی کہ سید مبارک بادشاہ دہلی نے دار السلطنت جونپور پر حملہ کردیا ہے اور گھر کی خیر منانا کالپی کے فتح کرنے سے زیادہ ضروری تھا۔ ابراہیم فوراً جونپور چلا گیا اور سلطان آسانی سے کالپی پر قابض ہوگیا۔ مساجد میں سلطان مالوہ کا خطبہ پڑھا گیا اور عبد القادر مالوہ کا ماتحت بن گیا۔

کاپی سے واپسی کے وقت راستہ میں خبر ملی کہ چند ڈاکوؤں نے "حوض بھیم" کے مقام پر اپنا
ملجا اور مامن بنایا ہے اور وہاں سے مالوہ کے علاقہ پر چھاپے مارتے ہیں۔ سلطان ان
ڈاکوؤں کو سزا دیتا اور "حوض بھیم" کو تباہ کرتا ہوا مانڈو آیا۔

گونڈواڑہ کے راجاؤں کو مغلوب کرنے کے لئے نربدا کے کنارے سلطان نے ایک
شہر آباد کیا تھا جو آج تک ہوشنگ آباد کے نام سے ہندوستاں میں مشہور ہے۔

کالپی سے واپسی کے بعد سلطان اسی شہر میں مقیم تھا کہ ایکدن شکار میں اس کے تاج سے لعل بدخشاں
گر گیا اور تیسرے دن ایک پیادہ کو ملا جس نے وہ گمشدہ دولت سلطان کی خدمت میں حاضر
کی بادشاہ نے خوش ہوکر پیادہ کو پانچسو تنکہ انعام دیا اور اپنے ارکین سلطنت سے
مخاطب ہو کر کہا کہ بادشاہ فیروز تغلق کو بھی یہی قصہ پیش آیا تھا اُس کی موت سے چند
روز پہلے شکار میں اُس کا بھی ایک لعل گم ہوگیا تھا اور جب وہ دستیاب ہوا تو بادشاہ
فیروز نے بھی پانچسو تنکے انعام دئے تھے اور ارشاد فرمایا تھا کہ اس لعل کا گم ہوکر واپس ملنا
مجھکو تنبیہ ہے کہ سفر آخرت کے لئے تیار رہنا چاہیئے جبکہ سب لعل وجواہر چھن جائینگے
اور تمام لوازم شاہی چھوڑ کر یکہ وتنہا اُس ملک کی طرف کوچ کرنا ہوگا جس کا حال کچھ معلوم نہیں
ہے۔ اس قصہ کو بیاں کرکے سلطان افسردہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ میری موت بھی قریب آگئی ہے
اور یہ واقعہ میری بیداری کے لئے غیب کا اشارہ ہے۔ ارکین سلطنت نے عرض کی کہ فیروز
تغلق کا لعل نوے برس کی عمر میں گم ہوا تھا اور حضور ابھی جواں ہیں۔ ایسی بدفالی کا گماں
کیونکر ہو سکتا ہے۔

سلطان نے جواب دیا کہ انفاس عمر میں بیشی وکمی نہیں ہوسکتی۔ جب وقت برابر ہوتا ہے
تو وہ جواں اور بوڑھے میں امتیاز نہیں کرتا۔ خدا کی قدرت!! اس واقعہ کے چند ہی

روز بعد سلطان کو مرض سلسل بول شروع ہوا اور بیماری کو اس قدر شدت ہوئی کہ بادشاہ نشست و برخاست کے ناقابل ہوگیا۔

جب مرض کو اشتداد ہوا اور سلطان کو زندگی سے مایوسی ہوئی تو اس کو ایک بھولا ہوا خواب[1] یاد آیا جس میں اُس کو خبر دی گئی تھی کہ "تیرے بعد حکومت تیرے فرزندوں کو نہیں پہونچیگی" اس نے اپنے بڑے بیٹے غزنی خان کو ولی عہد مقرر کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وزیر السلطنت محمود خان کے ہاتھ میں دیا اور تخت و تاج کی حفاظت کا وزیر کو ذمہ دار بنایا۔ سلطان محمود خان کی حوصلہ مندی سے آگاہ تھا اور اُس کو شک تھا کہ یہ کسی دن تاج کی ہوس کریگا لہذا دربار برخاست کرنے کے بعد اُس نے محمود کو خلوت میں بلایا اور غزنی خان کی وفاداری کی اُس سے قسم لی۔ یہہ بھی سمجھایا کہ احمد شاہ گجراتی ایک بڑا زبردست بادشاہ ہے اور اس کو مالوہ فتح کرنیکی آرزو ہے اُس سے بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ محمود کے دماغ میں واقعی ہوائے بادشاہی بھری ہوئی تھی۔ لیکن ہوشنگ کے سلوک و مروت کا لحاظ کر کے اُس نے غزنی خان بلکہ کل شاہی

---

[1] گلزار ابرار کی روایت ہے کہ جب سلطان ہوشنگ سوداگروں کے بھیس میں جاجنگر گیا تھا تو وہاں اُس نے خواب دیکھا کہ "منبر کا ایک پایہ گر گیا ہے" اس کی تعبیر دی گئی کہ منبر کا گرنا "پیر یا مرید کی رحلت کی علامت ہے" جب سلطان مانڈو آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پیر مخدوم قاضی برہان الدین عالم علوی کوچ فرما گئے۔ بادشاہ نے ارادہ کیا کہ پیر کی لاش قبر سے نکال کر سلطانی مقبرہ میں دفن کیجائے تاکہ اُن کی ہمسائگی کی بدولت ہوشنگ کی خوابگاہ بھی ٹھنڈی رہے خاندان درگاہ نے عذر کیا لیکن پذیرا نہ ہوا۔ لوح قبر اٹھائی گئی تو سوا کفن کے کچھہ نہ تھا جسم کا نشان بھی مفقود تھا سلطان یہہ کرامت دیکھ کر حیران ہوا اور تربت پر پتھر پھر ڈہک دیا گیا۔ اس رات کو بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ پیر فرماتے ہیں کہ درویش کے اسرار کا پردہ تو نے فاش کیا تیری سلطنت کی بنیاد دست تقدیر نے اوکھاڑ پھینکی یعنی تیرے بعد حکومت تیرے فرزندوں کو نہیں ہونچیگی۔

گلزار ابرار۔ تذکرہ مخدوم قاضی برہان الدین ۱۲

خاندان کی حفاظت و وفاداری کی قسم کہائی اور عرض کی کہ چھوٹا شہزادہ عثمان خاں جو مانڈو میں قید ہے آزاد کر دیا جائے اور اُس کو جاگیر عنایت کیجائے تاکہ غزنی خان کی ولی عہدی میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو۔

سلطان ہوشنگ کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تہین۔ عثمان خان فتح خان اور ہیبت خان ایک ماں سے تھے۔ اور تینوں میں باہم بہت اتفاق و اتحاد تہا بقیہ چار بیٹے احمد خان۔ عمر خان ابو اسحق خان اور غزنی خان ایک جداگانہ پارٹی بنائے ہوئے تھے۔ غزنی خان سب سے بڑا تہا لہذا احمد خان عمر اور ابو اسحق ہر معاملہ میں اس کا ادب و لحاظ کرتے تھے۔ یہہ دونون پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت میں جوڑ توڑ لگایا کرتی تہین سرداران سلطنت میں سے کچھہ غزنی خان کے شریک تھے اور کچھہ عثمان خان کے۔ ملک مغیث اور اُس کا بیٹا محمود خان دونون پارٹیون سے یکسان تعلق رکھتے تھے اور اُن کے باہمی نزاعات کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

جب بیٹوں کی مخالفت کی شکایت سلطان کے گوش گذار ہوتی تہی تو محمود خاں سلطان کو راضی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور بادشاہ کی زبان پر متعدد بار یہ فقرہ آیا تہا "کہ محمود خان لیاقت آن دارد کہ ولی عہد من باشد"۔ ملک مغیث عاجزی سے عرض کرتا تھا کہ شہزادون کی عمر دراز ہو ہم لوگون کا کام سوائے خدمت گزاری کے کچھہ نہیں ہے۔ غرض یہ پارٹیان عرصہ سے آپس میں خفیہ لڑائیاں کر رہی تہین۔ کالپی سے واپسی کے وقت غزنی خان اور عثمان خان مین کھلم کھلا جنگ ہو گئی۔ عثمان خان نے کچھہ کلمات بے ادبی اپنے بڑے بہائی کی شان مین استعمال کئے "و رشت و لگد" تک نوبت پہونچی۔ جب عثمان اپنی بیوقوفی پر نادم ہوا تو غضب سلطانی کے خوف سے لشکر سے چلا گیا۔ اور علم بغاوت بلند کرنے کی تدبیرین

کرنے لگا۔ بڑی حکمت عملی سے ملک مغیث نے اُس کو واپس بلایا مگر سلطان کا غصہ تیز ہوچکا تھا
اوجین کے مقام پر پہونچکر اُس نے عثمان خان فتح خان اور ہیبت خان کو بہت زجر و توبیخ کی اور
اُن کو قید کر کے مانڈو بھیجدیا۔ اُس وقت سے یہ تینوں شہزادے حراست میں تھے یہان تک
کہ سلطان ہوشنگ آباد میں بیمار ہوا اور زندگی سے مایوس ہوکر اُس نے غزنی خان کو
وارث تاج و تخت نامزد کیا۔ محمود خان نے سلطان سے سفارش کی کہ عثمان خان اور اُسکے
بھائی قید سے چھوڑ دئے جائیں۔ اور اُن کو جاگیرین عطا کردی جائین تاکہ ولی عہد کی ریاست
و امارت میں ان شہزادوں کے رفقا کوئی فساد برپا نہ کریں۔ بادشاہ مانڈو پہونچکر معلوم
نہیں کہ اُن کو حبس سے رہا کرتا یا نہ کرتا مگر خفیہ نویسوں نے غزنی خاں کو خبر کردی کہ وزیر نے
چھوٹے شہزادوں کی سفارش سلطان سے کی ہے۔ اُس نے محمود خان کو اپنے پاس بلایا
اور تجویز پیش کی کہ عثمان خان سے وفاداری کا حلف لیا جائے محمود خان نے منظور کیا۔
اودہر عثمان کے طرفداردن نے محمود خاں کو گھیرنا شروع کیا کہ چھوٹا شہزادہ غزنی خاں سے
زیادہ جوان شائستہ اور قابل ہے مالوہ کی ولی عہدی اسی کو ملنا چاہئے۔

محمود خان کو اور ہی دہن سوار تھی وہ جانتا تھا کہ عثمان غزنی خان سے زیادہ قابل ہے اور اُسکے
ایام سلطنت میں محمود کو اپنے منصوبے پورے کرنا دشوار ہوجائیں گے۔ اُس کو ایک مقدس
بزرگ نے سلطنت مالوہ کی بشارت[1] دی تھی اور وہ یقین رکھتا تھا کہ ان بھائیوں کے باہمی نفاق

---

[1] کہتے ہین کہ حضرت شیخ الاسلام خلیفۂ شاہ راجو قتال جنکا زادبوم اوچہ اور خوابگاہ مانڈو ہے۔ سفر حجاز کو جاتے ہوئے مانڈو
مین وارد ہوے اس وقت سلطان ہوشنگ غوری سریر آرائے سلطنت تھا اور اس کا چچازاد بھائی ملک مغیث منصب وزارت
سے سرافراز نہ تھا۔ وزیر کا نوعمر لڑکا ملک محمود نقیر دوست اور درویش پرست تھا حضرت شیخ کی ملازمت میں حاضر ہوا کھانا
سامنے رکھا گیا۔ آپ نے متواتر چار لقمے محمود خان کے منہ میں دئے اور فرمایا کہ صوبہ مالوہ کی شہنشاہی بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶

سے تخت و تاج آخر کار اُسکو ملے گا لہذا ایک کمزور شہزادہ کا مسند پر بٹھانا قرین مصلحت ہے اُس نے جواب دیا کہ سلطان نے غزنی خان کو ولی عہد مقرر کیا ہے اور فرمان شاہی میں مداخلت کی اُس کو مجال نہیں ۔

عثمان خان کا ایک طرفدار ظفر خان نام شاہی کیمپ سے بھاگا تاکہ عثمان خان کو ان واقعات سے مطلع کرے۔ غزنی خان نے شاہی گارد کے پچاس سوار ظفر خان کے گرفتار کرنیکو بھیجنا چاہے۔ گارد کا سردار عثمان کی پارٹی میں تھا اُس نے فرمان شاہی کے بغیر گارد کے گھوڑے دینے سے انکار کیا اور اتنا شور وغل مچایا کہ بیمار بادشاہ نیند سے بیدار ہوگیا اور یہ سنکر کہ غزنی خان نے باپ کی زندگی ہی میں شاہی گارد پر حکم چلانا شروع کر دیا ہے بیٹے سے بیزار ہوگیا اور تیر و کمان منگاکر قسم کھائی کہ وہ غزنی خان کو قتل کرے گا۔ شہزادہ اس خبر سے بہت خوف زدہ ہوا اور گنگرون کی طرف بھاگا جو کیمپ سے تین منزل تھا۔ محمود خان نے سمجھا بجھا کر اُس کو واپس بلایا کیونکہ بادشاہ مرض کی شدت سے قریب قریب بدحواس تھا۔ عثمان خان کے طرفداروں کا پلہ زبردست ہوگیا تھا۔ اور انہوں نے بادشاہ کو غفلت و کمزوری کیحالت میں مانڈو لیجانے کی تجویز کی تاکہ وہاں پہونچکر عثمان قید سے آزاد کیا جائے۔ اگرچہ غزنی خان واپس آگیا لیکن یہاں اراکین سلطنت کی سازش پختہ ہوچکی تھی۔ دوسرے دن صبح کو انہوں نے بادشاہ کو جو بالکل بیہوش تھا پالکی پر سوار کیا اور مانڈو کی طرف کوچ شروع کردیا۔ محمود خان

تیرے یہاں تیرے اگر تین نرزند دن تک رہیگی۔ محمود خان نے شکریہ ادا کرکے عرض کی کہ سفر حج سے معاودت بھی اسی راستہ سے فرمائی جائے آپ نے یہ التماس قبول کی اور جس وقت سلطان محمود کا خورشید فرمانروائی نصف النہار پر تھا مانڈو تشریف لائے جیسا آگے بیان ہوگا۔ گلزار ابرار حمن سوم تذکرہ شیخ الاسلام ۱۲

اور غزنی خان نے پالکی کو واپس لانا چاہا تو سرداروں نے جواب دیا کہ بادشاہ نے مانڈو کے کوچ کا حکم دیا تھا اور اُس ارشاد کی تعمیل ہمپر فرض ہے۔

قضا و قدر کے رجسٹر میں مالوہ کی سلطنت محمود خاں کے نام لکھی ہوئی تھی اس لئے تھوڑا ہی راستہ طے کرنے کے بعد سلطان ہوشنگ غوری کا انتقال ہوگیا۔ محمود خان نے اسی جگہ بارگاہ سلطانی نصب کرائی اور تجہیز و تکفین میں مصروف ہوا۔ غزنی خاں کی ولی عہدی کا اعلان ہو ہی چکا تھا وزیر نے سرداران ریاست کو جمع کیا اور کہا کہ جس شخص کو غزنی خان کی حکومت سے ناراضی ہو لشکر سے جدا ہو جائے اور جو سلطان مرحوم کی وصیت کی تعمیل کرنا چاہے شہزادہ کی بیعت کرے یہہ کہکر محمود رونے لگا۔ ارکین دربار بھی ہائے ہائے کرنے لگے اور بعد دیگرے سب نے غزنی خان کے قدمون پر بوسہ دیا اور اُس کی سلطنت کو تسلیم کرلیا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ ارکان سلطنت ہوشنگ کی لاش مانڈو لے گئے اور وہاں ۹ ذی الحجہ کو خاک کے سپرد کی لیکن زیادہ صحیح روایت یہ ہے کہ اُس کی نعش پہلے ہوشنگ آباد میں دفن کی گئی اور بعد کو جب مانڈو مین ایک عالیشان مقبرہ سلطان کے لئے تیار ہوگیا تو اس کی نعش جو ہوشنگ آباد میں ودیعت تھی مانڈو کو منتقل کی گئی ۱۸۱۸ء تک ہوشنگ آباد میں لوگ اس مقام سے واقف تھے جہاں سلطان کی نعش امانتاً سپرد زمین کی گئی تھی۔ سلطان کا خوبصورت سنگین مقبرہ اس وقت تک مانڈو میں سموم حوادث سے محفوظ ہے اور قابل دید ہے قطعہ ذیل مخبر سال وفات ہے :-

شہ والا قدر سلطان ہوشنگ — سوے دار البقا چون کرد آہنگ

بہ پرسیدم زہاتف سال تاریخ — ندا آمد نمادہ شاہ ہوشنگ

فرشتہ نے سال وفات ۸۳۸ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات آہ شاہ ہوشنگ نماند" درج کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اگر دلاور خاں کی چہار سالہ سلطنت نہ شمار کی جائے تو ہوشنگ غوری مالوہ کا پہلا خود مختار بادشاہ تہا۔ اُس نے تیس سال سلطنت کی اور اپنی ہمت و اولوالعزمی سے مانڈو کا نام ہندوستان میں روشن کر دیا۔ اُس کا بیشتر وقت میدان جنگ میں صرف ہوا اور متعدد لڑائیوں میں اُسکو شکست ہوئی لیکن ہر ایک ہزیمت آئندہ جنگ کے لئے اُس کو مستعد کرتی تہی اور اسکے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوتی تہی اگر وہ اپنی ساری قوت بندیلکھنڈ کی فتح میں صرف کرتا اور گجرات سے روزنئی لڑائی نہ مول لیا کرتا تو مالوہ کا بہترین بادشاہ شمار کیا جاتا اُس نے بدعہدیاں کر کے اپنے ملک کو نقصان پہونچایا اور گجرات کو بہی کچہہ عرصہ کے لئے ملکی اور قومی خدمات بجالانے سے باز رکہا اس کا جاج نگر کا حیرت انگیز سفر صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ یادگار رہیگا اور آئندہ نسلین ہوشنگ کو بدعہد کہین لیکن کم ہمت نہیں کہسکتین۔ رعایا سلطان کی جانثار تہی اور اُس کے عدل و انصاف کا ترانہ گاتی تہی۔ بلکہ آج تک مانڈو والے سلطان ہوشنگ کی ولایت و کرامت کے قایل ہیں۔ خاکسار جامع الاوراق ادبیت اور افضلیت کے موتی اس اولوالعزم سلطان کی تربت پر نثار کرتا ہے۔

جہان اے برادر نماند بکس
دل اندر جہان آفرین بند و بس
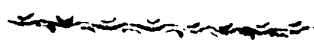
بحر المحبّت شیخ غلام ہمدانی مصحفی

جناب مولوی سید محمد احمد صاحب وفا بی اے ڈپٹی کلکٹر

گذشتہ سے پیوستہ

دوسرا ٹکڑا جس پر مصحفی کو ترجیح دی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

میر فرماتے ہیں :-

گھر سے باہر محافہ جب نکلا ۱ اس جوان پاس ہو کے تب نکلا

طپش دل سے ہو کے یہ آگاہ ۲ ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ

وان کے رہنے سے اُس کو کام نہ تھا ۳ وہ گلی اُس کا کچھ مقام نہ تھا

جس سے جی کو کمال ہو الفت ۴ جس سے دل کی درست ہو نسبت

جنبش اُس کی پلک کو گر دان ہو ۵ دل میں یان کاوش نمایان ہو

وان اگر ہو شکست کا سدباب ۶ یان رگ جان کو ہوے پیچ و تاب

وان اگر پانو میں لگے ہے خار ۷ دل سے یان سر نکلے ہے یکبار

یار کو درد چشم گر ہووے ۸ چشم عاشق لہو میں تر ہووے

چاک دامن ہے وان پئے زینت ۹ یان گریبان ہے چاک گل کی صفت

وان دہن تنگ یان ہے دل تنگی ۱۰ حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

دست افشان دپاے کوبان یہ ۱۱ تھا محافہ کے ساتھ گرم رہ

قطرہ زن سادہ رو براہ تمام ۱۲ در پئے راہ تھا یہ بے آرام

ہر قدم تھا زبان پر جاری ۱۳ خواب ہے یہ کہ ہے یہ بیداری

ہم رہی اُس کی تھی میسر کب ۱۴ ہے مجھے سخت واژگوں سے عجب

شوق مفرط نے بے رہی کی سخت ۱۵ ناشکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوے نالے ۱۶ اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطراب دلی نے زور کیا ۱۷ ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا ۱۸ آفت تازہ جان پر لایا

کائے جفا پیشہ و تغافل کیش ۱۹ اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منہ چھپایا ہے تونے اس پر بھی ۲۰ نگہ التفات ادہر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں ۲۱ چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں

منزل وصل دور میں کم پا ۲۲ تجھ کو اس مرتبہ میں استغنا

ہے تو دل سے نزدیک اے طناز ۲۳ لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے اک نفس نہ رخصت دی ۲۴ آئینہ نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی ۲۵ جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھکو تھی اپنے خالِ رخ پہ نگاہ ۲۶ دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھکو مد نظر تھی اپنی چال ۲۷ میں ستمکش ہوا کیا پامال

بستر خواب پر تجھے آرام ۲۸ تجھکو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لب لعل تیرے خندان تھے ۲۹ یاں فسردہ جگر پہ دندان تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے ۳۰ رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر ۳۱ حال پر میرے ٹک تاسف کر

مصحفی نے بھی محافہ کی روانگی اور عاشق کی بیتابی تحریر کی ہے۔ اس میں اتنی جدت کی ہے کہ عاشق کے ساتھ معشوق کے جذبات کی بھی تصویر کھینچی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اضافہ نے اِس مرقع کی خوبیوں کو کہاں تک بڑھایا۔ مصحفی فرماتے ہیں۔

لے چلی جب وہ دایۂ مکار ۱ کر محافہ میں اُس پری کو سوار

گزر اُس کا جوان کے سر سے ہوا ۲ جوں ہی باہر وہ رہگزر سے ہوا

اس کی آنکھ اُسکی گھات پا ہی گئی ۳ بوئے اُنس اُسکو اُس سے آ ہی گئی

سر پہ بے صبری نے خروش کیا ۴ دل میں اُسکے قلق نے جوش کیا

متصل سر پہ ہاتھ پڑنے لگا ۵ واں سے پائے ثبات اُدھڑنے لگا

جذب کہتا تھا۔ چل نکل یاں سے ۶ عشق کہتا تھا تو نہ ہل یاں سے

کشف اُس کا مقام الفت ہے ۷ سچ ہے وہ جو غلام الفت ہے

کہ محافہ میں ہے وہ رشک قمر ۸ دل آگہ نے دی یہ اس کو خبر

تو بھی ہمراہ ہو برنگ صبا ۹ اب ترا اِس گلی میں کام ہے کیا

دیکھ نادان فریب مت کھا تو ۱۰ جس طرف جاوے وہ ادھر جا تو

مورد چشم التفات ہوا ۱۱ یہ سمجھ جب وہ اُس کے ساتھ ہوا

جی پہ آفت کہ چشم خوں روئی ۱۲ دل میں دہشت کہ کیا کہے کوئی

کشتی دل کی پاؤں میں زنجیر ۱۳ ساتھ اس کے یہ دردمند سفیر

پیچھے دایہ کے قطرہ زن یہ جوان ۱۴ دل کی دہشت سے پیش دلبر نگران

جوں قفس میں ہو کوئی کبک دری ۱۵ سر بزانو محافہ میں وہ پری

اور رسوائیوں کا اپنی خیال ۱۶ دل میں گھر چھوٹنے کا اُس کو ملال

کہ یہ کیا افترا بندا مجھ پر ۱۷ زہر کھا کون مرگیا مجھ پر
میری آنکھون نے کس کو خویش کیا ۱۸ میری پلکوں نے کس کو ریش کیا
کس پہ خواہش سے کی نظر میں نے ۱۹ چھوڑا کس کے سبب سے گھر میں نے
کس سے میں آہ ہمکلام ہوئی ۲۰ کس سے نظارہ باز بام ہوئی
کس سے میں نے کیا پیام وسلام ۲۱ کس کی الفت سے میں ہوئی بدنام
کس سے غرفہ میں میں لڑائی آنکھ ۲۲ کس کو روزن سے مین دکھائی آنکھ
چاک پردہ سے میں نے جھانکا کب ۲۳ میری ویرانی کا ہے کچھ بھی سبب
یہ عجب خانمان خرابی ہے ۲۴ کہ نکلنا باین شتابی ہے
ایسی صورت جوان غم دیدہ ۲۵ بخیال محال پیچیدہ
چشم در راہ کر برائے خدا ۲۶ دے محافہ کا پردہ باد اٹھا
دیکھے تا ردے ماہ پردہ نشین ۲۷ جس کی خاطر مذلتین نہ سہین
کھول دے گو نہ اُس کا منہ سارا ۲۸ اک جھلک کا تو ہوئے نظارہ
تھا محافہ وہ ڈوریوں سے کسا ۲۹ اس میں دشوار تھا گزارہ ہوا
نہ رہی جبکہ اس میں طاقت صبر ۳۰ جیب پھاڑا بمرگ رخصت صبر
(برگ رخصت)
کرکے نالہ بطرح سوز وگداز ۳۱ یون قرین محافہ دی آواز
کا اے پری چہرہ اتنی روپوشی ۳۲ اس سے گزرا میں ہاے خاموشی
نہ تو آواز ہی سناتی ہے ۳۳ نہ تری بو ہی مجھ تک آتی ہے
ہے گھٹاٹوپ - یا محافہ یہ ۳۴ ٹک تو پردہ اٹھا دے غیرت مہ
کہ بھلا اک جھلک تو میں دیکھون ۳۵ تیری نتھ کی ڈھلک تو میں دیکھون

خوبرو کرتے ہیں تغافل سب ۳۶ پر نہ اتنا کہ ہووے محض غضب

داغ ہے انتظار آنکھون میں ۳۷ خون ہے جائے یار آنکھون میں

تجکو اپنی ستمگری کی قسم ۳۸ تجکو غمزہ کی کافری کی قسم

قسم اپنے تجھے تغافل کی ۳۹ قسم اپنے تجھے تجاہل کی

حرف زن اپنے دردمند سے ہو ۴۰ گرم اسے آتش سنید سے ہو

میرصاحب کہتے ہیں کہ جب محافہ اس خود رفتہ کے پاس گزرا تو اس کو از خود خبر ہو گئی یہ آہ بھر کر مستانہ وار جوش کے ساتھہ محافہ کے ہمراہ ہولیا میر کے سادہ الفاظ اور اُن کا اثر قابل ملاحظہ ہے۔ آہ دو حالتون میں بھری جاتی ہے ایک تو بحالت غم دوسرے دل پر سے کسی بوجھہ کے ہٹنے پر۔ پس یہان جو آہ بھری گئی ہے وہ بھی دوسرے قسم کی ہے پہلے اس کو اپنے آرام دل سے بُعد زیادہ تھا اب نسبتاً کم ہو گیا پہلے اس کی کوئی بات اُسکے کان تک نہیں پہونچ سکتی تھی اب دل کھول کر تمام شکوے شکایت اس کے کان تک پہونچا سکتا تھا ایک اُمید موہوم یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ممکن ہے راہ میں یا محافہ سے اترتے ہوئے اس کی جھلک نظر آجائے ان ہی تمام باتون پر نظر رکھتے ہوئے میرصاحب فرماتے ہیں۔

گھر سے باہر محافہ جب نکلا ۱ اس جوان پاس ہو کے تب نکلا

طپش دل سے ہو کے یہہ آگاہ ۲ ہولیا ساتھہ اُس کے بھر کر آہ

وان کے رہنے سے اسکو کام نہ تھا ۳ وہ گلی اُس کا کچھہ مقام نہ تھا

دست افشان دپائے کوبان یہہ ۴ تھا محافہ کے ساتھہ گرم رہ

مقولہ شاعر بیچ میں میرصاحب نے دیدیا ہے جو اپنی جگہ میں صحیح اور لطیف ہونے کے

علاوہ ایک شعر میں دو کیفیتوں کی تشریح کرتا ہے معشوق محافہ میں بیٹھی رو رہی ہے اُس کو یہہ بھی بے چین ہو جاتا ہے۔

قطرہ زن سادہ رو۔ بر راہ تمام

در پئے راہ تھا یہہ بے آرام

جب شوق نے اظہار حال پر مجبور کیا اور دل اختیار سے جاتا رہا تو "رفتہ رفتہ سخن ہوئے وا" بیتابانہ شکوے شکایت بالکل فطری ہیں۔

مصحفی نے اظہار خیال کیلئے سادہ زبان استعمال نہیں کی۔ فارسی کی ترکیبیں اور محاورے نظم کو گرانبار کر رہے ہیں جو مثنوی کے واسطے عیب ہیں۔ بعض جگہ نظم مغلق ہو گئی ہے اور تشریح کی ضرورت ہے اور تشریح ہونے پر بھی کچھ لطف پیدا نہیں ہوتا مثلاً

"گزر اُس کا جوان کے سر سے ہوا" "کس سے نظارہ باز بام ہوئی" "تخیال محال پیچیدہ" "چشم در راہ گزر برائے خدا" "جیب پھاڑا ابمرگ رخصت صبر" "دکھ کے نالہ بطرح سوز و گداز" "اُس سے گزرا ہیں ہائے خاموشی" "گرم اے آتش سپند سے ہو" "ساتھ اسکے یہ دردمند سفیر" "کشف اُس کا مقام اُلفت ہے" زبان سے گزر کر اب خیالات ملاحظہ ہوں۔ محافہ کے گزرنے پر مصحفی عاشق کا بیتاب اور پر جوش ہونا ظاہر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ میر کی تقلید میں اُس کو از خود خبر ہو جانے کے بھی قائل ہیں اس کو نظر میں رکھتے ہوئے اشعار ذیل کہاں تک مناسب موقع ہیں۔

دان سے پائے ثبات اُکھڑنے لگا　　　متصل سر پہ ہاتھ پڑنے لگا

معشوق کا محافہ جاتا تھا نہ کہ جنازہ۔ جوش اور بے صبری میں سر پیٹنے کا کوئی موقع نہ تھا

عشق کہتا تھا تو نہ ٹل یاں سے　　　جذب کہتا تھا چل نکل یاں سے

جب دل آگاہ نے معشوق کے جانے کی اطلاع کر دی تو عشق کا یہ تقاضا کہ یہاں سے نہ ہلو بیمعنی ہے اس لئے عشق معشوق سے تھا نہ کہ اس کے مکان سے

خیر دل آگاہ کی رہبری سے یہ محافہ کے ساتھ ہولیا مگر معلوم نہیں ہوتا کہ کیونکر "مورد چشم التفات ہو"

اُس کے بعد کے تین اشعار (۱۲ لغایت ۱۴) عجب معجون مرکب ہیں جو اس بیمار عشق کیواسطے سودمند نہیں ان سے شاعری کی غلط نبض شناسی کا پتہ چلتا ہے ۔ جو شخص جوش عشق میں آپے سے گزر چکا ہو۔ راحت و آرام نیکنامی اور بدنامی کے خیال سے اُس کا درجہ بلند ہو۔ اس کے نسبت شاعر کا یہ خیال کہ

"دل میں دہشت کہ کیا کہے کوئی" یا "دل کی دہشت سے پیش و پس نگران"

اس کی توہین ہے ۔ "رجی یہ آفت کہ چشم خون روئے" کے واسطے تشریح کی ضرورت ہے اُسپر بھی کچھہ لطف پیدا نہیں ہوتا۔ "ساتھہ اُس کے یہہ دردمند سفیر" میں لفظ "سفیر" بمعنی سفر کرنے والے کے کسقدر بھونڈا ہے جو اردو کی بول چال میں نہ پہلے استعمال ہوا اور نہ اب استعمال ہوتا ہے۔

میر صاحب کا ایک مصرع "قطرہ زن سادہ رو براہ تمام" ان کی کمال شاعری پر دلیل ہے بہت سی اجمالی باتیں جو رمز و کنایہ میں لطف دیجاتی ہیں ان کی ہزار تفصیل کیجئے وہ لطف پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مصحفی تفصیل کرکے نظم کو بےمزہ کرنے کے علاوہ خلاف واقعہ باتیں بیان کرنے لگے۔ میرے معشوق کے رونے کی وجہ بیان کرنے سے بالقصد اعتراض کیا ہے بقول آتش۔

سمجھہ لیتے ہیں مطلب اپنی اپنی طور پر سامع   اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

اِس رونے کی وجہہ جو چاہے سمجھہ لیجئے - گھر اور اعزا کے چھوٹنے کا خیال اس کا باعث ہو یا اثر عشق سے مغلوب ہوکر اپنی بے بسی اور عاشق کی پریشان حالی آٹھہ آٹھہ آنسو رولاتی ہو - یا رسوائی کا خیال جیساکہ مصحفی نے لکھا ہے اِس کا سبب ہو - یہ ایک مصرع ان تمام خیالات کے اظہار پر حاوی ہے -

یہہ تسلیم کرتے ہوئے کہ غرفہ میں بیٹھا دیکھکر جوان اس نازنین پر عاشق ہوا اور اس کے عشق کا چرچا خاص اور عام میں مشتہر ہوگیا اسی کے ساتھہ بقول مصحفی لڑکی کے بھی دل میں عشق نے گھر کیا اور یہ راز گھر والوں پر ظاہر ہوگیا - ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے جن خیالات کو لڑکی کی طرف منسوب کیاگیا ہے وہ غیر صحیح ہیں - لڑکی کا منہہ ہی نہ رہتا تھا جو یہہ کہتی ,, کہ یہ کیا افترا بندہا مجھہ پر "

میری آنکھوں نے کسکو خواہش کیا　　میری پلکوں نے کسکو ریش کیا

. . . .　　کس سے نظارہ بازبام ہوئی

کس سے غرفہ مین مین لڑائی آنکھ　　کس کو روزن سے مین دکھائی آنکھ

اصلی خیال جو لڑکی کے دل میں پیدا ہوسکتا تہا وہ مصحفی کے بیان کردہ خیال سے خلاف ہوگا - خیالات سے قطع نظر کرکے زبان کو جو ملاحظہ فرمائے تو وہ بھی صاف و فصیح نہیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہو -

(۱) ,, کس پہ خواہش سے کی نظر مین نے "

لفظ خواہش ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے اور ایک عورت کے زبان سے ہنایت کریہہ معلوم ہوتا ہے انتخاب الفاظ شاعر کا خاص کام ہے یہ لفظ مصحفی کی خامی کو ظاہر کرتا ہے -

(۲) دوسری مثال لیجیے۔

"میری ویرانی کا ہے کچھ سبب"

"ویرانی" ہمیشہ جگہ سے متعلق ہوتی ہے نہ کہ شخص سے البتہ "خانہ تن" کو ویران کہہ سکتے ہین

(۳) تیسری مثال ملاحظہ ہو۔

یہ عجب خانمان خرابی ہے   کہ نکلتا باین شتابی ہے

دوسرے مصرع کی ترکیب ملاحظہ فرمائے تعقید کے علاوہ زبان اردو کے محاورہ کے خلاف واقع ہوا ہے "شتابی" کا لفظ نفس واقعہ کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اس سے بیشتر شاعر کہہ چکا ہے۔

الغرض یون ہی گزرے جب کئی ماہ   ہوئی اس کے بھی دل میں اُسکی راہ

کئی ماہ کے شور و شغب اور رسوائی کے بعد اگر لڑکی کو کہیں بھیجا جاوے تو وہ یقیناً شتابی نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) لڑکی کے دماغ میں اگر خیالات چکر لگا رہے ہیں تو جوان بھی خالی از ذہن نہین اُس کو مصحفی اسطور سے شروع فرماتے ہیں:-

ایسی صورت جوان غم دیدہ   بخیال محال پیچیدہ

چشم در راہ کز برائے خدا   دے محافہ کا پردہ باد اُٹھا

. . . .

تہا محافہ وہ ڈوریوں سی کسا   اس میں دشوار تہا گزار ہوا

نرہی جبکہ اُس میں طاقت صبر   جیب پہاڑا بمرگ خصت صبر

"لفظ محال" کی تشریح نہیں ہوتی اگر پردہ کا ڈوریوں کی وجہ سے ہوا میں نہ اڑ سکنا
محال مانا جائے تو نظم میں بجائے کسی خوبی پیدا ہونے کے سقم پیدا ہوتا ہے ڈوریوں
کا کھل جانا یا ٹوٹ جانا محالات عقلی سے نہیں ہے اگر دانتی پردہ کا اُٹھ جانا اُس کے نگاہ میں محال
تھا تو

چشم در راہ کہ برا سے خدا   دے محافہ کا پردہ باد اڑتا

کا کیا موقع تھا جو چیز محال ہو اس کے واسطے "چشم در راہ" کیا معنی۔ اگر یہ کہا جائے کہ
وہ عشق سے دیوانہ ہو رہا تھا محال اور ممکن میں اُس کو تمیز نہ تھا تو "بخیال محال پیچیدہ"
نظروں سے گرا جاتا ہے اس لئے سوچنا اور اگر مگر کرنا عقل والوں کا کام ہے دیوانہ
کو اس سے کیا سروکار۔

(۵) جیب پھاڑا مرگ رخصت صبر۔

مولوی عبدالماجد صاحب خود تسلیم فرماتے ہیں کہ اس مصرع کے معنے سمجھ میں نہیں
آتے بحیثیت موجودہ میں بھی کوئی معنی نہ پیدا کر سکا اگرچہ دو مثنویوں میں یہ مصرع یونہی
ہے مگر ممکن ہے "مرگ" اور "رخصت" کے درمیان واو عاطفہ ہو جو سہو کتابت سے
متروک ہو گیا ہو۔ اگر اس مصرع کو "جیب پھاڑا مرگ و رخصت صبر" پڑھا جاوے تو مصحفی
کے مذاق شاعری کے مطابق معنی ہو جاتے ہیں۔ عام دستور ہے کہ مرجانے پر جو رنج و غم کا
جوش ہوتا ہے وہ جنازہ کو گھر سے لیجاتے وقت بدرجہا زیادہ بڑھ جاتا ہے گویا اس گھر
سے مرنے والے کی آخری اور دوامی رخصت پر ایک طوفان غم اٹھتا ہے اور بے صبری
کی حالت میں انسان طرح طرح کی حرکات کر گزرتا ہے جس میں گریبان کا پھاڑنا بھی منجملہ
اُن کے ایک حرکت ہے۔ اس حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصحفی فرماتے ہیں کہ صبر کے

مرنے پر جب اُس کا جنازہ خانۂ دل سے نکلا تو اُس کی آخری رخصت پر اس جوان نے بے صبری میں گریبان پھاڑ ڈالا۔ اگر اردو کی مثنوی کے اشعار کی شرح لکھنے کے لئے خان آرزو یا صہبائی سے شارحوں کی ضرورت ہو تو مثنوی اپنی اپنے درجہ سے گر جاتی ہے ایسے بیسیوں اشعار اس مثنوی میں موجود ہیں مگر میں صرف اُن ہی قطعات مثنوی کو پیش کرتا ہوں جن کو میر پر ترجیح دی گئی ہے۔

(۶) کرکے نالہ بطرح سوز و گداز یوں ترے محافہ دی آواز

کائے پر چہرہ اتنی روپوشی اس سے گزرا ایں ملئے خاموشی

دوسرے شعر نے تو فصاحت و بلاغت دونوں کو الٹی چھری سے حلال کر ڈالا۔ مطلب شاعر کا یہہ ہے کہ۔ خیر تونے منہ تو چھپایا ہی تھا مگر ستم یہہ ہے کہ تو خاموش بھی ہے باتیں سنا کر میرے دل کو تسکین نہیں دیتی جس نظم میں "اس سے گزرا ایں ہائے خاموشی" سا مصرع موجود ہو کر اُسکو میر کے مقابلہ میں پیش کرنا میر پر شدید ترین ظلم ہے۔

(۷) ہے گھٹاٹوپ۔ یا محافہ یہ ٹک تو پردہ اٹھادے غیرت مہ

کہ بھلا اِک جھلک تو میں دیکھوں تیری نتھہ کی ڈھلک تو میں دیکھوں

اگر محافہ ڈوریوں سے ایسا کسا تھا کہ پردہ اٹھنا محال تھا تو پردہ اٹھانے کی فرمائش کے کیا معنی؟ "تیری نتھہ کی ڈھلک تو میں دیکھوں" ایک عاشق صادق کے منہ سے ادا کرنا مصحفی ہی کا مذاق تھا۔ جو مذاق سلیم سے کوسوں دور ہے۔

(۸) "داغ ہے انتظار آنکھوں میں" مصحفی کے خاص رنگ کا مصرع ہے جس سے اردو نظم کی شان بجائے بڑھنے کے گھٹتی ہے اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ انتظار مجھے بہت گراں ہے یہ طرز ادا اختیار کیا گیا ہے۔

(۹) حرف زن اپنے درد مند سے ہو گرم اُسے آتش سپند سے ہو

بحیثیت موجودہ یہ شعر بے معنی ہے۔ اگر آتش بلا اضافت پڑھا جائے تو مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ غالباً لفظ "اب" سہو کتابت سے آتش کے بعد متروک ہو گیا ہے "اَب" بڑھانے سے مصحفی کے رنگ کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر گرم آتش اور سپند کے سوا مزا خاک بھی نہیں۔ ایسے اشعار عیوب مثنوی ہیں۔ ایک عورت سے تخاطب کی حالت میں کہنا کہ اپنے درد مند سے حرف زن ہو خلاف روزمرہ دخلاف موقع ہے۔

(۵) یہ جوان محافہ کے پیچھے بحالت محویت۔ درد دل بیان کرتا چلا جاتا ہے دایہ اُس کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ میر اور مصحفی دونوں اس کیفیت کو لکھتے ہیں۔ مولوی صاحب نے مصحفی کے حق میں فیصلہ فرمایا ہے ہم دونوں ٹکڑوں کو پیش کر کے انصاف کے طالب ہیں۔ میر فرماتے ہیں:۔

"گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن تھی وہ اُستاد کار حیلہ فن"

"پاس اُس کو بلا تسلی کی وعدہ وصل سے تشفی دی"

"کائے ستم دیدۂ غم دوری ہو چکا اَب زمانہ مہجوری"

"زار نالے بکر شکیبا ہو عشق کا راز تا نہ افشا ہو"

"دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے چل کوئی دم میں داد خواہش لے"

"سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ قطع تجھ بن نہ ہوسکے تھی راہ"

"گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے اُس کے بھی جذب اشتیاق سے ہے"

"تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا نشۂ دوستی زیادہ ہوا"

"بزم عشرت کریں گے باہم ساز ہوجیو اَب اپنے دست کا دمساز"
(لفظ اہو جو)

"دے کے اُس کو فریب ساتھ لیا — دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا"

ولیک در پردہ اُن نے یہ ٹھانی — کیجئے اس سے خصمیٔ جانی"

مصحفی فرماتے ہیں:-

سن کے دایہ یہ اس کے طرز کلام — ہو مخاطب بالتفات تمام

پاس اُسکو بلا کے آہستہ — یون لگی کہنے "کاے جگر خستہ"

یاس کو دے جواب۔ گھر جا دے — درد حرماں سے کہہ کہ مر جا دے

آہ و نالہ سے کہہ کہ رخصت ہون — گرم رفتار راہ فرصت ہون

کیونکہ نزدیک ہے زمان وصال — ہجر تہا جو۔ ہوا وہ خواب و خیال

اَب کوئی دم کو رہم و ثاقی ہے — دیر منزل تلک کی باقی ہے

جبکہ منزل پدید ہوے گی ؎ — شب تری روز عید ہوے گی

آ۔ بس اَب درد غم کو جانے دے — دور دور اس صنم کو جانے دے

شب کو مل ہی رہے گا تو اس سے — اَب کنارہ ہی خوب ہے اِس سے

کیونکہ ہے اس میں بیم بدنامی ؎ — تو چلا چل ابھی بہ ناکامی ؎

اک ذرا تو دل کو ڈھارس دے — چل کے منزل پہ جام عشرت لے

تیرے آنے سے یہ صنم ہوئی شاد ؎ — کیونکہ ملنا ترا تہا اُس کی مراد

جی سے چاہے تہی۔ ہمرہی تیری — اس کو رستہ میں یاد تہی تیری

بارے اس کے بہی دل کی داد ملی — حق سے مانگی تہی جو مراد ملی

پیچھے پیچھے تو کیا بجا آیا ؎ — مثل سایہ جو یون لگا آیا

غرض اُس کو لگا کے باتوں مین — ہوئی یہ دشمنی کی گہاتوں میں

بی میں ٹھانی کہ کچھ دغا کیجئے ۔۔۔۔۔ سر سے اس بدلا کو وا کیجئے

میرؔ کی زبان کس قدر صاف اور مثنوی کے مطابق حال ہے۔ دایہ کی گفتگو بالکل مطابق فطرت ہے۔ عاشق کی تسلی صرف وعدہ وصل سے ہو سکتی ہے چنانچہ دایہ نے یہی پیرایہ اختیار کیا مگر کس قدر مناسب الفاظ میں جس کا شائبہ بھی مصحفی کے یہاں نظر نہیں آتا

زار نالے نکر۔ شکیبا ہو ۔۔۔۔۔ عشق کا راز تانہ افشا ہو

میں بکنایہ گزشتہ واقعات کی مصیبتوں کو دوہرا کر تنبیہ کی ہے کہ اس چلانے پکارنے کے بدولت تو یہ نوبت پہونچی کہ لڑکی کو گھر چھوڑنا پڑا اور تجکو آلام و مصائب اٹھانے پڑے۔ کیا اُن کو دوہرا کر اپنے مقصد دلی سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ارے تیرے واسطے تو یہی مناسب ہے کہ خاموشی کے ساتھ پیچھے پیچھے اس طرح لگا آکہ کسی کو خبر بھی نہو میرؔ نے ایک ایک شعر میں وہ باتیں بیان کر دیں ہیں جن کے تشریح کے واسطے مصحفی کو شعر پر شعر لکھنے پڑے ہیں مگر تفصیل نے بجائے لطف پیدا کرنے کے بے لطفی پیدا کر دی عاشق سے یہ کہدینا کہ معشوق بھی اس کے واسطے بیچین ہے سب سے بڑی تسلی ہے۔ میر صاحب نے جو دایہ کے زبان سے کہوا دیا ہے اُس کا پرچھانواں بھی مصحفی کو نصیب نہوا گو کہ میرؔ کی مثنوی اُن کے زیر نظر تھی اور ہر شعر کا جواب وہ لکھنا چاہتے تھے۔ نقش ثانی ہمیشہ نقش اول سے بڑھا چڑھا ہونا چاہئے مگر مصحفی کے اشعار میرؔ کے مقابلہ میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی رنگین مرقع کی نقل پنسل سے اتاری ہوئی۔ پنسلی نقل بھی صاف نہیں۔ جا بجا ہاتھ کا رعشہ خد و خال کو بگاڑ رہا ہے۔

مصحفی کے اشعار کا تجزیہ کرنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) دایہ ایک عشق کے دیوانہ کو ان الفاظ میں سمجھاتی ہے۔

یاس کو دے جواب گھر جاوے ‏ ‏ ‏ ‏ در دحرمان سے کہہ کہ مرجاوے

آہ و نالہ سے کہہ کہ رخصت ہون ‏ ‏ ‏ ‏ گرم رفتار راہ فرصت ہون

نہ تو یہ بول چال ہے اور نہ یہ الفاظ دایہ کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے۔ یہ الفاظ مصحفی یا یا امانت کی زبان سے اُسی زمانہ کے لوگون کو بھلے معلوم ہوتے ہون گے۔ اس زمانہ میں تو کسی کی زبان سے بھی کوئی سننا پسند نکرے گا۔ اس سیدھی سی بات کو کہ "مایوس نہ ہو" دو پیچیدہ مصرعون میں ادا کیا گیا ہے۔ اسی طرح "مت رو" کو دوسرے شعر میں چیستان بنایا گیا ہے۔ مین خیال کرتا ہون کہ غریب عاشق کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہوگا کہ دایہ صاحبہ فرما کیا رہی ہیں دوسرے شعر مین لفظی رعایت نے شاعری کا خون کیا ہے۔ "رخصت" "گرم رفتار" "راہ فرصت" اکٹھا ہو کر یہ شعر بن گیا۔ خوبی دیکھئے تو خدا کا نام۔

(۲) چھٹے شعر میں لفظ "ہم وساقی" بیحد ثقیل ہے جو شاعری کے واسطے عموماً اور مثنوی کے لئے خصوصاً نہایت بدنما داغ ہے۔

(۳) ساتوین شعر مین شب کو روز عید بنانا بھی عجیب صنعت ہے۔ خوشی کی رات کو شب برات سے صرف تشبیہ دیجاتی ہے مگر یہان رات کو دن بنا دیا گیا۔ آخر کچھ تو ادتیج ہو۔

(۴) آٹھوین شعر میں پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

(۵) نوین شعر مین قافیہ ہی غائب ہے اس غلطی کو ہم مصحفی کی طرف نسوب نہیں کر سکتے ممکن ہے کہ یہ شعر اس طرح ہو۔

شب کو مل ہی رہے گا جب اُس سے

ہے کنارہ ہی خوب اَب اُس سے

(۶) سولہ شعر کے ٹکڑے ہیں تین "کیونکر" پتہ دیتے ہیں کہ شاعر کا مذاق کس حد تک

صیحح تھا ملاحظہ ہوں "کیونکہ نزدیک ہے زمان وصال"، "کیونکہ ہے اس میں بیم بدنامی" "کیونکہ تمنا تر اتھا اُس کی مراد"

(۷) "کیونکہ اس میں ہے بیم بدنامی" ایک ایسا مصرع ہے جس کا تعلق نہ اپنے ماقبل کے شعر سے ہے اور نہ مابعد سے اور نہ اس شعر کے دوسرے مصرع سے ہے جس میں یہ واقع ہوا ہے جس بات میں بیم بدنامی ہے اُس کا کہیں پتہ نہیں "المعنی فی البطن الشاعر" اسی کو کہتے ہیں۔

(۸) اشعار ۱۲ الغایت ۱۵ تسلسل کی نظر سے بالکل بیموقع ہیں۔ تمام تسلیوں کے بعد جب فرمائش ہی کرے کہ الگ الگ چلو تو پھر ان شعار کا کیا موقع تھا۔ اگر میر کی ان اشعار کی تقلید میں ان کو کہا تھا تو ان کو کہیں اور کسی موقع سے چسپاں کرتے۔

میر

سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ — قطع تجھ بن نہو سکے تھی راہ

گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے — اسکے بھی جذب اشتیاق سے ہے

تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا — نشۂ دوستی زیادہ ہوا

میر کے ان اشعار میں جو لطف ہے مصحفی کے یہاں اُسکی جھلک بھی نہیں۔ عشق صادق میں جذب معشوق کا اثر دعا کی مقبولیت کے اثر سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ عشق صادق سوائے معشوق کے کسی دوسرے کی وقعت دل میں رہنے نہیں دیتا عشق کے مذہب میں معشوق ہی سب کچھ ہے۔ میر صاحب نے عاشق کو جو شیشہ میں اتارا ہے تو یہی کہکر کہ معشوقہ خود تیرے لیئے بیچین تھی اور جو ساتھ لگا چلا آیا وہ اسی کی کشش کی بدولت مصحفی معشوق کے دعا کی قبول ہونے کی وجہ سے اس کا ساتھ ساتھ آنا ظاہر کرتے ہیں اہل دل اس رمز کو سمجھیں گے کہ دونوں طرز ادا میں کتنا بڑا فرق ہے۔ موازنہ کیلئے

مصحفی کے اشعار بھی نقل کیئے دیتا ہون۔

تیرے آنے سے یہ صنم ہوئی شاد ۱ کیونکہ ملنا ترا تھا اس کی مراد ۂ

جی سے چاہے تھی ہمرہی تیری ۲ اس کو رستہ میں یاد تھی تیری ۂ

بارے اسکے بھی دل میں داد ملی ۂ ۳ حق سے مانگی تھی جو مراد ملی ۂ

پیچھے پیچھے تو کیا بجا آیا ۂ ۴ مثل سایہ جو یون لگا آیا ۂ

(۹) چوتھا شعر تو عجب پھُس پھسا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہان مصحفی کی شاعری کا تھک کر سانس پھولنے لگا ہے مجبوراً دم لینے کے لئے یہ سُست رفتاری ہے۔ اگر میر اور مصحفی کی زبانی دایہ کی کل گفتگو پھر بغور پڑھیئے گا تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ ٹکڑا مصحفی نے زبردستی ٹھونس کر خلاف محل و موقع داخل کیا ہے نہ اس کا بیان موقع ہے اور نہ کوئی لطف پیدا کرتا ہے یہ میر کی رنگین تصویر کی پھیکی نقل ہے جو بموقع وصل کی گئی ہے۔

(۱۰) مصحفی کے اس مصرع کا بھونڈا پن بھی ملاحظہ ہو۔

سر سے اس بد بلا کو وا کیجیئے

سر سے بلا کو وا کرنا نہ اردو محاورہ ہے نہ اردو زبان۔ از سر وا کردن بمعنی دور کردن چیزی فارسی محاورہ ضرور ہے مگر مصحفی اُردو کی نظم اور نظم میں بھی مثنوی لکھنے بیٹھے ہیں اس میں غیر مانوس فارسی محاورے اور ترکیبین داخل کر کے میر سے برتری کا دعویٰ! ذوق سلیم تو اسکو تسلیم نہین کرتا۔

(۱۱) محافہ کشتی میں رکھا جاتا ہے یہ شوریدہ سر بھی اسی میں سوار ہو جاتا ہے۔ اس عارضی یکجائی سے جو کچھ بھی سکون دل مضطر کو حاصل ہوا ہو اس کا اندازہ مشکل ہے طرح طرح

کے خیالی قلعے بنتے اور بگڑتے ہونگے۔ کشتی کے چھوٹنے پر جدائی کا نقشہ نظر میں پھر جاتا ہوگا خیال آتا ہوگا کہ کشتی دریا کے اس کنارے پہونچی اور قیامت آئی۔ جو چند لمحہ کو پاس بیٹھنا ملا ہے وہ پھر کہاں نصیب۔ پھر وہی کوچہ گردی ہوگی۔ یا دشت نوردی۔ اس معیت کا ایک ایک لمحہ محشرستان خیال ہوگا ایسی حالت میں دایہ نے معشوقہ کی جوتی دریا میں پھینک دی۔ میر کا عاشق فوراً دریا میں نہیں کودتا۔ مصحفی کا فوراً کود کر غرقاب ہوجاتا ہے۔ مصحفی کے اس حصہ نظم کی مولوی صاحب نے نہایت تعریف فرمائی ہے خصوصاً "ہاں میاں لینا" کی بلاغت کو معراج کمال تصور فرمایا ہے ہم دونوں ٹکڑوں کو پیشکش ناظرین کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

کفش اُس گل کی اُس کو دکھلا کر	۱	بیچ دریا کے دایہ نے جاکر
اور بولی کہ او جگر افگار	۲	پھینکی پانی کی سطح پر یک بار
موج دریا سے ہوئے ہم آغوش	۳	حیف تیری نگار کی پاپوش
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُسکو	۴	غیرتِ عشق ہے تو لا اسکو
اس نواحی کی سیر کرنا ہے	۵	اس طرف آب کے اترنا ہے
ظلم ہے ہوئیں گر غبار آلود	۶	پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار	۷	جس کف پا کو رنگ گل ہو بار
آبلہ چشم کو سیاہ کرے	۸	ان میں نرمی میں گل سے ہوں جو پڑے
مفت ناموس عشق کو مت کھو	۹	یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام	۱۰	جی اگر تھا عزیز اسے ناکام
دل سے اُسکے گیا شکیب و قرار	۱۱	سن کے یہ حرف دایۂ مکار

بے خبر کار عشق کی تہہ سے ۱۲ جست کی اُس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینہ میں یا کہ دریا میں ۱۳ موج زنجیر پڑ گئی پا میں
کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب ۱۴ تھی کشش عشق کی مگر تہِ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں ۱۵ ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے ۱۶ غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اُس کو ۱۷ آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

مصحفی

پہونچی کشتی جو بیچ میں اک بار (۱) ہوئی سرگرم حیلہ وہ غدار
امتحاناً بروے سطحِ آب ۲ یعنی کفش اُس پری کی پرتاب
تھا جو منظور اس کی جان لینا ۳ پھر کہا یہ کہ "ہاں میاں لینا"!
ہاتھ اُسکے سے کی جو کفش نے جست ۴ لیا موجوں نے اُسکو دست بہ دست
ہوئی جا کر بزیر آب رواں ۵ غاتمِ دست پنجۂ مرجان
قعر دریا میں جبکہ جا پہونچی ۶ سیپ کے سر پہ پشت پا پہونچی
ہوکے وہ کفش تاجِ فرق حباب ۷ ہوگئی پل میں گوہر نایاب
تھا جوان بسکہ سخت دلدادہ ۸ ہوکہ ناگہ بمرگ آمادہ
کفش پر کر دراز اپنا ہاتھ ۹ آشنا یانہ کودا "ہاں" کے ساتھ
کودتے ہی چلا گیا تہ کو ۱۰ طے کیا عمق آب کی رہ کو
گوہر جان نثار کفش کیا ۱۱ نہ ذرا انتظار کفش کیا
کفش ساتھ اپنے اُس کو لے ڈوبی ۱۲ نہ غلط بلکہ پا کی محبوبی
نہ وہ اچھلا نہ کفش ہی اچھلی ۱۳ عقل حیران کار اُس کی ہوئی

مرتبہ عشق اس قدر بلند ہے کہ اُس پر پہونچکر ماسوا سے تعلق نہیں رہتا زوائد چھوٹ کر صرف ایک نظر میں رہ جاتا ہے اُسی ایک کے حاصل کرنے کی اُس کو تمنا ہوتی ہے۔ اُسی کے لئے جیتا ہے اور اُسی پر مرتا ہے عاشق کی آنکھہ کو سوائے معشوق کے کچھہ اور نظر ہی نہیں آتا۔ میر اور مصحفی کے عاشقون مین پختہ مغز اور خامکار کا فرق ہے۔ ایک معشوق سے غرض رکھتا اور دوسرا معشوق کی چیزوں سے۔ میر کے عاشق کی نگاہ اور دماغ میں سوائے معشوق کے اور کچھہ نہ تھا۔ اس کو جوتی کے گرنے کا ہوش بھی نہ ہوا ہوگا۔ جب دایہ نے بک بک کرکے اُس کا سر کھایا ہوگا اور معشوق کی تکالیف کا طومار باندھ کر اُس کے خیال کو اس طرف منعطف کیا ہوگا اُس وقت اُس کو معلوم ہوا ہوگا کہ جوتی پانی میں گر گئی جس سے اوس کے آرام جان کو تکلیف پہونچنے کا خیال ہے معشوق سے جدائی ضرور شاق تھی مگر معشوق کی تکلیف بھی گوارا نہ تھی جوتی کی تلاش کیواسطے پانی میں کود پڑتا ہے۔ مصحفی کا عاشق جوتی کے ساتھ ہی کود پڑتا ہے۔ گویا اس کا دماغ معشوق کے خیال سے آزاد اور آنکھیں دریا کی سیر میں مشغول تھین کان دایہ کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ ادہر دایہ نے کہا کہ "ہان میاں لینا" اور یہ جوتی کے ساتھ ساتھ پانی میں تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں بڑی باریکی ہو جس کو سمجھنے میں میرا دماغ کام نہ دیتا ہو مگر میری رائے میں تو میر کی تصویر صحیح جذبات عشق کے مطابق ہے۔

اَب ذرا طرز ادا ہر دو شعرا کا بھی ملاحظہ ہو۔ میر کا آٹھوان شعر ضرور مغلق ہے باقی اشعار نہایت آبدار ہیں جس بات کو بیان کیا گیا ہے وہ نہایت خوش اسلوبی سے ادا ہوئی ہے۔

مصحفی کے اشعار کا رنگ ملاحظہ ہو۔

(۱) "امتحاناً" بروے سطحِ آب - یعنی کفش اُس پری کی کی پر تاب" اس شعر کا دوسرا مصرع مجموعہ قبح ہے "یعنی" کا کوئی موقعہ نہیں ہے نہ یہ بول چال ہے صرف مصرع کو پورا کرنے کے لئے "یعنی" استعمال کیا گیا ہے - "کی کی" صاحب نظر کی نگاہ میں کنکر سے کم نہیں اگر کوئی مبتدی ایسی غلطی کرے تو قابل معافی ہے مگر میر کے مد مقابل کے واسطے "کی کی" لکھنا سخت معیوب ہے۔ اُس کے علاوہ "کی پر تاب" نہ اردو زبان ہے نہ اُردو کا محاورہ

(۲) "ہاتھ اس کے سے کی جو کفش نے جست"

فارسی کے طرز استعمال سے قطع نظر کر کے دیکھنا یہ ہے کہ اُردو میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے ہاتھ سے کفش نے جست کی۔ آخر یہ کون زبان ہے؟

(۳) ہوئی جا کر بزیر آب رواں ٭ خاتم دست پنجۂ مرجاں ٭

دوسرے مصرع میں خلاف واقعہ ہونے کی غلطی ہے۔ کشتی دریا میں ہے مرجان دریا میں نہیں ہوتا سمندر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح

(۴) قعر دریا میں جبکہ جا پہونچی ٭ سیپ کے سر پہ پشت پا پہونچی

سیپ سمندر میں ہوتی ہے۔ مگر سیپ کا دریا میں ہونا مصحفی کے یہاں جائز ہے۔ شائد اُن کو خبر نہیں کہ سیپ دریا میں نہیں ہوتی۔ غریب میر سے یہ نازک خیالی کہاں ہو سکتی تھی علاوہ بریں "پشت پا" بمعنی جوتی۔ اُردو میں آج تک کہیں استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ مصحفی کا تراشا ہوا ہے۔ گندہ سہی مگر ایجاد بندہ تو ہے۔

(۵) "آشنایانہ کود اے "ہان" کے ساتھ"

"آشنایانہ" دریا کی رعایت سے مصحفی کو استعمال کرنا ناگزیر تھا۔ بیچارے اس قسم کے الفاظ کے استعمال کرنے پر مجبور تھے۔

(۶) "گوہر جان نثار کفش کیا — نہ ذرا انتظار کفش کیا"

دوسرے مصرع کا مفہوم سمجھ ناقص مین نہ آیا گو الفاظ صاف ہیں۔ المعنی فی البطن الشاعر کفش کا انتظار کیا، معنی۔۔

(۷) "کفش ساتھ اپنے اُسکو لے ڈوبی — نہ غلط۔ بلکہ پا کی محبوبی"

سبحان اللہ دوسرا مصرع اِس قدر بلند ہے کہ میر کی کمزور نگاہ وہان تک پہونچ ہی نہیں سکتی تھی۔

(۸) "نہ وہ اچھلا نہ کفش ہی اچھلی — عقل حیران کار اُس کی ہوئی"

معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کا دوسرا مصرع صرف برائے بیت ہوتا ہے یہان پر بھی دوسرے مصرعے کی خوبی نہ معلوم ہوئی "حیرانی عقل" پر عقل حیران ہے۔ کفش اور اُس شوریدہ سر کا پرشور دریا میں ڈوب جانا لازمی تھا پھر اُس میں عقل کی حیرانی کی کونسی بات تھی۔

عاشق ڈوب جاتا ہے دایہ خوش اور لڑکی مغموم دریا پار جاکر قیام کرتے ہین اُس کے بعد کا جو منظر ہے اُس کو بھی مولوی صاحب میر پر ترجیح دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔

میر

قصہ کوتاہ بعد اک ہفتہ — ۱ آئی وہ رشک مہ زخود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ — ۲ ہوگیا غرق وہ فرومایہ

اب تو وہ ننگ میان سے گیا — ۳ آرزومند اس جہان سے گیا

تھے جو ہنگامے اُس کے حد سے زیاد — ۴ ساتھ اُسکے گئے وہ شور و فساد

شور فتنے تھے اُس تلک سارے — ۵ اب تو بدنامیان نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متصل میرا — ۶ مرغ بسمل ہے یاکہ دل میرا

وحشت طبع اَب تو افزون ہے ۷ حال جی کا مرے دگرگون ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے ۸ جان وتن کی وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم کو خون ہووے گا ۹ آج کل میں جنون ہووے گا
بیکلی جی کو تاب دیتی ہے ؎ ۱۰ طاقت دل جواب دیتی ہے
جی مین آتا ہے ہون بیابانی ؎ ۱۱ پر کہوں ہوں کہ یہ ہے نادانی
مصلحت ہے کہ مجکو لے چل گھر ۱۲ ایک دو دم رہیں گے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو ؎ ۱۳ ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو ؎
دایہ بولی کہ اَے سراپا ناز ۱۴ حسن کا - دریہ تیرے روئی نیاز
ابتو میں فتنہ کو سلایا ہے ۱۵ اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا ۱۶ سد رہ کون ہے نکلنے کا ؎
ہو محافہ میں دل خوشی سے سوار ۱۷ شاد شادان کر آب سے تو گزار
دل سے ۔ اپنے پدر کے غم کم کر ۱۸ مادر مہربان کو خرم کر
کر ملاقات ہمدمون سے تو ۱۹ گرم بازی ہو محرمون سے تو

مصحفی

ایک دن دایہ سے کہا آکر ؎ ۱ مجھ کو اکثر رہے ہے درد جگر
یہ مکان بہی نہ سازوار ہوا ۲ دل مرا یان بہی بے قرار ہوا
گھر کو لے چل کہ جس کا تھا خطرہ ۳ اب تو وہ مدعیٔ جان نہ رہا ؎
ساری اُس کے سبب سے تھی آفت ۴ وہ نہیں ابتو کیا ہے پھر تہمت
کوئی اَب اُسکا دادخواہ نہین ۵ اُسکی باتین اُسی کیساتھ گئین ؎
کون جانے ہے وہ کدہر کو گیا ؎ ۶ مرگیا یا کسی نگر کو گیا ؎

طبع نازک کا میری پر رکھ پاس ۷ اس سے اب جی میں تو نہ لا وسواس

درد ہے رنج ہے مصیبت ہے ۸ کیونکہ اب دل پہ اک اذیت ہے

وہی وحشت ہے اور وہی سودا ۹ کیون ہے دل میرا یان نہین لگتا

ہے وہی زیست میرے جی کا وبال ۱۰ ہے سراسیمگی وہی دنبال

ہاتھ کہتے ہین جیب کو آ لے ۱۱ پانوں کہتے ہیں راہ صحرا لے

کچھ ہوا صبح و شام میرے تئیں ۱۲ بیکلی ہے مدام میرے تئین

پہلوئے دل میں کچھ الم سا ہے ۱۳ سر پہ کوہ گران غم سا ہے

جی رکا آتا ہے کدھر جاؤن ۱۴ پر نہیں ہیں کہ اڑ کے گھر جاؤن

بیٹھی جاتی ہون ورنہ مثل حباب ۱۵ کچھ تو تدبیر میری کر تو شتاب

تیرے صدقہ یہ میرا کہنا مان ۱۶ سفر دور کا ہے قاصد جان

نازبر تیرے صدقہ اہل نیاز ۱۷ سن کے بولی یہ دایہ اے طناز

اتنی کرتی ہے مجھ سے کیون تکرار ۱۸ ہون میں آمادہ تہیہ کار

اور سر آیا زمان ناکامی ۱۹ سچ ہے اب تو مٹی وہ بدنامی

اب ملایا تجھے اب وغم سے ۲۰ دل کو خوش رکھ کنارہ کر غم سے

تیری خاطر محافہ لاتی ہون ۲۱ پوچھنے جوتکی سے جاتی ہون

کیجیو ہمدمون میں جلوہ گری ۲۲ ملیو تو شاد شادمان سے پری

میر کے اس ٹکڑے میں نمبر چھ لغایت ۱۲ مین ایسے اشعار ہیں جن کا جواب مصحفی کی کوشش بلیغ کے بعد بھی نہ ہو سکا۔ لڑکی اور دایہ کی گفتگو مناسب موقع نہایت صحیح جذبات کی تصویر ہے۔ ۳ لغایت ۱۵ اشعار میں مصحفی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ عاشق

دیوانہ چل بسا اُٹھ رسوائی کا اور نہ کسی کی داد خواہی کا ڈر رہا اسی کے بعد فرماتے ہیں

(۱) کون جانے ہے وہ کدہر کو گیا مرگیا یا کسی نگر کو گیا

مولوی عبدالماجد صاحب نے اس شعر کی توجیہ اِن الفاظ میں فرمائی ہے کہ "لڑکی نے اپنے تئیں جوان کے انجام سے قصداً انجان بنایا تاکہ دایہ کو ذرا بھی بدگمانی نہ پیدا ہو سکے،، یہ مولوی صاحب کا حسن ظن ہے کہ مصحفی کا ہر عیب اُن کو ہنر معلوم ہوتا ہے لڑکی کو وہاں سے جھنکارے کے واسطے تو یہی مناسب تہا کہ وہ اگرچہ جوان مرا بھی نہ ہوتا تو بھی دایہ کو باور کراتی کہ وہ مرگیا۔ بدقسمتی سے مصحفی کو یہ یاد نہین رہتا کہ وہ کیا لکھ آئے ہیں اس لئے اختلاف بیانی اون کی نظم میں بہت پائی جاتی ہے جب کہ لڑکی صاف لفظون مین یہ کہہ چکی ہو ،، اَب تو وہ مدعیٔ جان نہ رہا،،

،، اب کوئی اُس کا دادخواہ نہین۔ اس کی باتیں اُسی کے ساتھ گئین،، اُس کے بعد اس قول کو کون جانے ہے کہ وہ کدہر کو گیا۔ مرگیا یا کسی نگر کو گیا،، یہ کہکر ٹال دینا کہ تجاہل عارفانہ ہے قابل قبول نہیں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ لڑکی نے آگے چل کر خود دایہ سے باین الفاظ گفتگو کی ہو۔ ،، اُس سے پوچہا کہ دایہ سچ بتلا۔ کس مکان پر وہ خستہ ڈوبا تہا،،

،، کفش پر میرے جی دیا اُس نے یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے،،

. . . . بولی دنا زنین ہوا سو ہوا ،،

اگر بقول مولوی صاحب اُس کو لڑکی کا تجاہل مان لیا جائے تو تجاہل کی اس سے زیادہ بھونڈی مثال دوسری شکل سے ملے گی جبکہ قبل اور بعد دونوں صورتوں میں صاف لفظوں میں لڑکی جوان کے مرنے کا ذکر کر رہی ہو۔ اُس کے بعد کا شعر بدنگی میں فرد ہے فرماتے ہیں۔

(۲) "اُس سے اَب جی میں تو نہ لا دسواس　　طبع نازک کا میری پر رکھ پاس"

(۳) میر کا مصرع "جی میں آتا ہے ہوں بیابانی" کا لطف کچھ دل ہی اٹھا سکتا ہے اس کے جواب میں مصحفی نے بہت ہاتھ پانون مارے مگر میر تک نہ پہونچے فرماتے ہین -

"پانون کہتے ہیں راہ صحرا لے　　ہاتھ کہتے ہیں جیب کو آ لے"

دوسرے مصرع نے تو شاعری کو کند چھری سے حلال کر ڈالا دوسری مثنوی میں جو نسخہ ہے وہ اور بھی عجیب ہے ملاحظہ ہو۔

"ہاتھ کہتے ہیں جیب سودا لے"

بہر حال یہ مصرع ہو یا وہ دونون مصحفی کے اصلی رنگ کی صحیح تصویر ہیں۔

(۴) یہ شعر بھی قابل غور ہے۔

"سفر دور کا ہے قاصد جان کا　　تیرے صدقہ یہ میرا کہنا مان"

مصرعہ اول کی ترکیب ہی ایسی واقع ہوئی کہ مولوی صاحب کو اس کے مہمل ہونے کا دہوکا ہوا جس کی وجہ سے یہ نوٹ دینا پڑا کہ "مصرعہ کا مطلب واضح نہیں ہوا۔ ق۔ ن کے مطابق نقل کر دیا گیا" دوسرا نسخہ مولوی صاحب کو دستیاب ہوا اُس میں بھی یہ مصرعہ بجنسہ موجود ہے اس میں شک نہین کہ یہ مصرعہ صحیح ہے مگر مہمل تھا۔ جان کو بجائے مونث کے مذکر لکھا ہے جیسا کہ اس زمانہ کے شعرا نے اکثر کیا ہے۔ قاصد بمعنی قصد کنندہ مطلب یہ ہے کہ "دور و دراز کے سفر کا میری جان قصد کر رہی ہے۔ یعنی اس دنیا کو چھوڑنے پر جان تلی بیٹھی ہے" دوسرے مصرعہ کا تعلق اس شعر کے ماقبل شعر کے مصرع اول سے ہے جس کو اس طرح پڑھنا چاہئے۔

"کچھ تو تدبیر میری کر تو شتاب   تیرے صدقہ یہ میرا کہنا مان"

تیرے صدقہ" ایک نوخیز لڑکی کی زبان سے بھلا نہیں معلوم ہوتا ہاں البتہ اگر دایہ اس کو ادا کرتی تو ٹھیک تھا مگر مصحفی کے یہاں موقع محل کا خیال کجا۔

(۵) یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

سن کے دایہ نے یوں کہا طناز   ناز پر تیرے صدقہ اہل نیاز

یہ پسر معنوی مصحفی اس خاک سے پیدا ہوا ہے جسکو میر کے لخت جگر کے خوں سے گوندھا گیا تھا میر کا شعر ملاحظہ ہو۔

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز   حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز

مصحفی کے یہاں لفظ "طناز" نہایت بھونڈی طرح ادا ہوا ہے۔ دوسرے مصرع سے تو مصحفی کی شاعری کا بھرم ہی کھل گیا۔ دایہ لڑکی کے جو ساتھ گئی تھی تو عزت و آبرو بچانے نہ کہ آشنائی کی گھاتیں سکھانے ایک پاکباز عصمت پناہ لڑکی سے یہ کہنا۔

"ناز پر تیرے صدقہ اہل نیاز"

اُس کے پاکدامانی کی توہین کرنا ہے۔ چونکہ "ناز و نیاز" کا یکجا ہو جانا مصحفی کی شاعری میں واجبات سے تھا۔ بلا سے شاعری کا خون ہو جائے مضمون رکیک ہو جائے جو کچھ بھی ہو مگر ضلع جگت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ میر نے بھی "روئے نیاز" لکھا ہے مگر لڑکی کے شایان شان "حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز" ایسے ہی مواقع اکتسابی اور وہبی شاعر کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۶) پوچھنے جو تکی سے جاتی ہوں   تیری خاطر محافہ لاتی ہوں

پہلا مصرع بدمذاقی میں ڈوبا ہوا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ جس حصہ نظم میں ایسے

اشعار ہوں اُس کو میر کے کلام پر ترجیح دیجائے

(۷) "دلیو تو شاد شادماں سے پری کیجیو ہمدموں میں جلوہ گری"
پہلے مصرع کے معنے تو مولوی صاحب سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ شاد شاداں اور شادماں ہم معنے ہیں چونکہ میر نے "شاد شاداں کر آپ سے تو گزرا" لکھا ہے مصحفی نے شاد شادماں لکھا۔ دونوں مصرعے سامنے ہیں فرق آپ ظاہر ہوجائیگا۔ لفظ "پری" کا موقع استعمال ہی قابل ملاحظہ ہے۔

جذبات

نہ وفورِ گریہ ہے کوئی شے نہ اثر ہے سوز و گداز میں
مری زندگی کا معاملہ ہے عجیب پردۂ راز میں

مرے انتظار پہ رحم کر مرے جوشِ شوق کی داد دے
ادھر آ کہ سر بسجود ہوں تری راہ دیدہ نواز میں

یہ تصورِ وسعتِ ذوق تھا جو خیال طوفِ حرم ہوا
ترا حسن ہی نہ سما سکا مرے شوقِ تنگدہ ساز میں

مجھے رحم آتا ہے غزنوی تری خامکاریِ ذوق پہ
جسے پا کے بھی تو نہ پا سکا وہ نہاں تھا حسنِ ایاز میں

کوئی عکس ہی نہ سما سکا کبھی عکسِ یاس کے ماسوا
مری بیکسی کا بھی کچھ اثر تھا خیالِ آئینہ ساز میں

تجھے عرضِ جلوۂ رہگزار کی ہے قسم زرہِ کرم
مرے دل کا رنگ بھی دیکھ لے کبھی اپنی خلوتِ ناز میں

یہ نہیں کہ راہ نما نہیں وہ کہیں ہے اور یہ نہیں کہیں
ہے اثر جنونِ فراق کا مرے پائے بادیہ ناز میں

کبھی سیرِ گلشنِ مدعا بھی رہینِ لطفِ نگاہ ہو
مرے آرزو کا بھی پھول ہو کبھی تیرے دامنِ ناز میں

تجھے غزنوی یہ خبر نہیں جو بنا تھا تیشۂ کوہکن
وہی عشق شکل بدل ہے ترے لطفِ بندہ نواز میں

تری سرد مہری ناروا کا ہوا نتیجہ یہ بے وفا
نہ وہ شعلہ آتشِ دل میں ہے نہ وہ کیف سوز و گداز میں

یہ تپش کا لطف یہ لذتیں ہے دعا کہ ہادیِ خستہ جاں
نہ کمی ذرا بھی ہو حشر تک ترے غم کی عمرِ دراز میں

(ہادی مچھلی شہری)

بے سروپا!

رشید احمد صدیقی علیگ

آج صبح سے میں اس فکر میں ہون کہ شمع کے لئے کوئی ایسا مضمون لکھ کر اپنے وعدہ اور اڈیٹر صاحب کی فرمائش سے عہدہ برآ ہو جاؤں جو کسی کو پسند آئے یا نہ آئے میرے پاس مدیران شمع میں سے کسی ایک کا شکریہ کا خط آ جائے فی نفسہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا زبانی یا تحریری اعادہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ ایک طور کی کمزوری اور شائد بدمذاقی بھی ہے لیکن کیا کیا جائے اس کے سوا چارہ نہیں ہے یہ البتہ ہے کہ دوسرے کچھ ہی کیون نہ خیال کریں آرٹ اور تصوف کا تصور عام ذہنوں میں آج کل جیسا کچھ ہے وہ ہر قسم کی رندانہ جرات کے لئے ایک سند جواز ہے!

غور کیجئے صبح سے یہ وقت ہونے آیا (۱۲ بج چکے ہیں) اور اب تک کچھ سمجھ میں نہین آیا کہ یہ چار پانچ صفحے کس طور پر پر کئے جائیں گے۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں، اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے، کوئی سو رہا ہے، کوئی کچہری گیا، کوئی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے جامع مسجد گیا ہے، مکان کا صدر دروازہ کھلا ہوا ہے اور میں مراقبہ میں ہون! میرا مکان عین بازار کے سامنے ہے، پڑوس ایسے بزرگون کا ہے جن کی موجودگی میں دن رات کا کوئی وقت ہو عافیت یا تنہائی نہیں محسوس کیجا سکتی۔ ہمارے اور ہمارے پڑوسیون کے درمیان صرف ایک سڑک حد فاصل ہے جو آیند و روند سے کسی وقت خالی نہیں رہتی قصبہ کے وسط سے جو سڑک گذرتی ہے اُس نے بستی کو مشرقی اور مغربی دو

حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مشرق کے اندرونی حصہ میں جتنی گلیاں ہیں وہ سب اس سڑک سے ملتی ہیں۔ جو ہمارے مکان سے شروع ہو کر قصبہ کے باہر ختم ہو گئی ہے۔ بازار سے جتنے لوگ مشرقی حصہ کی طرف آتے ہیں ان میں کم سے کم بیس فیصدی کتوں کی تعداد ہے۔ جتنے مرد معقول ہیں وہ تو گلی سے گذر جاتے ہیں لیکن یہ دوسرے قسم کے لوگ دروازہ کھلا پاکر سیدھے کمرہ میں آتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انھوں نے میرے ہی مکان کو ٹرمنس قرار دیدیا ہے۔ یہ ہمارے پڑوسیوں کا تصرف ہے کہ اُن کی طرف جانیکی یہ ہمت نہیں کر سکتے، اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو اس گلی سے نکل جاتے ہیں اُن کا پایہ کیا ہوگا۔ اس ایک گھنٹہ میں کم سے کم ایک درجن کتوں نے شرف زیارت بخشا ہے اور ان کی پذیرائی کے لئے جتنی بار مجھے اٹھنا بیٹھنا پڑا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو اس آفت کا سامنا رہا ہے میرا خیال ہے کتوں اور آدمیوں کی اقسام بے شمار ہیں اس مضمون میں میں ان دونوں سے بے اعتنا رہنا چاہتا ہوں اگر حالات ساعد ہوئے تو ان پر علیحدہ علیحدہ مضامین لکھوں گا۔ ایک ہی مضمون میں دونوں کا تذکرہ خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ ممکن ہے دونوں کا خیال بیک وقت ذہن میں آجائے!

آدمی گلی میں اور کتے کمرہ میں آتے جاتے رہے اور میں اسی فکر میں رہا کہ کسی طرح کوئی معقول بات ذہن میں آجائے اور میں لکھنا شروع کر دوں کچھ دیر سوچتا رہا کوئی معقول لکھا پڑھا، تندرست، خوش حال خوش رو بہیرو ملجائے تو اُسے کہیں کسی ٹرین، مسافر خانہ، بالاخانہ، تھیٹر، سینما، میدان جنگ، ہسپتال، گرلز اسکول، ہوٹل

یا جیلخانہ پہونچا کر کسی اسی قسم کی ہیروین سے متصادم کردوں اور اُن میں سے کسی ایک کی جان لیکر ایڈیٹر صاحب شمع کی فرمائش سے سبکدوش ہوجاؤں لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں۔ علی گڈھ اس کے لئے بہترین سرزمین تصور کیجاتی ہے۔ لیکن امتحان کا نتیجہ شائع ہوچکا ہے اور اَب تک اس قسم کا کوئی چرچا سننے میں نہیں آیا، بہت ممکن ہے جشن جوبلی کے موقعہ پر کوئی صورت نکل آئے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اس وقت تک مدیران شمع کی فرمائش معرض التوا میں رکھی گئی تو ممکن ہے بعض اندیشہ ناک صورتیں پیدا ہوجائیں۔ ہاں اگر صبر و اعتدال سے کام لیا گیا تو بہت ممکن ہے مدیران شمع ہی میں سے کوئی اپنے جذبات پیش کردے!

میرے کمرہ کے سامنے، کھڑکی کے مقابل، ہمارے دو پڑوسیون کے پہلو بہ پہلو مکانات ہیں ان میں ایک عمر رسیدہ خاتون ہیں جو اپنے مکان کے دروازوں پر دن رات بیٹھی ہوئی گایا یا گالی دیا کرتی ہیں۔ پڑوس میں اور کتنی نوعمر بہو بیٹیان ہیں لیکن یہ کیسکو کسی مبحث پر گفتگو نہیں کرنے دیتیں کسی نے اپنے شادی یا بچپن کا تذکرہ شروع کیا یا اُن میں سے کوئی گانے یا گنگنانے پر مائل ہوا اور انہون نے اپنا قصہ چھیڑ دیا انکی عمر جتنی اس وقت ہے، واقف کار لوگ کہتے ہیں کم و بیش اتنی ہی غدر میں بھی معلوم ہوتی تھی۔ محلہ میں کسی نے نیا کپڑا پہنا یا خبر لگی کہ کسی کی شادی ہونے والی ہے، یا کسی کے لڑکا پیدا ہوا ہے انہون نے فوراً تذکرہ چھیڑ دیا کہ میرے شوہر نے مجھے ایسا کپڑا پہنایا تھا۔ میرے شادی کے کتنے نازک مراحل کس طور پر طے پائے تھے اور لڑکے کی پیدائش کا ادمین تجربہ اُن کو کیا رہا ضرب الامثال جتنی اُن کو یاد ہیں اتنے اشعار میرے دو ہمنام

دوستوں کو نہ یاد ہیں اور نہ وہ تصنیف کر سکتے ہیں۔ اور جس برجستگی کے ساتھ وہ اُن کو برسرکار
لاتے ہیں، میرا خیال ہے، بعض لوگ جا و بے جا طور پر اپنی تقریر میں عربی جملے اور فقرے
بھی نہیں استعمال کر سکتے یہ اپنے خاندان والوں سے ہر وقت دانستہ یا نادانستہ طور پر برسر
بیکار رہتے ہیں، ایک روز شب میں خلاف معمول سبھوں نے زبانی تسبیث سے یکلخت
دراز دستی کی طرف گریز کیا ایک قیامت برپا ہوگئی، محلہ والوں میں کس کو جرارت ہوسکتی
تھی کہ اس جنگ کی طرف رُخ کرتا، اتفاق سے سپاہی گشت لگاتا ہوا ادہر آنکلا اُس نے
پہلے تو مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیا اور بالاخر وہ تمام تدبیریں عمل میں لایا جو نقض امن
کے سلسلہ میں پولیس والے کیا کرتے ہیں، لیکن جب اُس نے دیکھا کہ کوئی سنوائی نہیں ہوتی
اور پولیس آجانے سے کہیں کہیں دو چار تماشائی بھی نظر آنے لگے ہیں تو اُس نے خیال کیا کہ
اب ملک معظم کی دبدبہ و رعایا کے دل میں پولیس کی وقعت کم ہونے کا اندیشہ ہے اُس نے
سمجھا پولیس میڈل بھی اسی سلسلہ میں ملا جاتا ہے نشیب و فراز سے قطعاً بے نیاز ہو کر ان
بزو آزماؤں سے گتھ گیا، پہلے کچھ دیر تک تو سپاہی اور "معزز خاتون" دونوں کی چیخ پکار
برابر رہی لیکن معلوم نہیں کیا ہوا چشم زدن میں لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا، سپاہی صاحب کے
جسم پر سارا لباس تار تار تھا، جوتے ٹوپی کی کوئی خبر نہ تھی میدان کارزار سے کراہتے
ہوئے اور کچھ غصہ سے بھرتے ہوئے، کھسک نکلے، کچھ دور نکل جانے پر بعض لوگوں نے
سنا کہہ رہے تھے "ذرا اوچٹ اور پڑتا تو دین دنیا کہیں کا نہیں رکھا تھا قطامہ!!"

"معزز خاتون" کے معزز ہمعصر اور ہمسایہ ایک دوسرے بزرگ ہیں یہ جتنے صاف
گو اور کھرے ہیں اتنا ہی ان کا مکان بوسیدہ اور ان کے نو عمر لڑکے شریر اور کثیف

ہیں۔ دن رات اِن کو گالی بکنے اور ناریل (حقہ)، کا گندہ پانی بدلنے سے کام ہے۔ عرصہ ہوا بیوی نے دائمی مفارقت اختیار کرلی، مکان کا جو حصہ گلی کی سمت ہے اُس کی دیوار ہر برسات میں گرجاتی ہے اور مٹی دبانے کی وجہ سے سڑک ہر درجہ ناقابل گذار ہوجاتی ہے کہ کوئی شخص اُن کو کسی نہ کسی طور پر یاد کیے بغیر گذر نہیں سکتا۔ گالی دینے اور حقہ اپنے سے جب کبھی فراغت پاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب موسلا دھار بارش شروع ہوتی ہے، یہ اپنے دونوں لڑکوں سمیت دیوار اُٹھانے پر آمادہ ہوتے ہیں یہ آج تک نہ ہوا کہ نصف دیوار سے زیادہ کھڑی ہو سکتی یہ مصروف تعمیر رہتے ہیں کہ دیوار یک بیک سربسجود ہوجاتی ہے اور یہ اپنے لڑکوں، کتوں، آنے جانے والوں، مناظر اور عناصر فطرت کے خلاف اپنے مخصوص خطاب شروع کردیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اُن کے اس غصہ و جلال کی ماہیت دریافت کرنی چاہی تو بڑی تلاش و کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ اپنی خانہ آبادی کی فکر میں ہیں، بارے خدا خدا کرکے اُن کے مرض کا علاج بالمثل بھی ہوگیا، لیکن خدا جانے کیا افتاد پڑی بیوی نے علیحدگی اختیار کرلی اور اب سال کی پوری برسات اُن کو فن تعمیر کے تکمیل میں صرف کرنی پڑ رہی ہے۔ جتنے لوگ گلی سے گذرتے ہیں کیچڑ پانی سے تنگ آکر انکو دانستہ یا نادانستہ طور پر صلواتیں سناتے ہیں جس کا جواب یہ فوراً باہر نکل کر دیتے ہیں اور ہر دس پانچ منٹ پر یہ معلوم ہوتا ہے گویا کسی الکشن کے فریقین داد فصاحت باشجاعت دے رہے ہیں۔ ایک روز کسی کانسٹبل کا گذر ہوا اُس کو بھی وہی آفتیں پیش آئیں جو اس سے قبل دوسروں کو پیش آئی تھیں اُس نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اُن کو سراہنا شروع کیا۔ یہ بھلا کب تاب لا سکتے تھے چشم زدن میں، ناریل

اکبر کی عیسائی بیوی

جناب سید انصاری صاحب بی اے (جامعی)

مورخین کی یہ ایک عام غلطی ہے کہ وہ بعض وقت دو مختلف النوع واقعات میں باہم ایسا تعلق پیدا کرتے ہیں جس سے وہ ایک دوسرے کی علت ومعلول معلوم ہوتے ہیں اور اس وجہ سے تاریخ میں وہ ایک اہم اور دلچسپ واقعہ شمار ہونے لگتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کی عیسائی بیوی کا قصہ بھی مورخین کی اسی عام غلطی کا نتیجہ ہے جو باوجود کثیر روایات کے بھی مورخانہ تحقیق وتفتیش کی میزان میں پورا نہیں اترتا۔ متعلمین تاریخ کا سب سے مقدم فرض ہے کہ وہ اس قسم کے غلط واقعات کی تنقید وتحقیق کر کے سچ کو جھوٹ سے پاک کر دکھائیں اور دنیا کے سامنے صحیح تاریخ پیش کریں۔ اس واقعہ پر بحث کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم مختلف قسم کی رواۃ کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان روایتوں میں کہاں تک واقعیت کو دخل ہے۔ اور کہاں تک ان کے تخیئل کی کار فرمائی ہے :-

مختلف رواۃ پر تنقید

۱۔ اس واقعہ کا سب سے پہلا اور مستند راوی ڈی لیٹ (De Laet) بتایا جاتا ہے جس نے اپنی کتاب "سلطنتِ مغل اعظم" سنہ ۱۶۳۱ء میں اکبر کی وفات کے صرف ۲۶ سال بعد لکھی اور جس میں شاہی محلات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ایک سلسلہ" (محلات کا) مریم مکانی کا تھا جو اکبر کی بیوی اور جہانگیر کی ماں تھی" ڈی لیٹ

خود اکبر کے زمانہ میں موجود تھا اور اس حیثیت سے اُس کی روایت سب سے مستند اور مصدق قرار پاتی اگر اس نے اتنا اور بھی لکھدیا ہوتا کہ مریم مکانی مذہباً عیسائی تھی؛ اُس کے علاوہ بعض دیگر مستند ذرائع مثلاً "تزک جہانگیری"، وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کی ماں کا نام مریم زمانی تھا نہ کہ مریم مکانی اور وہ مذہباً ہندو تھی۔

۲- دوسرا راوی لوئی روزلیٹ (Louis Rousselet) ہے جو اپنی تصنیف "ہندوستان اور اُس کے دیسی والیان" میں لکھتا ہے کہ "اکبر کے مقبرہ کے قریب احاطہ سے باہر ایک وسیع خستہ حال روضہ ہے جس میں بادشاہ کی عیسائی بیوی بیگم مریم کی قبر ہے" اس روایت کے نقل کرنے والے مسٹر فنیٹم نے زمانہ روایت کا ذکر عمداً چھوڑ دیا ہے کیونکہ روزلیٹ کی یہ تصنیف بہت بعد کو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی اور یہ امر اس روایت کے ضعیف ہونے کی کافی دلیل ہے۔

۳- تیسرا گروہ رواۃ کا وہ عیسائی علما کا ہے جو اکبر کے ساتھ کافی عرصہ تک رہ چکے تھے اور جن میں اس مسیحی خاتون سے ملنے کے اکثر مواقع حاصل ہوئے ہوں گے۔ بعض تاریخوں میں اُن کی سند سے یہ مروی ہے کہ اکبر کی عیسائی بیوی تھی اور اُس کا نام مریم مکانی تھا۔ اس معاصرانہ روایت کی سند سے کسے انکار ہوسکتا ہے! لیکن جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا اُن مسیحی علما کی اصل تحریروں میں اکبر کی عیسائی بیوی کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

۴- چوتھے راوی پادری ہنری لیوی (Rev. Henry Lewis) ہیں جو اپنی کتاب "تاریخ سکندرہ" میں لکھتے ہیں کہ "وہ جگہ (یتیم خانہ سکندرہ کے لئے) بہت

ہی مناسب انتخاب کی گئی تھی، کیونکہ وہیں پر آس پاس دیہاتوں کے درمیان سکوت کی شاندار فضا میں ملکہ مریم کی قبر تھی جو اس روشن دماغ مگر حریص مسلمان بادشاہ اکبر کی عیسائی بیوی تھی،، مسٹر لیوی نے یتیم خانہ سکندرہ کے زمانہ تعمیر کو گزشتہ صدی سے قبل کسی طرح نہیں بتایا ہے اور یہ امر مثل سابق اس روایت کے ضعیف ہونے کے لئے کافی ہے۔

۵۔ پانچویں راوی ڈاکٹر ہنٹر (Dr. W. W. Hunter) ہیں جو تاریخ ہند میں بہت مستند عالم مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "سلطنت ہند" کے تیسرے ایڈیشن میں صفحہ ۳۵۰ پر یہ فقرہ درج ہے "اس کی (اکبر کی) ایک دوسری بیوی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عیسائی تھی"، یہ تصنیف بھی بہت بعد کی ہے اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ ان سب پر بالاتر اس واقعہ کا چھٹا ذریعہ روایت خود شہنشاہ شاہ عالم کے دستخط کی ایک تحریر بتائی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحی علما کو ملکہ مریم کی طرف سے وظائف مقرر تھے۔ پادری فیلکس (Rev. Felix) جو مسیحی مبلغین کے نام فرامین مغلیہ پر ایک اعلیٰ درجہ کی سند مانے جاتے ہیں، لکھتے ہیں کہ شاہ عالم کا فرمان جس کا ذکر مسٹر فینثم نے کیا ہے، ویڈل (B. Weddell) کے سالانہ وظیفہ کے متعلق ہے لیکن اس میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں کہ یہ عطیہ ملکہ مذکورہ کی جانب سے تھا۔ مسٹر فینثم نے غلطی سے "ازرق دیم" کی بجائے "از مریم" پڑھ لیا ہے، جو شاہ عالم کے ایک دوسرے فرمان میں مذکور ہے۔ علاوہ اس کے مسٹر موصوف فرامین مغلیہ پر کوئی سند بھی نہیں۔

۷۔ ساتویں راوی ای کاٹو (E. Colleau) ہیں جن سے یہ روایت مسٹر جے۔ اے۔ اسمٰعیل گریشس نے اپنی تصنیف کے مقدمہ میں نقل کی ہے ای کاٹو کی تصنیف ۱۸۸۸ء کی ہے اور اس لئے یہ روایت بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

۸۔ آٹھواں راوی گولڈائی (Goldie.) ہے جس کی سند سے مسٹر گریشس نے یہ روایت بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "مصنف نے بادشاہ کی عیسائی بیوی کے معمولی قصہ کا ذکر کیا ہے" اس بنا پر گولڈائی کے بیان کے مطابق اکبر کی عیسائی بیوی کا وجود ایک "معمولی قصہ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

۹۔ سب سے آخری نویں روایت کرنل کول (Colonel Cole) سے منسوب ہے جسے گولڈائی نے اس طرح نقل کیا ہے کہ "کرنل کول نے اپنے فتح پور سیکری کے نقشہ میں مریم کے مکان کا بھی ذکر کیا ہے جسے روایات یہ بتاتی ہیں کہ وہ اکبر کی ایک پرتگالی بیوی تھی" اس بیان کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ آیا گولڈائی نے یہ سمجھا کہ یہ "معمولی قصہ" روایات پر مبنی ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف کرنل کول کی رائے کا اظہار کر رہا ہے۔ بہرحال ان تمام اسناد روایت کے مطالعہ و تنقید سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت انیسوی صدی سے پیچھے کسی طرح نہیں ہٹتی ایسی صورت میں جبکہ کوئی روایت وقوع واقعہ سے دو صدی بعد شروع ہوتی ہو تاریخ میں اُس کی جو وقعت ہو سکتی ہے اُسے ناظرین خود بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

ایک عام فہم دلیل

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اکبر کے مسیحی مبلغین کیساتھ غیر معمولی ہمدردانہ سلوک کی وجہ اس وقت تک

نہین بیاں کیجا سکتی جب تک یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ اُس کا کسی عیسائی خاتون سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اسی بنا پر خیال یہ ہے کہ اکبر کا مسیحیت کی طرف اس قدر میلان طبع اور مبلغین کا گووا سے بلائے جانے کا سبب یہی مسیحی خاتون تھی۔

اس قسم کی دلیل ممکن ہے طبیعات یا ایسے دوسرے علوم میں قابل قبول سمجھی جائے لیکن تاریخ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ فن تاریخ کی بنیاد نظریات یا فرضی دعاوی پر نہیں بلکہ ٹھوس اور مضبوط واقعات پر ہوتی ہے۔ رہا اس واقعہ کو عیسائی مبلغین کے بلائے جانے کی علت قرار دینا، تو یہ مورخین کی اکبر کے دماغی اور مذہبی رجحان سے ناواقفیت ہے شہنشاہ اکبر نے ناؤساری پارسیوں کے سردار دستور مہرجی رانا کو بھی بلایا تھا تو کیا اس سے یہ لازمی آتا ہے کہ اس کے حرم میں کوئی پارسی خاتون بھی تھی؟

علاوہ اس کے اس دلیل کا کمزور پہلو اس مکالمہ سے اور روشن ہوجاتا ہے جو شہنشاہ اکبر اور پرتگال پادری کے درمیان ہوا تھا۔ اس گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اکبر نے تعلیمات مسیح اور عیسائی علمار کے متعلق اپنے شبہات ظاہر کئے جس کے لئے پادری مذکور نے یہ تجویز پیش کی کہ گووا سے دو پادری بلا لئے جائیں، وہ اصل حقیقت پیش کر دیں گے جنسے یہ شبہات رفع ہوجائیں گے۔ یہی بات اکبر کے ان دو فرامین سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو اُس نے عیسائی علمار کے پاس دو اشخاص کے بھیجنے کے متعلق لکھے تھے ان فرامین میں سے ایک کا ترجمہ اپنے بیان کی تصدیق کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

دو سینٹ پال کی جماعت کے معزز پادری معلوم ہو کہ آپ سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر میں نے اپنے قاصد عبداللہ اور اپنے ترجمان ڈاہینگ پاس

کو آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ آپ سے یہ التجا کریں کہ آپ میرے
پاس دو لائق پادری بھیجدیجئے جو اپنے ہمراہ اپنے مذہب کی خاص خاص
کتابین اور انجیل بھی لیتے آئین ۔ چونکہ مجھے آپ کے مذہب اور کمالات کے
معلوم کرنے کا بیحد شوق ہے ، اس لئے میں یہ استدعا کرتا ہون کہ آپ انہیں
اِن اشخاص کے ہمراہ ضرور بھیجدین ......"

اسی قسم کا ایک قصہ منوسی نے بھی لکھا ہے جسے اُس نے کئی سال بعد اورنگ زیب کے دربار میں سنا تھا اس لئے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے دربار میں متعدد عیسائی بسلسلہ ملازمت رہتے تھے ، ان کی خواہش پر اکبر نے چند پادری گوداسے بلائے تھے لیکن اس قصہ میں اکبر کی عیسائی بیوی کا کوئی ذکر نہیں ۔

معاصرانہ تاریخین سب سے مستند ذرائع معلومات اس باب میں اس زمانہ کے مورخیں اور تاریخی تحریریں ہیں ۔

لیکن بدقسمتی یہ کہ ان دونوں ذرائع میں سے کوئی بھی اکبر کی عیسائی بیوی کے وجود سے قطعی انکاری نہیں ہے ، لیکن اُن کے لئے ایسا کرنا ضروری بھی نہ تھا ۔ کیونکہ اسوقت یہ بھلا کے خیال ہو سکتا تھا کہ چند صدیوں کے بعد یہ طوفان اُٹھے گا ۔ مورخین کا فرض جدید اشخاص یا جدید واقعات کا گھڑنا نہین بلکہ جو اشخاص یا واقعات موجود ہوں انہین سے بحث کرنا ان کا کام ہے ، اس بنا پر اس مسئلہ میں ان مورخین کی خاموشی اکبر کی عیسائی بیوی کے عدم وجود پر دلالت کرتی ہے نہ کہ وجود پر ۔ لیکن مزید تصدیق کے خیال سے ان ذرائع معلومات کی تحقیق و تفتیش کر لینی بھی مناسب ہے ۔ یہ مورخین یا تاریخی تحریرین اپنی نوعیت کے لحاظ سے کئی قسموں پر مشتمل ہیں ، ہم ایک ایک

کر کے سطور ذیل میں اُن سے مختصر طور پر بحث کریں گے :۔

(۱) مسلمان مورخین :۔ دربار اکبری کے مختلف وقائع نگاروں میں ابو الفضل اور بدایونی نے مسیحی پادریوں اور اکبر کے علیسویت کی طرف میلان طبع کا متعدد۔ موقعوں پر ذکر کیا ہے لیکن حرم شاہی میں کسی عیسائی خاتون کا کنایتہً یا صراحتہً کہیں کوئی تذکرہ نہیں، یہاں تک کہ اں مواقع پر بھی اُس کے متعلق کوئی لفظ مذکور نہیں، جہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا عیں مطابق حالات ہوتا۔ مثال کے طور پر بدایونی کی تحریر لو۔ وہ لکھتا ہے۔

"بادشاہ (اکبر) عیسائی مذہب کی صداقت پر پورا یقیں رکھتا تھا چنانچہ تعلیمات مسیح کی اشاعت کے لیئے اُس نے شہزادہ مراد کو یہ حکم دیا کہ وہ مذہب عیسوی کے متعلق کچھ درس لیا کرے اور ابو الفضل کے سپرد انجیل کے ترجمہ کا کام کیا جس میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی بجائے یہ مصرعے لکھے گئے تھے "اے نامِ تو جیزز کرسٹو" اور شعر پورا کرنے کے لئے فیضی نے دوسرا مصرعہ یہ جوڑ دیا "سبحانک لاسواک لاہو" یہ ملعون پادری آنحضرت صلعم کی شان میں شیطان کے اوصاف استعمال کرتے تھے۔ یہ ایسی قبیح حرکت تھی جسے کوئی بدترین خلائق بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا"

(ب) عیسائی مبلغیں۔ یہ لوگ جو واقعات اپنے افسراں بالا کو گووا یا یورپ لکھکر بھیجتے تھے، وہ خود ان کے آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہوتے اِس لحاظ سے دربارِ شاہی کے متعلق، جہاں اُنکی اکثر آمد و رفت رہا کرتی تھی اُن کے بیانات نہایت

مستند اور قابل وثوق سمجھے جائیں گے۔ پہلی بار جب یہ مبلغین اکبر کے دربار میں گئے ہیں تو اس موقع کے بعض خطوط آج بھی برٹش میوزیم وغیرہ میں ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی خط میں بھی اکبر کی عیسائی بیوی کے متعلق کوئی ذکر نہیں اگر یہ امر واقعہ تھا کہ اکبر نے عیسائی مبلغین کو کسی عیسائی خاتون سے متاثر ہوکر یا اُس کی براہ راست تحریک پر لایا تھا تو ان مبلغین نے پھر اس وجہ کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟

ایک اور ذریعہ معلومات اینتھنی مانسیریٹ (Anthony monserrate) کی تصنیف ہے جسے چند سال قبل ایچ۔ ہاسٹن نے ترتیب وتہذیب دیکر شائع کیا ہے مصنف نے دو سال فتحپور سیکری میں بسر کئے لیکن اپنی تصنیف میں اکبر کی عیسائی بیوی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ البتہ مصنف نے ایک اور نیا شگوفہ چھیڑ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اکبر کے عیسائیت کی طرف اس قدر مایل ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے بعض قدیم آبا و اجداد عیسائی تھے" اگر حقیقتاً حرم شاہی میں کوئی عیسائی خاتون ہوتی تو مانسیریٹ نے اس درجہ بعید از قیاس وجہ بتانے کی بجائے اسی واقعہ کا ذکر کیا ہوتا۔ مرتب کتاب ایچ ہاسٹن کا خیال ہے کہ اکبر کی ایک عیسائی بیوی اس کے اخیر زمانہ عمر میں تھی لیکن بہت سے ایسے مسیحی مبلغین کے خطوط ملتے ہیں جو آگرہ اور لاہور دونوں جگہ اکبر کے دربار میں تھے لیکن ان میں سے کسی نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے ممکن ہے وہ خطوط ضائع ہو گئے ہوں جن میں یہ واقعہ مذکور رہا ہو لیکن یہ اس وقت تک کوئی دلیل نہین ہو سکتی تا وقتیکہ وہ گم شدہ خطوط پیش نہ کئے جائیں۔

(ج) پرتگالی تحریرین۔ ہندوستان کے سولہویں صدی عیسوی کی تاریخ کا ایک

بڑا ذریعہ معلومات پرتگالی تحریرین بھی ہیں۔ پرتگالی وائسرایوں کے خطوط جو انہوں نے سلاطین پرتگال کے نام وقتاً فوقتاً بھیجے یا مختلف نوآبادیات کے کپتانوں، گورنروں اور اُن کے وائسرایوں کے درمیان مراسلات یہ دونوں چیزیں اس زمانہ کی تاریخ پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ صرف ایک واقعہ ان مراسلات کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اُن میں سے اکثر خطوط میں ایک معزز عورت ڈونا جولیا ڈا کاسٹا (Dona Juliana da Costa) کے متعلق دلچسپ تذکرے ہیں جو اورنگزیب اور بعد کے سلاطین دہلی کے درباروں میں رہ چکی تھی، ممکن نہ تھا کہ اِن مراسلات میں اکبر کی عیسائی بیوی کا تذکرہ نہ رہتا۔

(د) یورپین مورخین۔ حیرت ہے کہ اس متنازعہ فیہ واقعہ کے متعلق نہ مسیحی مبلغین کے مراسلات میں ایک لفظ ملتا ہے اور نہ اوایل عہد کے دیگر مورخین کے ہاں اس کا کوئی ذکر ہے اِن یورپین مورخین میں ایک شخص سوزا (Sousa) نامی ہے جس کے معلومات تاریخی بہت وسیع اور مختلف ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ اِس نے گوؔا میں ایک کتاب لکھی جس کے مواد فراہم کرنے کے لئے اُس نے اِن سیاحوں اور مسیحی مبلغین سے ضرور گفت وشنید کی ہوگی جو اکبر کے دربار میں رہ چکے تھے لیکن عیسائی بیوی کے متعلق اُس نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

(ہ) سیاحین۔ شہنشاہ اکبر کے حرم میں ایک مسیحی خاتون کا وجود سیاحوں کی نظر میں غیر معمولی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی سیاح اس واقعہ کی خبر پاتا اور اپنے حالات سفر میں اسے شامل نہ کرتا۔ لیکن نہ سرطامس رو اور نہ اُسکے رفیق پادری ٹیری (Terry) نے اپنے سفرناموں میں اس کا کوئی ذکر کیا ہے

حالانکہ یہ دونوں اکبر کے دربار میں آچکے تھے اور نہ بعد کے سیاحوں مثلاً منڈی (Inunay) رویکے (Van de Brecke) منوسی (Manucci) برنیر (Bernier) ٹیوریز (Tavernier) وغیرہ کو اس واقعہ کی کوئی خبر معلوم ہوتی ہے۔

ایک اثباتی دلیل

جو لوگ اکبر کے عیسائی بیوی ہونے کے قابل ہیں. وہ مسیحی مبلغین کے اس حیرت خیز خاموشی کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ان کے ہم مذہب عورت کا ایک مسلمان بادشاہ کے حرم میں ہونا ان کے لئے باعث شرم تھا اور اسی لئے اُنہوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اسی وجہ سے اُنہوں نے اپنے سرکاری کاغذات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن اُن کو اپنے نجی خطوط میں اس قابل ذکر دلچسپ واقعہ کے لکھنے سے کیا شے مانع تھی؟

قصہ کی اصلیت

قبل اس کے کہ اس غلط العوام واقعہ کی تردید میں ہم دلائل کا سلسلہ ختم کریں آؤ دیکھیں کہ اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟ اور تاریخ میں اس قصہ کے اس قدر نمایاں جگہ پانے کی کیا وجہ ہوئی؟

اولاً، اتنا تو واقعہ ہے کہ دربار شاہی میں کبھی کوئی عیسائی خاتون رہ چکی ہے۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ اکبر کے عہد حکومت کی بجائے اورنگ زیب اور اس کے مابعد سلاطین کے زمانہ میں تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مورخین نے ان دونوں زمانوں جن کے درمیان اس قدر بڑا وقفہ ہے، التباس کر دیا ہے البتہ

ان وقائع نگاروں سے جن کی تاریخی معلومات بہت سچی ہوتی ہنین ایسی اُمید کرنی بیجا نہ ہوگی۔

ثانیاً، اس غلطی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اکبر کی ایک بیوی کا نام مریم زمانی تھا جس کا تذکرہ ابوالفضل نے اور جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں کیا ہے۔ اکثر معمولی درجہ کے مورخین نے مریم کا نام سنکر یہ فرض کر لیا کہ یہ کسی مسیحی خاتون کا نام ہے۔ حالانکہ حضرت مریمؑ کی عزت و احترام مسلمانون میں عیسائیوں سے کچھ کم نہیں ہے اور یہ نام اِن سے کہین زیادہ مسلمان گھرون میں رائج ہے اصل میں پورا لفظ یعنی مریم زمانی سرکاری لقب ہے جسے خود اکبر نے اپنی بیوی کو جو بہارمل، مہاراجہ جیپور کی لڑکی تھی، دیا تھا۔ بعض مصنفین مثلاً اسمٰعیل گریشس نے مریم زمانی کو جو جہانگیر کی ماں تھی، مریم مکانی کے ساتھ جو اکبر کی مان کا نام تھا خلط ملط کر دیا ہے در اصل زمانی و مکانی سے نسبت ظرفیت کا اظہار ہے اور کچھ نہیں۔

ایک تیسری وجہ اس غلطی کی یہ ہے کہ فتحپور سیکری میں شاہی عمارات میں ایک محل کا نام ہے "بی بی مریم کی کوٹھی"، لیکن تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکبر کی بیویوں میں سے کبھی کسی کی جائے سکونت اس نام سے منسوب نہ تھی یہ محل اصل میں مسیحی مبلغین کی قیام گاہ تھی اور اس کا یہ نام جیساکہ زبانی روایات معلوم ہوتا ہے اس لئے پڑا کہ اِن پادریوں نے بہ لحاظ عقیدت اُسے حضرت مریم علیہا السلام سے منسوب کیا۔

ماخوذ از جنرل آف انڈین ہسٹری

چاند سے

جھانکتا کیا ہے زمیں والوں کو اتنی دور سے
آ اُتر آ اپنے خلوت خانۂ پُر نور سے

آ کہ سینے سے لگا لوں تجھ کو اے ماہِ تمام
مجھ کو ملتا ہے تری صورت سے تسکین کا پیام

تجھ کو اک پروردۂ حرمان کی لیکن کیا خبر
تجھ پہ اس عالم کی حشر انگیزیوں کا کیا اثر

اے جمالِ پاک تو اک ہستیٔ مسرور ہے
اپنے جلووں کی شراب تند سے مخمور ہے

تیری ضو پاشی نمودِ طلعت مستور ہے
یعنی تو آئینہ بردارِ جمالِ حور ہے

چودھویں شب تیری صورت پر ہے اُف کیا نکھار
جھیل میں جیسے کنول کے پھول پر آئے بہار

آسمان نورِ صباحت ریز سے معمور ہے
کوئی دوشیزہ ترے جلباب میں مستور ہے

تو محبت کے لئے شمعِ حیات آثار ہے
شب کی بزمِ خامشی تیرا تجلی زار ہے

معجزہ ہے تو فلک کی معدنِ یاقوت کا
یا کوئی جگنو ہے شاید گلشنِ لاہوت کا

ساحلِ عُمّان چرخِ نیلگوں نایاب ہے
اس کی تو اک مختصر سی کشتیٔ سیماب ہے

چاندنی کا یہ گلِ تر کوئی بتلائے ذرا
گلشنِ فردوس سے کیونکر اڑا لائی صبا

پردۂ عصمت پڑا رہتا ہے غرفہ پر مدام
کس دُلہن کا حجلۂ نوریں میں رہتا ہے قیام

انہی جلووں کا تھا شاید عکس برقِ طور میں
کونسی دیوی نہاں ہے اس حجاب نور میں

ارزو کیا ہے کہ سرگردان و آوارہ ہے تو
معبدِ شب کی کوئی مضطر پرستارہ ہے تو

کون پا سکتا ہے ایسی محفلِ عزلت میں بار
تیرے کاشانہ میں مسکوں ہے کوئی شب زندہ دار

کوئی بتلاتا ہے تیرے دل میں ناکامی کا داغ　　کوئی کہتا ہے تجھے شہرِ خموشاں کا چراغ
رات کے تاریک گنبد میں اکیلا بیٹھ کر تو　　کیا کوئی عاشق ہے اپنی بیکسی پر نوحہ گر
پہن داماں فلک اک دشتِ ہول انگیز ہے　　اس سیہ منظر کی تو قندیلِ عبرت خیز ہے
گم کیا ہے تو نے شاید اپنی منزل کا نشاں　　چھوڑ کر غربت میں تجھ کو بڑھ گیا ہی کارواں
کس کی فرقت کی تپش سے اسقدر بیتاب ہو　　تیری چشمِ واازل کی رات سے بیخواب ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے اس کی یہ بتلا اے قمر　　تجھ میں کیا کیا دیکھتی ہے اہلِ عالم کی نظر
تیرے آگے میں تو اپنے آپ میں رہتا نہیں　　تیر صورت دیکھتا ہوں منہ سے کچھ کہتا نہیں
ہائے کیا عالم ہے تیرے پیکرِ خاموش میں　　بس نہیں میرا کہ تجھ کو کھینچ لوں آغوش میں
کاش تو بالا نہ ہو دنیا کے احساسات سے　　میری بیتابی کو یہ نسبت ہے تیری ذات سے

جس کے سنگِ در پہ مر رہنا مرا ایمان ہے
اُس کی بزمِ ناز میں تیرا گذر آسان ہے

مخمور

"داغ کی شاعری"

"انگریزی رسالہ "نیو اورینٹ" میں "داغ کی شاعری" پرخان بہادر شیخ عبدالقادر بی اے بیرسٹرایٹ لا کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ پیشکش ناظرین ہے" تمکین کاظمی"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ داغ شعرا متقدمیں دلی کی طرز روش پر چلنے والے تھے اگرچہ آپ کا کلام انیسویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتا ہے، اور خود آپ اور آپ کے ہمعصر امیر مینائی جو کہ لکھنؤ کی شاعری کے بہترین نمائندے ہی نہیں بلکہ بہ کمال احتیاط متقدمیں کی پیروی کرنے والے تھے، رنگ تغزل میں سلاست زبان اور فصاحت کو مغربی اثرات سے بہت محفوظ رکھا اور یہ ان کے عہد کی خصوصیت ہے انھوں نے اسی رنگ میں غزلیں لکھیں جس طرح کہ وہ ایک مشرقی حکومت کے زمانہ میں لکھتے، مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک میں جو تغیرات اور ایجادات ہو رہی ہیں اس کا مطلق اثر نہیں لیا، اُن کی غزلوں میں آپ کہیں بھی اُن انگریزی الفاظ کو نہ پائیں گے جو (اس وقت) یا آج کل مستعمل ہیں، اُن کے کلام میں وہ مختلف محاورات نہیں ہیں، جو انگریزی محاورات کی طرز پر اختراع کئے گئے ہیں اور جن کو مشہور اور مستند شعراء نظم و نثر میں فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ طرز تخیل میں وہ اسی قدیم اصول پر عمل پیرا رہے جو ان کی زبان کے لئے ضروری تھا۔ آپ محض اپنی تعلیم اور خاندانی تربیت کی وجہ سے اپنی پرانی روش پر قائم رہے گو تغیر تبدل ہوتا رہا نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں مگر ان پر کسی قسم کا اثر نہ پڑا۔ کیونکہ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ریاست رام پور میں بسر ہوا

جہان کے ماحول نے آپ کو طرز قدیم پر قائم رہنے میں بہت بڑی مدد دی، اور نہ وہاں مغربی تعلیم اور اُس کے اثرات سے دوچار ہی ہو سکے جب آپ رامپور سے حیدر آباد گئے تو وہاں بھی آپ کو مشرقی فضا میں بسر کرنے کا موقع ملا۔ آخری زمانہ میں آپ کو یقیناً ایسے اشخاص سے ملنے کا موقع ملا جنہوں نے تعلیم جدید حاصل کی تھی اور مغربی معاشرت بھی اختیار کرلی تھی، لیکن آپ اس قدر پُرانے ہو گئے تھے کہ اپنا رنگ بدلنا پسند نہیں کیا، اور میر۔ غالب۔ ذوق کے حقیقی جانشین بن کر اپنی زندگی بسر کی اور اس دنیائے فانی سے چل بسے،

آپ نواب شمس الدین خان کے بیٹے اور نواب احمد حسین خان کے پوتے تھے زمانۂ قدیم میں امراء کے خانداں فوجی اور علمی قابلیت کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے تھے چنانچہ آپ کا خاندان بھی انہیں خصوصیات کے لحاظ سے مشہور تھا، آپ نے فارسی کی تعلیم غیاث الدین مولف غیاث اللغات سے پائی۔ اور دو مشہور خوشنویسوں سیّد امیر پنجہ کش اور مرزا عباداللہ سے خوشنویسی سیکھی، آپ نے پٹہ شہ سواری، نشان اندازی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل کرلی تھی، اور اُس زمانہ کے معیار کے لحاظ سے ایک قابل ہوشیار، نوجوان خیال کئے جاتے تھے، ذوق دہلوی ولیعہد بہادر کے استاد تھے، آپ بھی ان کے شاگرد ہو گئے تھے اس سے فقط یہی فائدہ نہیں ہوا کہ اُردو کے مستند شاعر کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا بلکہ ولیعہد بہادر سے ملاقات کا وسیلہ بھی پیدا ہو گیا۔ ولیعہد بہادر کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی اور محل شاہی میں آئے دن شاعری ہوا کرتی تھی، جن میں آپ بھی شریک ہوتے تھے گویا محض استاد ذوق کی وجہ سے آپ کو اس کمسنی میں مشاعروں کی شرکت کا موقع ملا، ایک دفعہ مشاعرہ میں بادشاہ

بھی تشریف رکھتے تھے داغ نے غزل پڑھی تو پھڑک اُٹھے پیشانی چومی چھاتی سے لگا لیا لوگوں نے اُسی مشاعرے میں سمجھ لیا کہ یہ ہونہار شاعر کچھ ہو کے رہیگا، شاعری وہبی چیز ہے کسبی نہیں یہ مادہ اُسی کے پاس ہوتا ہے جسے کہ خدا مرحمت فرماتا ہے،

شاعری اس کا نام نہیں ہے کہ قافیہ پیمائی کیجائے،

اگرچہ ذوق کی شہرت انتہائی درجہ پر پہونچ چکی تھی اور غالب بھی اپنا فارسی چولا بدل کر اُردو کے جامے میں رونما ہو چکے تھے اور یہی زمانہ داغ کے عروج کا تھا ۱۸۵۷ء کا غدر کون نہیں جانتا۔ اس منحوس فساد کے اثرات کہاں کہاں نہیں پہونچے کون کون سے گھر نہیں تباہ ہوئے اور خاص کر دلی پیاری دلی تو اُجڑ ہی گئی، اس وقت داغ کی عمر ۲۶ سال کی تھی، اُس وقت وہ شاہ ملنے جاتے تھے اس ہنگامہ نے اُن کو کس قدر متاثر نہ کیا ہوگا اپنے وطن کو اجڑتے دیکھ کر دل بھر آیا بے ساختہ کہہ دیا ؎

زمین کے حال پہ یہ آسمان روتا ہے ہر اِک فراق مکیں میں مکان روتا ہے

گدا و شاہ وضعیف وجوان روتا ہے غرض یہاں کے لئے اِک جہان روتا ہے

گو دلی اُجڑ گئی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر یہاں کے علمی خزائن اطراف ہند میں منتقل ہو گئے وہ جواہر ریزے جو کانِ دہلی ہی میں محفوظ تھے اطراف وجوانب میں منتشر ہو گئے جن کی ضو سے سارا ہندوستان جگمگانے لگا داغ کو اپنے پیارے وطن کے آباد ہونے کی اُمید تھی اور دعا کرتے تھے ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم تو الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم

اگرچہ داغ نے اجڑی ہوئی دلی کو غدر کے بعد کئی مرتبہ دیکھا مگر وہ بات کہاں تھی آب نہ دلی دلی ہی تھی اور نہ دلی والے، دلی والے کہلانے کے مستحق تھے، دکن کے

واقعات بتانے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ داغ کی وہ زندگی بھی روشنی میں لائی جائے جو رام پور میں بسر ہوئی۔ غدر دہلی کے بعد داغ رامپور آگئے تو اب یوسف علی خان کے زمانہ سے نواب کلب علی خان کے عہد میمنت عہد تک یہین زندگی بسر کی اگرچہ داروغگی اصطبل خانہ اُن کے موزون نہ تھی اور یہ ایک بالکل غیر شاعرانہ خدمت تھی مگر داغ کو گھوڑوں سے اور گھوڑے کی سواری سے جو دلچسپی تھی وہی اس غیر شاعرانہ خدمت کی باعث ہوئی اس خدمت کو انھوں نے نہایت ہی تندہی اور محنت کے ساتھ انجام دیا، ہر شخص اُن سے خوش تھا، اس داروغگی کے ساتھ ہی ساتھ اُنکو ایک اعزازی خدمت مصاحبت بھی ملی تھی یہ محض اُن کی قابلیت کی وجہ سے عطا ہوئی تھی نواب صاحب آپ سے بہت خوش تھے، نواب صاحب ایک زندہ دل اور شاعرانہ طبیعت کے رئیس تھے امیر مینائی اور تسلیم دونوں اسی سرکار میں نوکر تھے اور داغ بھی اسی سلسلہ میں منسلک، ہمیشہ مشاعرے ہوتے اکثر مباحثے ہوتے رہتے تھے امیر، داغ کے ایک زبردست مدمقابل تھے، اور آج تک یہ تصفیہ نہ ہوا کہ آخر امیر کو داغ پر فوقیت تھی یا داغ کو امیر پر مگر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں ہی اپنے رنگ میں اُستاد تھے، ع

"دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا"

گو اب ہر دو اساتذہ کے شاگردون نے خوامخواہ کے جھگڑے پیدا کر کے خصوتین مول لی ہیں مگر ان دونوں میں نہایت ہی خلوص تھا، دونون ایک دوسرے کی بیحد عزت کرتے تھے یہان تک یگانگت تھی کہ دونوں نے ایک ہی احاطہ کو مدفن بنا دیا، ایک ہی سرزمین میں جان دی، گو داغ اور امیر سے اکثر شاعرانہ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ اور یہ دونون

شاعروں کی طبیعت کے بڑھنے کے لئے ازبس ضروری یہی تھا "گلزار داغ اسی نوک جھونک کے کلام کی یادگار ہے۔ میری رائے میں داغ کا قابل قدر کلام وہی ہے جو زمانہ قیام رامپور کا ہے۔ یہ مجموعہ محبت کے مختلف مدارج کو ایک استادانہ نفسانی تجربہ کیساتھ ظاہر کرتا ہے، داغ کا زیادہ کلام محفل سرود کی زینت ہو سکتا ہے یعنی اکثر غزلیں موسیقی کے لئے بیحد موزون ہیں اور اسی طبقہ میں بیحد مقبول بھی ہیں۔ درصل داغ کی شہرت کا اصلی باعث یہی کلام ہے۔ گو اکثر لوگون کا خیال ہے کہ اگر داغ کی غزلیں گوئیے اور طوائفین نہ گاتین تو انہیں اتنی شہرت حاصل نہ ہوتی مگر نہیں یہ رائے ایک حدتک ایک ادبی شخصیت اور شاعر کے لئے تخفیف اعزاز کی باعث ہے، میرے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں اگر گویوں اور موسیقی دانوں نے اُن کی غزلین پسند کیں تو اس سے اُن کی شان مین فرق نہیں آسکتا بہر حال اُن کے کلام پر عام شہرت کی مہر ثبت ہے اور سلاست زبان، سادگی بیان مطالعہ فطرت کے ساتھ ایک خاص لطف دیجاتی ہے

کلب علی خان کی وفات کے بعد بھی داغ رامپور میں رہے مگر جب ریاست کے مصارف میں تخفیف شروع ہوئی اور منجملہ اور جائدادون کے داغ کی جائداد بھی تخفیف میں آگئی تو مجبوراً آپ کو دلی واپس ہونا پڑا، اس وقت آپ کی عمر ۵۴ برس کی تھی دلی میں کیا تھا جو گزر کرتے چند روز رہکر حیدرآباد کی راہ لی یہ وہ زمانہ تھا کہ اعلیحضرت غفور نظام مرحوم میر محبوب علی خان بہادر تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھے اعلیحضرت مرحوم خود ایک شاعر اور شاعری کے دلدادہ تھے آپ کے دربار میں باریابی بہت مشکل تھی اور اگر باریاب بھی ہوجاتے تو عنایات سے متمتع ہونے کے لئے بھی ایک

حامی ملت کی ضرورت تھی پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں داغ حیدرآباد پہونچے اور چند روز کے بعد یلا باریابی دلی لوٹ آئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ آپ ریاست کی طرف سے پھر طلب کئے گئے اور اعلیحضرت غفران مکاں نے اپنی غزل اصلاح کے لئے مرحمت فرمائی ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ دو ہزار تک ترقی کر گئے کسی ادیب یا شاعر کو ہندستان میں اس سے پہلے کبھی اس قدر گران قدر مشاہرہ نہیں دیا گیا تھا۔ حضور غفران مکان کے مراحم خسروانہ نے داغ کو فکر معشیت سے ہمیشہ کے لئے مستغنی کر دیا، یہ ترقی ایسی نہ تھی جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی آخر مخالفین شروع ہو گئیں اعتراضات کئے جانے لگے مقابلہ کی تیاریاں شروع ہوئیں، اور ایسے ایسے لوگوں نے بھی مقابلہ اور مجادلہ کی ٹھان لی جنہیں بات کرنی بھی نہ آتی تھی[۱] مگر ان کے اثرات یہ مترتب ہوئے کہ داغ اعلیحضرت غفراں مکان کی نظروں میں اور باعزت ہو گئے آئے دن مراعات ہونے لگے اور اعتراض میں دن دونی ترقی، باوجود اسکے کہ انہیں ہر طرح فراغت تھی عیش و آرام بھی میسر تھا مگر انھوں نے وہی پرانی سادگی اور خوش اخلاقی قائم اور برقرار رکھی جو دار وغگی اصطبل کے زمانہ میں تھی اسی خوش اخلاقی اور خلوص نے ان کو ہزاروں شاگرد مہیا کر دئے۔

اُن کی عمر کے آخری اٹھارہ سالہ عمر کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یہ اُس زمانہ میں دماغ پر زور ڈالکر لکھا گیا ہے جب کہ طبیعت آرام کی متلاشی رہتی ہے اور اکثر

---

[۱] مثلاً ڈاکٹر مائل (حیدرآبادی) وغیرہ جنہوں نے باوجود اپنی کم مایگی کے داغ سے مقابلہ کی ٹھان لی تھی اور اس کو باعث شہرت سمجھ رکھا تھا۔ تمکین

اشخاص گوشہ نشینی اختیار کرنے لگتے ہیں ۔ اس وقت اُن کی زیادہ توجہ اپنے آقائے ولی نعمت کی غزلون کی اصلاح پر تھی جسے وہ کار سرکاری کہا کرتے تھے ، سرکاری غزلیں سر مہر لفافہ میں بند آتی تہیں اور یہ حکم ساتھ ہی ساتھ وصول ہوتا تھا کہ جس قدر جلد ہوسکے اصلاح دیجائے ۔ بادشاہون کے کلام کی اصلاح اور اپنی طبیعت کے برخلاف انہین کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے غزل بنانا کسقدر مشکل ہے اُس کا احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہین تجربہ ہوا ہو یہ ایسا نازک کام ہوتا تہا کہ ہر وقت عتاب شاہی پیش نظر رہتا تھا جب سرکاری غزل بنانے سے فارغ ہوتے تو خود غزل کہتے یا اپنے تلامذہ کی غزلین بناتے ، وہ خطوط اور غزلین جو بغرض اصلاح ہندوستان کے مختلف مقامات سے وصول ہوتیں بعد اصلاح واپس کر دی جاتی تہیں یہ ایک بہت ہی سخت اور تکلیف دہ کام تھا اُس کے لئے داغ نے ایک باضابطہ دفتر بنا لیا تھا اور اُس کے کارکن بعض شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بہی تھے ۔

مجھے بہی یہ افتخار حاصل ہے کہ حیدرآباد میں ایک دفعہ حضرت داغ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا ، جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ مجھے "جیرنلزم" سے تعلق ہے تو وہ مجھ سے ملکر بہت خوش ہوئے اُن بے شمار اشخاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو انہین ہدایات کے طلبگار ہوکر لکھا کرتے تھے انہوں نے کہا تہا ۔ "ایک میں ہون کہ مجھسے سارا ہندوستان لپٹا ہوا ہے" انہون نے دلچسپی کے ساتھ اقبال کے بارہ میں دریافت کیا جو اپنی طالب علمی کے زمانہ مین داغ سے مراسلت کیا کرتے تھے اور اُس پر داغ کو قدرتی طور پر فخر تہا ، اُس زمانہ میں اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر رہے تھے داغ نے اُن کے (اقبال کے) کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تہا کہ یہ ہونہار

طالب العلم ایک دن اپنے رنگ کا استاد بلکہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک فرد فرید ہوگا، لیکن یہ روش جو اقبال نے اختیار کی مغربی تعلیم کے زیر اثر بالکل انہیں کی ایجاد ہے اور قدما کے لئے اعجاز۔ اسی زمانے میں داغ نے ایک قصیدہ اپنے آقائے ولی نعمت کی شان میں لکھا تھا جس پر ایک پنجابی اخبار نے تنقید کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ زبان، قواعد عروض وغیرہ کی کمزوریوں کی وجہ سے ایک شعر اس قابل نہیں جو اچھا سمجھا جاسکے میں نے داغ سے پوچھا کہ آیا وہ تنقید اُن کی نظر سے گذری ہے اور اس کے بارہ میں کیا رائے ہے تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "ایک حد تک نقاد کی رائے کچھ اہمیت رکھتی اگر وہ بعض اشعار میں غلطیاں نکالتا اور بعض کو صحیح قرار دیتا مگر اُس میں اتنی بھی عقل نہ تھی کہ ایک کہنہ مشق اپنی تمام عمر شاعری میں گذار کر کیا تمام اشعار غلط لکھتا"؟

سید علی احسن، احسن مارہروی نے جو داغ کے ایک ممتاز شاگرد اور اُن کے بیحد مداح ہیں۔ داغ کی مختصر سوانح عمری "جلوۂ داغ" کے نام سے لکھی ہے، کاشکہ وہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھتے تاہم داغ کے آخری حصۂ عمر کی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ احسن حیدرآباد میں داغ کے ہاں استغرض سے ٹھیرے ہوئے تھے کہ اردو لغت "فصیح اللغت" کے نام سے لکھیں جس سے اُن الفاظ کے سمجھنے میں مدد مل سکے جو داغ کے کلام میں ہیں یا وہ محاورے جمع کردئے جائیں جن کو داغ نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے، اس لئے انہوں نے داغ کے خطاب "فصیح الملک" (جو اعلیحضرت حضور نظام کا عطیہ ہے) پر نظر کرتے "فصیح اللغت" نام رکھا تھا۔ اس کام میں داغ کو خاصی زحمت برداشت کرنی پڑی اگر اُن کے کلام میں کوئی خاص شعر ایسا

نہ ہوتا جس میں کہ کوئی محاورہ چاہیے تھا تو اُن کو تکمیل لغت کی غرض سے ایسے شعر کے
موزون کرنے کی ضرورت پڑتی یہ ایک عمدہ ادبی خدمت تھی استاد اور شاگرد دونوں
قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کام کو شروع کیا تھا مگر افسوس ہے کہ مکمل نہ ہوا
داغ کے کلام کا وہ مجموعہ جو قیام حیدر آباد کے زمانہ کی ادبی کاوش کا نتیجہ ہے۔
"مہتاب داغ" کے نام سے شائع ہوا ہے داغ کے تین مشہور دواوین کے محاسن
اور خوبیوں کے متعلق اختلاف آرا ہے۔ گلزار داغ جس طرح سے کہ ہم نے لکھا ہے
جوش جوانی کا ثمرہ ہے۔ جب عشق و محبت محض خیالی یا تصوری نہیں تھی بلکہ اصلی
تھی جس کا تجربہ کیا جا رہا تھا" آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے
جبکہ داغ جوان تھے اور دماغی حالت اور انسانی فطرت کی تصویر نہایت ہی
شاندار اور پُر تکلف الفاظ میں دکھائی گئی ہے "مہتاب داغ" جس میں گلشن عشق کی
عطر بیز خوشبو اور سورج کی تیز روشنی کا وجود بھی نہیں ہے فی الحقیقت یہ اسم بامسمیٰ۔
ماہتاب کی پر کیف اور ٹھنڈی روشنی ہے۔ جو پیرانہ سالی کی قناعت گزینی اور مسرت
بخشی کا نقشہ کھینچتی ہے۔ بہرحال اس دیوان میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ مسلم الثبوت
استاد کی پختہ کاری نظر آتی ہے۔ لیکن داغ کی وفات کے بعد دو اور دیوان طبع ہوئے
ہیں ایک تو یادگار داغ" جسے احسن نے اپنے استاد کی یادگار میں طبع کرایا ہے اور ایک
وہ جو لالہ سری رام ایم اے نے مرتب کیا ہے لیکن اس مجموعہ کو لالہ سری رام نے مہتاب داغ
کے طبع ثانی میں شامل کر دیا ہے۔ اور ایک مجموعہ دیوان داغ کے نام سے انوار محمدی پریس
لکھنؤ سے شائع ہوا ہے جو صرف انتخاب ہے ان آخری کتابوں کی اہمیت میرے نزدیک
صرف یہی ہے کہ ایک مشہور شاعر کا تمام کلام اکٹھا کر دیا گیا ہے ورنہ تین دواوین نے جو

شہرت قائم کردی ہے اُس میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا، یادگار داغ کے متعلق یہ لکھدینا ضروری ہے کہ اُس کو اُس مختصر کتاب سے جسے اسی نام کے ساتھ محمد اکبر علی خان افسون " (آگرہ) نے شائع کیا ہے مخلوط نہ کرنا چاہیے یوں تو داغ کی سوانح کئی ایک لکھی گئی ہیں مگر داغ دہلوی کے نام سے ایک کتاب سید محمد فاروق نے لکھی ہے جس میں داغ کے مختصر حالات اور کلام پر نہایت ہی اختصار سے بحث کی گئی ہے،

داغ کے کلام کی فہرست نامکمل رہیگی اگر ہم "فریاد داغ" کا تذکرہ نہ کریں، یہ ایک مسلسل نظم یا مثنوی ہے جسمیں خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ نظم کیا گیا ہے گو اُس پر نقاب ڈالنے کی سوانح نگار نے کوشش کی ہے مگر یہ واقعہ ہے اور اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ داغ کلکتہ میں ایک مغنیہ (طوائف) پر عاشق ہوجاتے ہیں جو صرف علم موسیقی سے ہی ماہر نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور ادبی مذاق بھی رکھتی تھی اور "حجاب" تخلص بھی کرتی تھی اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف سے کشش تھی، اس میں کوئی بات عجیب وغریب اور غیر فطری نظر نہیں آتی داغ کے سفر کلکتہ میں کسی جلسہ رقص وسرود میں داغ اور حجاب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور قیام کلکتہ ہی میں حجاب داغ سے "بے حجاب" ہوگئی اور داغ اس کی مفارقت کا ایک دائمی نقش اپنے دل پر لئے کلکتہ سے لوٹے جس کی راگنی انہوں نے "فریاد" کے نام سے الاپی ہے اور یہ راگ اس قدر صاف اور واضح طور پر الاپتے ہیں کہ کوئی شخص سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتا وہ صاف طور پر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ حجاب نے اُن پر یہ واضح کردیا تھا کہ اُن کی سیہ فامی یا مردانہ خصوصیتوں کی وہ مداح نہ تھی بلکہ وہ بحیثیت شاعر کے انکی مداح اور شیدا تھی وہ اس قدر خوش رو یا جواں طبیعت والے نہ تھے کہ اُن کو کوئی نازنیں بہ نگاہ اُلفت دیکھتی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حجاب اُنکی ظاہری شکل

وشاہت پر نہیں بلکہ اُن کی ادبیت، شاعری، نام آوری اور دولت پر مبنی ہوگی مگر ان دونوں
کی یکجائی بہت جلد ختم ہوگئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ حجاب سن رسیدہ ہونے کے بعد داغ سے
ملنے کے لئے آئی جبکہ داغ ستر برس کے ہو چکے تھے، اس قصہ کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے میں
نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس پر سوانح نگار کو شرمندہ ہونا پڑے، مثنوی
جو اس قصہ کو ظاہر کرتی ہے بڑی ہی پر لطف ہے وہ اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل
لوٹ جاتا ہے ہر ایک شعر حشر جذبات اور واردات قلبی کا نچوڑ ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ
شاعر اپنا کلام کسی ادبی سرپرست کی تعریف سے شروع کرتا ہے جسے وہ ممدوح کہتا ہے
یہاں داغ کو نواب رامپور کی مدح اور پایہ تخت رامپور کی تعریف لکھنی تھی اس لئے وہ بہت
ہی سادہ الفاظ میں دعایہ تعریف کرتے ہیں چونکہ انہوں نے اس شہر میں بہت ہی اطمینان اور
سکون کی زندگی بسر کی ہے اس لئے اُن کا یہ کہنا غلو تصور نہیں ہو سکتا ؎

ہے عجب شہر مصطفیٰ آباد ؎ اُس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں

وہ اشعار جن میں داغ "محبت" کا تذکرہ کرتے ہیں اس قدر پر لطف ہیں کہ اُن کی سادگی اور
زور اور صداقت کے لحاظ سے بمشکل اُن کے کسی ہمعصر کو یہ بات مل سکتی ہے میں نہیں
سمجھ سکتا کہ میں اس مختصر مضمون میں "فریاد" کی شاعرانہ خوبیوں کی پوری طرح تشریح کر سکتا
ہوں، یا تفصیلی تنقید میں ان لوگوں کو جنہوں نے اب تک نہیں پڑھا مشورہ دیتا ہوں اور
اس کی سفارش کرتا ہوں کہ وہ ضرور اس مثنوی کو پڑھیں اور اُس کے محاسن کے متعلق
خود رائے قائم کریں، میری ذاتی رائے اس کے متعلق بہت اچھی ہے اگرچہ داغ نے اور

تین ضخیم دیواں چھوڑے ہیں مگر صرف یہی مثنوی اُن کو بقائے دوام کا خلعت پہنانے کے لئے کافی ہے۔

اہل زبان اور استاد ہونے کی حیثیت سے اور سادہ الفاظ کو نہایت ہی جوش اور پر اثر طریقہ پر بیان کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے زمانہ موجودہ میں کوئی شخص اِن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اُن کی غزلیں استاد ذوق کے طرز کلام کی خصوصیتن رکھتی ہیں بلکہ اُن سے بڑھ کر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شعرا اردو میں سے قدرت نے میر تقی میر کو سوز و گداز اور درد و اثر عطا کیا تھا اور سودا کو بیحد شوخ کلام لکھنے کی قدرت حاصل تھی مگر بہت سی غزلوں میں داغ نے دونوں اساتذہ میر اور سودا کا رنگ دکھادیا ہے، بلکہ ان دونوں اداؤں کو ملاکر وہ ایک نغمۂ خوش آہنگ چھیڑتے ہیں۔ محاوروں کو استعمال کرنے میں داغ کو ایک خاص ملکہ تھا وہ عام محاورے بھی بعض اوقات استعمال کئے ہیں جس پر مخالفین نے بہت زوردار تنقید کی ہے لیکن یہ کمزوری نظر انداز کردینے کے قابل ہے جس پر زیادہ زور نہ دینا چاہئے اُن کے دیواں میں بہت سارے ایسے بھی اشعار ہیں جنکو معلمین اخلاق اور سنجیدہ طبیعت اشخاص ہرگز پسند نہ کریں گے مگر یہ بہت زیادہ نہیں اور اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہئے ان قابل اعتراض غزلوں کو چھوڑنے کے بعد ان کے دیواں میں ایسا مواد بھی کافی موجود ہے جو ان کی خوبیوں پر دلالت کرتا ہے، ایسی نظمیں جن میں وہ نادر کامیابی کے ساتھ انسانی قلب کی حرکتوں اور واردات عشق کے احساسات کو پر لطف طریقہ سے آسانی عقل کے نتائج اور تجربوں کا اظہار کرتے ہیں بہت سے ہیں۔

اردو دان طبقے کے لئے اُن کے دیواں میں دلچسپی اور مسرت کا کافی مواد موجود ہے۔

امیر اور داغ شاعر کی حیثیت سے سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ تغزل میں داغ کی استادی

کا تمام شاعروں نے اعتراف کیا ہے حالی گذشتہ عظمت وشان دہلی پہ ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ؎ نہ سنو گے گل و بلبل کا فسانہ ہرگز

امیر ایک غزل میں داغ کی غزل کی یوں داد دیتے ہیں ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

موجودہ زمانے میں ادب کے ایسے فدائی بہت کم ملیں گے جو ایک شاعر کی حیثیت سے زندہ رہے اور مر گئے۔ داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو بمقام حیدرآباد انتقال ہوا۔ اس وقت داغ کو عمر اور علم کے ساتھ ہی ساتھ دنیوی اعزاز بھی بہت حاصل تھا اس "بلبل ہندوستان" کی وفات سے تمام ادبی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہرام مچ گیا، گو ان کی وفات پر بہتوں نے مرثئے لکھا اور سب سے زیادہ موثر "شاعر پنجاب" "ڈاکٹر سر اقبال کا مرثیہ ہے جو بیان کرتے ہیں کہ فطرت انسانی کے تجزیہ کی قوت بھی داغ کی شاعری کی ممتاز خصوصیت ہے، اقبال نے جو پر زور مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

اٹھینگے آذر ہزاروں شعر کے بتخانہ سے
مئی پلائیں گے نئے ساقی، نئے پیمانہ سے

(ترجمہ از نیو اورینٹ)

"تمکین کاظمی"

شذرات

اب کی بڑے دن کی تعطیل میں اس صوبہ میں بہت اہم اجتماعات ہونے والے ہیں۔ کانپور میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس قرار پایا ہے۔ اور علی گڈھ میں بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک یادگار جشن منایا جائیگا۔ ان اجتماعات سے مزید فائدہ اٹھانے کے لئے صوبہ اور ملک کی بعض، دوسری انجمنوں نے اپنے اجلاس کانپور یا علی گڈھ میں مقرر کئے ہیں۔ ان مہتم بالشان مواقع کو دیکھکر اگر ہمدردان زبان اردو بھی اس نوع کی کوئی متفقہ کوشش کریں تو کچھ بڑی بات نہیں۔

یہ صوبہ زبان اردو کا مرکز ہے۔ معاونین اردو کو ہر گوشہ ملک میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان پر مبادلہ خیالات کا بھی ایک موقع آجائے تو فائدہ سے خالی نہیں۔ اس تدبیر سے اگر کوئی معین نتیجہ نہ نکلے تب بھی اردو کی منتشر قوتوں کا یکجائی مظاہر کم از کم ہمارے محسوسات کی ایک دلیل ہوگا۔ کیا ہم انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) اور انجمن اردو (لکھنؤ) کو اس طرف توجہ دلا سکتے ہیں؟

م-ا

بدنصیب ہندوستان اپنی خانگی بلاؤں میں اور موت وحیات کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے اور جوں جوں زمانہ ترقی کر رہا ہے اس ملک میں وہ مسائل جو چند سال قبل کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے غیر معمولی اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں حب الوطنی اور اقتصادیات کی دشواریاں جب تک حل نہ ہونگی ہندوستان میں چین اور سکون ناممکن ہے اور یہ صبر و اطمینان جو ہمارا

ورثہ اور ہمارے مقسوم کا حصہ ہے ہم کو مل کر رہے گا۔ سوال صرف وقت کا ہے اور لفظ "وقت" مترادف ہے "آزمائش" کا۔ ہندوستان کے لئے یہ زمانہ آزمائش کا ہے اور اس کی حکمران قوم کے لئے دور اندیشی اور بالغ نظری کا۔ لیکن حسرت کا مقام ہے کہ ہم کو ہندوستان سے باہر نکل کر بھی سکون اور راحت میسر نہیں ہے۔

افریقہ کے دردناک حالات کے علاوہ امریکہ نے بھی جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ قابل ملامت ہے، چنانچہ اب وہاں پر کوئی ہندوستانی امریکن باشندہ نہیں ہو سکتا ہے اور وہاں کے قانون کے مطابق چونکہ بیوی کی بھی وہی قومیت ہو جاتی ہے جو شوہر کی ہوتی ہے اس لئے وہ بدنصیب امریکن عورتیں جو ہندوستانیوں سے شادی کر چکی ہیں یک قلم امریکن قومیت سے خارج کر دی گئیں! یہ ایک سزا ہے جو امریکہ نے اپنی ان بیٹیوں کو دی ہے جو خدا کے احکام اور دنیا کے رواج کے مطابق اور تمدن کے اقتضا سے ہندوستان کے بیٹوں سے منسلک ہو گئی تھیں! اس قانون کے ہوتے ہوئے بھی امریکہ کو غرور ہے کہ صرف وہی ایک ملک ہے جس میں ہر قوم اور ہر ملک کے آدمی کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے!!!

جعفری

....

شمع بُک ڈپو

تذکرہ شعرائے اُردو ۔ مؤلفہ میر حسن دہلوی میر حسن دہلوی کے نام سے کون واقف نہین اونکی مثنوی بدرمنیر کو جو قبولِ عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کتاب کو نصیب ہوا ہو ۔ یہ تذکرہ اوسی مقبول اور نامور اوستاد کی تالیف ہے ۔ یہ کتاب نایاب تھی ۔ بڑی کوششون سے طبع کیگئی ہے میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے اسپر مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ کلدار۔

تاریخ تمدن ۔ سر ٹامسن بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے مصنف نے ہی تک تمدن کے ہر مسئلہ پر مکمل و مفصل بحث کی ہے اور ہر اصول کی تائید مین تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اسکے مطالعہ سے معلومات مین وسعت پیدا ہوتی ہے حصہ اول غیر مجلد عہ مجلد ۶ کلدار ۔ حصہ دوم مجلد ۶ کلدار

مقدمات الطبیعات ۔ یہ ترجمہ ہے گر انگلستان کے مشہور سائنس دان حکیم ہکسلے کی کتاب کا جسکا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے اسمین نظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے قیمت غیر مجلد ۶ کلدار مجلد ۶ کلدار۔

القول الاظہر ۔ امام ابن مسکویہ کی معرکتہ الآرا تصنیف فوز الاصغر کا یہ اُردو ترجمہ ہے یہ کتاب فلسفۃ الٰہیہ کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھین اصول کو منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد ۸ کلدار ۔ مجلد عہ کلدار۔

القمر ۔ قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہین اُن سبکو جمع کر دیا ہے ۔ طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے ۔ قیمت غیر مجلد ۱۰ کلدار۔

قاعدہ و کلید قاعدہ ۔ یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اسکی تعلیم ہونی چاہیئے اُنکی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کیگئی ہے ۔ قاعدہ غیر مجلد ۲ کلید قاعدہ غیر مجلد ۲

فلسفہ تعلیم ۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے ۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے ۔ تربیت کے قوانین کو اسقدر صحت کیساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے ۔ قیمت مجلد ے کلدار غیر مجلد ۸

دریائے لطافت ۔ ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خان کی تصنیف ہے ۔ اُردو صرف و نحو

اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اسمین زبان کے متعلق بعض عجیب وغریب نکات درج ہین۔ قیمت
غیر مجلد عہ کلدار۔ مجلد تعا کلدار۔

طبقات الارض۔۔ اِس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں مین تقریباً جملہ مسائل قلمبند کئے ہین
کتاب کے آخر مین انگریزی مصطلحات اور اون کے مُرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت غیر مجلد
عا۔ مجلد عا کلدار۔

مشاہیر یونان وروما۔ ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشا پردازی مین اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار
برس سے آجتک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے
وطن پرستی اور بے نفسی عزم جوانمردی کی مثالوں سے اسکا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔ قیمت جلد اول غیر مجلد ہے
مجلد للعہ۔ جلد دوم غیر مجلد تجا۔ مجلد ہے کلدار

اسباق النحو۔ ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے۔ کی تالیف ہے۔ اختصار کے باوجود
عربی صرف ونحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار۔ غیر مجلد
حصہ دوم ۴ آنہ کلدار

علم المعیشت۔ اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی۔ ایم۔ اے نے ملک
پر بہت بڑا احسان کیا ہے معیشت پر یہ کتاب جامع ومانع ہے۔ مبہم ومشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے
اسکے اکثر باب نہایت عجیب وغریب ہین۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۸۵ صفحے۔ قیمت
مجلد صہ کلدار۔

تاریخ اخلاق یورپ۔ اس مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم وتبحر تحقیق صداقت کا مرادف ہے
یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن معاشرت۔ اصول۔ اخلاق مذاہب وخیالات کا مرقع ہے۔
حصہ اول مجلد ہے حصہ دوم مجلد عہ کلدار

تاریخ یونان قدیم۔ یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ
سے سلاست وشگفتگی کا نمونہ۔ اسکا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف۔ اے کلاس کے طلبا جو

یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں۔ اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد عہ کلدار۔

انتخاب کلام میر۔ میر تقی میر تاج شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے قیمت مجلد عہ کلدار۔

رسالہ نباتات۔ اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔ علمی اصطلاحات سے معرا سلاست و روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے۔ طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد عہ کلدار

دیباچۂ صحت۔ اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا۔ پانی۔ غذا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے اسکا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ایکہزار صفحے۔ قیمت مجلد للعہ ر

قواعد اُردو۔ ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اُردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اسمیں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے۔ قیمت بغیر جلد عا کلدار۔

نکات الشعراء۔ یہ اُردو کا تذکرہ اُستاد الشعراء میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے اسمیں بعض ایسے شعراء کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔ نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اسپر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد عہ کلدار۔

فلسفہ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کیساتھ بحث کی گئی ہے متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد عا کلدار۔

وضع اصطلاحات۔ یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے۔ بقول فاضل مولف یہ بالکل نیا موضوع ہے بیسیوں علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آجتک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کے کسی زبان میں۔ اسمیں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کیساتھ بحث کی گئی ہے اور اسکے اصول قایم کئے گئے ہیں۔ مخالف موافق

رایوں کی تنقید کیگئی ہے اور زبان کی ساخت اور اوسکے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں
اور لاحقوں اُردو مصادر، اور اون کے مشتقات غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثین زبان کے متعلق آگئی ہین اُردو
مین بعض اور بھی ایسی کتابیں ہین جنکی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان مین انکی نظیر نہیں لیکن اس کتاب نے
زبان کی جڑین مضبوط کردی ہین اور ہمارے حوصلے بلند کر دئے ہین اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے
ہوتے جھجکتے اور اسکی آئندہ ترقی کے متعلق دعوے کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ
اندیشہ نہیں رہا اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھولدیا ہے تعداد صفحات ۵۰۳ قیمت مجلد ۱۲/
نفح الطیب - یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے - خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اسکی خوشہ
چینی کرنی پڑی ہے علامہ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو مین ترجمہ ہوئی ہے یہ کتاب
عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب مین بھی داخل ہے - صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد ۸/ کلدار -
محاسن کلام غالب - ڈاکٹر عبدالرحمن خان بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے - اُردو زبان مین یہ پہلی
تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے - یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر مین طبع ہوا تھا صاحب نظر قدر دانوں کے
اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے - قیمت غیر مجلد ۸/ کلدار -
ملل قدیمہ - ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے - اسمین بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی - آشوری - بابل بنی
اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت - عقاید - صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات صحیح اور خوبی کیساتھ دئے ہین - اُردو
مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکین اسلئے انجمن نے اسے خاص طور پر
طبع کرایا ہے - حالات کی وضاحت کیلئے جا بجا تصویرین دیگئی ہین صفحہ ۲۷۴ - قیمت مجلد ۲/ کلدار
بجلی کے کرشمہ - یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خانصاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے
بعد لکھی ہے - برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان مین لکھی ہے - ہمارے بہت سے ہموطن یہ نہین
جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے - یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے - لڑکے
لڑکیوں کے لئے مفید ہے - قیمت ۱۲/ کلدار -

منیجر رسالہ شمع - شاہ گنج آگرہ

سندری سہاگ ہیر آئیل
رجسٹرڈ
سندری سہاگ ہیر آئیل دماغ کو قوت بخشتا ہے- اس لیئے مرد اسے اپنا مونس قرار دیتے ہین
سندری سہاگ ہیر آئیل بالون کی جڑون کو مضبوط کردیتا ہے جسکی وجہ سے بال چمکدار لانبے اور
گھنے اور گھونگر والے ہوجاتے ہین- اس لیئے اسکو عورتین بڑے شوق سے لگاتی ہین- سندری سہاگ
ہیر آئیل کا رنگ اور خوشبو دونون کے دونون بڑی ہی دلربا ہین اس لیئے عام پبلک اسکو نہایت درجہ
پسند کرتی ہے- سندری سہاگ ہیر آئیل گرے ہوے بالونکی جگہ نئے بال پیدا کرتا ہے- سندری سہاگ
ہیر آئیل خاص بیلہ کے تیل مین اول درجہ کی فائدہ مند اور قیمتی دوائین ڈالکر تیار کیا جاتا ہے اس لیئے اسکے
لگاتے ہی دردسر کو سکون ہوتا ہے اور مسلسل استعمال سے یہ شکایت ہمیشہ کیلئے جاتی رہتی ہے
سندری سہاگ ہیر آئیل بالونکو قبل از وقت گرنے یا سفید ہونے سے روکتا ہے- قانون گو سوداگر
طالب علم اور مصر اس کو استعمال کرتے ہین بیماری سے اٹھا ہوا ضعیف و ناتوان دماغ سندری سہاگ کے
استعمال سے تر و تازہ ہوجاتا ہے- دماغ کو فرحت اور روح کو مسرت ہوتی ہے- باوجود ان خوبیون کے اگر
آپ استعمال نکرین تو سخت تعجب کی بات ہے! کیا ایک شیشی روانہ خدمت کیا جاے ؟
قیمت فی شیشی ایک روپیہ- تین شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے محصول علاوہ
ایجنٹون کی ہر جگہ ضرورت ہے! تاجرون کے ساتھ خاص رعایت کیجاتی ہے!!
ملنے کا پتہ:- ایس- اے- بی بخشی اینڈ کو- کوٹھی نمبر ۲ کولوٹولہ اسٹریٹ پوسٹ بکس ۱۱۴ کلکتہ

باہتمام منشی عبدالعزیز خان پرنٹر عزیزی پریس آگرہ میں چھپا

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹر ایٹ لا - ایم - آر - اے - ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹر ایٹ لا آگرہ

دار الاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد وضوابط

۱۔ رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے

۲۔ ۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک ۱۰ ہے ممالک غیر سے عہ۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمائیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت وترسیل زرچندہ واجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷۔ مضامین وخطوط متعلق مضامین آڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اس لئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے اور وی۔ پی منگوا کر واپس نہ فرمائیے۔

شرح اجرت حسب ذیل ہے

مدت	۱/۴ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	معہ ر	عسہ ر	مسعہ ر
چھ ماہ	عسہ ر	بعسہ	للعہ عسہ ر
ایک سال	مسعہ ر	سہ ر	للعہ ر

المشتہر: منیجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

نمبر ۴ — فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ اکتوبر ۲۵ء — جلد ۲

اطلاع

کاتب نے غلطی سے گذشتہ نمبر میں بعض حضرات مضامین نگار کے اسماء گرامی سے قبل 'جناب' یا 'صاحب' نہیں لکھا جس کا ہم کو دلی افسوس ہے اور ہم معذرت خواہ ہیں۔

مجھے حضرت ہادی مچھلی شہری اپنے تازہ عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ شمع بابتہ ستمبر ۱۹۲۵ء میں میری غزل کے مطلع کے دوسرے مصرعہ میں بجائے 'زندگی' کے 'بے کسی' ہے۔ یعنی اصل مصرع اس طرح ہے ؎ میری بے کسی کا معاملہ ہے عجیب اپردہ راز میں ——— مینے شاید غلطی سے زندگی لکھدیا تھا۔
اسی طرح غزل مذکور کے شعر نمبر ۹ کی سطر نمبر ۲ میں 'شکل بدل' کے بعد لفظ 'کے' ہونا چاہئے۔
ناظرین شمع نوٹ فرمالیں۔

شمع کا جوبلی نمبر غیر معمولی ضخامت کے ساتھ ہدیۂ قارئین کرام ہوگا۔ اس کے مضامین صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تصاویر بھی سحر حلال کا حکم رکھتی ہیں۔
ہندوستان کے مایۂ ناز مصور حضرت چغتائی کی ایک قلمی تصویر بھی اس میں موجود ہے جو آرٹ کے لحاظ سے لاثانی ہے۔
مضامین کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب صاحب قبلہ اڈیٹر شمع کا مضمون محمود غزنوی تحقیق کی جان ہے۔ اسی طرح 'زیب النساء کا مرقع' ایک ایسا ادبی۔ تاریخی اور معاشرتی مضمون ہے کہ صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی افسانے اور مضامین و غزلیات و نظمیں ہیں جو مجموعی حیثیت سے نہایت دلکش ہیں۔

ہمنے انتظام کیا ہے کہ جوبلی کے موقع پر علیگڈھ میں شمع کا مستقل آفس رہیگا تاکہ علاوہ شمع کی فروختگی کے حضرات مضامین نگار سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا پورا پورا موقع مل سکے۔

شمع کے جوبلی نمبر کی بہت زیادہ مانگ ہوگی لہٰذا غیر خریدار حضرات سے عہ علاوہ محصولڈاک وصول ہونے پر روانہ ہو سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ روپیہ پیشگی مع آرڈر دفتر شمع آگرہ میں وصول ہو جائے۔

جو حضرات ۱۹۲۶ء سے شمع کے خریدار ہونا چاہتے ہیں، اگر وہ اپنا زرچندہ اخیر دسمبر ۱۹۲۵ء تک منیجر شمع کے پاس آگرہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں گے۔ شمع کا جوبلی نمبر انکی خدمت میں مفت روانہ ہوگا۔ امید کہ حضرات اسطرف مزید توجہ فرمائیں گے، اور اس ادبی خزانہ کو ہاتھہ سے نہ جانے دیں گے۔

"منیجر شمع"

رسالہ

شمع

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء

مرثیہ اور اُس کی عہد بعہد ترقی

مرثیہ[۱] کے لفظی معنی "وصف میّت" ہیں اور اصطلاح شعرا میں مرثیہ اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شخص متوفیٰ کے محامد فضایل وسوانح درد وحسرت کے ساتھہ بیان کئے جائیں۔

درد وغم کا جذبہ تمام جذبات انسانی سے قوی تر ہے۔ حسرت ومصیبت کی کہانی عیش و شادمانی کی داستان سے زیادہ گراں بہا اور آنسوؤں کا تار قہقہہ کے پھول سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ رنج وآلام سے متاثر ہونا فطرت انسانی کا خاصہ ہے اسلئے مرثیہ کا اثر قصیدہ اور منقبت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ دلوں پر نشتر چلاتا اور ہر ایک شعر آہ و زاری کا مینھہ برساتا ہے۔

---

[۱] یہ مضمون یادگار انیس کا مقدمہ ہے کتاب عنقریب انوار المطابع لکھنؤ سے شائع ہوگی اور اسکا حق اشاعت بحق نواب ذکی احمد علوی سلمہٗ محفوظ ہے۔

یوں تو مرثیہ ہر ایک مصیبت اور تباہی پر کہا جا سکتا ہے۔ دہر تراشت کا نوحہ کوروں کی تباہی پر، سہراب کی ماں کا ماتم بیٹے کے قتل پر۔ شیخ سعدی کا مرثیہ ملک مستعصم کے زوال پر اس قابل ہے کہ "آسمان خون ببارد بر زمین"

عجم کی تذلیل پر فردوسی کا ایک مصرعہ "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو" اور دارا کی موت پر نظامی کا ایک شعر "نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے بردباد" ہزار داستان حرماں و قلق کا خلاصہ ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر امام حسین علیہ السلام اور اُن کے رفقا کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔ یہ حسرت ناک واقعہ اس قدر عبرت خیز ہے کہ اگر سادہ الفاظ میں بغیر کسی عبارت آرائی کے بیان کر دیا جائے تو بھی سُننے والوں کے دل ہل جائیں اور "گریہ بر ملایک ہفت آسمان فتد۔"

اللہ! اللہ!! کیسا دردانگیز منظر ہے کہ مُسلمانوں کے نبی کا نواسہ حاکم وقت کے جبر و ظلم سے عاجز آکر اپنے وطن سے جدا ہوتا۔ رسول پاک کا مقدس جوار چھوڑ کر مکّہ کو اقامتگاہ بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہاں بھی چین میسّر نہیں آتا۔ بعض گندم نما جو فروش حمایت و نصرت کا سبز باغ دکھا کر خانۂ خدا میں بھی ٹکنے نہیں دیتے۔ بیوفائی اور بدعہدی کوفیوں کا شیوہ ہے لیکن وہ محمّد کا کلمہ پڑھتے ہیں اور حُجّت حق اُن کو مُسلمان سمجھ کر عین موسم حج میں کعبہ سے کوچ فرماتے۔ ریگستان عرب کی گرمی اور سختی برداشت کرتے ہوئے اپنے کنبہ کی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لئے عراق کی سرحد تک پہنچتے ہیں۔ ناگہاں خبر ملتی ہے کہ جن بے وفاؤں نے خط اور پیام بھیج بھیج کر بلایا تھا منحرف اور برگشتہ ہو گئے اور مہمان عزیز کے خیر مقدم کے لئے تلواریں تیز ہو رہی ہیں۔ کوفہ کی عزیمت فسخ کی جاتی ہے اور قضا ر

ایزدی راستہ بھول کر نینوا کی ہولناک سرزمین پر پہنچا دیتی ہے۔ دشمنوں کا ایک عظیم الشان لشکر آن پہنچتا ہے۔ ہر طرف کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ نہر فرات کا پانی جس سے چرند پرند تک سیراب ہوتے ہیں ساقی کوثر کے فرزند کو اس قصور میں نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک حاکم فاسق و فاجر کی بیعت کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔

ترسم کزیں گناہ شفیعان روز حشر

دارند شرم کز گنہ خلق دم زنند

جان نثاروں کی جمعیت نہایت قلیل ہے جن میں سے بیشتر اپنے ہی بھائی بھتیجے ہیں مقابلہ پر شام کی کار آزمودہ اور آراستہ فوج ہے جس کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے نتیجۂ جنگ میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ اعوان و انصار۔ اعزہ و اقربا۔ سب کی موت یقینی ہے۔ عورتوں کی اسیری اور بچوں کی یتیمی پیشِ نظر ہے لیکن اُس کوہ عزم و استقلال کی ہمت میں فرق نہیں آتا۔ پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ کھانا پانی بند ہے۔ معصوم بچے پیاس کی تکلیف سے تڑپ رہے ہیں۔ بنی فاطمہؓ پر تیسرا فاقہ ہے لیکن نانا کی امت کو درطۂ ضلالت میں ڈالنا گوارا نہیں فاسق کی بیعت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ زبان میں تاثیر ہے کہ لب ہلائیں تو پتھروں سے چشمے جاری ہونے لگیں۔ دل میں قوت ہے کہ بہشت کی نعمتوں کی خواہش کریں تو فوراً رضوانِ جنت طبق لیکر حاضر ہو لیکن رضاء الٰہی پر صابر و شاکر ہیں۔ غلاموں کی محبت بیٹوں سے زیادہ ہے اس لئے دشمنوں کے حق میں دعائے بد بھی نہیں فرماتے اور نہ زبان مبارک کو کلمۂ شکا سے آلودہ ہونے دیتے ہیں۔

اعزہ اور انصار میں سے ہر ایک کی تمنا ہے کہ سب سے پہلے میں جگر گوشۂ رسولؐ

کا فدیہ ہوں۔ باپ کی خواہش ہے کہ پہلے میں سر کٹاؤں اور بیٹوں کا داغ نہ دیکھوں۔ بیٹے بھتیجے کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے آپ کو میدان جنگ میں جانے نہ دیں گے۔ ان کی شجاعت اور جوانمردی ضرب المثل ہے نیزہ بازی اور فنون حرب کے خوب خوب جوہر دکھاتے ہیں لیکن دشمن غول کے غول ایک ایک پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور بھائی بیٹے سب آنکھوں کے سامنے مارے جاتے ہیں حتیٰ کہ چھ مہینہ کا ایک شیر خوار بچہ جو تشنگی کی شدت سے خود ہی نیم جاں ہو رہا تھا آغوش مبارک میں دشمنوں کے تیر کا شکار ہوتا ہے لیکن اس نازک وقت پر بھی رحمت غضب سے سبقت لیجاتی ہے "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"۔ نہ شکوہ ظلم زبان پر آتا ہے اور نہ دل یاد خالق سے غافل ہوتا ہے۔ آخر کار دشمن نرغہ کر کے اس صابر و شاکر کو بھی شہید کرتے ہیں۔ سر مبارک نیزے کی انی پر آویزاں کیا جاتا ہے ؎

آں سر کہ بود بر سر دوش نبی مدام
یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببیں

جسد اطہر گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوتا ہے۔ خیمۂ فلک بارگاہ میں آگ لگائی جاتی ہے۔ اہل حرم برہنہ سر اعدا کی قید میں گرفتار ہوتے ہیں۔ خاندان نبوت کا ایک چراغ جو بیماری کی شدت سے جنگ کے قابل نہ تھا زندہ اسیر ہوتا ہے اور طوق و زنجیر سے مسلسل اس لٹے ہوئے کارواں مدینہ کے ساتھ حاکم شام کے دربار میں حاضر کیا جاتا ہے۔

آں ناکساں کہ تیغ بصید حرم زنند ۔ از صاحب حرم چہ توقع کنند باز

دشمن اپنے مقتولین کی تجہیز و تکفین کرتے ہیں مگر محمدؐ کے نواسہ کے لاش عرصہ تک میدان کربلا میں بے گور و کفن پڑی رہتی ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ کیا دردناک بیان ہے اور کسقدر حسرت بھری داستان اگر اُس عہد کا کوئی شاعر جس کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا اس واقعہ کو نظم کرتا تو تمام دنیائے اسلام میں آگ لگ جاتی اور قتل حسینؑ سچ مچ "مرگ یزید" بنجاتا۔

عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا اور ایام جاہلیت ہی میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ عبدالمطلب جدِ رسول اللہ اور بعض دیگر ناموروں کے مرثیے عربی لٹریچر میں اس وقت تک محفوظ ہیں اور "حماسہ" میں ایک مستقل فصل "باب المراثی" کے عنوان سے موجود ہے۔ آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو زوال نہیں آیا۔ حسان بن ثابت مداحِ رسولؐ نے شہنشاہ کونین کی وفات پر ایسے مرثیے لکھے کہ ان کا ہر شعر مجسم سوز و گداز ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ نے بھی اس سانحہ قیامت نما پر ایک دردناک مرثیہ کہا جس کے ایک شعر کا مضمون یہ تھا کہ "مجھ پر مصائب ایسے آپڑے ہیں کہ یہ مصیبتیں دنوں پر گزرتیں تو وہ رات ہو جاتے"۔ خلیفہ دوم نے اپنے بھائی کا مرثیہ اُس عہد کے مشہور مرثیہ گو متمم بن نویرہ سے فرمایش کے لکھوایا لیکن افسوس کہ حسینؑ پر آنسو بہانے کی کسی کو ہمت نہ تھی اور کربلا کے محشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا تصنیف نہیں کیا گیا کہ زندہ رہتا۔

بنی اُمیہ کے جور و ستم نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ فرزدق نے ایک قصیدہ حضرت امام زین العابدین کی شان میں لکھا جس کے ایک شعر کا مضمون یہ تھا کہ "حضرت نے لفظ لَا (کلمہ انکار) سوائے تشہد (اشہد ان لا الٰہ الا اللہ) کے کبھی زبان مبارک سے نہیں نکالا اور اگر تشہد لازمی نہ ہوتا تو آپ کی ہر ایک "نہیں" "ہاں" ہوتی"۔ اور مجمع عام کے سامنے بڑے جوش سے حاکم وقت کو مخاطب کر کے کہا کہ "تو نہیں جانتا تو جان لے کہ یہ فاطمہؑ کے بیٹے

۵؎ قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(مولانا محمد علی)

ہیں اور اُن کے جد پر انبیا کا سلسلہ ختم ہوا" بادشاہ نہایت ناراض ہوا اور شاعر کو قید

اسی جباری کا نتیجہ یہ تھا کہ اُس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعہ کربلا کو نظم کرنے کی جراءت نہیں کی اور عرب کی شاعری بیان مصائب اہل بیت کی سعادت سے محروم رہی، بنی عباس کے عہد میں بعض غیر مشہور شعرا نے متفرق اشعار واقعہ کربلا کی متعلق کہے اور دعبل خزاعی نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کی شہرت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے حضور میں پڑھا گیا لیکن اثر اور جوش کا اُسمیں پتہ نہیں۔ بلکہ اُسی زمانہ میں ائمہ کے قتل پر جو دردناک مرثئے کہے گئے تھے اُن سے بھی اس سرمایۂ ناز و افتخار دعبل کو کچھ نسبت نہیں،

البتہ ایران کی مقدس سرزمین نے غلامی خاندان رسالت کا حق ادا کیا اور جب اس ملک کو خود مختاری نصیب ہوئی اہلبیت کا نیازمند شاہ طہماسپ صفوی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شعرا کو ائمہ اہل بیت کی شان میں طبع آزمائی کرنا چاہیئے۔ دفتر ازل میں یہ شرف محتشم کاشی کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا کہ وہ مصائب کربلا پر پہلی مرتبہ ایسے دردناک الفاظ میں نوحہ کرے کہ اُس کے مرثیہ کو قبول عام اور بقاء دوام کی سند نصیب ہو۔ اُسنے چند بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو فطرتی جذبات سے لبریز اور درد و غم کی مجسم تصویر ہے۔ اُسکے کچھ شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

(دختر زہرا امام زماں کے پیکر شریف کو خاک و خون میں غلطاں دیکھ کر مدینہ کیطرف رُخ کرتیں اور حضرت رسول عربی کے برزخ مبارک سے عرض کرتی ہیں)

پس با زبان پر گلہ آں بضعۃ البتول　　رو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول

این کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسین تست	ویں صید دست و پا زدہ درخوں حسین تست
این غرقۂ محیط شہادت کہ روئے دشت	از موج خون او شدہ گلگوں حسین تست
این خشک لب فتادۂ ممنوع ازفرات	کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسین تست
این شاہ کم سپاہ کہ باخیل اشک و آہ	خرگاہ ازیں جہاں زدہ بیروں حسین تست
این قالب طپاں کہ چنیں ماندہ برزمیں	شاہ شہید ناشدہ مدفوں حسین تست

محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی میں شہرت پائی اور شوکت الفاظ کے زور سے ملا محتشم کی درد و تاثیر کا جواب دیا۔

فرماتے ہیں :-

بلند مرتبہ شاہے زصدر زیں افتاد اگر غلط نہ کنم عرش برزمیں افتاد

انہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات ابتدا ر سفر سے اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینہ آنے تک نظم کر دیئے۔

پھر تو ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا اور سیکڑوں شاعر مرثیہ کہنے لگے۔ اب ہندوستان میں فارسی شاعری سے دلچسپی بہت کم باقی ہے اسلئے مرثیہ گویان ایران کے کلام پر تبصرہ بیکار ہے۔ ہمارے ملک میں اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ گوئی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ سلاطین بیجاپور و گولکنڈہ نے سرپرستی کی۔ محمد قلی قطب شاہ (المتوفی ۱۰۲۲ھ) سلطان محمد قطب شاہ (المتوفی ۱۰۳۵ھ) اور عبداللہ قطب شاہ (المتوفی ۱۰۸۳ھ) بادشاہان گولکنڈہ خود شاعر اور سخن سنجوں کے جوہر شناس تھے۔ انہوں نے فارسی آمیز دکنی اردو میں دواوین[1] مرتب کیے اس عہد کے شعرا میں سے نصرتی اور ہاشمی صاحب

[1] (نوٹ صفحہ آیندہ میں ملاحظہ فرمایئے)

دیوان و قصاید تھے۔ غواصی کی مثنوی[۵۲] "سیف الملوک و بدیع الجمال" ابھی تک مشہور ہے۔ اور میرزا ان نامی ایک پاک طینت بزرگ تھے جو صرف مرثیے کہتے تھے۔ حمد و نعت و منقبت کے سوا اپنی زبان کو دوسری چیزوں سے آلودہ نہیں کیا۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کے کلام کا نمونہ موجود نہیں۔

گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ شعر و سخن کے فریفتہ تھے اور اُن کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں ایک مرثیہ گو شاعر تھے جن کے اشعار ہاتھوں ہاتھ دہلی اور آگرہ پہونچتے اور وہاں مجالس عزا میں پڑھے جاتے تھے۔

اُن کی زبان کا نمونہ یہ ہے۔

ملنا تمھیں کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے

(نوٹ صفحہ ۹)

[۵۱] کلام کا نمونہ یہ ہے۔

محمد قلی قطب شاہ — سدا تو پیج نبی و علی کی کہتا ہے	معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست
ہے محمد قطب شہ بارہ اماموں کا غلام	میں سو عاجز داس ٹھرا با علی سنج دستگیر
آیت قرآں نازل جیوں ہوا حضرت کے تئیں	مرتضیٰ ہیں بس دو جگ میں جیوں محمد بے نظیر
سلطان محمد قطب شاہ — بکرید عید آیا صلوٰۃ بر محمد	آنند علم اچھا ہا صلوٰۃ بر محمد
انجانے میں جوانی گیا پند نا سنا	قرآن اور حدیث سوں ترکیب کر کلام
عبداللہ قطب شاہ — راز کیا باتاں نبی کے صدقے پوچھیگا اگر	شاہ عبداللہ کو پوچھ آکر کہ ہے حاضر جواب

[۵۲] اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔

برس یک ہزار ہوا پنج تیس میں — کیا ختم یو نظم دن تیس میں

کس کس کا منہ موند دں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

جب زمانہ نے گولکنڈہ کا ورق الٹ دیا تو سپہر سخنوری پر شمس الدین ولی کے عروج و اقبال کا ستارہ چمکا جن کو صاحب تذکرۂ آب حیات نے نظم اردو کا بابا آدم قرار دیا ہے۔ اردو شاعری ان کے وقت سے سو برس پہلے شروع ہو چکی تھی اور قریب قریب تمام اصناف سخن ریختہ میں آچکے تھے لیکن زبان صاف نہ تھی وہ ولی کے دور میں اس رتبہ کو پہنچی کہ ان کا کلام ہمارے زمانہ میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق   کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ہاتف نے یوں دیا ہے مجھ کو ولی بشارت   اس کی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

انہوں نے شہدائے کربلا کے احوال میں ایک مثنوی لکھکر صاف شدہ اردو میں مرثیہ گوئی کا بنیادی پتھر رکھا۔ مثنوی کے خاتمہ میں کہتے ہیں۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال   تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال [۱۱۴۱]

کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول   ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ولی کی پیرانہ سالی میں سودا و میر کا عنوان شباب تھا۔ محبان اہلبیت کو رلانے اور مجالس ماتم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مرثیہ گوئی کی شدید ضرورت تھی ہر طبقہ کے شعرا توشۂ آخرت فراہم کرنے کے لئے نعت و منقبت کہتے اور ان میں سے بیشتر مرثیے بھی تصنیف کرتے تھے جو چو مصرعے کہے جاتے اور مجلسوں میں رونے رلانے کے کام آتے تھے۔ سودا اور میر

کے عروج سے پہلے مرثیہ کا خوب رواج ہو چکا تھا۔ اپنے وقت کے مشہور مرثیہ گو میاں مسکین کا سودا نے شہر آشوب میں تذکرہ کیا ہے ؎

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا | پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

میر تقی نے بھی مرثیہ کہا لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ شہنشاہ سخن کے دیوان میں شامل کیا جاتا۔

سودا نے اس مرثیہ پر اعتراضات کئے تھے اس لئے اُن کے کلیات میں موجود ہے:

(۱)

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے | مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے | حسینؑ علی کی شہادت کی شب ہے

(۲)

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے | ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے | کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

(۳)

کوئی دل نہیں جسکو ماتم نہ ہوگا | وہ دل دَیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا | قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے

(۴)

ہے چاروں طرف ہورہا شورِ محشر | زمین آسماں ہو رہا ہے تلے اوپر
حسینؑ علیؑ پر چلایا ہے خنجر | ہر ایک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

(۵)

بجا ہے کہ تو ہو کے دریا بہائے	یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہ تشنہ لب کا کیسے غم سُنائے	یہ کس مُنہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

مرزا رفیع سوداؔ نے اس کا رد لکھا۔ تمہید میں فرماتے ہیں :۔

"لیکن مشکل ترین دقایق طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی دیا۔ اس کام میں محتشم سا کسو نے غرقبول نہیں پایا پس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھکر مرثیے کہے نہ کہ برائی گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"۔

مگر جب خود مرثیہ کہنے بیٹھے تو اس زمین کو ذرا بھی بلند نہ کر سکے۔ اُن کا بہترین مرثیہ یہ ہے :۔

(۱)

یارو سُنو تو خالق اکبر کے واسطے[۱]	انصاف سے جواب دو حیدر کیواسطے
وہ بوسہ گہ نبیؐ تھی پیمبر کے واسطے	یا ظالموں کی برّش خنجر کے واسطے

(۲)

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی بیر	انکی سی پر قساوت قلبی نہ کی میں سیر
پینے دیں آب انس سے لیتا بوحش و طیر	مانع ہوں ابن ساقی کوثر کے واسطے

---

[۱] جنت مکان مرزا دبیر کا عجز و انکسار دیکھیے۔ کسی سوزخواں کی فرمایش سے اسی بحر میں مربع مرثیہ کہا تو مقطع میں سوداؔ کے فضل تقدم کا اعتراف کیا۔ فرماتے ہیں :۔

بس اے دبیرؔ سینہ ہے بریاں جگر کباب	سوداؔ کے مرثیہ کا تو ممکن نہیں جواب
پھر فضل حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب	کافی ہے تجھ کو بخشش محشر کے واسطے

(۳)

اُمت ہو وہ کہ خانۂ دیں کی ہو پاسبان — یا لوٹ لیوے اپنے پیمبر کا خانمان
آتش برائے پخت و پز آئی تھی در جہان — یا دینے کو وہ فاطمہؓ کے گھر کیواسطے

(۴)

راوی لکھے ہے خورد و کلاں زمیں جب ہوا — نیزے سے اور تیر سے سب کا لہو چوا
شش ماہہ طفل اصغر معصوم تک ہوا — طعمہ عقاب تیر ستمگر کے واسطے

(۵)

تنہا پھر اُس زمیں پہ رہا شاہ کربلا — اس کا بھی تیغ ظلم سے آخر کٹا گلا
بعد اس ستم کے خیمہ ہوا موردِ بلا — غارت گروں کے ہاتھ سے زیور کیواسطے

(۶)

یا مرتضےٰ علی ولی حشر کا قیام — جس روز ہو غرض کئے رکھے ہی یہ غلام
سوداؔ کو بھولیو نہ تو اپنے ز فیضِ عام — دریائے العطش کے شناور کے واسطے

سوداؔ نے خداوندِ سخن کو ہدفِ ملامت بنایا لیکن خود بے تکلف مرثیوں میں غلط الفاظ استعمال کرتے ہیں نہ صفائی بندش کا لحاظ ہے نہ "مرتبہ در نظر" اور نہ مضامین نو بنو کی تلاش.

ملاحظہ ہو

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی — جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی — یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی

کون فرزند علیؑ پر یہ ستم کرتا ہے

کیوں مکافات سے اُسکے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اُسکے تھے جتنے پیارے دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں کے سب مارے
اہلبیت اُسکے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے قید میں کوفیوں کی جاتے ہیں وہ بے چارے

نہ اُنہیں چین ہے دن کو نہ اُنہیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے تا شام

یہ مرثیہ مسدس ہے حالانکہ اس سے پہلے مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ ٹیپ لگانے کی جدت مرزا ہی کو سوجھی یا یہ شرف میاں سکندر کو نصیب ہوا جو پنجاب کے رہنے والے۔ مرزا کے ہمعصر تھے اور تلاش معاش میں لکھنؤ آ بسے تھے اُنہوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس کے طرز میں کہا جو آجتک مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور یقیناً اُردو زبان میں پہلا[۵۱] مسدس ہے جس کو قبول عام کی سند ملی۔ سودا کا مرثیہ اُن کے دیوان

---

[۵۱] بعض حضرات کا خیال ہے کہ اردو میں پہلا مسدس حیدر شاہ نامی ایک شاعر نے کہا تھا جنہوں نے احمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں وفات پائی۔ اور مندرجۂ ذیل بند اُن کا کلام بتایا جاتا ہے:۔

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے شب رخصت ہے بہنوں سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے

منہ اوس کا چومتی ہے اور یہی کہہ کہہ کے روتی ہے
اری اُٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

لیکن یہ ایسا بہتان عظیم ہے کہ اس کی تردید کے لئے نقلی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں محمد شاہ اور احمد شاہ کے وقت میں اردو زبان کی جو حالت تھی اس کا نمونہ ان اوراق میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ولی، میر تقی، مرزا رفیع سودا اور اُن کے ہمعصروں کا کلام اردو لٹریچر میں بکثرت موجود ہے (باقی آیندہ)

میں معتقد ہے اور سکندر کا مرثیہ نواح لکھنؤ میں سو برس کے بعد بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

شیر دلان پنجاب فخر کریں کہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا دوسرا دور ان کے ایک ہم وطن کے کلام سے شروع ہوتا ہے اور جس عالیشان عمارت کو شعرائے لکھنؤ نے "تا بہ ثریا" پہنچایا اس کی داغ بیل میاں سکندر ہی کی ڈالی ہوئی تھی!!

اس مقبول مرثیہ کے چند بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول ۔۔۔ ایک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اسکا نزول
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن بتول ۔۔۔ ایک لڑکی کھڑی دروازہ پہ بیمار و ملول
خط لئے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار
ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

ناگہاں سن شتر اسوار وہ آواز حزیں ۔۔۔ با دب آن کے کہنے لگا پردے کے قریں
کوئی اس گھر میں دلاسے کو تری ہے کہ نہیں ۔۔۔ اتنی سی عمر میں کیا دکھ کہ تو ہے غمگیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵)

ممکن ہے کہ حیدر شاہ کوئی مرثیہ گو شاعر عہد احمد شاہ میں ہوں مگر یہ بند ان کے کلام کا نمونہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان بہت صاف و شستہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین میں سے کسی غیر مشہور شاعر کی تصنیف ہے۔ اگر بفرض محال یہ بند احمد شاہ کے عہد میں کہا بھی گیا ہو تو ثابت نہیں ہوتا کہ حیدر شاہ نے کوئی طویل مرثیہ اس طرز میں تصنیف کیا تھا یا صرف یہی ایک بند انکا سرمایہ ناز ہے۔ علاوہ اس کے میاں سکندر کا فضل تقدم اس شہادت سے مٹ نہیں سکتا کیونکہ سودا کے مسدس کی طرح یہ بند بھی گارسن ڈی ٹاسی کے تذکرۂ شعرا میں بند ہے اور قبولیت عام میاں سکندر کے مرثیہ سے پہلے کسی مسدس کو نصیب نہیں ہوئی۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

کون سے قوم کی لڑکی ہے تو بیمار صغیر
کیا ترا نام ہے اور کس کے لئے ہے دلگیر

وہ لگی کہنے کہ سُن بندۂ حی القیوم　　میرا نانا ہے نبی دادا علی باب علوم
یہ محلہ بنی ہاشم کا ہے سب پر معلوم　　اور میں لڑکی جو بیمار رہوں دُکھیا مغموم

فاطمہؑ صغرا اسی واسطے ہے میرا نام
دادی زہرا کی سی صورت ہے مرے مُنہ کی تمام

اور چچا میرا حسنؑ زہر سے جس کو مارا　　بعد اُس کے کوئی اس ڈیرے کا والی نرہا
ایک جیتا جو رہا میرا حسینا بابا　　وہ بھی بیمار مجھے چھوڑ سفر کو ہے گیا،

اب تلک اُس کی خبر مجھکو نہیں کچھ معلوم
اُمّ سلمہ مری نانی بھی ہے گھر میں مغموم

ایک تو فاقہ کشی دوسرے میں ہوں بیمار　　گھر میں دانہ نہیں کیا تجھ سے کہوں ناقہ سوار
ایک مقنع ہے مرے سر پہ سو دیتی ہوں اُتار　　میں نے بخشا تجھے بھائی مرا خط لیکے سدھار

کہیو بابا سے کہ ہے فاطمہؑ صغرا بے چین
نام لے لیکے وہ مر جائے گی کہہ کہہ کے حسینؑ

اسلئے دیتی ہوں نامہ تجھے اے ناقہ سوار　　کربلا کی مجھے بو آتی ہے تجھ سے ہر بار
میرا بابا بھی گیا ہیگا ادہر ہو لاچار　　گر کہیں ہو ترا اُس دشت کی میداں میں گزار

کہیو رو رو کے زبانی میرا یہ سب پیام
بندگی میری بڑوں کو مرا چھوٹوں کو سلام

میری ماں بانو سے کہیو کہ تم اتنا کیجو　　میری جانب سے سکینہ کی بلائیں لیجو

اور مری پھوپھیوں سے تم زار رو کے یہ کہدیجو
کھانا واں کھاؤ تو گھر آن کے پانی پیجو
بھائی اکبر سے یہ کہیو کہ وطن کو جاؤ
پھیر بابا کو مدینہ کی طرف لے جاؤ

یہ پیام اپنا سُنا فاطمہ رض صغرا بی بی
خط و مقنع شتر اسوار کو جب دینے لگی
اُس نے مقنع نہ لیا رو کے کتابت لیلی
وقت رخصت کے کہا بی بی نے مت رو بھائی
جگ میں روتا ہوا قاصد جو کہیں جاتا ہے
پھر مقرر وہ موئے ہی کی خبر لاتا ہے

سُن کے خاموش ہو مُنہ پھیر کے وہ ناقہ سوار
ہانکتا اونٹ چلا چھوڑ مدینہ کا دیار
جسطرف دیکھتا جنگل میں کہ اُٹھتا ہے غبار
دوڑ کر پوچھتا ہر ایک مسافر کو پکار
لشکر ابن علی سے جو کوئی ہو آگاہ
مجھ کو بتلا دے نشان اسکا برای اللہ

.. ..

.. ..

التماس اب ہے سکندر کا یہی یا اللہ
میرے مکتوب سے یوں طول امل ہو کوتاہ
نہ ہے جس کی سطر میں کہیں اک حرف گناہ
واسطے فاطمہ رض صغرا کے ہو بخشش کی نگاہ
آب رحمت سے مرے جرم کا نامہ دھو ڈال
ہو وے شبیر کی خاطر سے یہ منظور سوال

اس مرثیہ کا سن تصنیف معلوم نہیں لیکن سودا کا سال وفات ۱۱۹۵ھ ہے اور میاں سکندر مرزا رفیع کے ہم عصر تھے اس لئے یہ جدت غالباً ۱۱۹۵ھ سے پہلے کی ہے۔ اسکے

تقریباً ۲۰ سال بعد سید انشا کا عروج ہوا۔ وہ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوتا ہے۔ اُس وقت تک مرثیہ خوانی کے پیشہ کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے۔ مگر سلطنت کا مذہب شیعہ تھا۔ اُمرا اور اعیان ریاست اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے عشق اہلبیت لکھنؤ کی خاک پاک میں سرایت کر گیا تھا۔ مجالس عزا دھوم دھام سے ہوتی تھیں اور اہل ایمان آرزو کرتے تھے کہ اُن کی مذہبی مجلسوں میں مشاعروں سے زیادہ رونق پیدا ہو۔ مرثیوں میں صحیح الفاظ ادا کئے جائیں اور شعرا اپنا زور طبیعت سرمایۂ آخرت میں صرف کریں۔ اہل کرم کی داد و دہش نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور چند ہی روز میں ایک کامل پیدا ہوا جس نے عاشقانہ شاعری سے دست بردار ہو کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کی۔ یہ بزرگ مرزا دبیر کے اُستاد میر ضمیر تھے۔ دلگیر۔ میر فصیح۔ اور میر خلیق نے بھی اسی صنف میں کمال حاصل کیا اور بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں یہ فن اسقدر ترقی کر چکا تھا کہ مرزا رجب علی سرور نے اپنی فسانۂ عجائب میں اہل لکھنؤ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیہ گویوں کی طرف بھی اشارہ کیا اور اُن تمام مرثیہ گویوں کے نام بتا دیئے جو اُس وقت موجود تھے۔ یا اُس سے پہلے اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

"مرثیہ گو بے نظیر۔ میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب۔ دبیر مرغوب۔ سکندر طالع۔ بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا"

سرور نے یہ عبارت میاں دلگیر کی مدح میں لکھی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دلگیر ہی کے دلدادہ تھے۔ اسوقت سے بیشتر اہل کمال دلگیر سے محبت رکھتے تھے شیخ ناسخ لکھنؤ سے جدا ہوئے تو دلگیر کو یوں یاد کرتے ہیں :-

مستحد ایسے زمانے میں کہاں ہوتے ہیں آپ دگیر ہے ناسخ جو ہے دگیر جدا

میاں دگیر کے کلام میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند بند لکھے جاتے ہیں

شہید ظلم جو وہ شاہ تشنہ کام ہوا بنوک نیزہ علم تب سر امام ہوا
حرم سرا میں لعینوں کا اژدہام ہوا خیام شاہ میں ابنوہ فوج شام ہوا
حرم کا زیور و زر لوٹنے لگے ظالم
حسینؑ امام کا گھر لوٹنے لگے ظالم

جو شہر بانو تھی شہزادی دیار عجم عزیز رکھتے تھے جسکو بہت امام امم
رکھا تھا صحن میں جس نے نہ تا بہ عمر قدم پڑی تھی جس کے نہ منہ پر نگاہ نامحرم
سو روز بد بہتا یہ اُس معدنِ حیا کے لئے
ستم کی فوج میں محتاج تھی ردا کے لئے

ہوئی یہ خانۂ آلِ عبا کی بربادی کہ سر برہنہ ہوئی ایک اک بنی زادی
ستمگروں نے یہ آلِ بنی کو ایذا دی کہ بنت فاطمہؓ کر سر برہنہ فریادی
جلا جو خیمہ تو چھپنے کو کوئی جا نہ رہی
جناب زینب خاتون کی ردا نہ رہی

جب آیا تیغ بکف خیمہ گہ میں شمر شقی سکینہ گود میں اپنی پھوپھی کے جا چھپی
سر اپنا پیٹ کے وہ دل جلی یہ کہنے لگی کوئی پدر کو مرے اب پکار لو جلدی
کبھی وہ چھوٹے سے ہاتھوں سے مُنہ چھپاتی تھی
کبھی وہ بید کے دہشت سے تھرتھراتی تھی،

سرہانے عابدِ مضطر کے آئی فوج شریر کوئی تو نیزہ دکھاتا تھا اور کوئی شمشیر

سب اپنی اپنی لگے کرنے اشقیا تدبیر　　کوئی تو طوق درسن لایا اور کوئی زنجیر
نہ ہاتھ ظلم کا اس دل کباب سے کھینچا
پکڑ کے ہاتھ اسے فرشِ خواب سے کھینچا

غرض جو خیمۂ عصمت جلا چکے اظلم　　اور ان کی قید میں بھی پھنس چکے سب اہل حرم
تمام دفن ہوئے لاشہائے اہل ستم　　پڑا زمیں پہ رہا لاشۂ امام اُمم
نہ کوچ فوج نے اُسدم لبوئے شام کیا
قریب مقتلِ شبیر کے مقام کیا

بٹھایا شب کو اسیروں کو اک درخت تلے　　زمیں پہ بیبیاں بیٹھی تھیں منہ پہ خاک ملے
سکینہ روتی تھی لگ لگ کے اپنی ماں کے گلے　　پرائی قید میں جو ہوں بس اُنکا خاک چلے
اندھیری شب میں نہ کوئی چوکی دینے والا تھا
ستم زدوں کا نگہبان حق تعالے تھا

وہ سونا دشت وہ میدان کی شب کی تاریکی　　جو دیکھی زینب بیکس نے بے قراری کی
تباہ ہوگئی حالت علی کی پیاری کی　　یہ بات اُس نے ہراک سے بہ آہ وزاری کی
نہ کوئی بھتیجا نہ بٹیا نہ کوئی بھائی ہے
عجب طرح کی یہ رات ہمپہ آج آئی ہے

غرض کہ رات مصیبت کی ہوگئی جو تمام　　تو کوچ پر ہوئے آمادہ وہ سب سا کن شام
برہنہ اونٹوں پہ اہل حرم بٹھائے تمام　　لبوئے شام روانہ ہوئے وہ بدانجام
اب آگے کیا کہے دلگیر کیسی آفت تھی،
پہونچکے شام میں زینب پہ جو مصیبت تھی

اسی زمانہ کے قریب میر ضمیر نے وہ مشہور مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:-

جب پیاس آب تیر سے اصغر بجھا چکے — بچپن میں اپنا داغ پدر کو دکھا چکے
آغوش قبر میں اُسے حضرت سلا چکے — بانو کا لال خاک کے اندر چھپا چکے
کہتے تھے اب قریب ہے رحلت حسینؑ کی
اے خاک ہے یہ چاند امانت حسینؑ کی

اس مرثیہ کے چند بند سنئے تو ضمیر اور دلگیر کی زبان اور طرز بیان کا فرق صاف ظاہر ہوتا ہے ؎

ناگاہ سامنے سے نمایاں ہوا غبار — سمت مدینہ سے ہوا پیدا شتر سوار
اک نامہ اُسکے سر پہ بندھا ہے بافتخار — ہر سمت دیکھتا ہوا آتا ہے بار بار
کہتا ہے یا خدا مری محنت قبول ہو
مہمان کربلا کی زیارت حصول ہو

پہنچا جو قتل گاہ میں تو دیکھتا ہے کیا — لاشے پڑے ہوئے ہیں جوانوں کے جابجا
ہے اک طرف کو خیمۂ ویراں کھڑا ہوا — ہیں اک طرف سوار و پیادے ہزارہا
پرچم کھلے ہوئے ہیں نشاں سر پہ اوج ہے
اور اُسطرف علم ہے نہ لشکر نہ فوج ہے

اک سو تو العطش کی صدا ہے باتصال — اور اک طرف کو پانی بہاتے ہیں بدخصال
لاشوں پہ بیکسی ہے برستی پڑی کمال — کتنے ضعیف کتنے جواں کتنے خوردسال
زخم جگر پہ ہاتھ کسی کا دھرا ہوا
دست بریدہ میں کہیں کنگنا بندھا ہوا

آیا اُسی طرف کو یہ قاصد صفوں کو چیر | کھولے علم کھڑا تھا جہاں لشکرِ شریر
حیران کار ہو کے پکارا وہ مرد پیر | ہاں صاحبان خیل و حشم اے گروہِ امیر
اس قافلہ کا قافلہ سالار کون ہے
اے صاحبو بتاؤ کہ سردار کون ہے

لوگوں نے ابن سعد کا اُسکو پتا دیا | دیکھا بہ زیر چتر مرصع ہے وہ کھڑا
پاؤں سے سر تلک اُسے دیکھا تو یہ کہا | افسوس ہے کہ دل کو نہ واشد ہوئی زرا
سید ہے اور امام ہے صاحب جمال ہے
میں اُسکو پوچھتا ہوں جو زہرا کا لال ہے

اس نامہ بر سے کہنے لگی فوج نابکار | جا اسطرف کھڑا ہے بلندی پہ جو سوار
آیا یہاں تو پائے شتر باندھ ایکبار | بس چڑھ گیا بلندی کے اوپر بحال زار
دیکھا غموں سے وار دو اندوہ ہے حسینؑ
گویا کہ آفتاب سر کوہ ہے حسینؑ

عالم ہے غش کا سینہ کے اوپر جھکائے سر | ہے خون کا خضاب لگا ریش پاک پر
عمامۂ رسول خدا ہے لہو میں تر | رخساروں سے ہے نور ولایت کا جلوہ گر
زخمی تمام ناف سے لے تا بہ فرق ہیں
گھوڑے سمیت خون کے دریا میں غرق ہیں

اس نے ٹھہر کے سبط نبی کو کیا سلام | ہاتھوں پہ رکھہ کے نامہ کو لایا سوئے امام
شہ نے کہا کہ کون ہے بھائی تو نیکنام | بیکس کو یوں سلام جو کرتا ہے اس مقام
اس خط سے روح کچھ مری لذت اُٹھاتی ہے

تجھ سے تو بوئے اہل وطن مجھ کو آتی ہے

اسُ نے کہا مدینہ کو اک روز میں گیا　　سوئے محلہ بنی ہاشم گزر ہوا
اک دختر مریض کو واں دیکھتا ہوں کیا　　سر پر قصابہ ہاتھ میں تھامے ہوئے عصا
پردے سے یوں لگی ہوئی کرتی کلام ہے
بھائی خدا کی راہ کا درپیش کام ہے

فریاد اسُ کی کر گئی دل پر مرے اثر　　پوچھا جو اسُ کے حال کو ڈیوڑھی پہ آنکر
بولی کہ ہوں میں قوم کی سیدانی نوحہ گر　　پر ہے کئی مہینہ سے تپ اور درد سر
اور یہ محلہ ہاشمیوں کا مقام ہے
دادی بتول جد مرا خیر الانام ہے

بیٹی حسین کی ہوں یہ سب جانتے ہیں آہ　　بابا مرا سفر کو گیا ہے بہ عز و جاہ
مجھ کو اکیلے گھر میں گیا چھوڑ کر بتاہ　　قاصد بھی کوئی آتا نہیں دیکھتی ہوں راہ
تو کربلا میں لے کے جو اس خط کو جائے گا
محشر میں فاطمہؑ سے صلا اسکا پائیگا

شہ نے کہا کہ بس نہ زباں سے سنا پیام　　خط کر کے چاک پڑھنے لگے شاہ تشنہ کام
لیتے تھے ہر مقام کے اوپر جگر کو تھام　　پہنچے جب اسجگہ پہ تو روئے بہت امام
چندے مفارقت میں جو یونہیں گذر گئی
سُنیو اکیلے گھر میں وہ ٹکرا کے مر گئی

قاصد سے تب کہا شہ دیں نے کہ ہو سوار　　تجھ سے نہ دیکھا جائے گا میرا مآل کار
گر وہ کہے کہ تجھ کو ملے شاد نامدار　　کر دیجیو فقط اسی کلمہ پہ اختصار

برباد کر چکے تھے لعین گھر حسین کا
جب میں چلا تو کاٹ لیا سر حسین کا

قاصد تو سوئے شہر مدینہ ہوا رواں — ساماں قتل سبط پیمبر ہوا یہاں
خاموش اے ضمیر نہیں طاقت بیاں — اہلِ زمیں بھی روتے ہیں اور اہل آسماں
مطلب نہ مدح سے نہ غرض واہ واہ سے
گزرے یہ مرثیہ شہ دیں کی نگاہ سے

فسانۂ عجائب کی تکمیل سے بادشاہ نصیر الدین حیدر[۵۱] کے عہد میں فراغت ہوئی جن کا سال جلوس ۱۲۴۳ھ ہے۔ اُسوقت تک دلگیر، ضمیر، خلیق ہم پلہ مانے جاتے تھے۔ مرثیہ گویوں کی توجہ بین پر تھی۔ مرثیوں کے بند ۱۲ سے لیکر ۳۵ یا ۵۰ تک ہوتے تھے اور بیشتر مرثئے سوز خواں ہی پڑھتے تھے۔

میر ضمیر نے روائتیں نظم کرنا شروع کیں تو مرثیہ پچاس بندوں سے بڑھ کر سَتّر اسّی بند کا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ تعداد سَو سے بھی متجاوز ہوئی ۱۲۴۹ھ میں میر ضمیر نے رزم و سراپا بھی مرثیوں میں داخل کیا اور اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ اُنہوں نے شہزادۂ علی اکبر کی شہادت کے بیان میں ایک مرثیہ ۱۰۱ بند کا کہا جس کا مطلع ہے:-

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے — کس نور سے پر نور یہ نورِ نظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاس بشری ہے — یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے
گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبہ طور ہوا ہے

---

[۵۱] سرور، تا ابد قایم رہے فرمانروائے لکھنؤ — یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

اس میں تمہید سے چہرہ باندھا۔ پھر سراپا لکھا جو مرثیہ میں شعرائے سابق نے شامل نہیں، کیا تھا۔

قرآن کی تشبیہ یہ اس دل نے بتائی پیشانی انور ہے کہ ہے لوح طلائی
ابرو سے وہ بسم اللہ قرآں نظر آئی جدول کشش زلف کی تاروں نے دکھائی

دو زلف وہ مبنی الف لام رقم ہے
پر میم دہن مل کے یہ اک شکل الم ہے

دیکھو کہ صفا ہے رخ اکبر سے نمایاں یاں سعی میں ہر دم ہے دل زینب نالاں
کعبہ جو سیہ پوش ہوا اے صاحب عرفاں یاں بھی رخ انور پہ ہیں گیسوئے پریشاں

اس زلف میں پابند دل شاہ امم ہے
زنجیر میں کعبہ کی یہ قندیل حرم ہے

مانند دعائے سحر قد رسا ہے ماتھا ہے کہ دیباچۂ انوار خدا ہے
دو زلف نے اک چاند سا منھ گھیر لیا ہے وصل شب قدر و شب معراج ہوا ہے

دو زلفیں ہیں رخسار دل افروز بھی دو ہیں
یاں شام بھی دو ہیں بخدا روز بھی دو ہیں

پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا۔

تھا آب دم تیغ سے طوفان کا اسباب تھی موج فنا سر سے گزرتا تھا پڑا آب
دریا تھا وہ لشکر تو ہر اک حلقہ تھا گرداب اعضائے بریدہ صفت ماہی بے آب

آب دم خنجر پہ علمداروں کے دم تھے
جب تیغ علم کی تو علم صاف قلم تھے

اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ مقطع میں فرماتے ہیں :۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے ۱۲۴۹ھ (بارہ سو انچاس) تھی ہجر نبوی کے

آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

افسوس ہے کہ رزم کا بیان مرثیوں میں اُسوقت شامل کیا گیا جب اہل ہند کو فوج کشی صف آرائی اور قلعہ شکنی سے تعلق باقی نہ رہا تھا۔ شب و روز عیش پرستی سے سروکار تھا اور بجز افسانہائے بزم کے کسی اور چرچے میں دل نہ لگتا تھا۔

مجالس عزا کی برکت تھی یا میر ضمیر کے صدق و خلوص کا ثمرہ کہ وہ میدان جنگ کی ہولناک تصویر دکھانے۔ قتل و خوں ریزی کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوئے اور خلایق نے اُن کی لطافت بیان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ اونھوں نے پہلی بار نظم اُردو کو تصویر رزم سے آشنا کیا گویا کہ سنگ مرمر کی ایک خوبصورت بارہ دری بنائی جسپر جواہرات کی پچی کاری کرنا اور طلائی نقش و نگار بنانا آیندہ نسل کے لئے محفوظ تھا۔

اہل فارس قصیدہ کو

(۱) تشبیب

(۲) گریز

(۳) مدح

(۴) دعا

اور (۵) عرض حال پر مشتمل رکھتے تھے۔

اِنہوں نے مرثیوں میں

(۱) چہرہ

(۲) رخصت

(۳) سراپا

(۴) آمد

(۵) رجز

(۶) لڑائی

(۷) بیان شہادت

اور (۸) دعا کو لازمی قرار دیکر ۱۲۴۹ سنہ ہجری سے مرثیہ گوئی کے تیسرے دور کا آغاز کیا۔

اِنہوں نے مرثیہ میں جو جدتیں کیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) رزمیہ لکھا

(۲) سراپا شامل کیا

(۳) گھوڑے۔ تلوار اور اسلحۂ جنگ کے اوصاف لکھے۔

(۴) صفائی بندش پر توجہ کی

(۵) غلط الفاظ جو مرثیوں میں بے تکلف استعمال ہوتے تھے ترک کر دیے۔

(۶) تحت لفظ پڑھنے کا رواج دیا اور منبر پر ہاتھ اور اشارات چشم و ابرو سے بتانا شروع کیا۔

(۷) پہلے سب سے بہتر مرثیہ گو وہ سمجھا جاتا تھا جس کو مصیبت کے موقعوں

کے روزمرے کثرت سے معلوم ہوں اور اُن کو مناسب طریقہ سے استعمال کر سکے۔ میر خلیق۔ میاں جگر۔ مرزا فصیح۔ ضمیر کے ہم رتبہ تھے بلکہ محاورہ بندی میں خلیق کا درجہ بلند تھا مگر اس طرز جدید نے سب کا بازار سرد کر دیا۔

میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی۔ وہ خود مرثیہ نہیں پڑھتے تھے۔ اُن کا کلام سوز خواں پڑھا کرتے تھے۔ سوز کے لئے بین ہی مناسب تھا۔ وہ اپنی وضع پر قائم رہی اور ضمیر کی تقلید نہیں کی۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ ترکیب دیکر اہل مجلس کو رولانا تھا۔ وہ مرثیت کے کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ضمیر کی تقلید کو اپنے کمالات میں موجب افزایش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور صرف درد و تاثیر کی نعمت سے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

فصیح نے ”زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز“ پر عمل کیا اور بیان رزم مرثیوں میں شامل کرنے لگے مگر وہ چند ہی روز کے بعد حج وزیارات کو تشریف لیگئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ مشق سخن وہاں بھی جاری تھی۔ انکا ایک نہایت پر زور سلام مکہ سے آیا اور لکھنؤ میں ایسا مقبول ہوا کہ آجتک اہل دل کو اس کے اشعار حفظ ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند شعر اس سلام کے درج کئے جاتے ہیں ؎

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سر اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہے

گھرے ہیں بادل سے شام کے دل کھچی ہے حیدر کی سیف براں
گھٹا میں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے

سکینہ پیاسی تڑپ رہی ہے پڑی ہے بیہوش بنت مسلم
اِدہر کو اصغر سسک رہا ہے اُدہر کو باقر بلک رہا ہے

کہا یہ عابد نے ماں سے رو کر بچے نہ اصغر رہا میں زندہ
لگا گلے پر جو تیر اُن کے جگر میں میرے کھٹک رہا ہے

خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے
فصیح مشتاق اسقدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے

مصحفی کی مثنوی بحر المحبت

(از مولوی سید محمد احمد صاحب رضوی بی اے ڈپٹی کلکٹر)

بہ سلسلۂ سابق

دایہ لڑکی کو لیکر براہ دریا واپس ہوتی ہے لڑکی بیچ دریا کے پہونچکر دایہ سے پوچھتی ہے کہ وہ دیوانہ کہاں ڈوب مرا دایہ کے مقام تبلانے پر یہ بدنام محبت بھی دریا میں کود کر جان دیتی ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں :-

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا[1] تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم[2] آغوش — تھا تلاطم سے کسطرف ہم[3] دوش

تجھ کو آیا نظر[4] کہاں آکر — پھر جو ڈوبا[5] تو کس جگہ جاکر

مجھ کو دکھیو نشان اُس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ہو نہیں ناآشنائے سیر آب — ناشناسائے موجہ و گرداب

تجہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں — گھر میں ہم نام سُنتے رہتے ہیں

ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور — اتفاقی ہیں اسطرح کے امور

مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق — ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں[1] ہوا تھا وہ ماجرای شگرف

یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند — پھر نہ تھا کچھ سراب کی مانند

سُنتے ہی یہ "کہا کہ اللہ" کرکے — گر پڑی قصد ترکِ جاں کرکے

مصحفی فرماتے ہیں :-

اُس سے پوچھا کہ دایہ سچ بتلا — کس مکاں پردہ خستہ ڈوبا تھا
کفش پھینکی تھی تو نے کس جا گہ — مجھ کو لے چل ذرا تو اُس جا گہ
میں بھی دیکھوں تو واں کی سوزش آب — اور وہ مردم رہا پئے گرداب
کفش پر میرے جی دیا اُس نے — یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے
یہ ترنگ اُسکے جی میں کیا آئی — کہیں مرتے ہیں ایسے سودائی
کفش میں ایسی کیا کرامت تھی — کفش والی تو میں سلامت تھی
اُسکی نادانی جی کھپاتی ہے — اب کوئی دم میں جان جاتی ہے
پھر بدل کر زبان بناز و ادا — بولی وہ نازنیں ہوا سو ہوا
دایہ موجوں کا پیچ و تاب تو دیکھ — اور یہ زنجیرہ حباب تو دیکھ
کیا ہی جاتا ہے تیز آب رواں — ہمنے دیکھا نہ تھا کہیں یہ سماں
آہ جاتے تو پردہ پوش تھے ہم — شرم بیگانہ سے خموش تھے ہم
اب جو پردہ ذرا اُٹھایا ہے — دل نے ذوق نظارہ پایا ہے
دلکشا سطح آب کی ہے فضا — سرد لگتی ہے کیا ہی جی کو ہوا
کاش کشتی کھڑی کریں کوئی دم — تا نکالوں میں اپنے جی کا غم
دایہ غافل تھی از ادائے کلام — ہنس کے کہنے لگی کہ سیم اندام
دیکھ لے اس جگہ وہ ڈوبا تھا — میں یہیں کفش تیری پھینکا تھا
کفش کیا تھہ ہی ہو وہ غرق — کفش میں اسمیں کچھ رہا تھا نہ فرق
یہی اُسکا مقام منزل ہے — موج اوسکی نشان ساحل ہے

سُنتے ہی یہ سخن وہ پا بہ رکاب گر پڑی اُسجگہ پہ جوں سیماب

ساتھ اپنے نہ دایہ نے جاں لی رہ شہرو دیار جاناں لی

میر نے کس خوش اسلوبی سے تمام مدارج ۔پانی میں گرنے ۔غوطہ کھانے ۔پھر اُچھلنے اور اس کے بعد ڈوب جانے کے اپنی نظم میں ظاہر کر دیے ہیں جو ایک صحیح المذاق شاعر ہی لکھ سکتا تھا گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام واقعات میر کے آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہیں اور وہ (میجک لینٹرن) طلسمی لالٹین سے کاغذ کے پردہ پر اس کی تصویر دکھا رہے ہیں "مجکو دیکھ نشان اس جا کا" کہہ کر ایک دوسری بات ایسی چھیڑ دی ہے جس سے دایہ کا خیال قدرتاً اصل معاملہ فہمی سے کوسوں دور ہو گیا ۔ایک گھر میں بیٹھنے والی ناتجربہ کار بھولی بھالی لڑکی کہہ رہی ہے کہ گھر میں بیٹھے بیٹھے یہ سُنا ہی کرتی تھی کہ دریا میں مینڈ ہے اور چادریں پڑتے ہیں، بھنور ایسی ہوتی ہے کہ جو اس میں پڑ جائے اُس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے، پانی میں لہروں سے تھپیڑے ایسے لگتے ہیں کہ تیراکوں کے منہ پھر جاتے ہیں مگر اُن کو آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا اب اتفاقیہ یہ موقع ہاتھ آیا ہے کہ جن کے نام سُنا کرتے تھے اُن کو پہچان بھی لیں ۔مکارسی مکار شطاح کو بھی غوطہ دینے کے لئے یہ فقرے کافی تھے ۔دایہ نے دم میں آکر وہ مقامات بتلا دیے اُس کے اس کہنے پر دیاں وہ بیٹھا حباب کے مانند" لڑکی کا "کہاں کہاں" کرکے گر پڑنا قیامت کی شاعری ہے جس میں کوٹ کوٹ کر اثر بھرا ہے ۔اصل بلاغت یہ ہے اس موقع کو "ہاں میاں لینا" سے موازنہ فرمائیے خود ہی کھل جائے گا کہ کون گرا ہوا ہے اور کون ہیچکارہ۔

(۱) مصحفی نے بھی دایہ کو دھوکے میں لانے کی تصویر کھینچی ہے مگر بیڈھنگی ۔پہلے تو لڑکی فریاد کرتی ہے کہ یہ کیا غضب کر ڈالا کہ اپنی جان دیدی۔

"کفش پر میری جی دیا اُس نے یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے"

"کفش میں ایسی کیا کرامت تھی کفش والی تو میں سلامت تھی"

"اُسکی نادانی جی کھپاتی ہے اب کوئی دم میں جان جاتی ہے"

اسکے بعد "بولی وہ نازنیں ہوا سو ہوا ٭ دایہ موجوں کا پیچ و تاب تو دیکھ"

دایہ سے تفریح کی باتیں ہونے لگیں ٹھنڈی ہوا اور پانی کے سیر سے دل کو فرحت حاصل ہونے لگی یکایک پھر رنگ پلٹ جاتا ہے اور بے موقع سفر درمیان میں مصحفی کی تلون مزاجی کو ظاہر کرنے کے لیے زبان سے نکل جاتا ہے فرماتے ہیں :-

"کاش کشتی کھڑی کریں کوئی دم تا نکالوں میں اپنے جی کا غم"

یہ مصرع تو اصلی قلبی کیفیت کا پتہ دے رہا ہے اگر اس پر بھی دایہ نے دھوکا کھایا تو اُس سے زیادہ احمق کون ہو سکتا تھا۔

میر نے لڑکی کی تصویر ایسی معصومانہ کھینچی ہے کہ بے اختیار میر کی تعریف کرنی پڑتی ہے نائی شرم و حیا سے کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکلی جس سے یہ ظاہر ہو کہ عشق کا اثر اُسکے دل پر بھی ہے برخلاف اس کے مصحفی کی ہیروائن ( ) خواہ مخواہ عشق کو اوڑھے لیتی ہے اور جا و بیجا اُس کا اظہار کرتی ہے۔

ایک معصومہ عورت کی زبان سے ایسے کلمات۔ کلمات کفر سے کم نہیں معلوم ہوتے۔

(۲) "کفش میں اس میں کچھ رہا تھا نہ فرق"

مصحفی ظاہر تو یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کفش اور یہ جوان ساتھ ہی ساتھ گرے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون پہلے گرا اور کون بعد مگر الفاظ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ مثل کفش کے ہو گیا تھا اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ کفش کون ہے اور عاشق کون۔

(۳) "یہی اُس کا مقام و منزل ہے   موج اوسکی نشان ساحل ہے"

مقام اور منزل کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں چاہئے "مقام منزل" کے معنی ہوں گے وہ مقام جہاں وہ پانی میں اترا یعنی کودا تھا۔ دوسرا مصرع کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے۔

ساحل ہی پر انسان اُترتا ہے اور ساحل سے ٹکرا کر موج واپس آتی ہے جس سے ساحل کا پتہ چلتا ہے چونکہ یہ جوان بیچ دریا میں کود پڑا اور اُس کے گرنے سے موج اوٹھی اور وُہی اُس کی جائے منزل تھی اس لئے یہ موج جو اُٹھی وہ نشان ساحل دینے لگی "جائے افتادن" کو ساحل نہیں کہہ سکتے۔

ساحل کے معنی دریا کے کنارہ کے ہیں نہ کہ "جائے نزول" کے مصحفی جس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اُن کے لفظوں سے پیدا نہیں ہوتی۔

(۴) "سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے   گر پڑی قصد ترک جاں کرکے"

میر کے اس شعر میں جو عُجلت کا لطیف پہلو ہے اُس کے جواب میں مصحفی نے بھی عجلت دکھانی چاہی ہے کہتے ہیں:۔

"سنتے ہی یہ سخن وہ پابرکاب   گر پڑی اُسجگہ یہ جوں سیماب"

"ساتھ اپنے نہ دایہ نے جا لی   رہ شہر و دیار جاناں لی"

اگرچہ "پابرکاب" کے معنی مستعد بکار ضرور ہیں اور سیماب کی کیفیت بھی اضطراری ہر مگر ان دونوں ترکیبوں سے کوئی خاص اثر دل پر پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کشتی میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے واسطے پابرکاب کا محاورہ کوئی لطف خیز نہیں بلکہ برعکس اس کے اس سے طبیعت کو انقباض ہوتا ہے۔ سُرعت ظاہر کرنے کے واسطے تیسرا مصرع غضب کا فرمایا گیا ہے یعنی نہ صرف دایہ کو جو کہ نہایت ضروری رفیق تھی ساتھ نہیں لیا بلکہ اپنی جان کو بھی ساتھ

نہیں لیا اور شہر جاناں کی راہ لی۔ جن کو خدا نے ذوق سلیم دیا ہے وہ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ مصحفی کی کوشش نہ صرف ناکامیاب بلکہ مضحک ہو کر رہ گئی ہے۔

(۵) دایہ نے جب گھر جا کر لڑکی کے ڈوب مرنے کی خبر کی تو اعزا دریا کنارے روتے پیٹتے آئے دریا میں جال ڈالے گئے اس کے بعد کی کیفیت میرؔ و مصحفیؔ ذیل کے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

میرؔ۔

دام داروں سے سب نے کام لیا	آخر اونکو اسیر دام کیا
نکلے باہر دلے ہوئے نکلے	دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ایک کا ہاتھ ایک کی بالین	ایک کے لب کو ایک سے تسکین
جو نظر ان کو آن کرتے تھے	ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا کہوں مل رہے تھے وصل دار	ہمدگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہوے انکا فصل	جان دیکر ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم	شکل تصویر آپ میں تھے گم
میرؔ اب شاعری کو کر موقوف	عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے	اسے جو تو کہے سو آتا ہے

مصحفیؔ۔

دام دار آئے دام بر سر دوش	حلقہ اُن دامونکے تمام آغوش
از پئے صید ماہی سیمیں	پہونچے جا کر کے تا بقعر زمیں
دام پہونچا جو زیر آب تلک	کہا کہوں اُس سے اُس گھڑی کی جھلک
وہ ہم آغوش دام میں نکلے	پکے اپنے وہ کام میں نکلے

لب سے لب آشنائے بوسہ بہ ذوق	ہاتھ دونوں کے وہ گلوں کے طوق
ساق با ساق پا سے پیچیدہ	یکدیگر عضو عضو گردیدہ
سینہ سینے کے ساتھ شیر و شکر	جسمیں خالی ذرا نہ جائے نظر
نظر آئے وہ دونوں ماہ منیر	جیسے اک آئینہ میں دو تصویر
دیکھ اس واقعہ کو پیر و جواں	دیر تک واں کھڑے رہے حیراں
تھی جدائی بہم زبس دشوار	سب نے ناچار ہو کے آخر کار
خاک میں یا ملا دیا اُن کو	آگ میں یا جلا دیا اونکو
مصحفی بس زباں درازی بس	آفریں ہے مقام ضبط نفس

میر نے جو دونوں کے وصل کی تصویر کھینچی ہے وہ نہایت مؤثر و مہذب ہے مگر مصحفی کو تفصیل کی بھول بھلیاں ایسا کھو دیتی ہیں کہ اُنہیں خیال نہیں رہتا کہ کیا لکھنا چاہئے اور کیا لکھ رہے ہیں۔

(۱) شعر نمبر ۳ میں اگر بجائے "اُس سے" کے "تم سے" کر دیا جاوے تو شعر کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں ورنہ شعر مہمل ہے لفظ "جھلک" سے اور آئندہ کی تفصیل سے جو مصحفی نے کی ہے کچھ مناسبت نہیں یہ شعر بالکل بھرتی کا ہے شاید ماہی سیمیں کے خیال سے جھلک کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔

(۲) "لب سے لب آشنائے بوسہ بذوق"

"آشنائے بوسہ بذوق" نہ معلوم کہاں کی اردو ہے۔ ایسی مہمل ترکیبیں میر کے لئے باعثِ ننگ تھیں۔ زمانہ میں اگر بدمذاقی کی وجہ سے اندھیر ہو تو ہو میر کی بلا سے۔ وہ آفتاب شاعری اپنی جگہ پر ہمیشہ درخشاں رہیگا۔ آنکھوں والے اُس کی عظمت و فروغ کے آگے ہمیشہ

ہندووار سر جھکاتے رہیں گے۔

(۳) "ساق پا ساق پا سے پیچیدہ یکدگر عضو عضو گرویدہ"

اگر اس شعر کو مصحفی نہ لکھتے تو کیا حرج ہوجاتا؟ - یہ تفصیل اُن کی شاعری کی منزلت کو بڑھانے کی بجائے گھٹا رہی ہے۔ ساقِ پا کا وصل میں پیچیدہ ہونا لازمی سہی مگر مصحفی شاید یہ بھول گئے کہ وہ ایسے عاشقانِ صادق کا وصل لکھ رہے ہیں جن کا وصال ہوچکا ہے"

(۴) "سینہ سینے کے ساتھ شیر و شکر جس میں خالی ذرا نہ جائے نظر"

اسے سبحان اللہ کیا زبان اور کیا خیالات ہیں جس سے میر کو شکست دیجاتی ہے! اس شعر کا دوسرا مصرع تو ماشاء اللہ دہقانیت کی بولتی تصویر ہے۔ لفظ "خالی" تجلیات معنوی سے پُر ہے۔

(۵) "تھی جدائی بہم زبس دشوار سب نے ناچار ہو کے آخر کار"

"خاک میں یا ملا دیا اُن کو آگ میں یا جلا دیا اُن کو"

دوسرا شعر تو واقعی مصحفی کی لغویت کو طشت از بام کردیتا ہے معلوم نہیں اس میں کیا خوبی ہے جو مثنوی میں داخل کیا گیا۔ اس تفصیل بے معنی کی ضرورت ہی کیا تھی۔

(۶) "مصحفی بس زباں درازی بس آفریں ہے مقام ضبط نفس"

اس مقطع سے میں بالکل متفق ہوں۔ کاش وہ میر کے سامنے زبان ہی نہ کھولتے جو یہ شعر کہنے کی ضرورت ہوتی "ایاز قدر خود بشناس"!

خاتمہ

مولوی صاحب نے آخر میں جن الفاظ میں مصحفی کی قصیدہ خوانی فرمائی ہے اوس کو ہم بجنسہ

نقل کئے دیتے ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"تصریحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ میر و مصحفی دونوں نے ایک ہی بحر میں شناوری
"کی ہے۔ میر کی افضلیت و اولیت تمام اردو شاعروں کے مقابلہ میں مسلم ہے لیکن اس"
"مخصوص میدان میں جیسا کہ اوپر کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہے مصحفی کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے"
"اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ اُن کے سامنے ایک نمونہ پیشتر سے موجود تھا اور نقش ثانی ہمیشہ"
"نقش اول کے مقابلے میں آسان تر اور بہتر ہوتا ہے، خواہ کچھ اور ہو۔ واقعہ ہر صورت"
"یہ ہے کہ مصحفی کی مصوری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ"
مطابق ثابت ہوئی۔"

مولوی صاحب نے جن حصہ جات مثنوی کو بہتر شمار کیا ہے اُن کو میں نے ایک ایک کر کے ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جب عمدہ قطعات کی یہ حالت ہو کہ جتنے عیوب مثنوی میں ممکن ہو سکتے ہیں وہ سب موجود ہوں تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ متوسط اور خراب حصہ جات کی کیا حالت ہوگی۔ مصحفی کا خاص رنگ ایک خاص زمانہ کے لئے صرف غزلوں کے واسطے مناسب ہو تو ہو اور گو اس زمانہ میں اُن کو مقبولیت حاصل ہوئی ہو مگر مثنوی لکھنے کے وہ اہل نہ تھے۔ نقش ثانی نقش اول سے ضرور عمدہ ہو سکتا ہے مگر اسی مصور کے ہاتھ سے جس نے پہلا نقش کھینچا ہو نہ کہ ہر دست مرتعش سے۔ مثنوی سحر البیان حسن کا آج تک جواب نہ ہو سکا گو اس کو لکھے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو چکا۔ نقش اول کے ہوتے ہوئے نقش ثانی آج تک ممکن نہ ہوا۔

پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ دریائے عشق کی نقل کی وجہ سے بحر المحبت کو چار چاند لگ گئے۔ جیسا اوپر عرض کیا گیا ہے یہ ایک رنگین مرقع کا پنسلی خاکہ ہے جس میں لکیروں

کے کاوا کے پیچ و خم ظاہر کر رہے ہیں کہ مصور کا ہاتھ قابو میں نہیں۔ جا بجا جہاں جدت کی ہے اُس سے بدمذاقی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جذبات بشری جو صحیح ہیں وہ میر کی نقالی ہے اُس سے جہاں الگ ہوئے ہیں بے طرح غوطے کھائے ہیں۔ بحرالمحبت کا دریائے عشق کے مقابلہ میں پیش کرنا میر کی توہین کرنا اور شاعری کا نام ڈبونا ہے۔

سادگی

اگر غور سے ملاحظہ فرمائیگا تو سادگی کو جو مثنوی کی جان ہے بحرالمحبت میں نام کو بھی نہ پائیے گا۔ غیر مانوس الفاظ۔ خود ساختہ اجنبی ترکیبیں جن کو نہ اُس وقت اُردو زبان سے لگاؤ تھا اور نہ بعد کو ہوا جا بجا مثنوی میں بہ کثرت پائیے گا۔ مثنوی کی زبان اسقدر سادہ ہونا چاہیے جس پر سہل ممتنع کا اطلاق ہو سکے نہ کہ ثقیل الفاظ و غیر مانوس محاورات فارسی سے اس کو اسقدر گرانبار کر دیا جائے کہ پڑھنا بار ہو جائے مفہوم اشعار ایسا سہل ہونا چاہیے کہ سُنتے ہی معنی ذہن میں آجاویں نہ کہ کسی مولوی صاحب سے معنی پوچھنے کے لئے مکتب جانا پڑے۔ اُن اشعار کے علاوہ جن کی بابت میں سابق میں عرض کر چکا ہوں چند مزید اشعار مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

(۱) "کہیں پیچاک آہ کر تحریر دے بنا زلف کی کہیں زنجیر"

پیچاک بمعنی پیچ و خم اُردو زبان کے واسطے بعید ثقیل لفظ ہے چہ جائیکہ مثنوی کے واسطے۔

(۲) دریا کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

"صفت ماہی دہ بر سر طغیاں ہر جگہ اسمیں چار موج عیاں"

یعنی پانی کی دہار پر مچھلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے تھے اور ہر جگہ دریا میں بھنور

پڑ رہی تھیں۔ لفظ چار موج بمعنی بھنور اردو زبان میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ مصحفی کی انوکھی پسند طبیعت واقع ہوئی تھی اس لئے ہر انوکھی بات انکو مرغوب تھی جس کو وہ اپنی شاعری میں لکھ جاتے تھے بلا خیال اس کے کہ اور لوگ بھی اوسکو پسند کریں گے یا نہیں اور زبان کے لحاظ سے اُس کا استعمال کہاں تک جائز ہے۔

(۳) عاشق کی بے صبری ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:-

"صبر بھاگا بدیدہ گریاں ناشکیبی سے بندہ گیا پیماں"

یعنی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے بلکہ ان کی راہ سے صبر بھاگا چلا جاتا ہے اور عاشق کی بے صبری سے دوستی ہوگئی یعنی ہر وقت بے صبر رہنے لگا۔ سبحان اللہ جذبات بشری کیا خوب پیرایہ میں ادا ہوئے ہیں۔

(۴) "آہ حسرت کا گھر بنا دل زار گرم پہلو کیا بہ بستر خار"

یعنی عاشق کا دل حسرت کا دل بن گیا تھا اسی سے آہ پیہم نکلتی تھی۔ گھر میں بستر بھی ہوتا ہے اس لئے بستر کی رعایت سے گرم پہلو لکھا یعنی عاشق کانٹوں کے بستر پر لیٹا یا یوں کہئے کہ کانٹوں پر لوٹنے لگا۔ ماشاء اللہ کیا خوب طرز ادا ہے۔

(۵) "تھا ز خود رفتہ اُسکے یاد کے بیچ ہو گیا تھا گم اتحاد کے بیچ"

خود رفتہ کی رعایت سے گم استعمال فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی یاد میں اسقدر محو ہوا کہ گویا محبت میں گم ہو گیا یعنی اُس کی یاد اور محبت میں تن بدن کا ہوش نہ رہا اگر ہوش تھا تو اُس کی یاد کا اور خبر تھی تو اُس کے محبت کی۔ اگر صحیح شاعری کی شان یہی ہے تو شاعری سے ہزار بار توبہ۔

ربط کلام | ربط کلام مصحفی کے یہاں نسبتاً بہت کم ہے جیسا کہ تنقید میں جا بجا دکھایا جا

چکا ہے جو کچھ ہے بھی اوس کو غیر مانوس الفاظ اور لفظی رعایتیں راہ کے روڑے بن کر غارت کرتی ہیں برخلاف اس کے میر کے یہاں تسلسل کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کا دریا بہ رہا ہے تمام سطح ہموار ہے مگر جتنا گہرا جائیے خزائن جواہرات نظر آئیں گے۔

مبالغہ وضایع

میر کی مثنوی کو اوّل سے آخر تک دیکھہ جائیے نہ کہیں غیر معمولی مبالغہ نظر آئے گا نہ ایسی رعایات لفظی جس سے شیشۂ خیال کو ذرا بھی ٹھیس لگے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ شاعر نے بالقصد کسی لفظ کو اس خیال سے استعمال کیا ہے۔ شاعر اپنے جوش میں لکھتا چلا جاتا ہے جو کچھ آمد کی رو میں آجاتا ہے وہ نگینہ سا جڑ کر رہجاتا ہے جس سے نظم مرصع بنکر اور چمکنے لگتی ہے مصحفی کی مثنوی اوّل سے آخر تک پڑھ جائیے آورد ہی آورد نظر آئے گی نہ کہیں اصلی جوش ہے نہ اثر۔ رعایت لفظی نے نفس مضمون پر وہ کام کیا ہے جو تیزاب ایک تصویر پر کرتا ہے مصحفی کو لفظوں سے مطلب ہے اور میر کو معنی سے۔

الفاظ اور محاوروں کو جو دیکھئے تو جابجا ایسے فارسی کے ٹھوس غیر مانوس الفاظ اور غیر مروجہ فارسی محاورے پائیے گا جن کے بار کی زبان اردو متحمل نہیں۔ قصیدہ خواص کے واسطے ہے تو مثنوی عوام کے واسطے مصحفی کے فارسی الفاظ و محاورے عوام کے سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اس مثنوی کے سمجھنے کے لئے عوام کے واسطے لازم ہے کہ مثنوی کے ساتھہ ساتھہ چند لغات الفاظ و محاورات بھی خریدیں۔ اسپر بھی اُن کی تشفی نہ ہوگی کیونکہ اُلجھی ہوئی خود تراشیدہ ترکیبیں مطلب کو سمجھ میں نہ آنے دیں گی۔

مبالغہ اس بدسلیقگی سے کام میں لایا گیا ہے جس سے طلسم شاعری شکست ہو کر رہجاتا

ہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ مصحفی نے اپنے شیشہ کے مکان پر بے محابا سنگ باری کی ہے۔
مصحفی کی بیجا لفظی رعایات نوالہ کے کنکر ہیں اور دور از کار مبالغے زہر کے گھونٹ۔
تشبیہ و استعارات میں بھی نہ نزاکت ہے اور نہ صحیح معنوں میں مناسبت جس سے سلسلۂ خیال
شکست ہو جاتا ہے اور اثر معدوم۔ گویا مصحفی کی مثنوی ہی کے واسطے حضرت شاد مدظلہ
ارشاد فرماتے ہیں:۔

– –

– – – – – – – – – – – – لفظوں کی کند دھار سے معنی کا خوں نہ کر

مقصد اگر ایچ پیچ کے اندر نہاں ہوا
وہ شعر پھر تو شعر نہیں چیستاں ہوا

تشبیہ و استعارہ و ذکر مناسبات ایہام معنوی و مجاز و مبالغات
ایضاح ظاہرات و خفائے مقدرات ان سب کے ساتھ فہم میں آجائیں سب نکات

لفظیں سلیس و چست فصیحانہ بات ہو
اردو رہے نہ یہ کہ غیاث اللغات ہو

چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں عاشق کی وارفتگی طبیعت کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

لفظی رعایت

(۱) اژدحام زناں جہاں ہوتا
آب ہو کر وہاں رواں ہوتا

آب شدن بمعنی شرمندہ شدن فارسی کا محاورہ ہے مگر اس کا یہاں موقع نہیں اور نہ
اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ روانی کو پانی سے ایک نسبت ہے اسلئے آب بنا کر بھی
رواں کیا گیا ہے کیا لطافت ہے قربان جائیے!

(۲) معشوقہ کے دریا میں ڈوبنے کے بعد کی کیفیت میں فرماتے ہیں۔

"نارِ دُکرِ دم کنارہ گیر ہوئے حلقۂ زلف میں اسیر ہوئے"

ایک ناشاد نامراد لڑکی کی مایوسانہ موت کے بعد سانپ بچھو اس کے بالوں میں لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ خدا ایسے شاعری سے بچائے جہاں موقع محل کا بھی خیال نہ ہے استغفراللہ

(۳) جوان نے لڑکی کو دیکھ کر دل کھو دیا اس کیفیت کو ذیل کے شعر میں دکھاتے ہیں۔

"طائر رنگ کر گیا پرواز ہو گیا عضو صید چنگل باز"

خیر چہرہ سے رنگ تو چڑیا بن کر اڑ گیا مگر طائر کی مناسبت سے مولا اور باز و صید و چنگل زبردستی دوسرے مصرع میں ٹھوسے گئے ہیں مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ کے رنگ کی چڑیا تو اڑ گئی مگر دل کا مولا معشوق کے چنگل میں گرفتار ہو گیا کھینچ تان کر دوسرے مصرع کے معنی پہنا لیجئے ورنہ دوسرا مصرع مہمل نہیں تو مہمل نما ضرور ہے۔

مبالغہ ملاحظہ ہو دریا کی بابت فرماتے ہیں

(۱) "اسمیں تیرے تھا نت بہ بیتابی نسر طائر بسان مرغابی"

نسر طائر آسمان پر ستاروں سے بنی ہوئی کرگس کی ایک شکل ہے جس کی بابت ارشاد ہوتا ہے کہ وہ دریا اسقدر بڑا تھا کہ اس میں نسر طائر مثل مرغابی کے تیرتا تھا۔ مبالغہ نامناسب کے ساتھ ساتھ لفظی رعایت بھی قائم ہے۔ یہ ظاہر کر دینا نامناسب نہو گا کہ نسر تیرنے والا جانور نہیں مگر مصحفی نے زبردستی تیرا دیا۔

(۲) پھر فرماتے ہیں

"غوطہ زن تھی بحر رو مد شلنگ بط چرخ اسمیں صورت خرچنگ"

(کمیکڈ ۱) برجستن از جائے بجائے

مبالغہ کے لحاظ سے تو آسمان کو بط بنا کر دریا میں تیرا دیا گیا مگر اس سے نظم کی خوبی بڑھنے کی بجائے اور گھٹ گئی۔

اس کے الفاظ اور ترکیب کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جہاں بعض شعروں میں مختلف قسم کی خوبیاں اور صنائع ہوتے ہیں وہاں اس شعر میں مختلف قسم کے عیوب موجود ہیں۔

مبالغہ کی بابت اوپر عرض کیا گیا۔ دوسرا عیب اس میں غیر مانوس الفاظ کا استعمال ہے۔

ترکیب شعر کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ خود مولوی صاحب کو اس کے مہمل ہونے کا دھوکا ہوا ہے۔ میرے خیال میں شعر مہمل نہیں ہے مگر مہمل نما ضرور ہے جو معنی میری سمجھ میں آئے ہیں اوسکو عرض کرتا ہوں۔

"پانی کے اوچھلنے کی وجہ سے جو جزر و مد یعنی طلاطم تھا اُس حالت میں بط چرخ مثل کیکڑے کے دریا میں پڑی غوطے کھاتی تھی"

یہ شعر کیا ہوا چیستان ہوا اس قسم کے اشعار مثنوی کے واسطے بدترین عیب ہیں۔

مناسبِ موقع کلام و حالت

شاعر کی کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مقتضائے حال کے موافق گفتگو ہو اگر عورت ہے تو اُس کی گفتگو میں لچک نرمی رحم اور نسائی جذبات کے جھلک نمایاں طور پر ظاہر ہو اگر مرد ہے تو اُس کی گفتگو بالکل مختلف ہوگی مردوں میں بھی شریف کی گفتگو رذیل سے مختلف ہوگی۔ اس میں بھی ہر ایک کی گفتگو غصہ۔ رنج۔ خوشی۔ اور غیرت کی حالت میں جداگانہ ہوگی اگر بہ نظر غور ملاحظہ فرمایئے تو کمال شاعری یہی ہے کہ مناسب موقعہ بات شاعر کی زبان سے نکلے۔

شکسپیر کے کلام کو جو اسقدر پسند کیا جاتا ہے اُس کی خاص وجہ یہی ہے کہ اُس کے قلم سے جو بات نکلتی تھی وہ عین مطابق فطرت ہوتی تھی مصحفی اس کوچہ سے بالکل نابلد ہیں۔

(۱) ایک غیرتمند باپ کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

"صاحب خانہ تھا زبس کہ غیور	دیکھکر اُس گلی میں یہ شر او ر شور"
"مشورت ہر کسی سے کرنے لگا	مارے غیرت کے سخت مرنے لگا"

(۲) آخر مشورہ ہوکر یہ بات طے قرار پاتی ہے کہ اوباشوں سے اس کو تنگ کرایا جاوے مگر بجائے بدمعاشوں کے لڑکے تنگ کرتے ہیں۔ وہ لڑکے شاید جرمنی اسکول کے لڑکے ہوں گے جن کے پاس تلواریں بھی تھیں اور برچھیاں بھی۔

" ـــ ـــ ـــ ـــ	تب اُنہوں نے یہ بات ٹھرائی"
"یعنی اوباش کوچہ و بازار	کچھ نہ کچھ اسکو دیویں آ آزار"
"جب یہ ٹھہری تو کود کان شریر	ساتھ لیکر کے اپنے جمع کثیر"
"یک بیک اس جوان پڑ ہائے	لڑکے کیا آئے اک بلا لائے"
"کوئی تلوار سے ڈرانے لگا	اُس پہ برچھی کوئی لگانے لگا"

(۳) لڑکی دایہ کے ساتھ دریا بھیجی جاتی ہے۔ پہلی نگاہ میں لڑکی بھی بقول مصحفی مجروح ہوجاتی ہے اور باپ کو اس کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ کشتی میں بیٹھ کر جو خیالات لڑکی کے دل میں آئے اُس کو مصحفی نے ذیل کے الفاظ میں ادا کیا ہے جو سراسر خلاف موقعہ ہیں۔

"میری آنکھوں نے کسکو خویش کیا	میری پلکوں نے کس کو ریش کیا"
"کس پہ خواہش سے کی نظر میں نے	چھوڑا کس کے سبب سے گھر میں نے"
"کس سے میں آہ ہمکلام ہوئی	کس سے نظارہ باز بام ہوئی"
"کس سے میں نے کیا پیام سلام	کس کی الفت میں میں ہوئی بدنام"
"کس سے غمزہ سے میں لڑائی آنکھ	کس سے روزن سے میں دکھائی آنکھ"

(۴) دایہ جوان کو تسلی دیتی ہے کہ پریشان نہو اب زمانہ فراق ختم ہوا چاہتا ہے ایک عورت اور عورت بھی جاہل اُن الفاظ میں تسلی دیتی ہے جس کو پڑھے لکھے مرد بھی ایسے موقع پر استعمال نہیں کرتے۔

"یاس کو دے جواب گھر جاوے | درد حرماں سے کہہ کہ مر جاوے"

"آہ و نالہ سے کہہ کہ رخصت ہوں | گرم رفتار راہ فرصت ہوں"

"اب کوئی دم کو ہم و ثاقی ہے | دیر منزل تلک کی باقی ہے"

"جبکہ منزل پدید ہووے گی | شب تری روز عید ہووے گی"

خلاف تجربہ و مشاہدہ

(۱) ایک دریا کو مصحفی نے سمندر کے صفات جو سراسر خلاف واقعہ ہیں عطا فرمائی ہیں جس سے لطف کلام غارت ہو جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

"ہاتھ سے اُسکے کی جو کفش جست | لیا موجوں نے اُسکو دست بدست"

"ہوئی جا کر کے زیر آب وہاں | خاتم دست پنجہ مرجاں"

"قعر دریا میں جبکہ جا پہنچی | سیپ کے سر پہ پشت پا پہونچی"

(۲) لڑکی کے ڈوب مرنے پر دریا کی کیفیت لکھی ہے جو خلاف تجربہ ہے۔

"لہریں خمیازہ کھینچ کھینچ موئیں | مچھلیاں غم سے ہمکنار ہوئیں"

"آب نے دل ہی دل میں کھایا جوش | لب ساحل بھی ہو گیا خاموش"

میر کے دو لخت دل

مولوی صاحب نے مصحفی کے بہترین حصے پیش کئے ہیں۔ میں بھی مثنوی دریائے عشق سے دو ٹکڑے پیش کرتا ہوں ایک کو تو عاشق کا لخت دل کہنا چاہیئے اور دوسرے کو میر کا۔

ان کی شستہ زبان۔ پاکیزہ خیالات اور پر اثر جذبات دل میں گہرا نقش کر دیتے ہیں انکو جتنی مرتبہ پڑھیے اُتنا ہی نقش گہرا ہوتا جائے گا۔ جو کہیں دل میں چوٹ لگی ہو تو یہی اشعار کلیجہ کو برما دیتے ہیں۔

(۱) جوان تیر عشق سے زخمی ہو کر مثل مُرغ بسمل کے کوچہ یار میں تڑپتا ہے ہر چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے مگر کھڑکی ہر وقت چشم بیمار کیطرح بند نظر آتی ہے۔ جس لیلیٰ کا یہ مجنوں بنا تھا وہ نظروں سے اوجھل گھر میں مُنہ چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی اتنا نہیں کہ درد دل ہی سنا دے۔ در و دیوار پر مایوسانہ نظر کرتا ہے۔ سوائے ستانے والے لڑکوں کے بات پوچھنے والا کوئی نہیں۔ یہ اپنی خیال میں مستغرق معشوق سے غائبانہ گفتگو کرتا ہے۔

"چشم تر سے لہو بہا کرتا — صبح کی باد سے کہا کرتا"

"کائے نسیم سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ"

"ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے — جان پر آبنی ہے تیرے لئے"

"جان دوں تیرے واسطے سو تو — آنکھ اُٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو"

"رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی — دور پہونچی ہے میری رسوائی"

"نام کو بھی ترے نہ جانا آہ — تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ"

"ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ — دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ"

"سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد"

"کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق — بیکسی میں نہیں ہے کوئی رفیق"

"نالہ ہوتا ہے گہ گہے دلجو — گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو"

"آہ جو ہمدمی سے کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے"

"چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
جی ہے اس سے اسیرِ آب و گل"

"ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت۔ اک معنیٔ نہاں ہوتی"

"اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
ایک ہیں۔ اور کتنے تصدیعات"

"سنگ باراں سے سخت ہوں دلتنگ
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ"

"محرم یک نگاہ بیش نہیں
کم ہے سینہ میں جا۔ کہ ریش نہیں"

"کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ"

"کچھ چھپا تو رہا نہیں یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز"

"بس تغافل ہوا ترحم کر
گوشِ دل جانبِ تظلم کر"

"کون کہتا ہے رو نہ محو ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جاوے نیاز"

(۲) مانی کو اگر تصویر کشی پیغمبر بنا سکتی تھی تو میر بدرجہ اولی پیغمبری عشق کے مستحق ہیں جنھوں نے تمام عمر عشق کے وہ وہ نکات بیان کیے جو آج تک کسی سے ممکن نہ ہو سکے لفظوں سے وہ وہ رنگین تصویریں کھینچیں جن کا رنگ تا قیام قیامت اڑنے والا نہیں۔ مانی اپنی تصویروں کو رنگوں سے آراستہ کرتا تھا مگر میر کی تصویروں میں خون دل کی جھلک نظر آتی ہے قبل اس کے کہ میر کا خطبہ پیغمبری نقل کروں میر کے دو اشعار اور نقل کرنا چاہتا ہوں جن میں میر نے اپنی قلبی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ شعر نہیں میر کا معجزہ ہیں۔

فرماتے ہیں:۔

"جھٹپٹا وقت ہے۔ بہتا ہوا دریا ٹھہرا"
"صبح سے شام ہوئی۔ دل نہ ہمارا ٹھہرا"

یہ تصویر تو دن کی تھی۔ رات کی تصویر بھی ملاحظہ ہو۔

"اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ اک درد جگر میں ہوتا ہے"
"ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں۔ جب سارا عالم سوتا ہے"

مضمون طویل ہو گیا میر کے خطبہ کو نقل کر کے قصہ مختصر کرتا ہوں۔

"عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال"
"دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا"
"کہیں آنکھوں میں خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا"
"کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا"
"گہہ نمک اسکو داغ کا پایا — گہہ پتنگا چراغ کا پایا"
"واں تپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ"
"کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خونچکاں شکایت ہے"
"تھا کسو دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ"
"تھا کسو کی پلک کی نمناکی — ہے کسو خاطروں کی غمناکی"
"کہیں باعث ہر دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا"
"کہیں اندوہ جانِ آگہ تھا — سوزش سینہ ایک جاگہ تھا"
"کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہ جاں گداز ہوا"
"ہے کہیں دل۔ جگر کی بیتابی — تھا کسو مضطرب کی بیخوابی"
"کسو چہرہ کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا"
"طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بے ستوں میں شرار تیشہ رہا"
"کہیں نے بست کو لگائی آگ — کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ"

"کبھو افغان مرغ گلشن تھا | کبھو قمری کا طوق گردن تھا"
"کسو مسلخ میں جا قتارہ ہوا | کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا"
"ایک عالم میں دردمندی کی | ایک محفل میں جا سپندی کی"
"ایک دل سے اُٹھے ہی ہو کر دود | ایک لب پر سخن ہے خون آلود"
"ایک زمانہ میں دل کی کاہش تھا | اک سمے میں جگر کی کاہش تھا"
"کہیں بیٹھی ہے جی میں ہو کر چاہ | کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ"
"خار خار دل غریباں ہو | انتظار بلانصیباں ہے"
"کہیں شیون ہے اہل ماتم کا | کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا"
"آرزو تھا امیدواروں کی | دردمندی جگر فگاروں کی"
"نمک زخم سینہ ریشاں ہے | نگہ یاس ھر کیشاں ہے"
"حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں | شوق کی اک نگاہ تھا یہ کہیں"

اعتراف و معذرت

مولوی عبدالماجد صاحب نے مثنوی بحر المحبت طبع کرا کے اُردو علم ادب پر بڑا احسان کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا صریحی کفران نعمت ہو گا۔ ساتھ ہی ساتھ میں مولوی صاحب اور اُن کے ہم رائے اصحاب سے اپنی اختلاف رائے کی معذرت کر کے معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ علم ادب کا معاملہ تھا خاموش نہ بیٹھا گیا جو کچھ میری رائے ناقص میں صحیح معلوم ہوا اوسکو بلاکسی خیال کے حوالہ قلم کر دیا مصحفی کی روح سے بھی مجکو شرمندگی ہے مگر وہ ایسے مقام پر ہیں جہاں ہٹ دھرمی ہو بھی نہیں سکتی امید ہے کہ اس راست گفتاری سے وہ ناخوش نہ ہوں گے۔

بہار عید

(از حضرت عزیز لکھنوی)

(۱)

خیز برسم میکشی کاسۂ نور شد پدید

گشت ہلال شام عید

قفل نشاط را کلید

رنگ طرب برخ دوید

باد چمن چمن وزید

پیک سرور در رسید

خیز برسم میکشی کاسۂ نور شد پدید

(۲)

خیز کہ صبح عید شد خندۂ دلکشائے حور

گشت زمیں بساط نور

حجلہ بحجلہ بانگ سور

جوش زند خم سرور

جلوۂ ذات در ظہور

لالۂ کوہ شمع طور

خیز کہ صبح عید شد خندۂ دلکشائے حور

(۳)

بانگ خلیل شد بلند نغمہ دوید در قفا

بلبلگان خوش نوا

صلصلگان نغمہ زا

سیرہ و سار دلربا

دور گلاں ہزار ہا

چہچہہ زن طرب فزا

بانگ خلیل شد بلند نغمہ دوید در قفا

(۴)

سرو قدانِ خوش ادا دستہ بدستہ سیل سیل

گل بگرفتہ ذیل ذیل

دُر بفشاندہ کیل کیل

دوش بدوش خیل خیل

زلف بزلف لیل لیل

زاہد خشک میل میل

سرو قدانِ خوش ادا دستہ بدستہ سیل سیل

(۵)

نرگس مست سرمہ سا نعرہ زناں بزن بزن

لعل لباں یمن یمن

جلوہ رخ چمن چمن

سحرفن از سخن سخن،

جعد رسا ختن ختن

خم بخم و شکن شکن

نرگس مست سرمہ سا نغرہ زناں بزن بزن

(۶)

لالہ رخان سیمتن ہیں بکنار آبجو

آفت جان ستیزہ خو

سیب زنخ بنفشہ مو

تازہ گلے برنگ و بو

شمع طراز شعلہ رو

فتنہ دہر فتنہ جو

لالہ رخان سیمتن ہیں بکنار آبجو

حسینہ نے قریب پہونچ کر شانہ ہلایا۔ دستِ سیم گوں ایک بے ساختہ انداز سے چشم تسنیم نما سے ہٹ گئے۔ اُف پیاری نیلوفر تو بے طرح رو رہی ہے۔ حسینہ نے رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "پیاری نیلوفر اس درجہ گریہ و زاری سے کیا فائدہ؟ آخر دُنیا میں یہ دن سب کے لئے ہے۔ کوئی آج۔ کوئی کل۔ تم اسقدر عقلمند ہو کر ایسی بیصبری کر رہی ہو۔ واقعی صدمہ سخت تر ہے۔ مگر کیا کیا جائے دیکھو تمہاری اس کیفیت سے تمہارے والد صاحب کا دل کیا کہتا ہوگا؟"

نیلوفر (ہچکی لے کر) "روزا! آہ کیا کروں اُف اُمی پیاری سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جاؤں اور صبر آجائے؟ اُف روزا میں چچا جان (والد) کے سامنے کبھی پلکوں کو تر نہیں کرتی۔ البتہ تنہائی میں ضبط نہیں ہوتا۔ آہ ...."

روز نے نیلوفر کو گود میں اُٹھا کر کوچ پر ڈالا۔ خود اُس کا سر گود میں لیکر بیٹھ گئی۔ دیر تک دل بہلاتی اور تسلیاں دیتی رہی۔ لیکن نیلوفر کا اضطراب کم نہ ہو سکا۔

قاعدہ ہے کہ دلاسوں سے درد کی بے قراریاں ہمیشہ بڑھ جایا کرتی ہیں۔ دیر تک رونے کے بعد نیلوفر تھک کر خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد دل شکن ہچکیوں کی متواتر آوازیں نرم ہونے لگیں۔ روزا نے اُس کا مُنہ دُھلایا۔ بال درست کئے۔ اور کہا "تمہارے شوہر کہاں ہیں؟"

نیلوفر: "دورہ پر گئے ہوئے ہیں۔ تنہا مکان میں تو آہ "

روز: "اچھا چلو۔ ذرا دریا کی طرف چلیں"

نیلوفر: "بہن میں تو کہیں نہیں جاؤں گی"

روز نے سخت اصرار سے نیلوفر کو مجبور کر لیا اور سواری دونوں کو لیکر روانہ ہو گئی

نیلوفر اپنے شوہر کے کاشانۂ حیات کی تنہا وجہ صد مسرت وابتہاج اور باعث ہزار فخر وناز تھی - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - (اور) آہ جبکہ وہ تعلیم سے فارغ ہوکر بیلکری کے چند ماہ ہی گذارنے پائی تھی اُس کی پیاری والدہ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ نیلوفر کے معصوم دل پر بجلی گری۔ اور وہ دیوانہ وار لوٹتی رہگئی۔

(۲)

سواری ٹرک کی لطیف منظر شاہ راہ پر سبک خرام ہے۔ دو رویہ خود رو گل مہندی اور گل عباس کی پاکیزہ اور کیف آفریں ٹیاں ہوا کے نرم اور دل افروز جھونکوں سے اٹھکیلیاں کررہی ہیں شبنم کے مسکر قطرے ہنوز رگ گل میں رشک لالہ بنے ہوئے جھلک رہے ہیں نیلوفر گاڑی کی دیوار سے سر لگائے پیشانی کو داہنے ہاتھ کی سیمیں ہتیلی کا سہارا دیے ہوئے خاموش بیٹھی ہے جبین ناز کے گل نواز دامن میں متجلی مگر اداس شکنوں کی تین متوازی لہریں ضوفگن ہیں۔ روز برابر دلدہی کرتی جارہی ہے۔ لیکن کبھی احمریں لبوں سے صدائے آہ نکل جاتی ہے۔ کبھی صدفی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ جنہیں وہ نہایت آہستگی اور افسردگی سے پیازی رومال میں لے لیتی ہے۔

روز "نیلوفر۔ پہلے میں اپنی عزیز سہیلی قمر کے یہاں چلتی ہوں۔ اُنہیں بھی ہمراہ لیکر دریا چلیں گے۔ بہت لایق خاتون ہیں۔ تم مل کر بہت خوش ہوگی"

نیلوفر "بہتر" گاڑی چند لمحوں میں سڑک سے مڑکر ایک کیف افروز باغ میں داخل ہوگئی جس کے حسین مناظر نظر نواز اور جمیل نظارے روح فروز تھے۔ گاڑی مہتابی میں ٹھہر گئی۔

روز "نیلوفر۔ تم بھی اُتر جاؤ"

نیلوفر: "میرا اترنا مناسب نہیں تم جا کر انہیں لے آؤ۔"

روز: "کچھ ہرج نہیں ان کے یہاں کوئی مرد نہیں۔ ذرا اتر جاؤ گاڑی میں تھک جاؤ گی نہ معلوم انہیں کتنی دیر لگے۔"

نیلوفر: "نہیں میں تھکونگی نہیں۔ اجنبی مکان میں میں نہیں اتر سکتی۔"

روز اتر کر چلی گئی۔ چند منٹ بعد دو ملازم عورتیں گاڑی کے قریب آئیں اور بصد ادب آداب گذاری کے بعد ملتمس ہوئیں حضور مالک خانہ فرماتی ہیں کہ بیحد الطاف نوازی ہوگی اگر چند منٹ کے لئے تشریف لیچلیں "میں خود استقبال کو حاضر ہوتی لیکن امیدوار معافی ہوں کیونکہ لباس پہن رہی ہوں۔"

نیلوفر: "میری جانب سے آداب عرض کرو اور کہدو کہ اب تو آپ تشریف لا ہی رہی ہیں۔ معافی خواہ ہوں۔" اتنے میں روز تیزی سے آئی نیلوفر کو کھینچ کر اتار لیا۔ اور یہ زبردستی اندر لے گئی۔ برآمدہ سے گذر کر ایک فردوس نما کمرہ میں داخلہ ہوا روز نے نیلوفر کو حسین کوچ پر بٹھا دیا اور خود "میں ابھی حاضر ہوئی" کہہ کر کمرہ سے نکل گئی۔ دفعتاً... کمرہ کے تمام دروازہ بند تھے۔

(۳)

نیلوفر نے انتہائی حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ آہ سامنے کی دیوار پر جلی الفاظ میں "**عبادت خانہ مسیحی**" کندہ تھا۔

نیلوفر کے پستی ہونٹوں سے ایک چیخ میں "آہ یہ فریب" کے الفاظ مسموع ہوئے اور وہ تھرا کر فرش پر آئی۔

نیلوفر کو ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ پتھر کی ایک میز پر پڑی ہوئی ہے سامنے کرسی پر

سیاہ لانبے جبّہ میں ملبوس پادریٔ اعظم متمکن ہیں۔ چند نوجوان لڑکیاں دست بستہ دو زانو فرش پر بیٹھی ہیں اور چند دیگر راہب پادری کے دائیں بائیں مؤدب سرنگون استادہ ہیں۔ ایک سفید بالوں والی راہبہ نیلوفر کو ہوا دے رہی ہے۔ نیلوفر نے گھبرا کر آنچل میں چہرہ پوشیدہ کر لیا اور متوحش ہو کر بیٹھ گئی۔ جسم بید لرزاں بنا ہوا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے دل ہی دل میں بدرگاہ ذوالجلال دعائیں کر رہی تھی پادری نے مخصوص لہجہ میں کہنا شروع کیا "او نیلوفر روح القدس کی عنایت اور پاک کنواری کی مہربانی سے تمہیں یہ برکت نصیب ہوئی کہ تم یہاں آگئیں۔ خدا کے بیٹے کی درگاہ میں شکرانہ ادا کرنے کے بعد ہم لوگ نہایت خوشی سے تمہیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ تم خدا کے پاک بیٹے کی درگاہ میں سر جھکا کر اُس کے سچے اور پاک مذہب کے (جو دنیا کے تمام مذاہب سے اچھا اور صحیح ہے) دامن پاک کے سایہ میں آجاؤ۔ او نیلوفر پاک مسیح کا سچا ہاتھ اور پاک کنواری کا مقدس آنچل تمہارے سر پر اپنا برکت کا سایہ ڈال رہا ہے۔ خدا کا بیٹا اور پاک کنواری تمہیں اپنے بازوؤں میں لینے کے کس قدر مشتاق ہیں۔ او نیلوفر اُٹھو جلدی اُٹھو۔ اور خدا کے سچے بیٹے کے پاک قدموں کی خاک کو سجدہ کرو" دیکھو دیکھو وہ تمہیں لینے کے لئے خود تشریف لاتا ہے"

سن سن کی آواز بلند ہوئی۔ اور کمرہ کی فضائے معلق میں دو مجسمے چادر دل میں ملفوف لہرانے لگے۔ حاضرین کی پیشانیاں جوش عقیدت سے سجدہ ریز ہوگئیں اور دعائے مغفرت کی گونجوں سے فضائے معطر مترنم ہوگئی۔

پادری "او نیلوفر فوراً اُٹھ کر مسیح پاک کے سچے مذہب کو تھام لو۔ ہاں شاباش

روح القدس کی برکتیں تم پر ہوں"
نیلوفر۔ (لڑکھڑائی آواز سے) "جناب پادری صاحب .... آپ براہ کرم اپنی تقریر ختم کیجئے۔ نیلوفر تا دم مرگ اپنے پیارے اور سچے مذہب کے دامن پاک سے دست کش نہیں ہو سکتی۔ جناب پادری صاحب یہ فضول شعبدہ کاریاں میری چشم مست مئے اسلام کو نشۂ ہوش ریز سے بیدار نہیں کر سکتیں۔ میں آپ کی تقریر کا ایک لفظ بھی سُن کر اپنی سماعت کو گنہگار نہیں بنا سکتی آئندہ ایسے مشرک اور کافر کلمات سے میرے سامع کو مجروح نہ بنائیے۔ نیلوفر انشاء اللہ ان پاکیزہ اور سچے لفظوں کی تطہیر اور تقدیس سے اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد عبدہٗ ورسولہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس لمحہ تک کہ موت کا بھیانک فرشتہ اُسے قید ہستی سے نہ آزاد کر دے روتاب نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت اور عالم ترکیب کی قوی سے قوی تر قوت بھی مجھے میرے سچے دین سے منحرف نہیں کر سکے گی (اگر خدا نے چاہا) جناب پادری صاحب خدائے عزوجل ہاں وہ معبود حقیقی وہ مسجود اصلی ایک اور صرف ایک ہے جس کی پرستش میں نیلوفر کی ہر رگ جان اور ہر خیال سجدہ ریز و سرنگون ہے۔ حضرت مسیحؑ اُس کے برگزیدہ رسول تھے۔ جو آپ صاحبان کی ان غلط کاریوں سے عروج رفعت سے پستیٔ تحقیر میں منتقل نہیں ہو سکتے" مجمع پر سکون مطلق طاری تھا۔ نیلوفر کے آئینہ نواز رخسار جوش عقیدت و غضب سے شفق گوں ہو رہے تھے، اُس کا جسم شاخ لرزاں بنا ہوا تھا۔ اُس نے تحرک ابرو سے قمر چکائیاں کرتے ہوئے پھر کہا "جس فریب ناجائز سے آج مجھے نظر بند کیا گیا ہے۔ اور جو ناروا طریقہ کار روز جیسی دلی سہیلی سے منصۂ ظہور میں آیا ہے۔ اُسیر حق و عداوت کا ہر تحرک صادق ابد

تک لعنت برسائے گا زمین کی ہر گردش اور آسمان کی ہر کیفیت بارش تحقیر کرے گی۔ آپ مجھ سے کسی قسم کی خوشگوار امید نہ رکھیں۔ میں انشاء اللہ اس دام فریب میں گرفتار نہونگی"

مجمع دفعتاً غضب آلود ہو گیا۔ پادری نے خشمناک آواز میں ایک خوفناک حکم صادر کیا "اس گنہگار لڑکی کو زندان تاریک کے آخری حصہ میں قید کر دو۔ اور صبح و شام پچاس پچاس آہنی چھڑیاں اس کی برہنہ کمر پر لگائی جائیں۔ تا وقتیکہ یہہ سچے مذہب کی اطاعت قبول نہ کرے۔ پاک کنواری کی لعنتیں اس پر اُسوقت تک رہیں گی جبتک یہ اس گستاخی کی جو آج اُن کی شان میں کی ہے۔ تلافی نہ کرلے"!

ایک سکون مطلق کے درمیان طوق و سلاسل گل فریب گلو و دست و پا میں پہنا دیے گئے' نیلوفر نے آنچل چہرہ سے کسی طرح علیحٰدہ نہ ہونے دیا۔ اُس نے ایک پرشوکت لہجہ میں کہا "جناب پادری صاحب..... خواہ یہ بار دوش اس تن خاکی سے جدا ہی کردیا جائیگا۔ لیکن نیلوفر کا پائے استقامت نقطۂ تحمل سے اِنچ بھر جنبش نہیں کھا سکتا۔ اے میرے سچے معبود، تو میری دعا کی سماعت کر۔ اور مجھے توفیق فرما کہ میرا پائے استقلال کسی وقت لغزش نہ کھائے۔ رحم اے خدائے پاک رحم"! اور مجنون خرامی سے چلدی۔ دو لڑکیاں اُسے زندان خانۂ تاریک میں لیگئیں۔ اور ایک سنگین چار گز مربع چبوترہ پر دوزانو بٹھا دیا۔ نیلوفر نے مطمئن نگاہوں سے فضائے تاریک کو دیکھا۔ اور سکون آفرین لہجہ میں یہ الفاظ مقدس آہنی زنجیروں میں گونجتے رہگئے۔

"ربّ السّجن احبُّ اِلیَّ مِمّا یدعُونَنی اِلیہ"!!!

(۴)

صبح و شام دو مستِ صہبائے شباب راہبہ لڑکیاں اور شکیل نوجوان اسیر قید ستم

نیلوفر کے خدمتِ ناز میں عیسائی مذہب کے فضائل روح نواز و دل نشین انداز میں بیان کر کے رنگین و مخمور دبستان گمراہی کی نظر فریب مناظر پیش چشم نظارہ کرتے ہیں۔ لیکن کامل ایک گھنٹہ بعد مخمور مئے عشق ملت نیلوفر کے سرِ ناز کی ایک پر شکوہ جنبش ساز گفتگو شکستہ اور نغمات شیریں منتشر کر دیتی ہے اور پھر اس روح سوز اور نظارہ شکن سزا کا اقدام شروع ہو جاتا ہے جسے ظالم پادری کے سنگین لبوں نے ادا کیا تھا۔ سرشار عشق مذہب نیلوفر وقت سزا ایک پرتمکنت ادا سے دو زانو نشست کرتی ہے۔ اس کی صبیح پیشانی کے فردوس زا دامن میں ایک متجلی شکن اس وقت تک نمودار رہتی ہے جب تک جلاد کے آخری لفظ "پچاس" کی سماعت فضائے متحیر کا ہر خیال کر لیتا ہے، اس کی متجلی آنکھوں اور مخمور پتلیوں میں استقامت کی شعاع زریں اس لمحہ تک ضو فشاں رہتی ہے جب تک فولادی چھڑی کی آخری ضرب اپنی نازک دمرمریں پشت پر محسوس ہوتی ہے۔ اس کے فردوسی رخسار دں میں مستی عقیدت کا غازہ اس وقت تک شفق گوں رہتا ہے جب تک زخمہائے گل فریب سے خونِ عشق ملت کا آخری قطرہ ٹپک کر ارض خاکی کو رشک فضائے قدس بناتا ہے اس کے قوس گوں لبوں میں رنگ خون جگر اس لحظہ تک چھلکتا رہتا ہے جب تک جلد آئینہ گوں سے آخری لخت خون آلود اڑ کر جبین فضائے ساکن پر حقیقت جذب حقیقی ثبت کرتا ہے۔ سزا کے اختتام پر نیلوفر جذب الفت میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں کے وہ گوہر غلطاں جو صدف چشم سے نکل کر فوراً ہی بارگاہ شاہد حقیقی سے خلعت حسن قبولیت حاصل کرتے ہیں۔ ساری کے انتہائی کثیف و خون آگین آنچل سے پونچھ ڈالتی ہے کوثرین لب متحرک ہوتے ہیں اور یہ روح نواز آواز یہ قدس فروز ترنم پردۂ خاکی سے اٹھ کر عرش مقدس کی فضائے نورین میں محو پرواز ہو جاتا ہے" اے بیکسوں کے حقیقی مددگار۔ اے بے بسوں

کے سچے معادن، اپنی اس ادنیٰ کنیز اس عاجز پرستارہ کو وہ خلعتِ محمدی عطا فرما جو سختیوں کے انتہائی اور روح سوز ساعتوں میں بھی اس کی پیشانی پر نفرت کی ایک شکن اور حقارت کی ایک لہر بھی پیدا نہ کر سکے ۔ میرے پیارے آقا ۔ یہ آئینِ آزمائی جسے عرفِ عام میں "سزا" کا لقب دیا گیا ہے ۔ میرے لئے جنت محسوسات ہے ۔ کیونکہ پیارے مذہب کے تحفظ اور برگزیدہ نبیؐ کے فرمان بری میں جو ضرب جسم نواز ہوتی ہے وہ اے شہنشاہ حقیقی روحِ مہجور کو مس نسیم فردوس کی لذت دیتی ہے ۔ اے میرے اولین و آخرین آقا ۔ تیری عاجزہ کا پیمانۂ دل ہاں اسی شراب آتشین سے مست و مخمور ہو جس سے ساقئ ازل نے تبسم بہ لب منصور و سرمد کے تشنہ لبوں کو سیراب کیا تھا ۔ ہاں تو ہی میرے دعووں کا شاہد عادل ہے ۔"

ارضِ نورین کا ذرہ ذرہ اس صدائے مجذوب سے محو ترنم اور فضائے عنبرین کا چپہ چپہ اس جوش عبودیت سے مصروف ہم زبانی ہو جاتا ہے ۔ ہوائے قدس کی سبک روی فضائے عرش کی عطر ریزی قدسیان قدس نشین اور ملائکہ ساکنانِ ارض ملکوتی اس کیف پرستاری سے مخمور و مدہوش ہو کر بارگاہ ازلی میں دست بدعا ہو جاتے ہیں ۔

"اے رحیم حقیقی ۔ ردائے ترحم کو جنبش دے موجۂ نور کرم میں تحرک پیدا کر ۔ اور اے ارحم الراحمین اس پیکر محبت کو ان مجازی اذیتوں سے نجات دلا ۔"

(۵)

دس دن، کامل، دس دن، سرشارِ وفا نیلوفر کے اس شدید ترین آزمایش کے گذر چکے ہیں ۔ آہ جسم گل فریب ہزار پارہ اور زخم ہائے خوں چکاں بحر خون بن کر رہ گئے ہیں ۔ لبریز لہو گلرنگ ساری کا آنچل کمر نازک میں پیوست ہو کر رہ گیا ہے جس کی ہر جنبش نوک نشتر کا کام

کرتی ہے غدار روشن آئینہ گوں چشم کوثرین سپیدۂ سحر اور لب احمرین رشک دہ پارۂ نیلم بن کر رہ گئے ہیں۔

آہ جس وقت وہ ایک آہ خفی کے ساتھ آہنی زیور کی جھنکار میں زانو بدلتی ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اور موجودات کا نکتہ نکتہ لرزہ بر اندام اور جگر بہ حلق ہو جاتا ہے۔ چرخ نیلمین کے پردوں سے صدائے آہ اور زمین خاکی کے ذروں سے آواز الحذر اٹھتی ہے اور بارگاہ صمدیت کے بنیادی ایوان سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہے۔ نیلوفر چار گز مربع فرش پر ظلمت نواز رات اور جہانتاب دن کے ۲۴ گھنٹے دو زانو بیٹھے ہوئے بسر کرنے پر مجبور رہے کیونکہ پشت جراحت آگین جس سے ہر لمحہ خون ملتہب کی تراوش ہوتی رہتی ہے۔ آہ زمین سخت سی ہنیں مس ہو سکتی۔ زندانخانۂ تاریک میں نہ خورشید درخشاں کی روشن کرنیں بار پا سکتی ہیں۔ نہ قمر شب فروز کو خنک ریزی۔ وہاں ایک تاریکی ہے مکمل۔ ایک ظلمت ہے مستقل لیکن وقف ستم نیلوفر کی سراج حقیقی و مجازی ہر وقت تنویر ریز و تبسم پاش ہے پرستارۂ مذہب نیلوفر کا ہر خیال تخیل اور ہر جنبش نظر ہر لمحہ صرف عبادت اور مصروف نظارۂ تنویر!!!

اس کی ہر رگ جاں سے "اللہ" کی صدائے مسحور دست کن آتی ہے۔ اور سماعت قدس وجد آفرین ہو جاتی ہے نیم مدہوش نیلوفر نے محسوس کیا کہ اُسے ایک احتیاط سبک سی اٹھایا گیا۔ اور محتاط رفتار سے چل کر مخملین گدے میں لٹا دیا گیا اس نے ناتوان آنکھیں کھولیں۔ اور پلکیں جھپکا جھپکا کر بہ مشکل معلوم کیا کہ اُسے ایک رفیع کمرہ میں آرام دہ کوچ پر لٹایا گیا ہے۔ اردگرد راہب اور اچھوتیوں کا ہجوم ہے۔ سامنے کرسی پر پادری اعظم رونق افروز ہے۔ وہ ایک جوش بے ساختہ سے بیٹھ گئی۔ سفید ہاتھوں نے چشم زدن میں چہرہ آنچل سے پوشیدہ کر لیا۔ ابروئے خمدار کھنچ گئے جبین قمر گوں پر تنفر و تحقیر کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ پادری نے کہا "او نیلوفر۔ کیا

تم ابتک اپنے پہلے اور بیہودہ خیال میں مبتلا ہو" لب ہائے ناتواں کو جنبش ہوئی۔ اور ایک لڑکھڑائی گر شکوہ آواز میں یہ الفاظ ادا ہوئے " ظالم و بے رحم پادری کیا آپکے کارکنوں نے ابتک اپنی سعی لاحاصل کے نتائج بے سود آپ کی خدمتمیں پیش نہیں کئے؟

بیشک بلا شبہ نیلوفر پرستار اسلام نیلوفر اپنے سچے اور پاک خیال میں تا ہنوز مست و مخمور ہے۔ او ناخدا شناس دوکاندار پادری دنیا کی کوئی قوت اور تیرے ظالم مظالم کی کوئی طاقت نیلوفر کو دائرہ اسلام سے خارج کرکے گنہ گار ابدی نہیں بن سکتی۔ انشاء اللہ !!!"

پادری اور دیگر حاضرین نے اس وقت اپنی انتہائی طاقت گویائی خوشامد و ملاطفت میں صرف کردی۔ اپنے مظالم کی گڑگڑا کر معافی مانگی۔ اور تملق و چاپلوسی کے آخری درجہ میں اُس سے مذہب عیسائی قبول کرنے کی درخواست کی وعدے کئے متواتر عہد دیئے۔ سرسبز۔ اور پیمان باندھے نامتناہی تعیش صرف اُسکا حصہ ہو جانے کے۔ لیکن ایک تحقیر آفرین صدائے شیریں نے بہ کمال استغنا ان الفاظ کی عزت نوازی کی " نیلوفر حرص ہوا کی پرستار نہیں۔ میری سماعت زیادہ فضول گوئی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ جس خیال مبارک کو مظالم کا آخری درجہ برہم نہ کرسکا۔ اُسے یہ چند مجازی لطیف باتیں زیروزبر کرنے سے قاصر محض ہیں۔ مجھے اس مجمع ناجنساں میں موجود رہنے کی زیادہ اذیت نہ دی جائے اور میرے کنج خاموش میں پہنچا دیا جائے"

مجمع برہم ہوگیا۔ پادری نے خشمناک لہجہ میں یہ سنگین الفاظ ادا کئے " اس کش و گستاخ لڑکی کو مسیح مقدس اور مریم پاک کے مجسموں پر قربان کردو۔ کہ ہم لوگ اب صرف اسی طرح نجات پاسکتے"

" روح القدس اس کی گستاخیوں سے سخت برہم ہیں۔ اور یہی فرمان دیتے ہیں"

نیلوفر مسکرائی، اور ایک کامیاب موجۂ تبسم مطلع انوار لبوں پر خندہ ریز ہو گیا۔ الحمد للہ کہ میرا مدعائے دلی اور تمنائے ازلی بر آنے کی صورت رونما ہو گئی کتنا مست کن ہے یہ خیال کہ یہ روح مضطرب اس قفس خاکی سے آزاد ہو کر شاہد حقیقی کے قرب پاکیزہ میں جذب ہو جائیگی اے ظاہر بیں پادری میرا خم خانۂ تصور اس صہبائے اولین سے مدہوش ہوا جارہا ہے کہ آج وادئی ایمن پر چمکنے والے جلوۂ تجلی سے یہ مضطرب نگاہیں بھی کامیاب دیدار ہوں گی۔

چل چل اے جلاد، روح بیقرار کو اذیت دوری سے نجات دلا۔ وہ جذب جنوں میں کھڑی ہو گئی، چار اچھوتیاں اُسے درشتی سے پکڑ کر لے چلیں۔ وہ ایک والہانہ رفتار سے چلی۔ اور تمام مجمع پس پشت نیلوفر کو حضرت مسیح اور حضرت مریم کے سنگین مجسموں کے روبرو قربانگاہِ صلیبی پر سرنگوں بٹھایا گیا۔ بازو پس پشت رسن خار دار سے باندھے گئے۔ اور دریافت کیا گیا کہ کیا وہ کچھ خواہش رکھتی ہے۔ یسمینی لبوں کو اذن تحرک ملا۔

"اے مجمع بے رحم اور اے پادری ناعاقبت اندیش مجھے اور کوئی خواہش نہیں صرف اتنی کہ اب جلد اس روحانی اذیت سے آزاد کر۔ موجودات عالم تا حشر تمہاری داستان ستم اور پرستارہ اسلام کی قوت روحانی کو فراموش نہ کر سکے گی ہر وہ سانس جو فضائے کائنات کا ہر چپہ لیگا۔ اس فسانہ عبرت خیز کو تازہ و سرسبز بنا کر خون باری کریگا۔"

شمشیر برہنہ کو حرکت ہوئی اور...... لا الٰہ الا اللہ .... شان رحمت نے ہاتھ پھیلائے۔ تجلی منور نے آغوش کھولدی۔ اور بگولۂ مضطرب نور ابدی سے ہم کنار!!!

نوک شمشیر کی جھنکار، سے صدائے "احسنت" اٹھی اور ہر قطرۂ خون مرتعش نے تحریر خونیں سے "قربان ملت" ہر ذرہ خاک پر مرتسم کردیا......

شوؔخ حامی ہے خدا تو ناخدا کیا چیز ہے

(جذبات جانشین رئیس مرحوم حضرت شوؔخ اکبرآبادی)

مرنیوالے کے لئے مرنا بھلا کیا چیز ہے — جب کسیکا حکم ہو جائے قضا کیا چیز ہے

اپنی فطرت سے تری تیر نظر مجبور ہیں — ورنہ میں یہ جانتا ہوں دل مرا کیا چیز ہے

ہم اسی کو دیکھکر جیتے بھی ہیں مرتے بھی ہیں — زندگی بھی موت بھی تیری ادا کیا چیز ہے

آجتک الفت کسی سے بھی ہوئی ہو آپ کو — آپ کیا جانیں محبت کا مزا کیا چیز ہے

میں مسلماں ہو کے دل اسکو خدا کیواسطے — وہ بت کافر سمجھتا ہے خدا کیا چیز ہے

جائے حیرت ہی کہ ہوتا ہی نظر آتا نہیں — یا الٰہی یہ مقدر کا لکھا کیا چیز ہے

دیکھیے تو ایکدن تلووں سے ملکر خون دل — تو سہی خود آپ فرمائیں حنا کیا چیز ہے

مضطرب ہیں وہ کسی پہلو قرار انکو نہیں — ہائے اک دکھے ہوئے دل کی دعا کیا چیز ہے

سیر پروانہ کی دیکھو شمع رکھہ کر سامنے — شمع وہ خود سمجھ لوگے وفا کیا چیز ہے

دے نہ دے کوئی سہارا کشتی امید کو

شوؔخ حامی ہی خدا تو ناخدا کیا چیز ہے

قدیم ایرانیوں کے آداب مجلس ونشست برخاست

علامہ میرزا عباس ابن محمد علی شوستری نے ایک ضخیم کتاب بعنوان "ایران نامہ" یا "کارنامۂ ایرانیان باستان" فارسی زبان میں بڑی محنت وجانفشانی سے لکھی ہے اور اس کو مہاراجہ مملکت میسور کے نام نامی پر معنون کیا ہے۔ ذیل کی سطور کتاب مذکور کے ایک مضمون کا ترجمہ ہیں۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ یہ سلسلہ انشاء اللہ "شمع" کے آیندہ نمبروں میں بھی جاری رہیگا۔

ایرانیوں میں بہت سی صفات حمیدہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن ایک صفت جس کے لئے وہ زمانہ قدیم سے مشہور چلے آتے ہیں آداب مجلس ہے۔ ہم ایک ایرانی کو مغربی ایشیا کے مذاہب میں سب سے مؤدب کہہ سکتے ہیں۔ مورخین یونان نے بھی ان کی صفت مذکور کی تعریف کی ہے۔ ایرانی برہنگی بدن کو جسے اکثر مذاہب میں معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے خلاف تہذیب سمجھتے تھے۔ اور جب وہ لباس زیب تن کرتے تھے تو تمام اندام ڈھانپ لیتے تھے۔ اس کی تصدیق استرابو لباسی کے قول سے ہوتی ہے۔

ام میاں لکھتا ہے کہ کھانا کھانے کے وقت ایک حرف زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ اور اگر مجبوراً بولنا پڑتا تھا تو بات کو طول نہیں دیتے تھے، کم سخنی بلکہ خاموشی کے طالب رہتے تھے۔ جیسا کہ فردوسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

تو بر انجمن خامشی برگزیں | چو خواہی کہ یکسر کنند آفریں
چو گوئی ہماں گو کہ آموختی | بہ آموختن در جگر سوختی
سخن سنج ودینار گنج مسنج | کہ بر دانش مرد خوار است گنج

کھانے کے وقت دسترخوان کے چاروں طرف نظر نہیں دوڑاتے تھے بلکہ جو کچھ سامنے ہوتا تھا اسی کو کھاتے تھے۔

امیاں رقمطراز ہے کہ کوچہ و بازار میں کوئی چیز کھانا بلکہ پانی پینا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ راستہ میں مڑ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بلند آوازسے نہیں ہنستے تھے۔ اور جس چیز کو وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے یا نہ رکھتے تھے تو اس کا ادعا نہ کرتے تھے۔ ایسی ناشائستہ حرکات سے جس سے فریق مقابل کی دل آزاری ہو یا اس کی کراہیت کا موجب ہو پرہیز کرتے تھے۔

ہیرودوتش لکھتا ہے کہ راستہ میں اگر کوئی آشنا ملجاتا تھا، تو بصورت ہم رتبہ ہونے کے ایک دوسرے کے لب پر بوسہ دیتے تھے۔ اور اگر ان میں سے ایک کم رتبہ ہوتا تھا تو بڑی عمر والا شخص اس کے رخسار کا بوسہ لیتا تھا۔ اور اگر بہت ہی پست درجہ کا آدمی ہوتا تھا تو وہ اپنے سے بڑے کی تعظیم کرتا تھا، بروقت ملاقات نیز بروقت روانگی بوسہ لینے کا دستور تھا۔

زنوفن لکھتا ہے کہ اس رسم کا فقط اہل فارس کے ہاں معمول تھا۔

وفاداری و دوستی اور استقامتِ دوستی کو صفات حسنہ سے شمار کرتے تھے۔ داد دہش کے طالب تھے۔ جو کچھ ایک دوسرے سے کہتے تھے اس کے مطابق کرتے تھے، راستی و پاکیزگی و درخشندگی کے پرستار تھے۔ اور ان صفات کو خدا تعالےٰ کی عنایت سمجھتے تھے۔ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک سب سے بُرا عیب تھا۔ اور اسی وجہ سے قرض لینے سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ مقروض آدمی بعض اوقات جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے پلوتارخ لکھتا ہے کہ قرض لینا ایرانیوں کے نزدیک دروغ سے بھی بدتر تھا۔ جو لوگ

راست گوئی کے بہت پابند ہوتے تھے وہ تجارت سے بھی اجتناب کرتے تھے اور محض زراعت پر قانع تھے۔ سلاطین ہخامنشی کے زمانہ میں دروغ گو بہت ذلیل و خوار سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو سزا ملتی تھی، جب کوئی معاملہ کر چکتے تھے تو ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے اور اس کے بعد ایفائے وعدہ کو فرض سمجھتے تھے۔ سب سے مضبوط پیمان یہ ہوتا تھا کہ معبد خورشید میں جا کر قسم کھاتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات حکام و فرماں روایان پیمان توڑ دیتے تھے بلکہ لڑائی میں مکر و فریب کو بھی روا رکھتے تھے۔ لیکن اس قسم کی حرکت شاذ و نادر ہی عمل میں آتی تھی، کبھی حکام پیمان شکنی پر مجرم تصور ہوتے تھے۔ چنانچہ بہمن اردشیر کے زمانہ میں مصر میں ایک مدعی سلطنت نے خروج کیا اور بادشاہ کے بھائی کو جو کہ مصر میں نائب السلطنت اور فرمانروا تھا دوران جنگ میں قتل کر ڈالا۔ بعد ازاں اس نے اپنے آپ کو بگا باز نامی ایک سردار مصر کے حوالہ کر دیا اور اس نے جان بخشی کا وعدہ لے لیا۔

بگا باز نے اس کو پایۂ تخت میں بھیجدیا۔ بادشاہ نے اپنے بھائی کے انتقام میں اس کو قتل کر ڈالنا۔ لیکن بگا باز نے اس پیمان کی جو کہ اس کے ساتھ کیا گیا تھا بادشاہ کو اطلاع دی۔ اسوجہ سے بادشاہ اپنے ارادہ سے باز رہا۔ چند سال بعد ملکہ ایران نے بھائی کے انتقام میں قاتل کو مروا ڈالا۔ اس پر بگا باز اتنا برافروختہ ہوا کہ بادشاہ کو ارتکاب جرم کا مجرم ٹھیرایا۔ ایرانی عہد و پیمان کی نگہداشت فرض سمجھتے تھے جیسا کہ فردوسی سیاوش کے افسانہ کے دوران میں فرماتے ہیں ؎

زفرزند پیمان شکستن مخواہ — مگر آنچہ اندر خورد با گناہ

چنیں گفت شنیدہ کہ پیمان شاہ — نہ ایں بود باد بہ پیش سپاہ

جو پیمان شکن باشی و تیز مغز — نیاید ز پیکار تو کار نغز

ممنونیت اور ادائے احسان کو واجب سمجھتے تھے۔ اپنی ہی آسودگی اور آرام کی دُعا نہ مانگتے تھے بلکہ بادشاہ اور اپنے ہموطنوں کی فلاح و آسایش کی دعا بھی مانگا کرتے تھے اور یہ قاعدہ ابتک جاری ہے۔ اپنے والدین مومنین اور عزیزان کی صحت اور بخشش کی دُعا بھی مانگتے تھے۔

ہیرودوتس لکھتا ہے کہ اپنے ہمسایہ کو عزیز سمجھتے تھے۔ ایرانیوں کی بادشاہ پرستی مشہور چلی آتی ہے۔ اس کی راحت و بزرگی اور جلال و عزت و شوکت سے خوش ہوتے تھے اور اس کی زحمت و شکست و گرفتاری کو اپنی بدبختی اور ذلت تصور کرتے تھے، میدان جنگ میں بادشاہ کے بدن کی حفاظت سب پر واجب تھی اور حتی الامکان خواہ وہ دشمن کا مقابلہ کرے یا اپنے آپ کو معرض خطرہ میں ڈالے اسکا ساتھ نہ چھوڑتے تھے۔ فردوسی کے بعض اشعار سے اُس کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ راپ اپنی کتاب موسومہ "مذہب و رسوم ایرانیان" میں لکھتے ہیں کہ قدیم زمانہ کے ایرانی عزت نفس کو ملحوظ رکھتے تھے اور پریشانی اور افلاس کی حالت میں ذلت کو گوارا نہ کرتے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ باوجود اتنی دفعہ مغلوب و اسیر بلا ہونے کے اُنہوں نے اپنے فاتحین کے پنجۂ ذلت سے رہائی پائی۔

ان کی ہمعصر اقوام مثل اشور و بابل و روما و مصر کا نام و نشان نہ رہا۔ اور صرف ایران ہی اپنے استقلال، قومیت اور زبان کی نگہداشت کر سکا۔ لیکن باوجود ان صفات حسنہ کے وہ بے عیب نہ تھے۔ ان کی بری صفات غرور و نمایش و انانیت و عیش پرستی تھیں۔ ذرا سے صدمہ سے پریشان ہو جاتے تھے اور ذرا سی کامیابی پر بڑے شادمان ہوتے تھے۔ اگر ان کا رہنما کوئی لایق شخص ہوتا تھا تو بڑے کارہائے نمایاں ان سے ظہور

میں آتے تھے بصورت دیگر غایت درجہ پستی کا اظہار کرتے تھے ۔چنانچہ جب مشت بھر بے سروپا افغان اصفہان پایۂ تخت صفویہ پر قابض ہوگئے اور انہوں نے قتل عام شروع کیا تو بقول سرجان ملکم ایک نفر افغان چند ایرانیوں کو قتل کی غرض سے پکڑ کر لیجاتا تھا اور ایرانی باوجود قتل کا علم ہونے کے قتل گاہ کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے ۔ اور دشمن سے مطلق نہیں لڑتے تھے ، بلکہ مثل گوسفند کے سر تسلیم خم کر دیتے تھے ۔ آداب مجلس کی بڑی پابندی و استبداد سلطنت نیز مدت مدید تک عربوں کی غلامی میں زندگی بسر کرنے کے باعث ان کی صفت راستی میں کمی واقع ہوگئی تھی اور ظاہرداری اور ریاکاری کا مادہ ترقی کرگیا تھا نتیجہ یہ ہے کہ آجکل جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں دل میں نہیں رکھتے ۔

ہخامنشی کے زمانہ میں پادشاہ اور اعیان سلطنت کے لئے پیادہ روی خلاف شان تصور ہوتی تھی۔

دروغ گو کو قتل کر ڈالتے تھے ۔ اور بغاوت و پیمان شکنی کی سزا بھی قتل تھی ۔مجرم شخص کو سولی پر چڑھا دیتے تھے یا اگر وہ جنگ میں قتل ہو جاتا تھا تو اس کے دائیں ہاتھ اور سر کو کاٹ ڈالتے تھے ۔

سیّد وزارت علی

(از گوڑگانوہ)

کوئی نہ کوئی گریباں میں تار باقی ہے

فلک کے دل میں ابھی تک غبار باقی ہے
نہیں تو کیوں مری خاکِ مزار باقی ہے؟
چنے تھے پھول وہ مرجھا کے رہ گئے سارے
مگر ابھی خلشِ نوکِ خار باقی ہے
نگاہِ لطف سے دنیا کو دیکھنے والے
ادھر بھی اک دلِ امیدوار باقی ہے
ہنوز دم کے الجھنے میں کچھ کمی نہ ہوئی
کوئی نہ کوئی گریباں میں تار باقی ہے
کیا کچھ ایسا پراگندہ خوابِ ہستی نے
کہ میری خاک میں بھی انتشار باقی ہے

مجنوں (گورکھپوری)

دی ٹرنکس کمپنی لمٹیڈ شاہ گنج آگرہ

ہمنے اس کارخانہ کو مختصر پیمانہ پر شروع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں ہمارے کارخانہ نے اسقدر ترقی کی کہ لمٹیڈ فرم ہو گیا ہے۔

نہایت پائدار جوتے مردانے۔ زنانے و بچکانے ہر قسم کے اور ہر شیپ سائز کے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو نہایت کم قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں اور بہ لحاظ قیمت و پائداری کے ہم اپنی ذمہ داری پر فروخت کرتے ہیں۔

علاوہ جوتوں کے چمڑے کا ہر قسم کا سامان ہمارے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً بستر بند۔ سوٹ کیس اٹیچی کیس۔ کالر بکس۔ پیٹیاں وغیرہ وغیرہ جو اپنی خوبصورتی اور پائداری کے لئے مشہور ہیں۔

ہمارے یہاں آگرہ کی مشہور دریاں اور قالین بھی ہیں۔ ہر سائز اور ہر وضع کی دریاں جانمازیں و قالین تیار ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے نرخ پر آپ کو دوسری جگہ مال نہیں ملسکتا۔ ہر سامان ہماری ذاتی نگرانی میں تیار ہوتا ہے اور جو آرڈرس آتے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پوری پابندی کیجاتی ہے۔

ہم آپکو یقین دلاتے ہیں کہ آپ ہمارے یہاں سے مندرجہ بالا سامان منگا کر بہت سی پریشانیوں سے بچیں گے اور ہمارے طریق کاروبار و مال کے آپ ہی ایک مستقل طرح خریدار بنجائینگے

المشتہر

سید حسن زاہد جعفری منیجنگ ایجنٹ دی ٹرنکس کمپنی لمٹیڈ شاہ گنج آگرہ

باہتمام منشی عبدالعزیز خاں پرنٹر عزیزی پریس آگرہ میں چھپا

نمبر ۵ فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ نومبر ۲۵ء جلد ۲

تصویر تاج محل آگرہ

اعلان

دسمبر کا رسالہ بھی قریب قریب تیار ہے اور اپنی ظاہری دلربائی اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے حقیقت میں ادب اردو کا ایک گوہر شاہوار ہے جس کی پاکیزگی و رونق صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دسمبر کا پرچہ بجائے خود ادبی حیثیت سے ایک مستقل چیز ہے۔ تاریخی و ادبی مضامین تحقیق اور محنت سے لکھے گئے ہیں نظمیں اور غزلیں بغایت کیف آور اور دلکش ہیں۔ حجم بھی زائد ہے۔ تصاویر بھی نہایت نادر و لطیف ہیں۔

برابر آرڈر وصول ہو رہے ہیں۔ عہ علاوہ محصول ڈاک قیمت ہے جو غیر خریدار حضرات سے لی جائیگی۔

جدید خریداران شمع کے ساتھ رعایت

جو اصحاب سنہ ۱۹۲۶ء کا سال بھر کا چندہ پیشگی ہم کو ۱۵ جنوری سنہ ۲۶ء تک بھی بھیجدیں گے انکی خدمت میں دسمبر کا نمبر مفت روانہ ہوگا۔

شائقین جلد توجہ فرمائیں کیونکہ فرمائشات کو دیکھتے ہوئے اگرچہ ہم نے دسمبر نمبر سابقہ اندازہ سے زائد شائع کرایا ہے۔ پھر بھی خوف ہے کہ جو اصحاب توقف کریں گے ممکن ہے کہ انکو مایوس ہونا پڑے۔

مینیجر شمع

حسن منزل۔ شاہ گنج۔ آگرہ

رسالہ

ماہ نومبر ۱۹۲۵ء

مقدمہ یادگار انیس

از

جناب مولوی منشی امیر احمد علوی صاحب بی۔ اے۔ جج

میر ضمیر کے نامور شاگرد مرزا دبیر عرصہ سے مرثیہ گوئی کی مشق کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اُستاد کی پیروی میں شہزادۂ علی اکبرؑ کے حال کا مرثیہ طرز جدید میں لکھا اور مطلع بھی اُسی شان کا کہا۔ ع۔ سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل۔ جس مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا اُس میں خواجہ آتش بھی تشریف فرما تھے۔ جب گھوڑے کی تعریف میں حسب ذیل بند مرزا صاحب نے پڑھا:-

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال　　　　نکھ سکھ سے درست اور جواں بخت جواں سال

جادو کی نری آنکھ، فقط معجزے کی چال　　　　خورشید کے سُم، برق کی دُم سنبلہ کے بال

قوت کی طبیعت تھی، دلیری کا جگر تھا

سرعت کا بدن، فہم کا دل، عقل کا سر تھا

توخواجہ آتش نے پکار کر فرمایا! "کہ بھئی سلامت علی خدا تم کو خوش رکھے۔ کون کہتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو۔ تم سے بہتر کوئی دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا۔"
مرثیہ گوئی کے آسمان پر ضمیر و دبیر ماہ و مشتری کی طرح چمکنے لگے۔ قدردانوں کی جوہر شناسی اور اہلِ کرم کی گوہر پاشی نے لکھنؤ کی خاک پاک سے بیسیوں مرثیہ گو پیدا کر دیئے لیکن ان بزرگوں کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ ہو سکا اور جس کسی نے مقابلہ پر آنے کی ہمت کی زک پائی اور شرمندگی اٹھائی۔

عام طور پر خیال کیا جانے لگا کہ مرثیہ گوئی درجۂ کمال کو پہنچ گئی اور اب اس صنفِ سخن میں ترقی کی گنجائش باقی نہیں۔ یکایک خورشید نے رُخ سے نقاب اُٹھائی۔ گردونیہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا۔ میر خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر ببر علی انیس نے فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مجلس پڑھی اور رزم بزم کی وہ چلتی پھرتی تصویر یں دکھائیں کہ "ہٰذا اکبر" کی صدا ہر گوشہ سے آنے لگی۔

اُنہوں نے طرزِ مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسنِ کلام کا ایک مرقع بنایا اور اُس پر میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کا رنگ روغن چڑھا کر طلسمات کا عالم دکھا دیا۔

اگلے معبودوں کی پرستش کرنے والے عرصہ تک کوشش کرتے رہے کہ خداوندِ جدید کے سامنے سر بسجود نہ ہوں لیکن کلام میں وہ معجزہ تھا کہ سب کی گردنیں جھک گئیں۔

خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

میر ضمیر واجد علی شاہ کے عہد تک زندہ رہے اور کہا جاتا ہے کہ آخری زمانہ میں اُنہوں نے ایک بے نظیر مرثیہ ۱۸۰۰ بند کا لکھا تھا جو مشہور ہوتا تو دبیر و انیس دونوں کے چراغ گُل ہو جاتے مگر یہ حکایت غالباً افسانہ ہے۔

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے

اُن کا کلام جو اس وقت موجود ہے مرزا دبیر کے دفتر ماتم سے بہت کم وزن ہے اور میر انیس کا حریف مقابل اس صنف سخن میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف مرزا دبیر علیہ الرحمۃ کی ذات بابرکات ہے۔

ان دونوں باکمالوں کے نقش قدم پر چلنے والے سیکڑوں پیدا ہوئے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہے خود اُنکے بھائی بیٹے بھی گوئے سبقت نہ لے جا سکے۔ خاندان انیس میں سے مونس و نفیس اور خاندان دبیر میں سے مرزا اوج نے بہت زور مارا لیکن کلمۂ انصاف یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے ہمقدم بھی نہ ہو پائے۔ آگے بڑھنا تو بہت دشوار تھا

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انیس و دبیر مرثیہ گوئی کو اُس نقطۂ عروج تک پہنچا گئے جس کے بعد زوال ہی زوال ہے۔ ان دونو میں صدر نشین فضیلت کون تھا؟ یہ مسئلہ اس وقت تک زیر بحث ہے علامہ شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں مرزا دبیر کو میر انیس کا حریف مقابل قرار دینا بدمذاقی کی دلیل سمجھی ہے لیکن بدمذاقی اس قسم کی تھی کہ سارا لکھنؤ جو اُس وقت شعر و سخن کی ٹکسال تھا۔

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ ۔۔۔ لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

اسی بلا میں گرفتار تھا اور ان دونوں باکمالوں کو حریف مقابل سمجھتا تھا۔

"موازنہ" ہندوستان کے ایک مشہور انشا پرداز کے قلم سے نکلا اور اُسمیں خیالات کا اظہار نہایت بیباکی اور دلیری سے کیا گیا۔ سارے ملک مین آگ لگ گئی۔ دبیریئے تو ناراض ہوتے ہی بعض انیسیے بھی خوش نہ ہوئے۔ اُسکی تردید میں کئی کتابیں شائع ہوئیں جنمیں سے "المیزان" ادب اُردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ دبیر کا بہترین کلام علامہ شبلی کی نظر سے نہیں گذرا تھا ورنہ وہ دبیر کی بابت ایسی غیر منصفانہ رائے قایم نہ کرتے جیسی کہ "موازنہ" سے ظاہر ہوتی ہے۔ مؤلف حیات دبیر کا بیان ہے کہ "جب علامہ نے حیات دبیر کو پڑھا اُنکی رائے بہت کچھ تبدیل ہو گئی۔ اور اُنھوں نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ مجھ کو یہ حالات پہلے نہیں معلوم تھے۔" دونوں اوستادونکی روش جداگانہ ہے۔ میر انیس کا کلام فصیح و شیریں ہے۔ اور مرزا دبیر کا دقیق و ملیح۔ شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے۔ اور ایک کو دوسرے پر من کل الوجوہ ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ البتہ میر انیس کو یہ فوقیت مرزا صاحب پر حاصل ہے کہ اُنکے کلام کی سادگی و تاثیر عرصہ تک زندہ رہے گی۔ اور مرزا دبیر کی شوکت الفاظ و بلند پروازی مٹ جائیگی۔ مرزا دبیر نے جو صنائع و بدائع اپنے کلام معجز نظام میں صرف کئے اُن کے سمجھنے والے ہندوستان میں بہت کم باقی ہیں اور اگر مشرقی علوم سے بے توجہی کا یہی عالم رہا تو چند ہی روز میں شاید کوئی شخص ان صنائع سے لطف اُٹھانیوالا ہندوستان میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملیگا۔ برخلاف اسکے میر انیس کی سادہ زبان اور محاورہ بندی اُس وقت تک مزہ دیگی جبتک اردو زبان زندہ ہے۔ فسانہ عجائب جاں بلب ہے

له حیات دبیر۔ جلد دوم حصہ اول صفحہ ۸۴۔

اور چہار درویش برقرار ہے۔ گلزار نسیم پر خزاں آنے کا اندیشہ ہے۔ مثنوی میر حسن سدا بہار ہے۔ سہ نثر ظہوری اور مثنوی غنیمت اب سمجھنا دشوار ہے۔ گلستاں و بوستاں سے ہر فارسی داں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ سید افضل حسین ثابت لکھنوی نے اپنی بے نظیر گنجینۂ واقعات "حیات دبیر" میں اُن تمام صنعتوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو مرزا دبیر کے کلام میں پائی جاتی ہیں مگر افسوس ہے کہ اُن میں سے بیشتر کا زمانہ حال کے تعلیم یافتہ طبقہ نے نام بھی نہ سُنا ہوگا!! مرزا دبیر کی معنی آفرینی اور سحر طرازی دیکھنا ہو تو **المیزان** اور **حیات دبیر** کے زریں صفحات ملاحظہ فرمایئے۔ میر صاحب کے کلام کا نمونہ ان اوراق پریشان میں موجود ہے۔ ان دونوں باکمالوں کے معتقدین نے ایک زمانہ میں وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ بقول سالک دہلوی "ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا تھا جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر"۔ مرزا دبیر کے مشہور مرثیہ گو شاگرد میاں مشیر[۱] نے اپنے مخصوص انداز میں بالکل صحیح کہا تھا کہ

جھگڑا اکبر کا ہے نہ جناب امیرؑ کا　　　اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

راقم آثم کے لئے ان بزرگوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک مصرعہ تبرک ہے۔ وہ ان دونو شہنشاہانِ سخن کے متحد المضامین اشعار کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ترجیح کا فیصلہ ناظرین کے ذوق سلیم پر چھوڑتا ہے۔

بسوگند گفتن کہ زر مغربی ست　　　چہ حاجت محک خود بداند کہ چیست

---

[۱] شیخ گوہر علی مشیر مرزا دبیر کے شاگرد اور شریعت ہر سیہ گوئی کے پیغمبر تھے میر ضمیر کو جس طرح مرثیہ کے طرز نو کی ایجاد کا شرف نصیب ہوا اُسی طرح دشمنانِ اہلبیت کی ظرافت آمیز ہجویں ہر سیہ

بقیہ صفحہ گزشتہ۔ ایجاد کرنیکا امتیاز بھی حاصل ہے۔ "ہرسیہ" ایک بے معنی لفظ ہے مگر غالباً "ہرسیہ" ہے مرثیہ" کے وزن پر بنا یا گیا ہے۔ مرثیہ کا مضمون پر عظمت ہے۔ اس لئے اس میں اگر ظرافت شامل کیجاتی تو مجلس ماتم، بزم طرب بنجاتی۔ مشہور ہے کہ کسی ذاکر نے ایک مجلس میں لشکر دشمن کی پہلوان کی بابتہ یہ مصرعہ پڑھا ع

آیا تھا بھونکتا پہ دبکتا ہوا بھاگا

تمام اہل مجلس ہنس پڑے اور اسکا اثر مجلس کے ختم تک زائل نہ ہوا۔

ہنسنے ہنسانیکے لئے لکھنؤ مرحوم کے زندہ دلوں نے یہ صورت نکالی کہ آٹھویں ربیع الاول کو عزاداری سے فراغت کر کے ۹ ربیع الاول کو جشن عید منعقد کرتے تھے اور اُن قاتلان حسینؑ کے انجام پر خوشی مناتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس عید میں سب سے پہلے میر ضمیر نے "ہرسیہ" پڑھا اور انکی تقلید مرزا دبیر اور میر انیس وغیرہ نے بھی کی۔ میاں مشیر نے ساری طاقت ہرسیہ پر صرف کر دی اور اس فن میں انکا مدمقابل بننے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ رعایت لفظی میں امانت کو مات کیا اور ایسے نادر محاورے استعمال کئے جنکی سند سوائے انکے کلام کے کہیں نہیں ملسکتی۔ انہوں نے مختلف قوموں اور اہل پیشہ کی اصطلاحیں کثرت سے نظم کیں اور اردو شاعری کو ظرافت و شوخی کے انمول خزانہ سے مالامال کر دیا۔ انکے بعض مصرعے مثلاً "منلی بنی تھی جائے وہ کشمیری ہوگئی"۔ یا "ماضی بنو گے حال نہ پہچانے جائیں گے"۔ ضرب المثل کی طور پر بزم احباب میں استعمال ہوتے ہیں اور انکا ہر شعر ہنسنے والونکے لئے زعفران زار کی کیاری ہے۔ افسوس ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹوں کا اتنا انبار ہے کہ اس مقدمہ کی تہذیب انکے بار کی متحمل نہیں ہوسکتی اور دامن گلچیں کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے ورنہ انکے بعض ہرسیوں کا انتخاب اس مقام پر درج کرتا۔ نمونہ کے طور پر حسب ذیل اشعار جن میں رعایت لفظی کی طومار سے امانت کو شرمندہ کیا ہے۔ نقل کئے جاتے ہیں۔

(ہندوستانی عورت ایک مغل کی شکایت لیکر حاکم کے سامنے جاتی ہے)

(١)

دنیا بے حقیقت ہے

دبیر۔

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا　　باقی سامانِ عیش فانی نکلا

چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر　　اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

انیس۔

راحت کا مزہ عدوِ جانی نکلا　　دل سے نہ کبھی غمِ نہانی نکلا

پیاسے رہے آکے چاہِ دنیا پہ انیس　　نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

بقیہ صفحہ ۸۔

وہ بولی صدقے جاؤں مصیبت سنو مری　　مٹی تلک نہ دی مجھے لوٹا دھڑی دھڑی

گہنا تمام لے گیا ملبوس لے گیا　　ہاتھوں کے چوہے دتیاں تک موس لے گیا

چوری کا حال صاف بتانا مجھے پڑا　　سنتی ہوں شہ چھڑے کی گلی میں کڑا بکا

ہتیائے کنگن ایسے یہ سفلے شریر ہیں　　جوشن لئے گواہ صغیر و کبیر ہیں

نتھ ناک سے اتاری ثمنہ کیل کر مرا　　اور چھپکا دیکھے سونے کا تعویذ بھی لیا

لے بھاگا ڈھولنا مرا قرآن کی قسم　　انگشتری چرالی سلیمان کی قسم

کیا کیا میں تڑپی بجلیوں کے واسطے میاں　　بالا تبا کے لے گیا بچپن کی بالیاں

سپتے مرے اتار لئے آگئی خزاں　　بیچیں انت رام کے ہاتھوں وانتیاں

سب چیز لبست باندھ کے بستے میں لے گیا

موتی کے جھالے پانی برستے میں لے گیا

(۲)

احوال حضرت حرؑ

دبیر۔

حر کو کیا بخت کبریا نے بخشا
یہ نام اُسے بختِ رسا نے بخشا

جب عذرِ گنہ کرتا تھا کہتے تھے حسینؑ
میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا

انیس۔

جب حر کا گنہ شاہِ امم نے بخشا
قطرے کو شرف بحرِ کرم نے بخشا

گردوں سے ندا آئی کہ اے سبطِ نبی
تو نے جسے بخشا اُسے ہم نے بخشا

(۳)

فکر مابعد الموت

دبیر۔

برزخ کی صعوبات کٹے گی کیونکر
تنہائی میں اوقات کٹے گی کیونکر

غفلت میں دبیر صبح پیری ہوئی شام
دن رات ہوا ، رات کٹے گی کیونکر

انیس۔

درد و الم ممات کیونکر گزرے
یہ چند نفس حیات کیونکر گزرے

پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیس
اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گزرے

(۴)

سفر آخرت و بے ثباتی دنیا

دبیر۔

آج آئے ہیں کل کوچ کی تیاری ہے
غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے

دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا
یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

انیس۔

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے

مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر یاں تک
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

(۵)
شاعرانہ خودستائی

دبیر۔

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں

خلاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

انیس۔

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں

میں باعثِ نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

(۶)
خاکساری

دبیر۔

بندوں پہ کرم حضرتِ باری کا ہے
مقدور کسے شکر گزاری کا ہے

دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہالِ خاکساری کا ہے

انیس۔

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے ۔۔۔ غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ ۔۔۔ ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

(۷)
اظہار کمال

دبیر۔

گنجینہ جسے رب ہمارا دیتا ہے ۔۔۔ وہ داد عطیۂ خدا دیتا ہے
خاموش حبابوں کے ہیں ظرف خالی ۔۔۔ دریا میں ہیں موتی وہ صدا دیتا ہے

انیس۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے ۔۔۔ وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی ۔۔۔ جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(۸)
قبر

دبیر۔

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا ۔۔۔ تنہا، تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیرؔ ۔۔۔ جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

انیس۔

آغوش لحد میں جبکہ سونا ہوگا ۔۔۔ جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ ۔۔۔ ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

(۹)

شیریں سخنی

دبیرؔ۔

شیریں سخنی پہ مورد تحسیں ہوں — واللہ نہ عیب بیں نہ نکتہ چیں ہوں
سکتے میں ہے میرے سخنِ شیریں سے — شکر کا ہے کیا منہ جو کہے شیریں ہوں

انیسؔ۔

کس منہ سے کہوں لائقِ تحسیں ہوں میں — کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر — کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

۱۰

آنسو

دبیرؔ۔

مجلس میں گلِ اشکِ عزا بوٹے ہیں — ثابت ہے دلا شیشۂ دل ٹوٹے ہیں
یاں اشکِ ریائی کا بھی ہے مول بہشت — موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں

انیسؔ۔

داغِ غمِ شہ سینے میں گل بوٹے ہیں — کیا کیا گہرِ بیش بہا لوٹے ہیں
مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں انیسؔ — اشک انکے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

(۱۱)

طلوعِ آفتاب

دبیرؔ۔

تھی بسکہ صبح قتل شہنشاہِ نامدار — اہلِ حرم تھے جیب دریدہ و اشکبار
تارِ شعاع سے یہی ہوتا تھا آشکار — خورشید نے کیا ہے گریباں کو تار تار
پو پھٹتے ہی، رسولؐ کا دامان پھٹ گیا
زہراؑ کے بھی کفن کا گریبان پھٹ گیا

انیس۔
تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرہ پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر ٹپکتی تھیں موجیں فرات کی

(۱۲)

دولت اور شرافت کا مقابلہ

دبیر۔
ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا — ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا — آئینہ گر اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

انیس۔
کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا — قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا — مِس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

(۱۳۳)

فرزند کا داغ

دبیر۔

وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا　　وہ رنج ہے کیا رنج کہ پایاں نہیں رکھتا
کس زخم کا مرہم دلِ انساں نہیں رکھتا　　کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا

بے صبر جس اندوہ میں ہر ایک بشر ہے
وہ داغ پسر داغِ پسر داغِ پسر ہے

جس درد کی تسکین میں عاجز ہیں خردمند　　وہ درد ہے کیا رحلتِ فرزندِ جگر بند
جب دست و گریباں ہو پدر سے غمِ فرزند　　وہ چاک یہی چاک ہے جس کا نہیں پیوند

سچ پوچھو تو فرزند کلیجہ ہے پدر کا
ناسور جگر میں نہ ہو اس لختِ جگر کا

فرزند گلِ باغِ تمنائے پدر ہے　　بے قدر ہے وہ شاخ جو بے برگ و ثمر ہے
تعویذِ تسلیٔ دلِ خلق پسر ہے　　داغ اس کا شگافِ جگر و زخمِ جگر ہے

کیوں دل میں پدر کے نہ ہو ناسور خلف کا
جب چاک گہر کے لئے سینہ ہو صدف کا

انیس۔

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ　　دل کو فگار کرتا ہے لختِ جگر کا داغ

آنکھوں کا نور کھوتا ہے نور بصر کا داغ
مرنا جوان بیٹے کا ہے عمر بھر کا داغ
یہ حال ابن فاطمہ رض کے دل سے پوچھیے
زخم جگر کے درد کو گھائل سے پوچھیے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہی پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہی پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہی پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہی پسر سے
آرام جگر، قوت دل، راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے
مالک سے بھرے گھر کے اجڑ جانیکو پوچھو
گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانیکو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانیکو پوچھو
یعقوب ع سے یوسف ع کے بچھڑ جانے کو پوچھو
اللہ دکھائے نہ الم نور نظر کا ؛؛
بہہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

(۱۴)

راکب و مرکب

دبیر

مرکب تو ہے، پھر راکب ذیشاں بھی ہو ایسا
طور ایسا ہو تو موسیٰ عمراں بھی ایسا ؛؛
اورنگ ہو ایسا تو سلیماں بھی ہو ایسا
اس شان کی ہو رحل تو قرآں بھی ہو ایسا
آہو بھی نکیں، شیر حجازی ہو تو ایسا
غازی ہو تو ایسا ہو جو تازی ہو تو ایسا ؛؛

انیس۔

تھا زینِ فرس رحل تو قرآں شہِ والا ؛ وہ تخت ہوا تھا تو سلیماں شہِ والا
وہ دوشِ صبا بوئے گلستاں شہِ والا وہ برجِ شرف نیّرِ تاباں شہِ والا
بو گل کی نسیمِ سحری لے کے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لے کے چلی ہے

۱۵

امام حسینؑ کی شہزادی سکینہؓ کو وصیت وقت رخصت

دبیر۔

سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا ؛
گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا لاشہ مرا تڑپے گا بہت مجھکو نہ رونا
گر چاہو، مری روح ہو ناشاد، سکینہؓ
تو غم میں مرے کیجیو فریاد سکینہؓ

انیس۔

دنیا ہے یہ، شادی ہے کبھی اور کبھی آلام راحت کی کبھی صبح، مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس سینے پہ آرام
ضد کر کے نہ اب باپ کو رویا کرو بی بی ؛
جب ہم نہ ہوں، تم خاک پہ سویا کرو بی بی

۱۶

زلف و رخ

دبیر۔

لاریب جرم ہے جو کہیں چاند رُخ کو ہم ہے چاند میں تو جرم یہ بے جرم لاجرم

رخ ہے وہ صبح شمس ہیں جسکے شہِ اُمم گیسو وہ شب کہ قدر شبِ قدر جس سے کم

گیسو و رُخ تو قدرتِ داور دکھاتے ہیں

ہر وقت شام صبح برابر دکھاتے ہیں

انیس۔

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب

یہ لطف عید اور شبِ قدر میں ہے کب ہے دو طرف دو چین و خطا بیچ میں حلب

رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں

اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

(۱۷)

گرمی

دبیر۔

وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا بس ہاتھ دھرا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا

بریاں ہوا۔ دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہ والا

پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر

پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہ دیں پر

انیس۔

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لوں کا وہ چلنا وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا

ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا   اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں

دبیر۔
مٹی خراب چرخ پہ ہے بُرجِ آب کی   رنگت سیہ ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی   حدت سے ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

انیس۔
گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں   انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں   تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

یہاں سے متحد المضامین مرثیہ مرزا دبیر و میر انیسؔ کے نکال لئے گئے ہیں وہ اصل کتاب کے ساتھ شائع ہونگے۔ جو عنقریب باہتمام مولوی محمد حسن صاحب علوی (علیگ) مالک نوار المطابع دکٹوریہ اسٹریٹ پل فرنگی محل لکھنؤ شائع ہوگی۔ اس کتاب کا حق اشاعت بحق نواب ذکی احمد علوی سلمہٗ محفوظ ہے۔   (مشیر احمد علوی)

اقتباسات کا سلسلہ طویل ہو گیا اب صرف ایک شعر اور سُن لیجئے۔ **دبیر**

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

انیس

اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے

مغربی سادگی کے دلدادہ کہیں گے کہ سعدی و فردوسی کو اگر جامی و نظامی پر ترجیح ہے شیکسپیر کی منزلت اگر ملٹن سے زیادہ ہے تو انیس کا مرتبہ دبیر سے بلند ہے اور وہ اُس تحسین و ستائش کا خراج وصول کرنیکے مستحق ہیں جو بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے اُنکے کلام پر نثار کیا جا رہا ہے۔

مشرقی نازک خیالوں کے فدائی اصرار کریں گے کہ انیس و دبیر آسمانِ سخنوری کے شمس و قمر تھے وجعلنا الّیل لباساً وجعلنا النہار معاشاً۔ دنیا کو دونوں کی ضرورت تھی

اور اُن کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہے
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہے

فقیر آمیر کا مشرب صلح کل، باسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام۔ وہ دونوں کا ہم آواز بن جاتا ہے مگر (دبیریوں کی نظر بچا کر) اُسکا عقیدہ وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے

انیس اب تو ہلال و بدر کو یکساں سمجھتے ہیں
رہی ہے منصفوں میں قدر یہ صاحب کمالوں کی

بزرگانِ ملک نے یہ رسم بنائی ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی سوانح عمری لکھتے ہیں تو

تو اُسکے کلام کا دوسرے مشاہیر سے مقابلہ کرکے اپنے ہیرو کی ترجیح ثابت کرتے ہیں۔ بعض برادرانِ وطن نے یہ ظلم کیا ہے کہ اپنے ممدوح کے چست و بلند کلام کا حریفوں کے سُست اور پست سخن سے موازنہ کرکے۔ رِند و صبا کا مرثیہ مرزا و دبیر سے بڑھا دیتے ہیں۔ تقابل کلام ادب کے لئے مفید ہے بشرطیکہ انتخاب دیانت سے کیا جائے اور جن اساتذہ کے رشحات قلم سے موازنہ مدنظر ہو اُنکے متحد المضامین اشعار نقل کر دیئے جائیں۔ مشک کی بو چھپ نہیں سکتی۔ اہل نظر خود امتیاز کرلیں گے کہ کس کا مرتبہ اعلیٰ ہے۔ یہ احوال پیشِ نظر رکھکر اس تالیف میں کلام انیس کی لطافتیں و نزاکتیں دکھانے اور منطق و فلسفہ کے دلائل سے میر صاحب کا پلہ گراں تر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میر صاحب اور اُنکے حریف مقابل مرزا دبیر سے متحد المضامین اشعار درج کر دیئے ہیں اور میر صاحب کا تفوق ثابت کرنے کے بہانہ سے کتاب کا حجم نہیں بڑھایا ہے ؎

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار

ہندوستان میں مرثیہ کی عہد بعہد ترقی کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اور ہر دور کے بعض شعراء کا کلام بھی بطور نمونہ درج کیا گیا جس سے ثابت ہوگیا کہ اس ملک میں مرثیہ ابیات سے شروع ہوا۔ پھر مربع کہا گیا۔ سکندر۔ و سودا نے مسدس کا آغاز کیا۔ میر ضمیر نے رزم و سراپا مرثیوں میں شامل کیا۔ اور غلط الفاظ جن کا استعمال بیانِ مصائب میں جائز سمجھا جاتا تھا ترک کئے میر انیس نے اس فن کو معراجِ کمال تک پہنچایا اور مرثیہ گوئی کو حقیقی شاعری بنا دیا

ادبی حیثیت سے اس صنفِ سخن کو خوب عروج ہوا مگر مورخ کی نظر میں ترقی معکوس ہوئی۔ بچپن میں جو سادگی اور صحت روایات کا التزام تھا۔ عنفوانِ شباب میں باقی نہ رہا اور جوانی کے وقت ضعیف و موضوع حکایات کا گہنا اس قدر پہنا دیا گیا کہ اصلی خط و خال بھی چھپ گئے۔ مرثیہ کا مقصود محبانِ حسینؑ کو رُلانا تھا۔ اور ایک ہی قسم کی روایات کو بار بار سُنتے سنتے عزاداروں کے آنسوؤں کا خزانہ خشک ہو گیا تھا۔ ضرورت تھی کہ کتب احادیث و مقاتل سے غیر مشہور حکایتیں تلاش کی جائیں اور اُن پر شاعری کا روغن چڑھا کر مجالس میں گرمی پیدا کی جائے۔ **مَس بکے اُدا بکے اَدیا** کا فرمان شعراء لکھنؤ کی چشم عقیدت کا سرمہ تھا۔ غمِ حسینؑ میں رونا رُلانا داخلِ عبادت سمجھ کر اُنھوں نے ہر ایک دردانگیز روایت کو بے تکلف نظم کرنا شروع کیا اور اس تحقیق کی کوشش نہیں کی کہ کونسی روایت ضعیف ہے اور کونسی موضوع۔ زعفر جن۔ ابوالحارث آہوانِ چین اور شہزادی حلب وغیرہ کے افسانے جن پر زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ اعتراض کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں نظم ہو گئے۔ راویوں کی جرح و تعدیل۔ علم حدیث کا دشوار ترین شعبہ ہے۔ ایک ہی راوی کو بعض علما ثقہ اور متدین اور دوسرے مبتدع اور وضاع بتاتے ہیں۔ اگر شعرا اپنا وقت عزیز تحقیق رُواۃ میں صرف کرتے تو "سیرت" اور "رجال" کو شاید فائدہ پہنچتا لیکن شاعری رخصت ہو جاتی اور جو سرمایہ دلکش نظموں کا آج ہمارے پاس موجود ہے۔ عالم وجود میں نہ آتا۔ دیکھیے حضرت امامؑ کا مجبور ہو کر اپنی عزیز بیٹی کو بیماری کی حالت میں تنہا خانہ ویرانی میں چھوڑنا نہایت ضعیف

روایت ہے۔ اگر یہ حکایت نظم نہ کی جاتی اُردو شاعری اس بے نظیر بیت سے محروم رہ جاتی جو حضرت صغراؓ کی زبان سے میر صاحب نے ادا کی ہے ؎

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چُرالیتا ہے مُنہ تکتی ہوں جس کا

اسی طرح حضرت شہر بانوؓ کا معرکۂ کربلا میں موجود ہونا روایات صحیحہ سے ثابت نہیں۔ اگر سخن سنج اس قصہ کی تحقیق شروع کرتے تو وہ بے شمار دردناک اشعار جو رُخصت امام از اہل حرمؑ کے موقع پر شعراء نے انکی زبان سے ادا کرائے ہیں نظم اُردو کو نصیب نہ ہوتے۔ حضرت قاسمؑ کی میدانِ کربلا میں شادی مسلمانوں کا ایک گروہ بے بنیاد قرار دیتا ہے۔ اگر اس حکایت کے نظم کرنے سے احتراز کیا جاتا تو درد انگیز اشاروں کا وہ لازوال گنجینہ نصیب نہ ہوتا۔ جو اسی قصہ کی بدولت دستیاب ہوا ہے۔ ضمیر کا مصرع۔ "دست بریدہ میں کہیں کنگنا بندھا ہوا" اُردو زبان کو میسر نہ آتا اور میر انیس نہ کہہ سکتے کہ ؎

کیا جانے ہوگا قبر میں کیا حال باپ کا
جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا

حضرت شہر بانوؓ کی آزاد کردہ کنیز شیریں کا قصہ نہایت مشتبہ ہے لیکن نظم اُردو کو اسی روایت کے طفیل میں یہ شعر نصیب ہوا کہ ؎

جام شربت کے بھرے ابنِ حسنؑ کی خاطر
گہنا پھولوں کا رکھا لاکے دُلہن کی خاطر

حضرت سکینہؓ کا زندانِ شام میں وفات پانا یقیناً غلط ہے لیکن مرزا دبیر کا

مشہور مرثیہ "جب قبر سکینہؓ پہ حرم آئے سوم کو"۔ اسی حکایت کی بنیاد پر سوز و گداز کی تصویر بنا۔

مورخ کی نگاہ میں شہنشاہان سخن کی یہ کمزوری کتنی ہی معیوب ہو لیکن نظم اُردو جواہرات کی ان قیمتی لڑیوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ اور شاعری کی سرکار سے مرثیہ گویان لکھنؤ اس قصور پر ہدف اعتراضات کبھی نہ بنائے جائیں گے کہ انہوں نے ضعیف اور موزوں روایات کو نظم کیا۔ اگر ایک امر محال کو شاعر نے ممکن فرض کر لیا اور اُس خود ساختہ عالم میں اپنی سحر طرازی کا جلوہ دکھایا تو نقادانِ سخن کو اس اعتراض کا کوئی منصب نہیں کہ جدید عالم امکان کیوں بنایا گیا۔ البتہ اگر اُس نوایجاد دائرہ میں شاعر کا کوئی بیان مقتضائے حال کے خلاف ہو تو اُس کی قادر الکلامی پر اعتراض کیا جائیگا۔ مرثیہ گویوں نے غلط روایتیں نظم کیں۔ لکھنؤ کی شادی و غمی کی رسوم عرب پر منطبق کئے۔ جوہی اور بیلے کے پھول عراق کے جنگل میں بچھا دیئے۔ یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا لیکن غضب یہ کیا کہ اہل مجلس کو رُلانے کے شوق میں بعض موقعوں پر حضرت امام اور اُنکے اہل حرم کے اصلی کریکٹر پر بھی پردہ ڈال دیا۔ اُنکی زبان سے ایسے الفاظ ادا کرائے جن سے بے صبری اور شکوے شکایت کی بو آتی ہے۔ وہ سب کے سب میدان رضا و تسلیم کے شہسوار تھے۔ اور اہل محبت کے قول کے مطابق کربلا کا معرکہ عشاق کے صبر و تحمل کا امتحان تھا جب عاشق امتحان صبر و وفا میں کامل نکلا تو معشوق خود عاشق بن گیا اور آج دنیا میں اس داستانِ عشق و محبت کی وہ شہرت ہے جو کائنات عالم کے کسی ہنگامہ کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ گریۂ و زاری تو بڑی چیز ہے

اگر حضرت کے دل مبارک پر مَیل بھی آتا تو دنیا کا تختہ اُلٹ جاتا۔ دشمنوں کی کیا مجال تھی کہ وہ آپ کو قتل کر سکتے یا اہل حرم کو تاراج کرنے کی جرأت کرتے۔ افسوس ہے کہ اُس برگزیدۂ عالم کی زبان سے بعض مرثیہ گویوں نے ایسے اضطراب اور بے صبری کے کلمات کہلائے جو اُنکے غلامان غلام پر بھی زیب نہیں دیتے۔

میر انیس نے جناب امام علیہ السلام کے صبر و رضا اور شوقِ شہادت کا بیان نہایت ہی موثر اور بلند الفاظ میں کیا تاہم اس رسم دیرینہ کو وہ قطعاً مسترد نہ کر سکے اور اُن کے کلیات میں بھی بعض جگہ ایسے کلمات پائے جاتے ہیں جو نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ کربلا کی لڑائی "رزمیہ نظم" کے لئے مناسب مضمون تھے یا نہیں گویوں نے معرکہ جنگ اس زور شور سے بیان کیا کہ الفاظ سے دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ لڑائی کے تمام ساز و سامان آلات و اسلحہ تفصیل سے لکھے۔ حریفوں کے داؤں پیچ بھی خوب دکھائے۔ لیکن اسکا کیا جواب ہے کہ دنیا کی کوئی مشہور رزمیہ نظم ایسی ہے۔ جس میں شاعر کے ہیرو کو ظاہری شکست ہوئی ہو۔ یونان کی قدیم ایپک۔ الیڈ۔ شاعر کے ہم قوموں کی فتح کی داستان ہے۔ آڈیسی اُس کے ایک ہم وطن کی بحری کامیابیوں کا ترانہ ہے۔ راماین راجہ رامچندر کی فتح مندی کا نغمہ ہے۔ مہابھارت۔ سری کرشن جی کی امداد سے اُن کے دوستوں کی کامیابی کا راگ ہے۔ سکندر نامہ میں نظامی کا ہیرو ہر معرکہ میں سرخ رو ہوتا ہے۔ شاہنامہ میں رستم ہر ایک مہم کو سر کرتا ہے۔ حملۂ حیدری میں حضرت اسداللہ الغالبؓ کے

فتوحات کی روایت ہے اور انگلستان کی مشہور نظم پیرڈائز لاسٹ میں اگرچہ بیان رزم بہت مختصر ہے مگر جس قدر ہے اُس کا انجام حق کی ظفر ہے۔

کربلا کی لڑائی نہ تو مہابھارت کے سے وسیع پیمانہ پر تھی اور نہ اس سے دنیا کی تاریخ میں جنگ سکندر و دارا کی طرح فوراً کوئی انقلاب پیدا ہوا۔ بلکہ ظاہرا باطل نے حق پر غلبہ پایا اور ایک مدت کے لئے حق پرستوں کی طاقت بالکل زائل ہوگئی اس دردناک انجام پر غم کرنا آنسو بہانا واجب ہے اور مرثیہ گوئی کے لئے یہ بہترین مضمون ہے لیکن حرمان وحسرت کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانی جذبات کی تصویریہ رزمیہ نظموں میں کھینچی جاتی ہے جو مرثیوں میں کسی طرح شامل نہیں ہوسکتی۔ زمانہ حال کے تعلیم یافتہ اُردو شاعری میں ایپک پویم کا موجود نہونا اپنے ملکی زبان کے چہرہ پر بدنما داغ تصور کرتے اور کلیات دبیر وانیس سے اشعار انتخاب کرکے ایک مسلسل رزمیہ نظم تیار کرنا چاہتے ہیں۔ بیشک مرثیہ گویان لکھنؤ کے کلام سے سیکڑوں اشعار ایسے تلاش کئے جاسکتے ہیں جن کا جواب فردوسی اور نظامی کے کلیات میں نہ مل سکے۔ اور اُن تاجدارن کشورسخن کے لئے ایک مسلسل نظم بھی لکھ دینا چنداں دشوار نہ تھا مگر وہ غالباً بیسویں صدی کے روشن خیالوں سے زیادہ دوراندیش تھے اور انھوں نے پہلے ہی دریافت کرلیا تھا کہ واقعہ کربلا کا بیان رزمیہ نظم کا موضوع بنانے کے لئے مناسب نہیں۔ اس لئے اپنا جوہر کمال دکھانے کے لئے انہوں نے رزمیہ شاعری کے تمام شرائط جمع کردیئے لیکن شاہنامہ وسکندرنامہ کا جواب نہیں لکھا اور مسلسل نظم تیار نہیں کی۔

غرض مرثیہ کا مقصود نہ تاریخ نویسی ہے اور نہ بیان رزم۔ وہ صرف درد وغم

کے جذبہ کو حرکت دینے کا آلہ ہے اور اس حیثیت سے میر انیس اور اُن کے ہمعصروں نے جو کچھ کہا خوب کہا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

حالی

اردو کو رواج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے
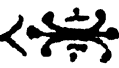
تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے ہر ماہ مطلع کرتے رہیں۔ تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور اُنکو شوق کے ساتھ خریدیں۔ اس لحاظ سے کہ اس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں۔ رسالہ کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ حضرات مصنفین و اہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا ضروری فرض تصور فرمائیں گے۔

(مینیجر)

تنہائی

(ایک انگریزی نظم سے متاثر ہو کر)

از جناب نواب مرزا جعفر علی خانصاحب بی-ای- آنرڈ ڈپٹی کلکٹر

دھوپ میں اس قدر تمازت ہے (۱) خامشی بر سرِ حکومت ہے
آسماں یوں ہے ابر سے خالی جس طرح روشنی سے تاریکی
رقص کرتی ہے موج دریا کی برق کی خیرگی ہے شوخی بھی
دوپہر کا جلال چھایا ہے سایہ نے ڈر کے منہ چھپایا ہے
اس قدر ہے سبک زمیں کی نمی کہ شگوفے کھلا نہیں سکتی
ہے صدائے طیور میں نرمی اور ہوائے بحور میں نرمی
شہر سے ہمہمہ نہیں اٹھتا بند ہے سازِ زندگی کی صدا
سطح دریا ہے اس قدر ہموار (۲) ابھر آئی ہے سبز نیلی سِوار
موجِ ساحل میں نور کا زد و خور جیسے تاروں کے ساتھ بارشِ نور
آہ اس وقت بھی میں تنہا ہوں سر جھکائے خموش بیٹھا ہوں
بحر اوڑھے ہے برق کی چادر بجلیاں گر رہی ہیں دل پہ ادھر
جنبشِ موج میں ترانہ ہے بیت لب پہ یہ عاشقانہ ہے
"کاش اس وقت تو یہاں ہوتا میرا ہمدرد ہمزباں ہوتا"
جان صرفِ نیاز ہو جاتی بیکسی کارساز ہو جاتی
لیکن ایسی کہاں مری قسمت کہ ہو راز و نیاز کی صحبت

ہائے ہمت جواب دیتی ہے (۴) آہ طاقت جواب دیتی ہے
چین آتا نہیں مجھے دم بھر تہ و بالا ہوئے ہیں قلب و جگر
اب کہاں وہ سکون و صبر و قرار دل بسمل کا تھا کبھی جو شعار
ہیچ تھی ساری عشرتِ دنیا راز داری میں غم کی تھا وہ مزا
بتِ کافر کو یہ بھی شاق ہوا (۵) ترکتازی کا اشتیاق ہوا
ایک تیرِ نگہ غلط انداز دل کی جانب چلا بصد انداز
خرمنِ صبر پر گری بجلی پھونک دی عقل و ہوش کی پونجی
مجھ کو بیداد گر نے لوٹ لیا لطف کی اک نظر نے لوٹ لیا
پھر نہ پرسش نہ مہربانی تھی وہی پہلی سی بدگمانی تھی
ہے زمانے کو فکر شہرت کی (۶) جاہ و حشمت کی عیش و راحت کی
اُن کو حاصل ہو لطف شرب مدام زہر سے ہے لبالب اپنا جام
آہ سرمایۂ اثر نہ رہی لذتِ گریۂ سحر نہ رہی
میں ہوں اور اک جہانِ مایوسی زندگی ترجمانِ مایوسی
سر سے آخر گزر گیا طوفاں (۷) اب نہیں وہ کشاکش تن و جاں
خار حسرت کی وہ خلش نہ رہی دل وہی ہے مگر تپش نہ رہی
غم نہ اب انتشار رہتا ہے موت کا انتظار رہتا ہے

مگر اُس کو خبر بھی ہو کہ نہ ہو
مژدہ اشکوں سے تر بھی ہو کہ نہ ہو
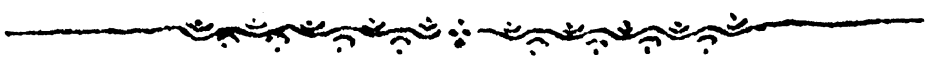
ہندوستان اور ذات

(مس کارنیلیا سہراب جی)

ترجمہ از سید محمد ابراہیم صاحب، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

ہندوستان کی اچھوت قوموں کے تذکرے انگلستان کے اخبار و نمیں برابر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آئین و ضوابط کا جو ذات کے نام سے موسوم ہیں، انگلستان میں اصلی مطلب نہیں سمجھا جاتا، اس میں شک نہیں کہ ذات کی جانب راسخ العقیدہ ہندو کے رویہ کا تذکرہ انگلستان میں شاذونادر ہی سماعت پذیر ہوتا ہے، جس کی وجہ جو کچھ بھی ہو، خواہ راسخ العقیدہ ہندوؤں کی انگریزی زبان سے ناواقفیت یا ایک غیر تبلیغی مذہب کی جانب مغرب کے خیالات سے بے اعتنائی۔

میری خواہش ہے، کہ گذشتہ بیس سال میں جو کچھ معلومات میں نے راسخ العقیدہ ہندوؤں کی صحبت میں حاصل کیا ہے، قلمبند کروں۔

صوبجات بنگال، بہار، اڈیسہ اور آسام کے ہندوؤں کا تذکرہ میں بالتخصیص کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی معلومات کی صحت کے خیال سے بنارس، گیا، ہردوار، دوارکاناتھ، پریاگ اور رامیشرم میں ہندوؤں سے گفتگو کی اور جس نتیجہ پر کہ میں پہنچی ہوں، وہ ان تبادلہ خیالات کا نتیجہ ہے۔

مسئلۂ ذات ماہرین اقوام کے نزدیک ایک ادنی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ سر ہربرٹ رزلے اپنی کتاب 'بنگال کے قبائل اور اُن کی ذات' میں تحریر فرماتی

ہیں" جتنی لانبی ناک اُتنی ہی عالی ذات"۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ تفریق ایرین اور
ڈریوڈین کی ہے۔ اور ایک ذات کی دوسری ذات سے اس بنا پر تفریق نہیں ہوسکتی۔
لیکن ایک پابند مذہب ہندو کے لئے صورت حالات کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔
اس کے نزدیک ذات کا تعلق مسئلہ تناسخ سے ہے۔ یہ وہ درجات ہیں جو ایک
انسان کو اسکی گذشتہ زندگی کے اعمال کی بنا پر آئندہ زندگی میں ملتے ہیں۔
ذات ایک سوشل تنظیم نہیں ہے اور نہ اس سے کسی قسم کی دنیاوی مساوات
میں فرق آتا ہے۔ یہ ایک آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اپنے اس ذاتی وقار کو
قایم رکھیں یا برباد کر دیں۔ اس کی بربادی آپ کو راست رو ہندوؤں کی برادری
سے محروم کر دیگی۔ اور اسکی سزا اس زندگی کے بعد بھی آپ پر لاحق ہوگی۔
ہر شخص جانتا ہے کہ ابتدا میں ذات کا وجود پیشیوں کی تقسیم کے باعث ہوا؛
چنانچہ برہمنوں کے سپرد خدا کی عبادت و علوم کی محافظت کی گئی، چھتریوں کو جنگ
کا بیڑا دیا گیا، ویشوں کو کاشتکاری، اور شدروں کو خدمت گاری کے پیشے
عطا ہوئے۔ یہ تقسیم اس ابتدائی زمانہ میں لوگوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب
حال تھی، اور اثنائے زمانہ میں یورپ کے پیشہ فرقوں کے مانند بہت سی ذاتیں پیشیوں
کے لحاظ سے بنتی گئیں اور شامل ہوتی گئیں۔ تاہم ایک راسخ العقیدہ ہندوؤں کے
نزدیک ذات پیشہ نہیں ہے۔ اسکے نزدیک ذات وہ نام ہے جو مشیت ایزدی
نے اپنی قلم سے ایک ہندو کے لئے اسکی پیدائشوں کی کتاب میں تجویز کر دیا ہے۔

لہ نوٹ صفحہ ۳۰۔ Sir Herbert Risley:
"Tribes + Casts of Bengal."

اور جس کا وقار کے ساتھ قائم رکھنا اسکا فرض منصبی ہے۔

ہندو مذہب میں کیا دینی اور کیا دنیاوی، سب امور کا انحصار ذات پر ہے۔ مثلاً ایک شخص خدا کی عبادت، قربانی اور ایثار نفسی، اُن قواعد کے خلاف نہیں کر سکتا، جو اسکا مذہب ذات کی شکل میں اس پر عائد کرتا ہے، اور تقریباً ہر وہ فعل جسکی انجام دہی فرائض زندگی میں داخل ہے، اور جس سے ہندو شاستر کے مطابق اہم نتائج مرتب ہو سکتے ہیں، ذات پر منحصر ہے۔ پیدائش، شادی، موت اور وراثت ملکیت کے رسومات یہ سب ذات ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندو شاستر کے مطابق متوفی کے نام پر کھانا کھلانے کا مسئلہ وراثت کے مسئلہ سے وابستہ ہے۔ اسکی رُو سے صرف وہی شخص متوفی کے نام پر کھانا کھلانیکا مستحق ہے جو اسکا جائز وارث ہو اور اسکی شرط یہ ہے کہ وہ متوفی کی اس اہلیہ سے پیدا ہوا ہو جو ذات میں اس کی ہم پلہ اور اسی برادری کی ہو اور جس سے اس کی شادی جائز طور پر ہوئی ہو۔

ہندو شاستر کے بموجب انسان کی خلقیت اسکی روح کو نجات دلانیکے واسطے ہے، اور اس کا وارث اسکے لئے ایک مفید ہستی ہے جس کے توصل سے اسکو نجات حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے سے ظاہر ہو جائیگا کہ وہ عملی دقتیں کیا ہیں جو ذات کی تفریق اٹھا دینے سے پیش آئیں گی۔ مثالاً میں اُن مشکلات کا حوالہ دینا چاہتی ہوں جو دہلی کی کونسل میں انٹر کاسٹ میرج بل[1] پیش کرتے وقت سامنے آئی تھیں۔ شادی، وراثت اور اولاد اگون کے تمام مسائل خطرے میں پڑ گئے تھے۔ اس بل کی

[1] Inter Caste Marrige Bill

مخالفت راسخ العقیدہ ہندؤں نے صرف مخالفت کی غرض سے نہیں کی تھی،
بلکہ یہ محسوس کر کے کہ انکے مذہب کا قدیم پیپل جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔ وہ کہنے
لگے کہ برٹش گورنمنٹ ہمیشہ ہمارے عقائد کی حرمت کرتی آئی ہے۔ اب یہ
نئی بات کیوں ہو رہی ہے؟ شادی میں ذات کی پابندی ہمارے عقائد کے
لحاظ سے ہمارے مذہب کا جز کل ہے۔ اُن کو کیا خبر تھی کہ یہ برٹش گورنمنٹ
نہ تھی بلکہ نئی روشنی کے ترقی یافتہ ہندو تھے، جو کونسل میں یہ تجویز پیش کر رہے
تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل یادگار رہے گی کہ مہاراجہ دربھنگہ نے، جو
بنگال بہار و اوڑیسہ کے پابند مذہب ہندؤں کے لیڈر ہیں، صورت حالات
کو اس قدر اہمیت دی کہ اپنے زیر صدارت ایک مجلس کی اور اس بل کے
خلاف صدائے احتیاج بلند کی۔

بہت سے نام ایسے ہیں جنکے برہمن، چھتری یا دیش ہونے کا اعتراف
ہندو پنڈت کرتے ہیں، لیکن وہ پوری طرح سے قوانین ذات کی پابندی نہ کرنے
سے اپنا ذاتی وقار کھو بیٹھے ہیں۔ ایک مکرجی، چٹرجی یا بھٹاچارجی، جو برہمن
پیدا ہوا ہو، سمندر پار سفر کرنے یا ممنوع غذا کھانے یا فعل کرنے سے اپنے
آپ کو بے دھرم کر لیتا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے کو برہمن سمجھتا ہے، مگر ایک
پابند مذہب ہندو کے نزدیک، جب تک وہ پرشچت (کفارہ) کے سخت مذہبی
رسومات کو ادا نہ کرے اور پاک نہ ہو جائے، برہمن نہیں ہو سکتا۔

مہاتما گاندھی کے پیرو کار، اور دیگر موجودہ زمانہ کی تہذیب کے دلدادہ ہندو،
ان رسومات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ذات کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی

کوشش میں سرگرم ہیں اور خود ذات نہ رکھنے پر فخر کرتے ہیں۔ چونکہ لیجسلیٹو کونسلوں اور اسمبلیوں میں اس روشنی کے لوگ زیادہ تعداد میں قوم کی نمائندگی کر رہے ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق گورنمنٹ سے ہے یہی لوگ انگریزوں کے بعد ملک پہ حکمرانی کر رہے ہیں۔

میں نے اکثر انگلستان کے مشہور اخباروں میں پڑھا ہے کہ رفارم اسکیم کے بموجب ہندوستان کی حکومت کی باگ برہمنوں کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے جسکا لازمی نتیجہ اچھوت قوموں پہ تشدد کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ یہ خیال غلط ہے واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس وقت ایسے لوگوں کے زیر حکومت ہیں، جنکی ذات جو کچھ بھی ہو، مگر فی الحال اُنھوں نے دیدہ دانستہ اپنے کو بے ذات قوموں کے زمرہ میں ڈال رکھا ہے، اور اپنی سوشل حالت درست کرنیکے لئے بخوشی نیچی قوموں کی داد و دہش و ترقی کے سامان مہیا کرنے میں مشغول ہیں۔ فی الحقیقت اس وقت اچھوت قوموں سے زیادہ قدامت پسند ہندؤں کی محافظت کی ضرورت ہے۔ کرسچین سوشلسٹ اور جمہوریت پسند اشخاصوں کے زاویہ نظر سے نئی روشنی کے ترقی یافتہ ہندؤں کا ذات کی جانب یہ رویہ ایک بہت پاکیزہ نصب العین رکھتا ہے، تاہم ہندوا یسے ایک قدیم مذہب کے قدیم نظام میں مداخلت کی مشکلات کا اندازہ کرنا ضروری ہے، اور تفریق ذات کو برطرف کرنا مذہب میں مداخلت ضرور ہے۔

اہل انگلستان کا یہ خیال، کہ ذات ایک سوشل تنظیم ہے، صرف ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ میں نے سمجھانیکی کوشش کی ہے، یہ روحانیت کی ایک

اعزازی فہرست ہے جو قضا و قدر کے ہاتھوں انسان کے ایک جنم سے دوسرے جنم کی طویل زندگی میں برابر مرتب اور شائع ہوتی رہتی ہے۔ جو کچھ اعزاز اسکو ملتا ہے، اس کی گاڑھی کمائی کی اُجرت ہے۔ یہ انسان کی خواہش پر ہے، کہ وہ اپنی زندگی اس روئے زمین پر جیسی چاہے بسر کرے، لیکن گذشتہ زندگی کے اعمال کا اعتراف کرتے ہوئے بلا کسی عذر و معذرت کے اسکو نیا جنم لینا ہوگا۔

دولت کا کوئی تعلق ذات سے نہیں ہے۔ ایک کم ذات والی ملک ایک اعلیٰ ذات بھیک منگے کی پالاگن کریگا۔ اس کو اپنے ساتھ آراستہ ہاتھی پہ بٹھا لینے کا ملتمس ہوگا، عاجزی کریگا، اور دلشکن جواب پائیگا۔

دنیاوی اعزاز اور ذات دو مختلف چیزیں ہیں۔ میں بذات خود واقف ہوں کہ ایک مہاراجہ، جو ذات کے تیلی تھے، جب اپنے افسر سے ملنے جاتے، تو اُسکے کلرک کی، جو برہمن تھا ہمیشہ پالاگن کرتے۔ نیز ذات کا ماحصل دنیاوی وقار یا دولت نہیں ہے۔

اس ذات کے نظام میں ایک ایسی خوبی مضمر ہے، جس کی تبلیغ کی خواہش ہر انسان کو ہوگی، اور وہ چاہے گا کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تمام دنیا اس پر کاربند ہو جائے۔ وہ اصول یہ ہے کہ خدمت کرنے سے انسان کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ شخص، جو سب سے اونچی ذات میں پیدا ہوا ہو، نیچے سے نیچے قوم کی خدمت سے بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ وہ تمام ذاتوں کی خدمت کرے، لیکن کسی دوسری ذات سے خدمت نہ لے۔ جس زمانہ میں کہ بنگال میں سوشل خدمات کی لہریں طغیانی پر تھیں، میں نے

خود اپنی آنکھوں سے برہمنوں کو کم ذات کوڑھیوں کے پیر دھوتے ہوئے دیکھا ہے۔ چنانچہ جس کسی نے بھی ہندوستان میں ریل پر سفر کیا ہوگا، برہمنوں کو تھرڈ کلاس میں اچھوت قوموں کو پانی پلاتے دیکھا ہوگا۔

یہ تو اُن لوگوں کے تعلقات ہوئے جو ذات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ایک ہی ذات اور برادری کے لوگوں میں آپس میں کیا تعلقات ہوتے ہیں۔ اس کا اظہار بخوبی اُس گیت سے ہو جاتا ہے، جس کو ہندو عورتیں ہر روز علی الصباح بوقت پوجا پوتر تلسی میں پانی دیتے وقت گاتی ہیں۔

"تلسی کی خوشبو، شادی، دفن اور محبت کرنے کے رسومات کو،
جو تمہاری ذات میں رائج ہوں، کبھی مت بھولو:۔

اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ذات کس طرح شادی کرنے، دفن کرنے اور محبت کرنے میں برادری کے ہر فرد کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے، اور کس طرح سوشل پارمنٹ کا تھا جُوا ان تمام امور میں ہر شخص کی گردن پر رکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نہ جانتے ہوں، کہ آپ کے گاؤں میں آپ کے کسی ہم ذات بھائی کا لڑکا کنوارہ ہے۔ مگر آپ ہر طرح سے مستحق ہیں کہ آپ اپنی لڑکی کو اسکے لڑکے سے منسوب کریں۔ آپ کو مجاز حاصل ہے کہ ایک ہم ذات شخص کا جنازہ اٹھانے کیلئے آپ اپنے ہم ذات بھائیوں کی امداد طلب کریں، کیونکہ لاش اگر نیچ ذات سے چھو جائے تو ناپاک ہو جاتی ہے اور اسکی سزا متوفی کو اپنے دوسرے جنم میں بھگتنی پڑتی ہے۔ زندوں کا فرض ہے کہ

مردوں کو ایسے عذاب سے بچائیں۔

برادری کی سب سے بڑی پہچان ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہے۔ ایسے مواقع شادی کی دعوتوں اور موت کے کھانوں میں ملتے ہیں۔ موت کے کھانے سے وہ دعوت مراد ہے جو ایک شخص کے مرنے کے بعد اُسکے نام پر اسکی نجات اور بہبودی کے لئے برہمنوں یا عالی ذات لوگوں کو دی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک کھانا پکانا بھی ایک قسم کی عبادت ہے، اور کھانا کھانا انکے یہاں ایک مذہبی فعل ہے۔ انہی وجہوں سے ہندوستان کے اکثر مقامات کے ہندو اپنے سے کم ذات والوں سے کہتے ہیں "ہم تمہارے ساتھ کھیل سکتے ہیں، گفتگو کر سکتے ہیں، لیکن تمہارے ساتھ نہ کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں، اور نہ عبادت کر سکتے ہیں۔" یہ ایک مخلصانہ قول ہے، مشیت ایزدی نے برہمن کو برہمن اور شدر کو شدر پیدا کیا۔ اس میں نہ کبر و نخوت کی گنجائش ہے نہ بغض و شکایت کی۔ اس جنم کا برہمن آیندہ جنم کا شدر ہو جائیگا، اور اسکے برخلاف شدر کے لئے بھی ترقی ممکن ہے۔ اس لئے ہندوستانی جب اپنے حال پہ چھوڑ دیئے جاتے ہیں، تو صورتِ حال ذاتی کدورت سے پاک نظر آتی ہے۔ شدر برہمن پر اپنی خراب حالت کا الزام نہیں رکھتا ہے۔ اسکا اعتقاد ہے کہ اسکی موجودہ حالت کی وجہ صرف اس کے پچھلی زندگی کے افعال ہیں۔

اس کی دلیل میں میں ناظرین کے سامنے دو قصے پیش کرنا چاہتی ہوں۔

(۱) مہابھارت کی کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ پانڈو بھائی اُفتان و خیزاں ایک دن اپنے اُستاد تیرانداز کے پاس ایک قصہ کی گوش گذاری کے واسطے، جس سے وہ خوف زدہ ہو گئے تھے، گئے اور کہنے لگے "مہراج جنگل میں ایک نیچ ذات

شخص تیر و کمان استعمال کرتا ہے۔ اس کا نشانہ چھتریوں سے بھی عمدہ ہے۔ آج کا واقعہ ہے کہ ایک پوشیدہ جگہ سے ایک تیر آیا اور ہمارے کتے کی زبان زخمی کرگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آواز پر نشانہ مارا ہے۔ ہم نے جنگل میں تلاش کی، اور دیکھا کہ ایک نیچ ذات شخص نشانہ مشق کر رہا ہے اور لاپرواہی کے ساتھ جنگل میں تیر پھینک رہا ہے۔ وہ تنہا آپ کے ایک مورتی کے پاس رہتا ہے اور اپنے کو آپ کا شاگرد بتلاتا ہے" ماہر فن مع اپنے شاگردوں کے اس جگہ جب پہنچا تو اس شخص کو بدستور نشانہ مشق کرتے ہوئے پایا۔ استاد کچھ دیر تو متعجب خاموش کھڑا رہا پھر پوچھنے لگا" تم کون ہو؟" "مہراج" اس شخص نے جواب دیا" میں فن سپہگری میں آپ کا ایک شاگرد ہوں"

"تو میرا شاگرد، نہیں اور ہرگز نہیں۔ تو مجھ سے فن سپہگری سیکھنے کا ضرور ملتجی ہوا تھا، مگر مجھے اپنا جواب یاد ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تو چھتری ہے؟ اور تو نے جواب دیا تھا کہ نہیں۔ تو نے بڑی منت اور عاجزی کی تھی اور اپنی سلطنت دینے کا وعدہ کیا تھا، جس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تو دکھن میں کسی ملک کا راجہ ہے، کیا تجھے میرا جواب یاد نہیں؟ میں نے تجھے فوراً سامنے سے ہٹ جانیکا حکم دیا تھا۔ پھر تو کیسے کہتا ہے کہ تو میرا شاگرد ہے؟

"مہراج جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل درست ہے۔ جب میں آپکے سامنے سے ناکام واپس ہونے لگا تو میرے دل پر رنج والم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی فوراً مرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ میں آپ کی ایک مورت بناؤں اور آپ کے فن تیراندازی پر رات دن غور کروں اور طلوع آفتاب سے غروب آفتاب

تک برابر اپنا نشانہ مشق کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اور جو کچھ کمال آپ دیکھتے ہیں اسی کی بدولت ہے۔ اب آپ خود ہی فرمائیے کہ اگر میں آپ کا شاگرد نہیں تو پھر کس کا شاگرد ہوں؟"

"اگر میں تیرا اُستاد ہوں تو مجھے مری اجرت ملنی چاہیئے" اُستاد نے جواب دیا۔

"میرے مہاراج میری سلطنت آپ کے نذر ہے"

"لیکن مجھے وہ اجرت ملنی چاہیئے جس کی مجھے خواہش ہو اور جو میں تجھ سے طلب کروں"

"جو مہاراج کی مرضی ہو"

"تو مجھے تیرا داہنا ہاتھ درکار ہے"

اور قصہ یوں ختم ہوتا ہے، کہ اس نیچ ذات شخص نے خوشی خوشی اپنا داہنا ہاتھ قلم کرکے اُستاد کے قدموں پہ رکھ دیا۔ اُستاد نے کٹا ہوا ہاتھ اپنے پیر سے ٹھکرا دیا۔ اور واپس آیا اور ناکامیاب ہمیشہ کے لئے تیر چلانے سے معذور ہوگیا۔

یہ قصہ اُن تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے جو زمانۂ قدیم میں نیچ ذات ہندو اور اونچ ذات ہندو کے درمیان میں تھے۔

(۲) دوسرے قصہ کے لئے میں اُس زمانہ کی تواریخ گردانی کرونگی جب مغلیہ خاندان ہندوستان پہ حکمراں تھا، اور جب بنگال کے حکومت کی باگ ایک مسلمان نواب کے ہاتھ میں تھی۔ نواب کے محکمۂ مال کا ایک افسر

ہندو تھا، جو نواب کے مکان پر اکثر مشورہ کے لئے آیا کرتا تھا۔ ایک روز رمضان کے زمانہ میں وہ نواب کے مکان پر جب پہنچا تو دیکھا کہ وہ مسند پہ بیٹھے ہوئے ایک گلاب سونگھ رہے ہیں۔

اُس ہندو افسر نے عرض کیا "ہمارے نواب صاحب نے اپنا روزہ توڑ ڈالا کیونکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق سونگھنا قریب کھانیکے ہے۔"

اس وقت تو نواب صاحب نے یہ کہکر "آیئے کام شروع کریں" بات ٹال دی مگر اسکی خلش دل میں باقی رہی۔ ایک دن جب وہ ہندو افسر روزے سے تھا، اسکو بدستور کام کے لئے نواب صاحب نے بُلایا۔ جب وہ مکان پر پہنچا نوابصاحب کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان پر گائے کا گوشت چنا ہوا تھا جس کی خوشبو سے تمام کمرہ معطر تھا۔ نوبصاحب نے ہندو افسر کو اندر بلاکر ارشاد فرمایا "میرے دوست آج تو تم نے اپنی ذات بھی کھوئی اور روزہ بھی، کیونکہ تمہارے عقیدے کے مطابق سونگھنا قریب کھانیکے ہے۔"

ہندو افسر کو سوائے مسلمان ہونیکے اور کیا چارہ تھا! آج تک اس خاندان کے لوگ چھٹیا کانگ میں جہاں پر انہوں نے اپنی بود و باش اختیار کر لی ہے موجود ہیں اور نام کے ہندو مذہب میں مسلمان ہیں۔ مجھے یہ واقعہ اُسی خاندان کے ایک شخص نے اپنے خاندانی تاریخ میں دکھلایا ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نے بے دھرمی قبول کی اور غیر ہندوؤں کے ہاتھوں اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔ یہ فعل اُسکے لئے اسکی متبرک کتابوں کی بنا پر لا بودی ہو گیا تھا۔ آجتک اس خاندان کے لوگ بلا کسی اظہار کدورت اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔

میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ دونوں قصے ایسی مثالیں ہیں جو شاذونادر واقع ہوتی ہیں۔ مگر انسے ایک حقیقتِ مسلمہ پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ مظالم، جو ذات کے بہانہ سے قدیم زمانہ کے پنچ ذات ہندوؤں پر انہی کی قوم کے ہاتھوں ہوئے، یا اعلیٰ ذات ہندوؤں پہ دوسری قوم کے ہاتھوں ہوئے ہمیشہ قسمت کی تجویز سمجھے جاتے تھے۔ مشیت ایزدی نے ایسا ہی طے کردیا تھا اس لئے کسی قسم کی کدورت وناراضگی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آج آپ ایک راسخ العقیدہ ہندو سے گفتگو کریں، تو آج بھی آپ اسکے خیالات ویسے ہی پائینگے جیسے قدیم زمانہ کے ہندوؤں کے تھے۔

صرف فرق اتنا ہوا ہے کہ پنڈتوں نے ذات میں واپس لے لینے کے قواعد کی سختیوں کو کم کردیا ہے۔ قدیم زمانہ کے پنڈت بڑی مشکل سے صرف چند صورتوں میں پرائشچت (کفارہ) کے رسم کی ادائگی کی اجازت دیتے تھے۔ اب ولایت سے واپس شدہ ہندو اپنی ذات پھر بہ آسانی خرید لیتا ہے۔ پنچ قوموں کی حالت میں انقلاب پیدا کرنا یا انکے ساتھ عمدہ سلوک کرنیکی کوشش کرنا یہ ایسی باتیں ہیں جنکو نہ پنچ ذات ہندو خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ اسکا احساس اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں میں ہے۔ یہ صرف مغربی تعلیم اور مغربی سوشیل اثر کا نتیجہ ہے۔

ایسی صورت میں کیا یہ درست اور جائز ہوگا کہ ترقی یافتہ ہندو اپنے سوشل آزادی کے پروگرام کو قبول کرنیکے لئے راسخ العقیدہ ہندوؤں کو مجبور کریں؟ فرقہ اول کے نزدیک ذات کا کوئی اثر مذہب پر نہیں ہے۔ نئی روشنی کے جمہوریت پسند ذات کی سختیوں سے عاجز ہیں۔ انکے جذبات برانگیختہ کردینے کے لئے 'مساوات' ایک نہایت مناسب سیاسی لفظ ہے لیکن جبکہ ایک پابند مذہب ہندو اس قسم کی آزادی پسند نہیں کرتا تو اسکو مجبور کرنا اور

ایسے کنوؤں کو گندا کرنا جنکو اُنہوں نے بے ذات ہندوؤں کی اجازت سے اپنے استعمال کیلیئے علیحدہ کرلیا ہو، کہاں تک انصاف ہوگا ؟

میں جانتی ہوں کہ ایک راسخ العقیدہ ہندو اپنی پیاس کی تکلیفوں کو برداشت کرلیتا ہے مگر ممنوع پانی نہیں پیتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بیوہ عورت اپنے چوبیں گھنٹے کے روزہ کو اٹھائیس گھنٹہ تک طول دینا اپنے مذہب کے رسومات کو توڑنے سے زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ جب کبھی کسی ہندو کے مکان میں موت ہوجاتی ہے تو تمام پکا ہوا کھانا ناپاک سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے اور خاندان کے تمام بوڑھے بچے فاقہ سے سو رہتے ہیں۔ اُنکے لئے ذات کی محافظت بھوک پیاس اور جسم کی تمام ضرورتوں سے زیادہ اہم ہے !

اس پر بھی ستیا گرہی، یعنی پیروانِ گاندھی اپنے ہم خیالوں کی سوشل اسکیم کو کامیاب بنانیکے لئے راسخ الاعتقاد ہندوؤں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنے اعتقاد کے خلاف ذات پات کی تفریق بالکل اُٹھادیں، چنانچہ حال ہی کا ذکر ہے کہ اُنہوں نے جنوبی ہند میں ایک اچھوت کو ایک برہمن کے راستہ میں ڈھکیل دیا۔ مشرق کو نجات اس طرح سے حاصل نہ ہوگی۔ اگر شہرت مدنظر ہے، تو ضرور تشدد ایک کارآمد ذریعہ ثابت ہوگا، لیکن ایک مشترکہ قومی مقصد کے حصول کیلیئے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت ہندوستان میں جو سب سے زیادہ قابل توجہ امور ہیں وہ ہمارے خانگی امور ہیں۔ بہتری ہو یا ابتری، قدامت پسند اور روشن خیال دونوں کو مل جل کر رہنا چاہیئے۔ فی الحقیقت انگلینڈ نے وہ کام کر دکھایا ہے، جسکے کرنے سے ماہرِ فن تیر انداز منکر تھا، اور جسکو مسلمان فرمانروا جبر و تشدد کرسکے تھے۔

برٹش راج نے اُن تمام ذاتوں کو، جو چھتری نہ ہونیکی وجہ سے فنِ سپہگری سیکھنے سے معذور تھیں، فوج میں داخل کرکے سپہ گری کے تمام فوائد سے مستفید کیا ہے، اور بلاکسی مذہبی احساس کو ضرر پہنچائے ہوئے ذات کی بہت سے رکاوٹوں کو علحدہ کردیا ہے۔ اور ہر شخص کے لئے تمام پیشے کھول دیئے ہیں۔

آبائی پیشہ والوں کو اگر ذات کی تفریق اُٹھا دینے سے نقصان پہنچا، اور اُن کے خاندانی صنعت وحرفت پر اسکا بُرا اثر پڑا تو اسکے بدلے میں انکے لئے ساتھ ہی ساتھ اور دوسرے پیشے بھی کھل گئے ہیں۔ ایک مہتر بھی بلاکسی خدشہ کے جو پیشہ چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ اس راج نے وہ تمام دروازے، جو اُسکے اختیار میں تھے سب کے لئے یکساں کھول دیئے ہیں، مگر کبھی کسی شخص کو دوسرے کے مندر یا مکان میں جانے پر مجبور نہیں کیا۔ اور سوائے ایک رسم کے، جس کا تعلق جان سے تھا، یعنی ستی، کبھی کسی کے مذہبی وخانگی امور میں مداخلت نہیں کی۔

میں ان نکتوں پر اپنے ملک کے نمایندوں کی توجہ منتقل کرانا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی ستیاگرہی اُن بے انصافیوں کو، جو ذات کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں، دور کرنا چاہتا ہو تو اُس کو کہنا چاہیئے! "میں برہمن ہوں لیکن پنچ قوموں کے لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرے دوست بھی ایسا ہی کریں گے۔" لیکن جیسا کہ بمبئی اور مدراس سے اطلاعیں موصول ہوئی ہیں وہ یہ نہیں کرتے، بلکہ دوسرے برہمنوں کا کھانا پانی نجس کرکے انکو گزند کرنا چاہتے ہیں، با ایں ہمہ جہاں اپنا معاملہ پڑجاتا ہے، تو کھانے پینے کی چیزوں کا کیا ذکر، ایک اچھوت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے اور اُسکی آواز سُننے کے بھی متحمل نہیں ہوتے۔ اور ایسے لوگوں کی مہاتما گاندھی جی،

ذات پات کے مخالف اور بنی نوع انسان کے بہی خواہ ہو کر مطابقت کرنا چاہتے ہیں۔

اصلیت تو یہ ہے کہ جب اپنا ذاتی معاملہ ہوتا ہے تو سیاسی آزادی دلانے والے بھی اپنے کو پابہ زنجیر پاتے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والوں پر یہ حقیقت بخوبی منکشف ہے، کہ چھوت چھات علیحدہ کرنیکے خوشنما الفاظ بنی نوع انسان کے اصلی ہمدرد کی زبان سے نہیں، بلکہ صرف سیاسی امور کی بنا پر سیاسی فرقوں کے نمایندوں کی زبان سے، نکلتے ہیں۔

حال ہی کا ذکر ہے کہ ایک روز میرے ایک ہندو دوست ایک جلسہ میں شرکت کرنے کے بعد جو مسلم ہندو اتحاد قایم کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا، اور جس میں بہت سے برآوردہ لیڈروں کی پُرجوش اسپیچیں بھی ہوئی تھیں، مجھ سے ملنے آئے اور ایک عجیب داستان سُنانے لگے۔ کہنے لگے "اتحاد کے مبلغ صاحب جب مکان پر پُہنچے تو قبل اسکے کہ اپنے کسی عزیز سے گفتگو کرتے، یا کھانا کھاتے، اپنی نجاست دور کرنیکے لئے گنگا اشنان کرنے گئے۔ اور جب میں نے اُنسے کہا کہ انکی چرب زبانی سے کہیں زیادہ بہتر اور پُراثر ہوتا کہ وہ خود مجلس میں بیٹھکر سب کے ساتھ کھانا کھاتے، تو کہنے لگے میں خود تو ایسا نہیں کرسکتا۔ مگر ہاں دوسرے برہمنوں کو ضرور مشورہ دونگا کہ وہ ایسا کریں۔"

گو یہ باتیں ایسی ہیں کہ ایک رفارمر کی ہمت ان سے پست ہوجاتی ہے لیکن ہم لوگوں کو نا امید نہ ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک مسئلہ ذات کو سیاست سے علیحدہ کرنا ضروری ہے۔ اگر اس سوال کو صرف مذہب کے سپرد کردیں تو میرا خیال ہے کہ ہم لوگ زیادہ کامیاب نظر آئیں گے۔

اگرچہ میں نے اس مضمون میں جنوبی ہند کے مسئلہ کو بالکل علیحدہ رکھا ہے جہاں پر اچھوت قومیں بہت تیزی سے اپنی سوشل آزادی حاصل کر رہی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہاں پر بھی یہ ریفارم زیادہ مستحکم ہوتا، اگر اسکو بجائے سیاسی جامہ کے مذہبی جامہ پہنایا جاتا اس لحاظ سے برہمو سماج فرقہ کی ہمت قابل تعریف وقعت ہے، جنہوں نے بخوشی بے ذات بننا قبول کیا ہے۔

ذات ایک پابند مذہب ہندو کے لئے مذہب ہے، اور ہر آزاد شخص تسلیم کریگا کہ مذہب میں کسی قسم کی مداخلت ظلم ہے۔ باقی رہا ہم لوگوں کو پروپیگنڈا کرنا چاہئے اور انہی کے اعتقاد کے بموجب کہ "صرف اعلیٰ ہی لوگ خدمت کرنیکے مستحق ہیں" برادرانہ تعلق پیدا کرنیکی ترغیب دینا چاہئے میں نے اس اصول کا استعمال بتا دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ محبت میں کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ خدمت ہے۔

علاوہ بریں پرانے روشن ہندوں کا خود مذہب انکو تعلیم دیتا ہے کہ مقدس مقامات میں سب لوگ ایک ذات ہیں۔ پوری، بنارس اور رامیشرم میں برہمن ایک مہتر کے ساتھ کھانا کھا کر صرف اپنی ذات ہی محفوظ نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسے رشی کی شہرت حاصل کرتا ہے جس نے نجات حاصل کر لی ہو۔ کیا یہ ممکنات سے باہر ہے کہ یہ اصول مع اپنے تمام خوبیوں کے ایک پابند مذہب ہندو کے سامنے پیش کیا جائے اور مقبولیت کے درجے تک نہ پہنچے۔

"آؤ ہم تمام مقامات کو مقدس بنائیں۔ آؤ ہم اگر کہیں اور نہیں مل سکتے ہیں تو پوری ہی میں ملیں، اور یہاں کی مساوات اور برادری کی یادگار کو ہندوستان کے ہر گوشہ میں لے جائیں۔ پہلے صرف ایک خواب و امید کی حالت ہوگی،

لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا خواب ایک دن تمام ہندوستان میں عملی صورت میں نظر آئے گا۔"

ان الفاظ میں مہاتما جی نے اپنے ہندو بھائیوں کو نصیحت کی ہے۔ اس نصیحت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اسی جذبہ کو دوسرے الفاظ میں میں نے ہندو عورتوں کی زبان سے سُنا ہے:۔

بھوک نہ جانے جوٹھا بھات - پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ
نیند نہ جانے ٹوٹی کھاٹ عشق نہ جانے ذات کُذات
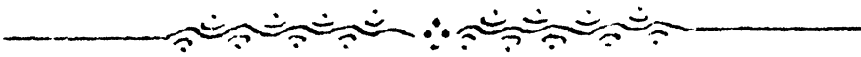
لمحاتِ غم

(۱)

اکثر کنارِ آبِ جو بیٹھا ہوا اندوہگیں — گنتا ہوں میں لمحاتِ غم رہ رہ کے تا حدِّ شمار
اٹھتی ہیں موجیں پے بہ پے، گرتی ہیں اُٹھ کر دم بدم — بڑھتی ہیں ساحل کی طرف، اُٹھ اُٹھ کے پھر دیوانہ وار

ٹکرا کے ساحل سے مگر ہٹتی ہیں پیچھے کی طرف — جاتی ہیں پھر کچھ دور تک، ہو جاتی ہیں آخر فنا
اٹھتا ہوں میں باچشمِ نم ساحل سے پھر کچھ سوچ کر — کہتا ہوں دل سے دیکھ لے انجام ہستی کیا ہوا

(۲)

اکثر چمن میں اک طرف بیٹھا ہوا اندوہگیں — گنتا ہوں میں لمحاتِ غم رہ رہ کے تا حدِّ شمار
آتی ہے کُنجوں سے ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی — کہتی ہے مجھ سے اُٹھ یہاں بیٹھا ہے کیوں تو سوگوار

کہتا ہوں میں، اے موجِ ہوا! جا اور اپنی راہ لے — ہاں تجھکو مجھ سے کیا غرض ہے جا اور اپنا کام کر
آزاد تو پابند میں، ہے شاد تو ناشاد میں — پھر تیرا میرا ساتھ کیا ہے جا کنج میں آرام کر

(۳)

اکثر کسی ویرانہ میں بیٹھا ہوا اندوہگیں — گنتا ہوں میں لمحاتِ غم رہ رہ کے تا حد شمار

آتے ہیں سمتِ دشت سے اٹھکر گمولے دمبدم — لیتی ہیں وہ میرے قدم، بنتے ہیں میرے غمگسار

کہتے ہیں مجھ سے اُٹھ، یہاں بیٹھا ہوا ہے کس لئے — چل جستجو اُسکی کریں باقی ہے جبتک دم میں دم

کہتا ہوں میں ای ہمدمو! تم اپنی اپنی راہ لو — آزاد تم، پابند میں۔ تم شاد، میں بیمارِ غم

(۴)

جب سے ہوا اُس سے جُدا کیا جانیے کیا ہو گیا — رہتا ہوں آتش زیر پا، لگی لگی ہے ہر گھڑی

چکر ہے میرے پاؤں میں، پھرتا ہوں کوہ و دشت میں — گنتا ہوں میں لمحاتِ غم، کٹتی ہے میری زندگی

اک دن یہی لمحاتِ غم لائیں گے پیغامِ اجل — اک دن میں قیدِ رنج سے آخر رہا ہو جاؤں گا

کھل جائیگی میری زباں، بن جاؤنگا آتش نوا — بھڑکے گی پھر دل کی لگی، جلکر فنا ہو جاؤں گا

ابوالفاضل راز چاندپوری

صنعت وحرفت اور دکن

از

تمکین الکاظمی

چند برس سے حیدرآباد دکن میں صنعتی ترقی کا خیال پیدا ہوگیا ہے اور مصنوعات دکن کو فروغ دینے کی ممکنہ تدابیر اور کوششیں عمل لائی جارہی ہیں، قومی ترقی کے لئے صنعت وحرفت لازمی ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ صنعت وحرفت قوم کو گراں مایہ کرسکتی ہے۔ دکن میں آئے دن جدید جدید چیزیں تیار ہورہی ہیں، سینکڑوں کارخانے کھل رہے ہیں، ہزاروں انعامات اور تمغے تقسیم ہورہے ہیں مگر ہماری دانست میں یہ سب قبل از وقت ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ پہلے دکن کی مردہ صنعت کو جلایا جائے اور پھر نئی چیزوں اور ایجادات کی طرف قدم بڑھایا جائے، نمائش مصنوعات ملکی، کو قایم ہوئے تین سال ہوگئے اس کا اثر ملک پر بہت اچھا مترتب ہوا مگر کسی قدر کمی رہی تو یہ کہ قدیم مصنوعات کی جانب کم توجہ کی گئی، ذمہ داران سررشتۂ صنعت وحرفت کو چاہئے کہ پہلے اُن مردہ صنعتوں کو زندہ کریں جو مر ہی نہیں گئی ہیں بلکہ بھلا بھی دی گئی ہیں، ہم ایک ایسی تفصیل ظاہر کرنا چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوسکے کہ دکن میں پہلے کیا کیا صنعتیں ہوتی تھیں اور اب وہ کہاں گئیں۔ اس صنعتی ترقی کو مصنوعاتِ قدیم کی طرف منتقل کرنا کس حد تک فائدہ مند ہوگا۔

دکھنی صنعت کا حال دریافت کرنیکے لئے قدیم تاریخ کی ورق گردانی بھی کرنی

پڑتی ہے، کتاب "پری پلس" میں جو ۲۴ء کی لکھی ہوئی ہے "مسولیا" کے ململ کی تعریف کی گئی ہے، سکیامنی اور بودھ کے زمانہ میں "کالنگا" کی ململ بھی مشہور تھی، اس سے قدیم کی صنعت اگر دیکھنا منظور ہو تو "ایلورا" اور "اجنٹا" کی سیر کی جا سکتی ہے، یہ ابتدائی ترقی تھی تیرھویں اور چودھویں صدی میں دکن کی حقیقی ترقی شروع ہوئی اور سترھویں صدی عیسوی تک جاری رہی، ریاست گولکنڈہ کے قیام کے بعد سے جو بدنظمیاں شروع ہوئیں تو سب ترقی کافور ہوگئی، گو بعض صنعتیں باقی رہ گئیں اور بعض ابتک باقی ہیں مگر وہ اسپرٹ ہرگز نہیں جو اس زمانہ میں تھی۔ "موسیو تھوتیو" ۱۶۶۶ء میں وارد گولکنڈہ ہوا وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہ نے قلعہ میں مکانات بنوا دیئے ہیں اور انہیں جوہریوں کو رکھا ہے۔ یہ تمام کاریگر جواہرات بنانے میں مصروف رہتے ہیں، یہ لوگ فیروزہ، کو تاروں سے کاٹتے ہیں ایک شخص کمان چلاتا ہے اور ایک شخص سفوف ڈالتا جاتا ہے۔" افسوس ہے کہ یہ فن دکن سے بالکل نیست و نابود ہوگیا ہے اب اس کا جاننے والا کوئی بھی نہیں، لوہے کی کانیں بھی دکن میں کئی مقامات پر تھیں جن میں سے بہ افراط لوہا برآمد ہوتا تھا۔ مثلاً کلیانی، نظام آباد، سنگم پلی، انندگری، کولور، کندرپور، جگتیال، گڈکول، نرمل، ایراپلی، کماریلی، وندرتی، ورنگل وغیرہ وغیرہ میں کانیں تھیں مگر اب کہیں سے بھی لوہا نہیں نکالا جاتا۔ دکن میں لوہے کا جس قدر کام ہوتا تھا وہ انہیں مقامات سے لیا جاتا تھا، باہر سے نہیں لیتے تھے۔ ہندوستان کا فولاد دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور دکن کا فولاد سارے ہندوستان میں۔ یوں تو دکن میں، الگندل، گڈکول، جنتلہ پٹہ، کونا پور، ابراہیم پٹن وغیرہ میں فولاد نکلتا تھا مگر کنا سمندرم اور نرمل کا فولاد سب فولادوں پر فوقیت رکھتا تھا اس زمانہ میں اس فولاد کی بے انتہا مانگ تھی، ڈاکٹر واکر لکھتے ہیں کہ "فولاد ان تمام دیہات میں بنایا جاتا ہے مگر وہ کنا سمندرم کے فولاد سے گھٹیا ہوتا ہے۔" کنا سمندرم میں اب بھی فولادی

کام ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ فولاد باہر جاتا ہے، کہا جاتا ہے ایران میں فولاد بنانے کی کوشش کی گئی اور بنایا بھی مگر وہ فولاد دکنا سمندرم کے فولاد کا مقابلہ نہ کرسکا۔

کہا جاتا ہے کہ بیدر میں ایک راجہ نے پوجا کے لئے ایک گلدان بنوایا تھا اس نمونہ کو دیکھ کر مسلمان بادشاہوں نے اور بھی چیزیں بنوائیں، اور یہ صنعت پھیلی اسکا موجد خواہ کوئی ہو۔ مگر یہ ایک عمدہ اور اچھی صنعت ہے، یوں تو بیدری کام کی سیکڑوں چیزیں بنتی ہیں مگر حسب ذیل اشیا بہت مشہور ہیں، ڈبیہ، رکابیاں، آبخورہ، صراحی، آفتابہ پاندان، پیکدان، حقہ، (فرشی گڑگڑی وغیرہ) افسوس ہے کہ یہ صنعت بھی ادہ موئی ہوگئی ہے اب صرف گنڈیاں (بٹن) اور ڈبیاں بنتی ہیں اور بس،

دکن کی تلواریں مشہور ہوا کرتی تھیں مگر دراصل تلواریں دکن میں نہیں بنتی تھیں۔ بلکہ تلواریں، ایران، گجرات وغیرہ سے آتیں اور کولاپور، دنپرتی، گدوال، حیدرآباد میں صرف اسکے پھل (قبضہ) بناکر تلوار مکمل کی جاتی تھی، تلواریں صرف جگدیو پور اور کھمم میں بنتی تھیں اور اب بھی بعض بعض دفعہ بنتی ہیں،

جب تلواروں کا تذکرہ کیا گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اقسام اور بعض اور ہتھیاروں کی تفصیل بھی ظاہر کردی جائے، جوہردار[۱]، مصری[۲]، دہوپ[۳]، یہ تلواریں عمدہ فولاد سے تیار کی جاتی تھیں۔ اور معمولی خیال کی جاتی تھیں،

پٹہ[۴]، نورخانی، یہ تلواریں متوسط خیال کی جاتی تھیں، نورخانی گو اب بھی نظر آجاتی ہے مگر پٹہ شاید ہی نظر آجائے۔

جمبیہ[۵]، یہ عربستان کا ہتھیار ہے مگر جب سے عرب دکن میں آبسے ہیں یہاں تیار ہونے لگا ہے، یہ سونے چاندی کی ٹکلیاں قبضہ پر لگاکر عرب اسے باندھتے ہیں

سکین[11] یہ ایک چاقو ہوتا ہے جو جبیہ کے پیچھے رہتا ہے یہ ہی عرب باندھتے ہیں، کٹار یہ پٹھانوں کا ہتھیار ہے جو نرمل ہی میں عمدہ فولاد سے تیار ہوتا ہے، اب گدوال میں بھی بنتا ہے،

پیش قبض[12]، یہ ایک عام ہتھیار ہے اسے روہیلے اکثر استعمال کرتے ہیں،

بانک[13]، یہ ایک قسم کا خنجر ہوتا ہے جو عموماً عمدہ فولاد سے تیار کیا جاتا ہے، انکے علاوہ کرچ، سپر (ڈھال)، قرولی، صفدرہ، سنانی، بچھو، جھرا، بلم، خنجر، وغیرہ بھی انہیں مقامات پر تیار ہوتے تھے، اب صرف جبیہ، پیش قبض، اور معمولی تلواریں گدوال اور نرمل میں تیار کی جاتی ہیں۔

بندوقیں بھی یہیں تیار ہوتی تھیں اور قرابین، یہی اب قرابینیں تو بنتی نہیں ہیں مگر دیہات میں لانبی نالیوں کی قدیم وضع کی فتیل دار بندوقیں ضرور بنتی ہیں۔ ورکشاپ میں بھرولدار بندوقیں بھی تیار ہونے لگی ہیں۔

ایک زمانہ میں بارود بھی عمدہ تیار ہوتی تھی مگر اب نہیں بنتی بعض عرب بناکر فروخت کرتے ہیں مگر بالکل معمولی، جس زمانہ میں کہ تلوار باندھنے کا رواج تھا کمربند بھی تیار کئے جاتے تھے چنانچہ ورنگل، امرچنتہ، حیدرآباد، گدوال کے کمربند اب بھی نظر آتے ہیں جن پر زردوزی کا کام ہوتا ہے، مگر اب یہ صنعت بھی ڈوب گئی۔

مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ دکن میں کپڑا بھی بنتا تھا اور اب بھی بنتا ہے۔ یہ صنعت ان صنعتوں سے زیادہ عمدہ اور کارآمد ہے۔ فی الحال ضرورت ہے کہ اس صنعت کو حتی الامکان ترقی دی جائے۔

کہتے ہیں کہ جب دکن میں حملہ آور آئے تو ان میں ایک مسلمان دفیع سُنی بھی تھے،

جنہوں نے شطرنجیاں بنانا شروع کیا، خواہ اس صنعت کا اجرا کرنیوالا کسی ہو یا وہابی مگر چیز اچھی ہے سب سے پہلے یہ ورنگل میں تیار کی گئیں اور اب سنٹرل جیل گلبرگہ اور ورنگل میں بہت ہی عمدہ بنتی ہیں، اسکے ساتھ ہی ساتھ قالین بھی بنائے جاتے ہیں جو ریشمی، سوتی، اونی، تین وضع کے ہوتے ہیں، اور یہ بھی مذکورۂ بالا ہر دو سنٹرل جیلز میں بنائے جاتے ہیں۔

اورنگ آباد میں کمخواب نہایت ہی عمدہ تیار ہوتا ہے، اور مشروع، ہمرو، جامہ وار، زربفت کلابتون، بادلہ، وغیرہ بھی، ناندیڑ، نارائن پیٹھ میں ساریاں اور ریشمی کپڑے بنتے تھے اور اب بھی بنتے ہیں، اب الند، چرچال وغیرہ میں رومال اور لنگیاں، اور شوراپور (گلبرگہ) میں ساریاں بہت اچھی بنتی ہیں،

سنگاریڈی، تلمدرگ، گلبرگہ، اندور، (نظام آباد) ورنگل، چنتاگری، گدوال، میں ٹاٹ، نمدہ، کمل، رومال، کمربند، لنگیاں، دھوتیاں، کھدر، ساریاں، مندیل، سیلے، ململ وغیرہ کی صنعت اب بھی باقی ہے،

میدک، میں جاجم، پردے، دسترخوان، نہایت ہی عمدہ رنگے جاتے ہیں،

مارکوپولو، نے ورنگل کے بکرم کی بہت ہی تعریف کی ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اب نظر نہیں آتا گلبرگہ سنٹرل جیل میں ڈیرے وغیرہ نہایت ہی عمدہ بنتے ہیں۔

رائچور میں سلیپر نہایت ہی عمدہ بنتے ہیں جو مضبوط ہونیکے علاوہ ایک تولہ سے زیادہ وزنی نہیں ہوتے اب بیدر اور شوراپور میں بھی یہ کام شروع ہوا ہے اور بیدر میں دلّی کی وضع کے سفید چڑھاؤ نہایت ہی عمدہ تیار ہونے لگے ہیں، اورنگ آباد میں دیسی چمڑے سے بوٹ، شوز، گارٹرز وغیرہ ولایتی کے مماثل تیار ہوتے ہیں، اب حیدرآباد نے بھی اس صنعت کو وسعت دی ہے، بیڑ اور ناندیڑ میں چھاگلیں، بہت ہی عمدہ بنتی ہیں،

دکن میں رنگ بہت اچھا بنایا جاتا تھا چنانچہ میدک میں جو پردے اور جاجم رنگے جاتے ہیں وہ یہیں کا رنگ ہوتا ہے، نیل اب تک استعمال ہوتا ہے مگر اور دوسرے رنگوں کی صنعت بالکل ڈوب گئی ورنہ نارنجی، گل انار، سبز، سرخ وغیرہ رنگ یہیں تیار ہوتے تھے، اسکے علاوہ وہ رنگ بھی بہت پائدار ہوتے تھے جو عمارتوں پر کئے جاتے تھے، حضرت بندہ نوازؒ اور حضرت شیخ جنیدیؒ گلبرگہ کے گنبدوں کے اندرونی حصوں میں وہی رنگ ہے، گو پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا مگر رنگ بھی ابھی بالکل نیا اور تازہ معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ تیل، اور عطر، سونے چاندی کا کام، وغیرہ ہر جگہ ہوتا ہے، دکن میں کیوڑہ بہ کثرت ہوتا ہے اور شراب بھی گل مہوہ سے اچھی تیار ہوتی ہے، گڑ، شکر وغیرہ ہر جگہ تیار ہوتی ہے، شورہ بھی تیار کیا جاتا ہے، گوڑاکو اور بھنگ کی بھی تیاری ہوتی ہے،

کاغذ ایک زمانہ میں بہت بنتا تھا مگر چند سال سے یہ صنعت ڈوب گئی تھی اب پھر تیار ہونے لگا ہے، اندور (نظام آباد)، میدک، حیدرآباد، گلبرگہ، کاغذ پورہ، (اورنگ آباد) میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے، سرکاری جرائد انہی کاغذوں پر طبع ہوتے ہیں، کھم اورنگ آباد وغیرہ میں لکڑی کا کام نہایت ہی عمدہ ہوتا ہے۔

کانچ کا کام ایک زمانہ میں جالنہ، یکر دان، وغیرہ میں ہوتا تھا مگر اب نہیں ہورہا ہے، مدرسہ صنعت و حرفت نے حال میں اچھی ترقی حاصل کی ہے۔

مٹی کا کام بہت عمدہ ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ رائچور میں پانی کی صراحی بہت ہی مضبوط تیار ہوتی تھی اور ایسی صراحی جس میں تین سیر پانی رہ سکے ایک تولہ وزن کی ہوتی تھی، اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ دکن میں کیا کیا صنعتیں تھیں اور کون کون سی صنعتیں تباہ و برباد ہوگئیں،

اور جو باقی ہیں وہ برباد ہونیکے لئے آمادہ ہیں۔

نمائش مصنوعات ملکی کی وجہ سے شطرنجی، ہمرو، کھدر وغیرہ اور بیدری کام ایک حد تک محفوظ ہوگئے ہیں اور ان مردہ ہڈیوں میں ضرور جان آگئی ہے مگر انہیں فروغ نہیں ہوا اور اُسی قدیم ڈگر پر قایم ہیں۔ انکی ترقی دیکھی جائے تو مفقود، نمائش دیکھنے والا " دکن بٹن قبا کرڑی کے بٹن، حیدرآباد کے کارخانۂ عثمانیہ" کا لکڑی کا کام، سمنٹ وغیرہ دیکھے ہونگے، گو یہ خود ایک اچھوتی صنعت ہے مگر اس میں اور بھی جدت پیدا کی جاسکتی ہے، ضرورت ہے کہ اسی طرح اور صنعتوں کو بھی فروغ دیا جائے اور گورنمنٹ امداد دے کر مالکان کارخانجات کو مجبور کیا جائے کہ وہ جدت پیدا کریں۔

ضلع گلبرگہ میں نہایت ہی عمدہ "کمبلیں" تیار ہوتی ہیں اگر انکو فروغ دیا جائے اور عمدہ نمونے کی کمبلیں تیار کرائی جائیں تو اچھی قیمت پر فروخت ہوسکتی ہیں، اور " اور کوٹ" جیسا کہ آج لوگ کمبل کے بنانے لگے ہیں، نہایت ہی عمدہ تیار کیے جاتے ہیں، بہرحال ان فرعمات پر اگر غائر نظر ڈالی جائے تو نہایت ہی اچھے نتائج مترتب ہونگے، انشاءاللہ کبھی آئندہ صحبت میں بتائیں گے کہ کن کن صنعتوں کو کس کس طریقے سے فروغ دیا جاسکتا ہے اور کیا کیا فوائد حاصل ہوسکتے ہیں، الدبس۔

"تمکین کاظمی" (محبوب گلشن گلبرگہ)

پیام آخری

از عزیزہ بلقیس جمال صاحبہ

تجھ کو اپنے عشوۂ محشر بداماں کی قسم
تجھ کو اپنے موج وش حُسنِ خراماں کی قسم

تجھ کو اپنے سرمۂ چشمِ غزالیں کی قسم
تجھ کو اپنی تاب ابروئے بلالیں کی قسم

تجھ کو اپنے عارضِ صبحِ بہاراں کی قسم
تجھ کو اپنے چشمۂ کوثرز نخداں کی قسم

تجھ کو اپنی چشم میگوں کی صباحت کی قسم
تجھ کو اپنی انکھڑیوں کی اس نزاکت کی قسم

تجھ کو اپنی چشم وحشی رشکِ آہو کی قسم
تجھ کو اپنی شوخ پتلی، حُسنِ جادو کی قسم

تجھ کو اپنے شعلہ افشاں حسنِ رعنا کی قسم
تجھ کو اپنے عشق افزا ناز برنا کی قسم

تجھ کو اپنی ناز آرا بے نیازی کی قسم
تجھ کو اپنی کافریں جادو طرازی کی قسم

تجھ کو اپنے مضطرِ شوریدۂ غم کی قسم
تجھ کو اپنے وحشی گیسوئے برہم کی قسم

سُن ذرا! آہِ پریشانِ دیارِ حُسن و عشق
سُن ذرا! اک نالۂ برباد و زارِ حُسن و عشق

اک پیام آخری ہے روح کا سُن لے ذرا
روز افزوں ہو یہ تاب برقِ حُسن شعلہ زا

تیری الفت مرہمِ زخمِ دلِ مجبور تھی
تیری الفت جانِ جسمِ بسملِ رنجور تھی

تیری الفت ہو گئی تھی مایۂ صد زندگی
تیری الفت شمع ارماں کیلئے تھی روشنی

تیری الفت تھی نہاں کنج نہیں لکر محوِ خواب
مستی پنہاں سے جسکی ہر تنفس تھا شراب

تیری الفت دل کی تنہا غمگسارِ درد تھی
تیری الفت اک اکیلی رازدارِ درد تھی

اُس نے دیکھی تھیں لہو آمیز راتیں ہجر کی
اُس نے دیکھی تھی پریشاں حال کی درماندگی

شامِ فرقت چھیڑتا جب آہ، دل سازِ جنوں
سوزِ حسرت بن کے وہ تھی محرمِ رازِ جنوں

آنکھیں جب تارونکی ہوتیں نیند میں ڈوبی ہوئی
تیری الفت نیند تھی بیخواب آنکھوں کی مری

سیکڑوں کلیاں چٹکتیں آہ جب صبحِ بہار
پھول الفت کا تری رہتا مری زیبِ کنار

سبزہ جب انگڑائیاں لیتا بھری برساتیں
تیری الفت موج بنتی قلزمِ جذبات میں

برف باری شبِ سرما کے ٹھنڈے نور میں
تیری الفت آتشِ روشن تھی دل کی طور میں

الغرض تیری محبت تھی مرا رازِ حیات
تیری الفت سے ہوا تھا گویا اقرارِ حیات

آہ اب کیوں کر کہوں یہ داستانِ دردزا
کس طرح الفت کو تیری آہ پھر چھینا گیا

شامِ حسرت تھی گھٹا تھی ہر طرف چھائی ہوئی
برق صد پارا ابر میں پھرتی تھی گھبرائی ہوئی

آسماں تاریک تھا ظلمت نما کالی گھٹا
تیرگی در بر نظر آتی تھی ہر موج ہوا

لرزشِ مستور سے جھونکے صبا کے سرد تھے
پردہ ہائے ابر میں رخسارِ اختر زرد تھے

بانسری کی اک طرف سے آئی اتنے میں صدا
نغمۂ اُلفت سے ہر گوشہ معنی ہو گیا

ہو گئی آوارہ نکہت وش صدائے بازگشت
ذرہ ذرہ ہو گیا محوِ نوائے بازگشت

ہو گیا ہر تارِ سازِ دل ترنم سازِ عشق
نغمۂ مضرابِ حسرت بن گیا غمازِ عشق

ہر رگِ جاں خود فراموشی میں بالکل کھو گئی
جاگتی تقدیر اتنے میں اچانک سو گئی

چُپکے چُپکے اس طرف دستِ ستم آرا بڑھا
سازِ الفت چھین کر ہاتھوں سے دل کو لے لیا

آنکھ حسرت سے اُٹھی گھبرا کے نیچے جھک گئی
آہ سینہ سے بڑھی ہونٹوں تک آ کر رک گئی

ہاتھ آ گے کو بڑھے بیساختہ پھر جھپٹ پڑے ۔۔۔ پاؤں اُٹھے دوڑنے کو سرد ہو کر رہ گئے

لیچلا آرام جاں محشر نما دستِ جفا ۔۔۔ نقشِ پا کو رہ گیا دل دیکھتا کا دیکھتا

آہ کبتک دل سُنائے داستانِ دردِ زا ۔۔۔ قصۂ غم ہائے پنہاں سوزِ عریانِ جفا

ختم ہوتا ہے ہمیشہ ہی کو اب طوفانِ آہ ۔۔۔ التجا ہے صرف اتنی اے نگارِ بے پناہ

اپنی سرمستی میں ہو بیہوش جب موجِ شباب ۔۔۔ بےخطر ساغر کی ہی کا فر جب برس اُٹھے شراب

یاد کر لینا ذرا اُس دم دلِ مغموم کو ۔۔۔ یاد کر لینا کسی کی اُلفتِ مرحوم کو

ختم ہے اے صبح جمالِ آرزوئے تشنہ کام !

رہتی دنیا تک رہے یہ تاب حسن بادہ فام !

ضروری گذارش

آج کل اشتہار دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر اشتہارات جھوٹے اور فریبی ہوتے ہیں۔ ایسے اشتہارات کی اشاعت افسوسناک ہے۔ اسلئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ صرف معزز اور معتبر تاجر اور دوکانداروں کے اشتہارات شمع میں شائع کئے جائیں تاکہ ہمارے ناظرین دھوکا اور نقصان سے محفوظ رہیں۔ اور خوش معاملہ اور ایماندار تاجروں کے کاروباری تعلقات اچھے لوگوں سے پیدا ہو جائیں لہذا اطلاعاً گذارش ہے کہ غیر معتبر اشتہارات کی اشاعت سے ہمکو قطعی معذور سمجھا جائے۔

مینیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہگنج۔ آگرہ

اندلس کا تاریخی جغرافیہ

اندلس (یعنی اسپین و پرتگال) کی اسلامی تاریخ سے ہمارے ملک کے مسلمانوں کو بھی دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں بالخصوص مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے نصاب تعلیم میں وہ داخل ہے۔ اس کی بعض مفید انگریزی اور عربی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں ہو چکا ہے اور چند قابل قدر تالیفات بھی شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اسلامی تاریخ عالم کے اس حصہ کو جسکے عروج کو آج تقریباً ایک ہزار برس منقضی ہونیکو آتے ہیں سمجھکر پڑھنے میں بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ جس ملک سے اسکو بحث ہے اسکا کوئی باقاعدہ جغرافیہ موجود نہیں۔ اگر اس تاریخ کو عربی میں پڑھتے ہیں تو جن مقامات کا تذکرہ اس میں آتا ہے انکی نسبت یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اب بھی وہ ملک میں باقی ہیں یا نہیں، اور اگر باقی ہیں تو آجکل انکا کیا نام ہے۔ اور موجودہ جغرافی نقشوں میں وہ کہاں دکھائے جاتے ہیں۔ اگر یورپین زبانوں میں اس تاریخ کو پڑھتے ہیں تو اُس میں جو نام اسپینی یا پرتگیزی ناموں کے آئے ہیں انکی نسبت یہ نہیں دریافت ہوتا کہ اُنکے عربی نام کیا تھے تاکہ عربی کتابوں میں اُنکے سابقہ حالات تفصیل سے پڑھکر تاریخ کے مطالعہ کا حق ادا کر سکیں بعض اسپین و پرتگال کا موجودہ جغرافیہ یا عربی تصانیف میں اندلس کا جغرافیہ جس طرز پر بیان ہوا ہے وہ اُن دقتوں کو جو اوپر بیان ہوئیں رفع نہیں کرتا۔ بس اس خیال سے کہ یہ دشواریاں دور ہوں اور نہ صرف یہی بلکہ عربی اور انگریزی زبان سے تاریخ اندلس کا ترجمہ کرتے وقت مقامی ناموں کی صراحت میں مترجمین کو آسانی ہو۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ

اندلس کا ایک تاریخی جغرافیہ لکھا گیا ہے۔ اس جغرافیہ کی فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

پہلا باب

اندلس سے مراد اسپین و پرتگال کے ملک ہیں۔ اندلس کی وجہ تسمیہ، وسعت ملک کے لحاظ سے اندلس کا مفہوم، اندلس کی شکل بطلیموسی اور حال کے نقشے میں۔ عربی علماء جغرافیہ نے بطلیموسی نقشہ کے مطابق اپنے جغرافئے لکھے بطلیموسی نقشہ میں اندلس کی شکل ایک بے قاعدہ مثلث کی ہے۔ اسی اعتبار سے عربی جغرافیہ نویسوں نے اس مثلث کے تین ارکان (زاویئے) اور تین اضلاع بیان کئے۔ ہر رکن (یا زاویہ) کی تفصیل موجودہ جغرافیہ کا لحاظ کرتے ہوئے نقشہ بنا کر سمجھائی ہے۔ اسی طرح ہر ضلع کی سمتیں بیان کرکے اسکے ساحلی شہروں کے عربی نام بیان کئے ہیں۔ نقشہ حال کے مطابق جسکی ساخت زیادہ صحیح ہے ملک کی شکل ایک بے قاعدہ ذوارِبعۃ الاضلاع کی ہے۔ اس شکل کے مطابق بطلیموسی نقشہ کے ارکان و اضلاع کی سمتوں میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ بتایا ہے۔ نقشہ حال کے مطابق ملک کے چاروں رکن یا گوشے، عربی جغرافیہ نویسوں نے بطلیموسی نقشہ کی پابندی سے جو ساحل کے مقامات تین ضلعوں میں بیان کئے ہیں اُنکو حال کے نقشہ کے مطابق چار ضلعوں میں ترتیب دیکر اُنکے عربی اور اسپینی یا پرتگیزی نام لکھے ہیں۔

دوسرا باب

اندلس کی حدود اربعہ۔ اندلس کو اہل عرب جزیرہ کیوں کہتے تھے۔ اندلس کا طول و عرض اندلس کی زمین اور اُسکی کیفیت۔ اندلس کے بڑے پہاڑی سلسلے۔ اندلس کے بڑے بڑے دریا (الف) جو بحر متوسط میں یا (ب) بحر زقان اور بحر محیط میں گرتے ہیں۔

تیسرا باب

اسپین و پرتگال کی موجودہ تقسیم "پراونسوں" (صوبوں) میں۔ اندلس کی قدیم عربی تقسیم حصّوں۔ کوروں یا اقلیموں میں۔ عربی اقلیموں یا کوروں کی جزوی یا کلی تطبیق۔ اسپین و پرتگال کے موجودہ صوبوں سے گو قلت معلومات کی وجہ سے عربی اقالیم اندلس کا مکمل نقشہ بنانا ممکن نہیں۔ لیکن جس قدر معلومات بہم پہنچیں اُسکے مطابق دو نقشوں میں اسلامی اقلیمیں اور کورے موجودہ "پراونسوں" پر منطبق کرکے دکھائی ہیں۔

چوتھا باب

اسپین اور پرتگال کے قدیم باشندے مسلمانوں کے داخلہ کے وقت اسپینی قوم کن اجزا سے مرکب تھی۔ مسلمانوں کی آمد۔ شرفاء حجاز۔ ایک صحابی اور دس تابعین کے اسمائے گرامی جو اسپین میں تشریف لائے۔ عرب کے شریف قبیلے جو اسپین و پرتگال میں آباد ہوئے عدنانی و قحطانی قبائل اور بربر کے قبیلوں کی تفصیل جنہوں نے اسپین و پرتگال کو اپنا وطن بنایا۔

پانچواں باب

اسلامی عہد میں اندلس کی زراعت۔ پیداوار۔ معدنی اشیا۔ مثلاً ترکاریاں۔ اناج۔ زیتون بلوط۔ میوے۔ نے شکر۔ خوشبودار جڑی بوٹیاں۔ گوند۔ پھول۔ کہربا۔ عنبر۔ قرمز۔ سونا چاندی۔ قلعی۔ پارہ۔ قیمتی نگینے۔ زاج وطفل۔ موتی۔ مونگا۔ عمارت کا پتھر۔ اندلس کے حیوانات۔ چوپائے۔ نرم بالوں والے جانور۔ سمور۔ وبر۔ قنلیہ۔ پرند۔ مچھلیاں۔ اندلس کی صنعت و حرفت۔ اندلس کی تجارتی چیزیں۔ جس طرح عربی تصانیف میں بیان ہوئی ہیں۔

چھٹا باب

اسپین و پرتگال کے ایسے مقامات کے مختصر جغرافی و تاریخی حالات جن کا ذکر عربی تاریخوں یا جغرافیوں میں آیا ہے اور جہاں مسلمانوں کی حکومت بھی رہی۔

اس اخیر باب میں تقریباً ساڑھے آٹھ سو عربی مقامات کو ابجدی ترتیب میں لکھا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے ذیل کی معلومات ہر شہر کی نسبت درج کرنے کی کوشش کی ہے۔

عربی شہر موجودہ اسپین یا پرتگال کے کس شہر سے مطابق ہوتا ہے۔ نام کی تحقیق یعنی عربی نام یونانی، آئبیری یا رومانی نام سے معرب کیا گیا ہے یا واقعی وہ عربی نام تھا جس نے آجکل اسپینی شکل پیدا کر لی ہے۔ آج کل یہ شہر کس صوبہ میں شمار ہوتا ہے عربی جغرافیوں میں وہ کس کورہ یا اقلیم میں بیان ہوا ہے۔ اگر پرانا شہر ہے تو مسلمانوں کی داخلہ سے پہلے اسکی کیا حیثیت تھی۔ شہر کے گرد و نواح کی جغرافی کیفیت۔ مسلمانوں نے جو کچھ حالات اس شہر کے موقع و محل۔ وہاں کی عمارات و استحکامات مصنوعات پیداوار و تجارت وغیرہ کے لکھے ہیں انکا خلاصہ۔ اسلامی عہد حکومت میں شہر کے تاریخی حالات۔ مسلمانوں نے اسکو کب فتح کیا تھا۔ عرب اور بربر کے کونسے قبیلے خصوصیت کی ساتھ وہاں آباد ہوئے تھے مروانیوں کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں کس کس نے وہاں خودمختارانہ اسلامی حکومتیں قایم کیں۔ مسلمانوں کی حکومت کب وہاں سے اٹھ گئی۔ اگر مسلمانوں کے زمانہ کی کوئی عمارت باقی ہے تو اُس کا حال۔ اسلامی عہد میں اگر کوئی بڑا عالم وہاں گذرا ہے تو اس کا نام اور مختصر حال۔

نوٹ - یہ ضرور نہیں کہ ہر شہر کی نسبت یہ کل باتیں معلوم ہوگئی ہوں۔ مگر جس قدر دریافت ہو سکیں

وہ لکھی گئی ہیں۔)

ہم کو یہ معلوم ہو کر دلی مسرت ہے کہ اس جغرافیہ کے مؤلف ہندوستان کے مشہور اہل قلم جناب قبلہ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی۔اے علیگ۔خلف الصدق جناب مرحوم شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب ہیں۔افسوس کہ جغرافیہ مذکور کے متعلق مفصل حالات نہ معلوم ہو سکے۔لیکن فہرست ابواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ عجیب وغریب کتاب شائع ہو گئی تو اردو میں ایک بیش بہا خزانہ کا اضافہ ہو جائیگا۔فہرست مضامین کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف نے نہایت وسعت نظری اور تنقیدی حیثیت سے کتاب کو لکھا ہے۔مولوی صاحب قبلہ کا نام نامی کتاب کی بہترین خوبیوں کا قطعی ضامن ہے جو لوگ آپ سے نیاز حاصل کر چکے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ آپ کی نقادی کا مرتبہ کس قدر بلند ہے۔آپ ہندوستان کے بہترین انشاپردازوں میں ہیں۔ہم دست بدعا ہیں کہ یہ جغرافیہ جلد سے جلد شائع ہو جائے۔اُس وقت ہم انشاءاللہ اُس پر مفصل ریویو لکھیں گے۔

جعفری

الوحدة الاسلامية

لقد مضت الايام وتوالت الازمان من حين أُخرج المسلمون من الاندلس بينما كان اخوانهم فى تركيا والهند شاخصين اليهم بدون ابدا إلى حركة نحواسعافهم اما اليوم فالعالم اسلامى يدرس وبلات حرب البلقان وفوز مصطفى كمال واصلاحات رضاخان وحملات عبد الكريم واقوال امان الله خان لانتباه لا مزيد عليه ورؤيتنا قراء الجريدة الشمع خارج الهند هى احدى الدلائل على ظهور روح الوحدة والتماسك بين مسلمين فى العالم بأجمعه إن قراء جريدتكم بعدن طالما تمتعوا بقراءة القصص والقصائد والمقالات التاريخية التى ظهرت فى ما مضى من الاعداد الستة الاولى ولقد شهدوا للخواجه حسن عابد جعفرى باليد الطولى فى المحاضراته الفنيه والحيويه والعلمية التجارية وماكتبه عن سنيا تشن الخ

اهم المقالات هى تلك التى تنوه عن الاقتراحات التى قدمها ثلاثة من الكتّاب فى اعداد الشمع الاخيرة فالخواجات شرد وشروانى يقيد ان كتاباتهم للغة الاردو والاول يحتج بوجوب جعل اللغة الاردو بسيطة وذلك باسقاط الجمل السامية والسنسكريتية الفحمة بعدما اكتساب رضا المسلمين والهند

واما شروانی فمرامه ان نتتبع خطی الجامعة العلمیة الافرنسیة[٥١]
والجمعیة الانکلیزیة الادبیة الهندیة[٥٢] اما السیّد محمد هادی
فهو من محبی المجتمع الجنسی و یود أن یقرب سبل الارتباط بین
الوحدات الاسلامیة المتفرقه فی الهند

(۱) بتأسیس مکتبة واسعة حافلة بکل الکتب اللازمة
(۲) بنشر جرائد فارسیة مستقلة عن بعضها
(۳) بحفظ نطاق کافٍ للمقالات العجمیة فی الجرائد الأردیة
(۴) بتاسیس درجات ورتب للغة الترکیة فی کلیة علی جره

یسهل علی بعض الناس تقدیم الاقتراحات ولکن وضع تلک
الاقتراحات فی حیز العمل هو میدان آخر و بما ان من قام بالتجارب
العملیة یوماً خیر من ذلك الذی یقضی العمر بوضع القواعد
تارکا ایاها للأیام فنود أن نری خواجات شروانی و شرفاً ممتهن
بالعمل فی القریب العاجل ودعنا نری الخواجه شروانی یقدم
لنا بیاناً عن بعض الغلطات الاعتیادیة التی جعلته یکشفها
باختیاراته الواسعة ودرسه العظیم فی شمال الهند وجنوبها و ینشر
ایضاً نقیا مرتطل روایات الحیاة
الجدیدة إذ یبین لنا کیف یمکن جعل اللغة الهندیة مقبولة
لدی کل فرد من رفقائنا من الشعب الهندی

ولقد استطعنت لانظار خواجیه محمد هادی ولم یکن ذلك بالمرة

[٥١] French Academy.
[٥٢] Early English Text Society.

الاولى نحو الجهل المخيم المنابه بين مسلمي الهند بما يختص بالتطورات
الأخيرة في الاداب العجمية والعربية ولقد اكّد خصوصاً الجهل
العظيم باللغة التركية . فمن هو المسؤول يا ترى عن هذا الاهمال
وايجاد الحق ليسوا الا اولئك المنوط بهم ترقية الجامعة الاسلامية
والنهضة القومية وكان الواجب الاول عليهم ان يقوموا بالنداء
اللازم لتعيين محاضرات وطنية لكل من اللغات العربية التركية
والعجمية وان يكون مركز ادارتها في مقر ندوة العلماء حيث يمكنهم
احياء المناظرات القديمة كما احيا اراسمس[1] وبترارك[2] العلوم
الرومية واليونانية فبتشجيعهم وهدايتهم وحثهم كان اقرب
من حبل الوريد تولد النهضة للمشرق ودرس تلك الاداب في حينها
وتأسيس مكتبة شرقية لم يكن يستوعب المحاولة التي نشعر
بها اليوم وكل ما اقترحوه من جمع ونشر الكتب المخطوطة هو ثاني
المسائل عند ذلك لكنه في الحال هو كقلب المشروع رأساً على عقب
وهل الفكرة بعيدة المنال لجلب رجل عربي وآخر تركي وثالث
عجمي من الذين هم قدوة صالحة للقيام باعباء وضع أساس
الاحياء الاداب الاسلامية

وبالوقت الحاضر بعثنا لكم يا حضرة المحرر بهذه النشرة باللغة العربية
لنساعدكم لتقوموا بوعدكم بنشر مقالات ايرانية وغيرها في جريدتكم
الغراء وايضاً لانه يكون غريب ان تبعث مقالة عجمية من

1) Erasmus 2) Petrarch.

بلاد العرب مع انه ليس ثمت اعتراض آخر وعلى كل حال يظهر أن من الواجب درس الارتياح العمومي لدى نشر مثل هذه المقالات بلغات مختلفة لأن الدرجة الاساسية للاتحاد الاسلامي العام في آسيا والعالم بأجمعه

عطا حسين

ناظر المدارس في عدن

محمد علي ابراهيم لقمان

المعلم الكبير في مدرسة الدولة في عدن

(ترجمہ)

اتحاد اسلامی

ازجناب ابرار حسین صاحب فاروقی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مسلمانوں کو اندلس (اسپین) سے نکلے ہوئے صدیاں گذر چکیں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برادران اسلام ترکی اور ہندوستان میں بیٹھے ہوئے اُنکے اخراج کا تماشہ دیکھتے تھے اور اُنکی مدد کے لیئے کسی تحریک کی ابتدا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن تمام عالم اسلام جنگ بلقان کی مصیبتوں، مصطفےٰ کمال کی کامیابیوں، رضا خاں کی اصلاحوں، عبدالکریم کے حملوں اور امان اللہ خاں کے قولوں کا جس ہوشمندی سے مطالعہ کر رہا ہے اُسکے بیان کی ضرورت نہیں

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے باہر اخبار "شمع" کے ناظرین کی تعداد اس بات کی دلیل ہے کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں یکانگی اور یکجہتی کی روح پیدا ہو گئی ہے۔ عدن میں آپ کے اخبار کے ناظرین نے اُن قصوں، قصیدوں اور تاریخی مضمون کو پڑھکر بے انتہا فائدہ اُٹھایا جو گذشتہ نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے خوب سمجھ لیا کہ مسٹر حسن عابد جعفری کو نہ صرف علوم معیشت، تجارت اور فنوں میں کامل دستگاہ حاصل ہے بلکہ جو کچھ کہ اُنہوں نے سائنس وغیرہ کے متعلق لکھا ہے وہ بھی اُنکی مہارت کا ثبوت ہے۔

"شمع" کے آخری نمبروں میں اہم ترین وہ مضامین ہیں جن میں تین نامہ نگاروں نے اپنی اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ چنانچہ مسٹر شرر و مسٹر شروانی نے اپنے مضامین صرف اُردو زبان کے متعلق لکھے ہیں۔ مقدم الذکر نے بدلائل اس بات کی کوشش کی ہے کہ اُردو زبان کو مسلمان اور ہندؤں کے مشورہ سے اس قدر سہل اور آسان کر دیا جائے کہ اُس میں

ملہ۔ اہل عرب لفظ مسٹر کے بجائے خواجہ استعمال کرتے ہیں۔

موٹے اور خالص سنسکرت جملے نہ رہیں۔ لیکن شیروانی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ہم "فرانسیسی مجلس علمی" اور "انگریزی انجمن ادب قدیم" کے قدم بقدم چلیں لیکن سید محمد ہادی صاحب اجتماع جنسی کے دلدادہ ہیں۔ اور اسی لئے یہ چاہتے ہیں کہ وہ راستہ اختیار کیا جائے جو مختلف اسلامی جماعتوں میں یکجہتی و ارتباط پیدا کرے۔ مثلاً۔

ا۔ ہندوستان میں ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں کل ضروری کتابیں ہوں۔

۲۔ فارسی اخبارات جو ایک دوسرے سے مستغنی ہوں جاری کئے جائیں۔

۳۔ اردو اخبارات میں فارسی مضامین کے لئے کافی جگہ (کالم) محفوظ ہوں

۴۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ترکی زبان کی جماعتیں کھولی جائیں۔

بعض لوگوں کے لئے تجاویز کا پیش کر دینا تو آسان ہے مگر ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانا ذرا کارے دارد۔ کسی شخص کا ایک دن کا عملی تجربہ اُس شخص کی قواعد سازی سے بہتر ہے جس نے تمام عمر قواعد کے بنانے میں صرف کر دی اور تجربہ کو آئندہ کے لئے چھوڑ دیا۔ کیا اچھا ہو کہ ہم مسٹر شروانی اور مسٹر مشرکو ان تجاویز پر عمل پیرا دیکھیں۔ ہم اُس وقت کے بھی منتظر ہیں۔ جبکہ مسٹر شروانی اپنی اُن بعض غلطیوں کا اعتراف کریں گے جبکہ اُنکا وسیع تجربہ اور شمالی اور جنوبی ہند کا کامل مطالعہ اُنہیں مجبور کریگا۔ و نیز ہم کو یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوگی کہ کوئی مرد میدان ایسا بھی ہے جو مفید زندگی کی روایات کا علمبردار ہے۔ اس لئے کہ وہ ہم کو بھی تو بتائیگا کہ وہ برادران ہندوستان کے ہر فرد کے لئے ہندوستانی زبان کو کیونکر ہر دلعزیز بنا سکے گا۔

مسٹر محمد ہادی نے مسلمانانِ ہند کے اُس محیط جہل کی طرف توجہ کی ہے جو بالخصوص

اس آخری دور نے فارسی اور عربی علم ادب کی طرف سے اُن میں پیدا کر دیا ہے - یہ توجہ پہلی اور نئی نہیں ہے - اس میں مسٹر اوی نے بالخصوص ترکی زبان کے حال پر زور دیا ہے - اچھا تو پھر اس کا ذمہ دار کون ہے ؟ اس کا ذمہ دار سوائے اُن لوگوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے جو قومی بہبودی اور اسلامی جامعیت کے علم بردار ہیں - انکا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ ایسی ضروری تدابیر اختیار کرتے جس سے عربی، ترکی، اور فارسی زبانوں کی قومی مجالس قایم ہوتیں اور اُن مجلسوں کی مرکزی ادارت ندوۃ العلماء میں قائم کی جاتی - کیونکہ انکے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ پُرانے تجربات اور مشاہدات کو زندہ کرسکیں جس طرح سے کہ "اراسمس" اور "بسطریق" نے علوم یونانی اور رومی (اطالیہ) کو زندہ کر دیا - کیونکہ انکی ہدایت اور حوصلہ افزائی اُس وقت خریدار میں نہایت آسانی سے حصول کی خواہش پیدا کرسکتی تھی - مشرقی کتب خانہ کا مقام ہماری موجودہ محسوس کردہ ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا ہے، اب رہی اُنکی یہ تجویز کہ کتابیں شایع کی جائیں یہ مسئلہ ثانوی درجہ رکھتا ہے فی الحال اُس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اصل کو پس پشت ڈال دیا جائے -

کیا یہ خیال دور از کار ہے کہ ایک عرب، ایک ترک، اور ایک ایرانی اُن لوگوں میں لے لیا جائے جو ادب اسلامیہ کے زندہ کرنے میں پیش پیش ہیں - اور اسکی بنیاد رکھنے کی اُن میں کامل صلاحیت ہے ؟

جناب اڈیٹر صاحب ! اس وقت ہم اس اشاعت کے لئے عربی زبان میں (مضمون) لکھ کر بھیج رہے ہیں - یہ اس لئے کہ ہم آپکے اُس ایفائے وعدہ میں مدد کریں جو آپ نے فارسی وغیرہ کے مضامین اپنے اخبار گوہر بار میں شایع کرنیکے

متعلق فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ یہ اچنبھا بھی تھا کہ ممالک عرب سے عجمی زبان میں مضمون بھیجا جاتا اگو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ مختلف زبانوں میں اس قسم کے مضامین کی اشاعت سے عام بہبودی اور ترقی کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ ایشیا اور تمام عالم کے عام اسلامی اتحاد کی یہ پہلی اور بنیادی سیڑھی ہے۔

محمد علی ابراہیم لقمان
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول۔ عدن

عطا حسین
انسپکٹر مدارس۔ عدن

نوٹ۔

ہم بہ دل ممنون ہیں کہ جناب مولنیا عطا حسین صاحب وجناب مولینا محمد علی ابراہیم لقمان صاحب نے عدن سے عربی میں مضمون مرحمت فرمایا۔ جن الفاظ میں شمع اور اُس کے مدیر کا ذکر فرمایا ہے وہ سراسر احسان ہے۔ اصل عربی سے ترجمہ جناب فاروقی صاحب نے خوب کیا ہے۔

ہمارے مقامی دوست حافظ صاحب کا جواب بھی درج کیا جاتا ہے افسوس کہ یہ مضامین جلد شائع نہ ہو سکے۔ بہرکیف ہم اپنی رائے کا اسوقت تک اظہار نہیں کرنا چاہتے ہیں جبتک کہ علاّمہ شیروانی و حضرت شرر و جناب ہادی کے جوابات نہ آجائیں۔ امید کہ دیگر قارئین کرام بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

جعفری

خط

نوشتۂ :- جناب مولوی حافظ محمد حسن صاحب۔ بی۔ای۔ایل۔ایل۔بی

مکرمی جناب اڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔

مسٹر عطا حسین صاحب انسپکٹر مدارس عدن و محمد ابراہیم لقمان ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول عدن کا خط مع ترجمہ واپس کرتا ہوں۔ جیسا اس خط کے پڑھنے سے واضح ہوگا۔ یہ دراصل ایک مضمون ہے جو مسٹر شیروانی و مسٹر ہادی صاحبان کے مضامین کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔ مضمون میں چونکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اس وجہ سے اصلی مفہوم اس تحریر کا سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش کہ صاحبان ممدوح ذرا وضاحت کرتے تو بہت اچھا تھا۔ بہرحال جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے۔

(۱) مسٹر شیروانی و مسٹر شفیع کی تجاویز ناقابلِ عمل ہیں۔

(۲) مسلمانانِ ہند کا عربی، فارسی و ترکی سے جہل مسلمانانِ ہند کی خود بے توجہی کا باعث ہے اور مسٹر ہادی کی تجویز کہ ایک کتب خانہ قائم کیا جائے اور کتابوں کی اشاعت ہو۔ اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔

(۳) یہ کہ عرب ترک و ایرانی جو احیار ادب اسلامیہ میں پیش پیش ہیں۔ اور صلاحیت تامہ رکھتے ہیں اُن کا شمول ہر ایسی تحریک میں ناگزیر ہے۔

میرے خیال میں اس موقع پر مسلمانانِ ہند کی اُن خدمات کا ذکر جو وہ مسلمانانِ عالم اور ادب اسلامیہ کے بارے میں کرتے رہے ہیں بے محل نہ ہوگا۔ مسلمان جب سے ہندوستان میں آئے ہیں وہ اُنہیں روایات پر کاربند رہے اور ہیں جو اُن میں بحیثیت مسلمان قبل از

وردو ہندوستان رائج تھیں۔ تبدیل ملک نے اُن میں کوئی تغیر ایسا پیدا نہیں کیا جو کسی اعتراض کا باعث ہوتا۔ اگر ہم تواریخ کی ورق گردانی کریں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ابتدائے حکومت سے لیکر ابتک مسلمانانِ ہند دیگر اسلامی ممالک کی امداد ہر طرح کرتے رہے ہیں۔ شاہانِ مغلیہ سے قبل تغلق بادشاہ اپنے آپکو خلیفۃ المسلمین کا نائب سمجھتے رہے۔ اُنکو تحفے تحائف بھیجتے رہے اور شاہانِ مغلیہ کا جو رویہ دیگر شاہانِ اسلام سے تھا وہ بھی تاریخ سے رجوع کرنے پر معلوم ہوگا بہر حال شاہان کا تعلق کیسا تھا اُسکی ذمہ داری موجودہ مسلمانانِ ہند پر نہیں آتی۔ اگر شاہانِ ہند سے کوئی لغزش ہوئی تھی تو وہ اُنکا انفرادی فعل تھا حکومتِ خود مختاری کی رموزِ مملکت میں عامۃ الناس کی کوئی آواز نہ تھی۔ ایسی ہی تاریخ کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان شاہانِ ہند کے زمانہ میں فارسی عربی وترکی ادب اسی طرح فروغ تھا جیسا کہ ایک دوسرے ملک میں ایک دوسرا ادب رواج پا سکتا ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے تک ہندوستان کی عام زبان بلا اختلاف مذہب وملت فارسی تھی جس پر عربیت کا غلبہ تھا۔ تمام تصانیف فارسی زبان میں ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ ہنود اہل قلم کی بھی کتابیں فارسی زبان میں ملیں گی۔

عربی کا رواج ہندوستان میں کیسا رہا اور کیسا ہے اسکی شاہد ہندیوں کی تصنیف ہے۔ متعدد کتب اہل ہند کی مصنفہ عربی زبان میں ملیں گی۔ اور سیکڑوں عربی مدارس کا ابتک قیام اس پر مزید دلیل ہے۔ مسلمانانِ ہند کی اخوت وہمدردی کا تحریری ثبوت متعدد تواریخ اسلامیہ ہیں جو مختلف زمانہ میں مسلمانوں نے تالیف کی ہیں جن کا پتہ کسی معقول مطبع کی فہرست سے چل سکتا ہے۔ رہا مذہبی ادب کا مسئلہ اسکی بارے میں ہندوستان کے مسلمان کسی نہج موردِ الزام ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر آج کسی غیر ممالک کے مسلمانوں کو تمام مذہبی ادب درکار ہو تو وہ ہندوستان سے مکمل طریقہ سے شاید ہر ایک بڑے شہر سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

لہذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحبانِ ممدوح کا مسلمانانِ ہند کو بے اعتنائی کا مورد بنانا کہانتک صحیح ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ مسلمانانِ ہند کسی طور سے موردالزام قرار نہیں دئیے جاسکتے البتہ اُنکو یہ حق ہے کہ وہ دیگر ممالک کے مسلمانوں کی شکایت میں لب کشائی کر سکیں (زمانہ حاضرہ کی تاریخ پر اگر آپ ذرا نظر ڈالیں گے تو واضح طور پر معلوم ہو جائیگا کہ میں اپنی دعوے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ۱۸۵۷ء زائد تر قرار دیا جاسکتا ہے اُس وقت سے ابتک کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ) مسلمانانِ ہند کے تعلقات مسلمانان عالم سے دو طرح پر ہو سکتے تھے اور ہو سکتے ہیں۔ اول سیاسی۔ دوئم ادبی۔

مسلمانانِ ہند نے مسلمانانِ عالم سے سیاسی تعلقات قائم کرنے میں یہانتک پیش قدمی کی کہ اُنہوں نے اپنی تمام تحریکات کا مرکز سلطنت اسلامیہ کو بنالیا۔ جتنی تحریکیں مسلمانِ ہند سے ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئیں اُن سب کا تعلق بیرونجات کے مسلمانوں سے رہا اور یہ شغف اسقدر بڑھا کہ انہوں نے اپنی ذاتی توقعات کو پس پشت ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستان کی دیگر اقوام سے علم و دولت تجارت وغیرہ میں ہمیشہ کے لئے پیچھے رہگئے اور حکومتی اعتبار بالکل جاتا رہا۔ ۱۸۵۷ء سے لیکر ابتک کوئی قرن ایسا نہ گزرا ہوگا جس میں مسلمانانِ ہند نے ایک معتدبہ رقم کسی نہ کسی اسلامی حکومت کی نذر نہ کی ہو۔ اور شاید کوئی سال ایسا گذرا ہوگا جس میں مسلمانانِ عالم کی بہبودی و بہتری کی خاطر ہندوستانی اخبارات میں مضامین نہ لکھے گئے ہوں اور بلا طلب تجاویز پیش کی گئی ہوں یا دیگر اقوام پر اسلامی حکومت سے عمدہ برتاؤ کرنے پر زور نہ دیا ہو۔ کیا میرے معزز مین دوست اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند نے حجاز ریلوے۔ جنگ طرابلس جنگ بلقان اور جنگ عظیم میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور کیا وہ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند

کو ان امور میں حصہ لینے کی وجہ سے مالی جانی اور اعتباری نقصان نہیں پہنچا۔ علاوہ اُس بڑی دولت کے جو مسلمانانِ ہند نے اسمیں صرف کی ہزاروں مسلمانوں کی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔ اور سب میں بڑی اور ایک محکوم قوم کیلئے لابد چیز "یعنی حکومت کا اعتبار" وہ بھی کھو بیٹھے۔ اور یہ سب مسلمانانِ عالم کی خاطر۔ کاش مسلمانانِ ہند اپنا روپیہ اور اپنی تمام جدوجہد مسلمانانِ ہند کی بہتری میں صرف کرتے تو شاید مسلمانانِ ہند موجودہ حالت سے کہیں بہتر حالت میں ہوتے۔ مسلمانانِ عالم نے اسکے بدلے میں مسلمانانِ ہند کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ میرے خیال میں اسکا جواب معترض صاحب خود دیتے تو بہتر تھا۔ مسلمانانِ ہند ایک محکومانہ حیثیت رکھتے ہیں اور کسی محکوم قوم سے کسی امداد و استعانت کی توقع اس موجودہ آزادی کے زمانہ میں بھی رکھنا شاید صحیح نہ ہو لیکن دیگر ممالک کے مسلمان خود برسرِ حکومت تھے مسلمانانِ ہند کے مقابلہ میں مہذب تھے اور یورپ کے قربت کی باعث قومی ہمدردی اور اخوت کے مسئلہ سے خوب روشناس تھے۔ لیکن تاریخ ہند میں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ اُنہوں نے مسلمانانِ ہند کے ساتھ کوئی ہمدردانہ برتاؤ کیا ہو۔ مسلمانانِ ہند آخر انسان تھے اُنپر مذہبی، سیاسی اور ملکی مصائب نازل ہوئیں لیکن تاریخ ہمیں کہیں پتہ نہیں دیتی کہ کسی اسلامی حکومت نے اُنکی ہمدردی کیلئے ہاتھ بڑھایا ہو۔ کیا اخوت اور ہمدردی کا اظہار ایک ہی طرف سے ہوتا ہے۔ کیا تمام قربانیاں محکوم ہی کیا کرتے ہیں۔ محکومیت یقیناً غضب خداوندی ہے لیکن کیا مغضوب ہمدردی اور استعانت کا مستحق نہیں۔ بہر حال یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے نہ اس تحریر کا سیاست سے کچھ تعلق ہے نہ سیاست شمع کی اغراض میں داخل ہے موقعہ پر اس ذکر سے معترض صاحب کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ مسلمانان ہند سیاسی تعلقات قائم کرنے میں بھی مسلمانانِ عالم سے پیچھے نہیں رہے۔

اب رہا ادبی تعلق، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس احاطہ کیلئے میں سمجھتا ہوں موجودہ تحریر شاید مکتفی نہو لیکن مسلمانانِ ہند پر سے بے اعتنائی کا الزام ہٹانے کیلئے انشاء اللہ آئندہ کچھ حوالۂ قلم کرونگا۔ والسلام۔ آپکا مخلص محمد حسن۔

افکارِ شمشاد

جناب سید غلام پنجتن صاحب شمشاد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) وکیل حیدرآباد دکن

وہ رات آ گئے بھی مرے گھر تو کیا ہوا ۔۔۔ دیوار سے رقیب کھڑا تھا لگا ہوا

دنیا کی نعمتیں مری آنکھوں میں ہیچ تھیں ۔۔۔ میرا رفیق جب دلِ بے مدعا ہوا

وہ خارِ زارِ عشق کی دامن نوازیاں ۔۔۔ چھوڑا نہ بندِ جامۂ ہستی لگا ہوا

مجنوں ذرا تو دیکھ ادھر آ رہا ہے کون ۔۔۔ کس کی ہے بوئے زلف سے صحرا بسا ہوا

واماندگی، فسردگی اور اضطرابِ قلب ۔۔۔ اُس بارگاہِ حُسن سے سب کچھ عطا ہوا

یہ لیجے، وہ بھی ناز سے اٹھلاتے آ گئے ۔۔۔ محشر میں اور ایک یہ محشر بپا ہوا

خلوت میں اُن سے چھوٹ گیا کاروانِ شرم ۔۔۔ مجھ پر کرم فزوں ہوا بے انتہا ہوا

محفل میں میرے دل کی سراسیمگی نہ پوچھ ۔۔۔ سامانِ عقل و ہوش و خرد سب ہوا ہوا

اس دم نزولِ رحمتِ پروردگار ہے ۔۔۔ اے میگسار اُٹھ کہ درِ توبہ وا ہوا

عقبیٰ کا خوف ہے نہ رقیبوں کا ڈر مجھے ۔۔۔ جو کچھ ہوا ضرور ہوا برملا ہوا

میری زیادتی تھی کہ مرضی تھی آپ کی ۔۔۔ اب خاک ڈال دیجیے جو کچھ ہوا ہوا

سُنتے ہیں ہم۔ وہیں کہیں شمشاد مر رہے
یہ اور ایک قصۂ حیرت فزا ہوا
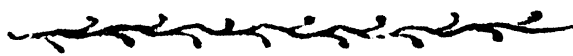
عذرا

"فی زمانہ انگریزی تعلیم پانیوالے نوجوان انگریزی ادبیات کے دلدادہ ہوکر بعض اوقات
تعریضاً اردو نظم میں یہ نقص نکالا کرتے ہیں کہ ردیف قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ادائے مطلب
میں خرابی واقع ہوجاتی ہے۔ انگریزی زبان میں بلینک ورس یا نظم معرا ایک ایسی نظم ہے
جس میں یہ قید نہیں۔ حقیقت میں ناواقفیت کی وجہ سے یہ اعتراض کردیا جاتا ہے۔
ورنہ اردو زبان بلینک ورس کی محتاج نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری ادبیات نے
اس کا نام نظم معرا نہیں رکھا بلکہ "نثر مرجز" سے موسوم کیا ہے۔ شاید اس ظاہری نام
کے تفاوت نے ہی اس کو دقیق نظر انگریزی خواں حضرات کی نگاہوں سے مخفی رکھا ہے
اور وہ اُس کو داخل دائرۂ نظم نہیں سمجھتے۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ
"عذرا" کے عنوان سے ایک نثر مرجز میرے بڑے بھائی ظاہر حسن صاحب بی۔اے۔ نے
لکھی تھی جو "شمع" کے نورانی صفحات کے لئے پیشکش کرتا ہوں"

"**مظہر حسن** از مالیر کوٹلہ"

اس درد بھرے دل کا افسانہ سناؤں کیا؟ طاقت نہ زبان میں ہے، یارا نہ قلم میں ہے
افسانۂ غم ہے یہ، یا قصہ ہے وحشت کا۔

جب فصلِ بہار آئی، گذری ہوئی باتوں کی پھر یاد ہوئی تازہ، پھر جوش جنوں اٹھا؛ اک روز
میں وقتِ صبح آبادی سے گھبرا کر باہر جب چلا گھر سے صحرا کا لیا رستہ، دریا کے کنارے
پہنچا دیا وحشت نے۔ تھا فیضِ بہار ایسا ہر برگ سے ہر گل سے تھا رازِ طرب پیدا،
ہر غنچۂ شگفتہ تصویرِ مسرت تھا، ہر نخل کی شاخوں پر، نوخیز شگوفوں سے جھرمٹ تھا

حسینوں کا ہر ذرہ کی آنکھوں میں سورج کی شعاعوں نے کرنوں کی سلائی سے اک نور کا سرمہ ساڈالا تھا صفائی سے۔ سبزے کی وہ کیفیت، تھا فرش زمیں مخمل سجادہ دیا تھا۔ اور اس پہ وہ پھولوں کی ہر رنگ میں زیبائش گو یا قلم مو سے قدرت کے مصور نے تصویر بنائی ہے آنکھوں کے لبھانے کو۔ یا جال بچھایا ہے نظروں کے پھنسانے کو، اور لہروں کی دریا میں بچھی ہوئی دریائی اور اس پہ حبابوں کا اٹھ اٹھ کے مچل جانا، بگلے کا بھگت بنکر پانی میں کھڑا رہنا، بلبل کا گل تر سے کچھ راز بیاں کرنا، باد سحری کا وہ سبزے پہ خرام ناز پھر سطح پہ دریا کی موجوں سے الجھ پڑنا۔ پھر شوخی سے سبزے کے دامن کو جھٹک دینا پھر چٹکیاں لے لیکر پھولوں کو ہنسا دینا اور دیکے انہیں دھوکا خوشبو کو اڑا لینا۔

وہ نام کو جنگل تھا پر کوئی اگر دیکھے۔ اک گلشن فطرت تھا جس کی کہ ہر اک شے میں اک حسن کا طوفاں تھا، لیکن میری آنکھوں نے ایک موقع پہ پہلے بھی اس منظر دلکش کو اس حال میں دیکھا تھا۔ اف تھا وہ زمانہ کیا، کیا دل میں امنگیں تھیں جاں صرف تمنا تھی دل لطف کا خوگر تھا آنکھیں متجسس تھیں تھا شوق تماشوں کا اور ذوق تھا سیروں میں اس وقت جو دیکھا تھا ہر شے میں یہی تھا لطف نغمے تھے عنادل کے۔ پانی کی روانی تھی جھونکوں میں ہوا کے بھی ایسا ہی ترنم تھا۔

ان سب سے مگر دلکش اک اور تھا نظارہ یعنی لب دریا سرسبز کنارے پر ان پودوں کے جھرمٹ میں اور پھولوں کے سائے میں اک صاف سا پتھر ہے پانی سے ذرا اونچا اور اسکے برابر میں اک پودا ہی چمپا کا، اس قدرتی کرسی پر لٹکائے ہوئے پاؤں، دامن کو نزاکت سے ایک ہاتھ کی چٹکی میں پکڑے ہوئے گرنے سے بیٹھی تھی مری عذرا، وہ حسن مجسم تھی، وہ نازوں کی پالی تھی، تصویر تھی عصمت کی، دیوی تھی وہ عفت کی، بچپن کا ابھی اسکے چہرہ پہ تھا بھولاپن، آنکھیں تھیں حیا پرور لیکن ابھی بچپن کی بیباکی بھی

تھی انہیں رخساروں کی تابش سے وہ خطہ منور تھا اور بھولے سے چہرہ کا تھا عکس جو پانی میں معلوم یہ ہوتا تھا
لہروں میں کھلے ہیں گل اک ہاتھ میں دامن تھا اک ہاتھ سے پانی کے چھینٹے وہ اڑاتی تھی قطرے جو بکھرتے تھے
پھر پانی میں گرتے تھے، وہ محوِ تماشا تھی اور لب پہ تبسم تھا، میں صورتِ آئینہ خود محوِ تحیر تھا، دل ایک نظر
میں ہی میں ہاتھ سے کھو بیٹھا، کچھ ہوش نہ تھا مجھکو بیتاب ہوا ایسا اک نعرۂ مستانہ لب سے مرے یوں نکلا،
عذرا کے بھی کانوں تک جا پہنچی مری آواز، عذرا نے ادھر پھر کر دیکھا جو وہاں مجھکو اک سادگی سے پوچھا
”کیا مجھ کو بلاتے ہو؟“
یہ لفظ سُنے میں نے، دیکھیں وہ نگاہیں بھی، وہ بھولا سا چہرہ بھی اور اس پہ تحیر کی ہلکی سی جھلک دیکھی
پھر مجھکو نہیں کچھ ہوش، میں پہلے ہی بیخود تھا، اب کچھ نہ رہا باقی ہاں یاد ہے صرف اتنا آنکھیں جو
کھلیں میری عذرا نے مرے مُنہ پر پانی کے دیئے چھینٹے اور ہوش مجھے آیا ......
افسوس کہاں وہ دن ہیہات کہاں یہ دن، راحت نہ ملی مجھکو، دنیا میں کبھی اک
پل، میں رازِ محبت کو لب پر نہ کبھی لایا عذرا گئی جنت کو، وہ حور تھی جنت کی اور چھوڑ گئی مجھکو
اس رنجِ دوامی میں، اب غم میں جدائی کے آوارہ و وحشی ہوں سرگشتہ و حیراں ہوں، اک
درد ہے پہلو میں، دل قابو سے باہر ہے، آنکھوں میں تصور میں تصویر ہے عذرا کی،
یہ منظرِ دل آویز، یہ بادِ سرور افزا، پھولوں کی یہ زیبائش اور موجیں یہ دریا کی، سب خاک
سے بدتر ہیں سب خار ہیں آنکھوں میں، وہ روح و روانِ حسن عذرا نہیں جب ان میں!

ظاہر حسن - بی - اے -

جذبات

غزل

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — کسی کو اپنے مقدر کا حال کیا معلوم

میں کیا بتاؤں گزرتی ہے زندگی کیونکر — خراب حالِ تمنا ہوں مجکو کیا معلوم

دلِ حزیں تجھے ڈھونڈھوں بھی میں تو کیا حاصل — ترا وجود غلط تیرا حال نا معلوم

قرار کہتے ہیں کس کو سکونِ دل کیا ہے — میں ناصبورِ تمنا ہوں مجکو کیا معلوم

مجھے یقین ہے دیگی زباں نہ ساتھ مرا — خیالِ عرض و تمنائے التجا معلوم

میں ہو کے قتل بھی عرضِ وفا کو ترسوں گا — ستم شعار ترا مُڑ کے دیکھنا معلوم

ہزاروں لذتیں اک اک خلش میں پنہاں ہیں — ابھی مرے دلِ بے مدعا کو کیا معلوم

اُبھارنا بھی غلط اور سنبھالنا بھی فضول — دلِ شکستۂ حسرت کا راز کیا معلوم

ہوئی جبین اگر صرفِ سجدہ کیا غم ہے — مرے نصیب کا لکھا تو ہو گیا معلوم

یہی بہت ہے کہ ہو جائیں منہ سے حرف ادا — اثر نوازیٔ مفہومِ التجا معلوم

شریکِ حال بناؤں کسے محبت میں — ہے اک نصیب مگر اسکا حال کیا معلوم

تجھے جو غم سے رہائی کی فکر ہے ہادی
مجھے بھی جوششِ محبت کا فیصلا معلوم

ہادی مچھلی شہری

تاریخ چتوڑ کا ایک خونیں ورق

از

"تماشائی" علیگ

آج سے تقریباً چھ صدی پیشتر کا ذکر ہے۔ خلافتِ عباسیہ کی شمع بزم کا گل ہونا گویا کل کی بات ہے۔ اندلس میں خانہ جنگی قایم ہے غرناطہ و قرطبہ کی واجب التقدیس درسگاہیں فاتحہ خوانی میں مشغول ہیں۔ ہلالی و صلیبی سلطنتیں برسرپیکار ہیں۔ قسطنطنیہ فتح ہونے میں ایک سو پچاس برس کی طویل میعاد باقی ہے۔ سلطان صلاح الدین کی وفات کو بھی ۲ صدیوں سے کم زمانہ نہیں ہوا ہے۔ تمام کارگاہِ عالم انقلابات سیاسی کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ ایک سے ایک حیرت انگیز و خروش بار ایکٹ ہو رہا ہے دیکھیں اس وقت مملکتِ ہند کے سیاسی مطلع پر کونسا درخشندہ "ستارہ" ضوفشاں ہے

(۱)

آریاورت کے مقدس سنگھاسن پر خاندان خلجی کا چشم و چراغ اسکندر ثانی علاء الدین رونق افروز ہے۔ شاہانِ عروج کا زمانہ ہے، راس کماری سے کشمیر تک اسکی سلطنت میں شامل ہے۔ شمالی ہند میں امن ہے ورنہ تمام کلیہ ہند میں بدنظمی کا سکہ رائج ہے اور طوائف الملوکی کا بازار گرم ہے۔ بادشاہی رعب و دبدبہ محض شمالی ہند میں مکرور و نحیف طبقہ پر جاری و ساری ہے۔ اعیانِ مملکت آپس میں شادی و بیاہ نہیں کر سکتے رؤسائے شہر مال جمع نہیں کر سکتے کیونکہ خیال ہے کہ اتحادِ ملی اور دولت و ثروت کی

فراوانی شاہی خاندان کا قلع قمع کر دیگی۔ مشیرانِ سلطنت خفیف حکم عدولی پر تہہ تیغ ہوتے ہیں۔ خانہ جنگیوں کا عام رواج ہے، احباب واعزہ میں محبت عنقا ہے، کیونکہ انہیں میں شاہی خفیہ جماعت کے سربرآوردہ کارکن ہیں۔ اور ہر متمول شخص اپنے ہمسایہ کے "معصوم خون" کا پیاسا نظر آتا ہے۔

(۲)

صبح کا وقت ہے مندروں سے بھجنوں کی خوش آیند آواز آرہی ہے تشنہ کامانِ معرفت "پریم" کے ساغر پیکر لطف اندوز ہو رہے ہیں اور "روحانی" سرور سے مسرور ہو کر دلکش لے میں پاکیزہ پدوں (نغماتِ معرفت) کو الاپ رہے ہیں۔ یہ پیام کرشن صرف چتوڑ گڑھ کے باشندوں کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ کل تشنہ کامانِ پریم اپنی تشنگی معرفت کو بجھانے کیلئے اس واجب التوصیف قربان گاہ پر حاضری دینا فخر سمجھتے ہیں۔ چتوڑ گڈھ سارے راجپوتانہ کی ناک اور سب سے زیادہ مضبوط قلعہ خیال کیا جاتا ہے۔ میواڑ کے راجپوت اُسے اپنے راج کا مبارک اور واجب التقدیس مقام سمجھتے ہیں۔ آہ زمانہ کی نیرنگی ملاحظہ ہو! آج یہی میواڑ کے علاقہ میں معمولی حیثیت کا ایک قصبہ ہے اسٹیشن بھی ہے اور چھاونی نصیر آباد سے ۸۰ میل جنوب اور چھاونی نیمچ سے تین ۳ میل شمال و مغرب ندی بیرس کے کنارہ پر آباد ہے۔

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدیدست صنادیدِ عجم را

(۳)

سنِ مسیحی کو تیرہ سو دو ۱۳۰۲ اور حضور سرورِ کائنات صلعم کی ہجرت کو ۷ صدیاں گذری ہیں۔ لاکھمی

ریاست میواڑ کے رانا کی وفات کے بعد اُس کا نابالغ لڑکا حاکمِ وقت ہے۔ ریاست کا کام کمسن رانا کے عمّ بزرگ رانا بھیم سنگھ کے سُپرد ہے۔ چونکہ اہلِ معاملہ کا انہیں سے تعلق ہے اور وہی ریاست کے سیاہ و سفید کے مختارِ کُل ہیں۔ اس لئے عوام میں وہی رانا چتوڑ مشہور ہیں۔ رانا کی شادی جزیرۂ سراندیپ کی ایک محبوبۂ دلنواز "رشکِ قمر" کافر ماجرہ "حسین و جمیل رانی سے ہوئی ہے۔ اُسکو حُسنِ بے حجاب کی تنویر کہیں تو بجا ہے۔

(۴)

سلطان علاؤالدین مدبر ہے اور سپاہی بھی۔ ازل سے سیاسی طبیعت لیکر پیدا ہوا ہے ہر جگہ اُسکے ہرکارے موجود ہیں۔ جو لمحہ لمحہ کی خبر اُسکے عمال کو پہنچاتے ہیں۔ اس وقت وہ سرِ دربار رونق افروز ہے، تمام اعیانِ مملکت اور مشیرانِ سلطنت موجود ہیں اور احکامات صادر ہو رہے ہیں۔ دفعتًا ایک پرچہ نویس حاضر ہوتا ہے اور پدماوت کے حُسنِ نادیدہ کا تذکرہ سُناتا ہے۔ سلطان مزید حالات کی تفتیش کے لئے دربار برخاست کرکے ہرکارہ کو محل میں لیجاتا ہے۔ اور حُسنِ شنیدہ پر عاشق ہی نہیں بلکہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔

ناوکِ عشق دل کے پار ہوا
طائرِ ہوش تک شکار ہوا

(۵)

علاؤالدین کے خیال میں ساری کائنات محض اس لئے بنائی گئی ہے کہ اُس میں صنم کدۂ حسن کی پرستش کی جائے۔ اور قربان گاہ عشق پر معصوم و پرکیف ہستیوں کا خون چڑھایا جائے۔ فضائے عالم میں اُسکو دوشیزگانِ ہند کے حُسنِ ملیح کی بجلیاں ہر وقت کوندتی نظر آتی تھیں۔ شب کے سناٹے میں، جنگل کی خاموشی میں، آبشار کی روانی میں غرض کہ

ہر حال میں اُس پر ایک خرد رُ باکیف اور سرور طاری رہتا ہے۔ مگر دل کی بے تابیوں سے مجبور ہو کر طلب بہ ماوت میں یہ خط لکھ بیٹھتا ہے :۔

"بسمع اقدس وہمایونِ مارسیدہ کہ آں زبدۂ راجگانِ عقیدت نشان کنیز خوش جمال فرخندہ خصال از جزیرۂ سراندیپ آوردہ است۔ باید کہ آں تحفۂ صنعتِ الٰہی ونمونۂ قدرتِ ایزدی رابزودی روانہ درگاہِ فلک اشتباہِ ماساز دہر آئینہ بہ "ظہور" ایں خدمتِ شائستہ موردِ تفضلات شاہی در مطمح نظرِ الطاف خسروی تواند بود۔ ودر صورتِ انحراف ونافرمانی بپاداش کردار خواہد رسید ...."

رانا بھیم سنگھ بہادر ہے اور رگوں میں شریف راجپوتوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ جوانی سے سرشار ہے، طبیعت میں اُمنگ ہے۔ جان دینا آسان ہے۔ مگر انتقام نہ لینا مشکل ہے۔ شقۂ عالی پہنچتا ہے! اگرچہ رانا ہمسر نہیں ہے مگر ایک جانباز راجپوت ہے۔ فطرتاً طبیعت میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور خود جواب لکھتا ہے!

"ضمیر آفتاب نظیر آں خدیو کشور گیر مخفی نہ خواہد بود کہ شاہانِ دین دار و خواقین معدلت شعار حرمات محترمات ومخدرات محصنات فدویانِ خاص وجاں نثارانِ بااختصاص راننگ وناموسِ خود تصوری فرمایند وذاتِ قدسی صفات خویش را از ظل الحق دانستہ مخلوق الٰہی را بزیر سایۂ حفاظت و امنیت خود نگاہ می دارند باغوائے نفسانی وترغیب شہوانی از حد حق پرستی ودائرۂ خداشناسی بیروں شتافتہ راہِ ناصواب طے می نمایند۔ حیف است کہ مسیحا کار اجل فرماید وخضر طریقۂ گمراہی بپاید۔ پاسبان را

دزد شدن نشاید و راعی را گرگ بودن نباید و اگر نیتِ حق طویت ہمی اقتضا می کند۔ بسم اللہ این گوئے و این میدان ؎

بیا و نوش کن پیمانۂ چند
فدائے مقدمت میخانۂ چند

لیکن معلوم است کہ در عالم غیرت و ناموس ذرہ با خورشید ہم چشمی میکند و مور با سلیمان مقابل می شود۔ اینک است۔ ہمت و مردانگیٔ ما در صف و سر شجاعت و شیر دلی بر کف ؎

وقتِ ضرورت چو نماند گریز
دست بگیرد سرِ شمشیرِ تیز"

جواب پڑھتے ہی علاؤ الدین کے غیض و غضب کی انتہا نہ رہی۔

"وہ کوئی فرمانروا یا مساوی درجہ کا انسان نہیں ہے، وہ آریہ ورت کا جلیل القدر مطلق العنان شہنشاہ ہے جس کی جبروت، اقتدار اور سطوتِ اقبال کا سکہ تمام ہند میں رائج ہے۔ وہ ایک نامور و نبرد آزما اور جہاں دیدہ سپہ سالار ہے۔ جو چتوڑ گڈھ کے قدیم تاریخی میدان میں زبان شمشیر سے حسن و عشق کی قربانگاہ پر قسمت کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ جرار فوج لیکر قضائے مبرم کی طرح فضائے چتوڑ پر مسلط ہو گیا۔

(۶)

چتوڑ کی "شبستان عیش" "سحرستان ناز" ہے۔ ایک خوبصورت مندر ہے جو کسی واجب التحریم دیوی کے نام سے مشہور ہے جس میں دوشیزگان ملیح صبح و مسا اپنے

اپنے معصوم و دلگداز نغمات سے عبادت میں مشغول ہیں۔ لیکن ایک تصویر غور طلب ہے اُس حسّاس ہستی کے نازک ہاتھ مرتعش ہیں اور صراحی دار گردن خمیدہ ہے۔ اکبارگی یہ جلسۂ عبادت ختم ہوتا ہے اور شہزادی پدماوت اپنی سہیلیوں کے ہمراہ "قصرِ جلالت" میں داخل ہوتی ہے۔ اُسکے انداز سے نسوانی تمکنت اور غرورِ شاہی ٹپکتا ہے۔ مالوہ والوں کا خیال ہے کہ رانی پدماوت کے مقابلہ میں کیکئی کی ملاحت، شیریں کی "صباحت" دیول دیوی کی نزاکت، اور دمینتی کی "رعنایت" کو وہی نسبت ہے، جو شمع احمر کو "قمر" سے!

رات زیادہ جاچکی ہے لیکن شبستانِ ناز میں ابھی چہل پہل ہے۔ شہزادی پدماوت مسندِ تمکین کی نازش بنی ہوئی ہے۔ دربار میں جلوہ گر ہے۔ چنچل دوشیزہ حلقہ کیے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نجومِ فلکی زمین پر اتر آئے ہیں۔ اور اُس "رشکِ قمر" کے گرد سرگرم طواف ہیں۔ ہیبتِ حُسن سے مختصر کائنات متزلزل ہے۔ سیاہ گیسو ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اور خمار آلود نگاہوں کے ساغر چھلک رہے ہیں۔

ایک جُھرمٹ حسین کنواریوں کا رقص میں مصروف ہے اور شہزادی پدماوت اُس کی خاموش نگراں۔ ایک بارگی شہزادی پدماوت غصہ سے کانپ اُٹھتی ہے اور نہایت برافروختہ ہوکر کہتی ہے۔

"بس — بس — بس — سرلا — بس!"

سرلا — "حکم"

رانی۔ "سُنا! دلی کا بادشاہ چتوڑ گڈھ پر حملہ کرنے والا ہے ——

——کس لئے —— پدماوت کی خاطر —— !

سُنو۔ پدماوت راجپوت کے گھر میں ہے۔ مجال ہے کہ کوئی اُس کے جسم سے ہاتھ بھی لگا سکے ——————"

عورتیں (ایک آواز ہو کر) ——" رانی —— مجال —— کس کی ہے !" رانی (تقریر جاری رکھتے ہوئے) "سُنو —— پتی برت کی زنجیر میرے گلے میں ہے۔ میرا یہی دھرم ہے —— کیا میں —— چھترانیوں کے نام پر بٹہ لگاؤں —— پاپ —— پرماتما ! کیا میں پاپ کروں —— نہیں نہیں۔ ناممکن —— چھتریوں کا سر کبھی نیچا نہیں ہوگا ——————

معلوم ہے کہ اس گڈھ میں' —— خون کی ندّی بہے گی ——————

—— میں سپنے میں روز دیبی جی کو دیکھتی ہوں —— وہ پیاسی ہیں —— جب تک اُن کی پیاس نہ بجھے گی —— یہ بلا نہ ٹلے گی۔ پیاس اُس وقت تک نہ بجھے گی —— جب تک چتوڑ گڈھ کی اینٹ سے اینٹ نہ بج جائے گی اور بچہ بچہ تلوار کے گھاٹ نہ اُتر جائے گا —— میں بھی اپنے لئے طے کر چکی ہوں۔ وہی کرونگی جو راجپوتنیوں کی شایانِ شان ہے —— سنگدیپ کی دیبیاں اور میری ماتا —— میرے مرنے کی خبر سُن کر خوش ہونگی —— غرور سے کہیں گی کہ پدماوت نے وہی کیا —— جو ہمارا دھرم ہے ! —— یعنی —— "جوہر" ——"

شاہزادی کی اس تقریر نے مجمع میں آگ لگا دی —— سب فوراً ایک زبان ہو کر بول اُٹھیں ——" ہاں —— ہاں —— ' جوہر' —— ! بے شک ! 'جوہر' !"

——————:——————

(۷)

آج چتوڑ گڈھ میں ہر شخص مضطرب ہے۔ کوچہ و بازار ویران ہیں اور سیر و تفریح کے مقامات سنسان۔ لیکن سر شام سے دربار میں ہجوم ہے —— رانا بھیم سنگھ تقریر کر رہے ہیں۔ غصہ سے اُنکی زبان بار بار رُک جاتی ہے۔ آنکھیں سُرخ ہیں لیکن چہرہ سے وہ سب عیاں ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ —— تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں، زبان خشک ہے! —— اہل دربار چلّا کر کہہ رہے ہیں ——

"پرماتما۔ آکاش پھٹ پڑے —— پاپ —— پاپ —— دنیا کا خون سفید ہو گیا —— پاپ —— پاپ ——"

رانا (تقریر جاری رکھتے ہوئے)

"...... بہادرو ...... تم کو معلوم ہے ہم پر یہ چڑھائی —— کس لئے ہے ——"

(ایک آواز —— سیکڑوں آوازیں) "معلوم —— معلوم —— پاپ —— پاپ —— جنگ —— جنگ!!"

رانا —— "تم زبان کے دھنی ہو۔ جنگ جنگ کہہ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ پچھتانا پڑے۔ اس میں جانیں ضائع ہوں گی۔ چتوڑ گڈھ کی اینٹ سے اینٹ بج جائیگی۔ اور سارا انتظام سلطنت منتشر ہو جائیگا —— بہادر سوچ سمجھ کر جواب دینا ——"

باہر سے صدہا آوازیں —— "جنگ —— جنگ ——"

رانا "کیا تم کو فتح کا یقین ہے —— ! اچھی طرح سمجھ لو —— شیر اور بکری ...... کا مقابلہ ہے ——"

باہر اور اندر سے جنگ۔ جنگ کی صدا گرجتی ہوئی آوازیں گونج اُٹھیں اور در و دیوار سے معلوم ہونے لگا کہ گویا منجنیق سے قلعہ شکنی ہو رہی ہے۔

رانا۔" جنگ ایک ہولناک حادثہ ہے۔ ہم فنا ہو جائیں گے۔ کل شیرازہ بکھر جائیگا
اور چتوڑ گڈھ ہو کا میدان بن جائے گا۔"

ایک آواز ــــــ "رانا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم نابالغ راجہ کی وفاداری کا حلف اُٹھاتے
ہیں ــــــ بے شک ہم زبان کے دھنی ہیں ــــــ ہماری زبانیں تلواریں ہیں۔ سپر نہیں
ــــــ البتہ ہمارے سینے ــــــ سپر ہیں۔ ــــــ ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم میں
اب بھی وہ خون باقی ہے جس نے ہمارے اجداد کے ناموں کو دنیا میں روشن کیا ہے۔"

اب رانا بھیم سنگھ کو معلوم ہو گیا کہ جنگ کے لئے ہر راجپوت تیار ہی نہیں ہے
بلکہ اس میں شرکت کرنا مذہبی فرض سمجھتا ہے ــــــ

رانا" تین پہر رات جا چکی ہے .... ٹھنڈی ... ہوائیں آرہی ہیں .....
آکاش .... کے دیئے بھی جھلملا رہے ہیں .... اب .... آپ
لوگ بھی آرام کیجئے شاید .... پھر آرام کا موقع نہ ملے .... اب میں
آپ لوگوں کی اجازت سے تمام چتوڑ والوں کی عزت کی قسم کھا کر جنگ کا اعلان
کرتا ہوں!

دار العوام کا جلسہ ختم ہوا۔ تاروں کی چھاؤں میں راجپوت اپنے گھروں کو رخصت
ہوئے۔ دور سے ایک ہرکارہ دوڑتا ہوا .... رانا بھیم سنگھ کے پاس آتا
ہے۔ اور اطلاع دیتا ہے کہ علاء الدین کی افواج فصیل چتوڑ سے ۲ میل پر آگئی
ہیں .... اور صبح سورج کے درشن ہونے سے قبل پہلا ....
دھاوا ہو گا!!

(۸)

سلطان علاؤالدین کی فوج قلعہ چتوڑ کا اس طرح محاصرہ کئے پڑی ہے کہ تل رکھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ چاروں طرف خیمہ اس طرح نصب ہیں کہ اچھی خاصی فصیل بن گئی ہے۔ باقاعدہ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے۔ ادھر مشرق سے "آتشیں رخ سر کھلا" اور ادھر جنگجو سپاہی خون شہادت کے شوق میں میدان میں جمنے شروع ہوئے۔ علاءالدین کو اپنی سپاہ کی شجاعت ------ اور فہم و ادراک پر کامل وثوق ہے مگر چتوڑ والے بھی اپنی ہتھیلی پر جان لیکر مقابلہ کے لئے آمادہ ہیں۔ اُن کا جذبہ مذہبی رنگ اختیار کر چکا ہے۔

سورج کی پہلی کرن اعلان جنگ کا کام دیتی ہے اور چشم زدن میں دونوں فوجیں آپس میں گتھ جاتی ہیں۔ ------ اور عرصہ تک شب و روز کشت و خون کا بازار گرم رہتا ہے ------ انجام کے خوف سے بھیم سنگھ سراسیمہ ہے ------ کیونکہ برابر کی لڑائی نہیں ہے لیکن انصاف یہ ہی ہے کہ بھیم سنگھ نے استقلال سے کام لیا ------ اور دشمن کے حملہ کی مدافعت میں شجاعت سے زیادہ قابلیت کا اظہار کیا .... اور قلعہ میں محصور ہو کر برابر دشمن کو زک دیتا رہا ------ مگر تابہ کے ------ محاصرہ کے طول سے بھیم سنگھ بالکل گھبرا گیا تھا!!!

(۹)

جب زبردست مقابلہ کے بعد بھی چتوڑ فتح نہ ہوا تو دونوں طرف سے صلح و آشتی کے پیام بھیجے گئے۔ علاؤالدین نے کہلا بھیجا "میں دلی واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اس شرط سے کہ پدماوت کو ایک نظر دیکھ لوں" بھیم سنگھ بھر برافروختہ ہو گیا۔ مگر اعیان

ریاست نے اُسکو سمجھا بُجھا دیا کہ اگر صورت کا عکس آئینہ میں دکھلا دیا جائے تو کچھ ہرج نہیں ہے ——— لیکن مشکل یہ آپڑی کہ رانی پدماوت اس ذلت کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی ——— مگر اپنے پران پتی کے حکم کو سرتابی نہ کرسکی ——— علاؤالدین سے جب یہ تجویز پیش کی گئی تو اُس نے منظور کرلی۔ حسب قرارداد سابق علاءالدین محض دو ایک آدمی لیکر قلعہ میں بغیر سلاح کے داخل ہوا اور آئینہ میں پدماوت کو دیکھ کر واپس ہوا رانا بھیم سنگھ قواعد شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے قیصرِ سند کی مشایعت میں قلعہ کے باہر تک آیا ——— ایک دستہ ترکی فوج کا کمین گاہ میں موجود تھا ——— اور بھیم سنگھ بات کی بات میں شاہی قیدی بن گیا!! ———

(۱۰)

رانی پدماوت بڑی چتر نار ہے۔ سمجھی۔ یہ موقع کھلم کھلا مقابلہ کا نہیں ——— فوراً علاؤالدین کے پاس پیام بھیجا ——— "راجہ کو رہائی بخشئے ——— میں حاضر خدمت ہوتی ہوں" بادشاہ نے جسکو مغلوں کے حملہ کا ڈر تھا یہ سب منظور کرلیا۔ رانی نے سات سو سورما بیروں کو محافوں میں سوار کرکے روانہ کردیا ——— اور یہ پیام بھیجا "میں بھی حاضر ہوں ——— مگر آئینِ محبت اور آدابِ عشق کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ آخری نظر بھی راجہ پر نہ ڈالوں؟" ——— فقرہ چل گیا، اور بسم اللہ کی گنبد میں رہنے والوں پر سحر سامری کا کام کرگیا

رانی مقید رانا کے خیمہ میں داخل ہوئی اور راجہ محافہ میں بیٹھکر قلعہ میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں غل ہوتا ہے ——— راجہ ہے نہ رانی! ——— دھوکے کا جواب دھوکا! بات کی بات میں تمام راجپوت تلواریں سوت کر محافوں سے کود پڑے۔

سخت لڑائی ہوئی ——— مگر انجام ——— ناکامی ——— !! علاؤالدین کو مغلوں کے خیال سے فوراً دلی واپس ہونا پڑا

(نوٹ۔ یہ واقعات حضرت امیر خسروؒ کے بیان سے مطابقت نہیں کرتے ——— لیکن اہلِ مالوہ کا یہی خیال ہے ——— اور میں نے فسانہ کو رنگین بنانے کے لئے اسی پر اکتفا کیا ہے ——— بہرحال تاریخ سے اس قدر ثابت ہے کہ وہ ایک ہی بار چیتوڑ گیا ——— اور اُسی مرتبہ اس کو فتح کیا۔)

مگر ناکامیابی کا خیال اور ایک عورت سے شکست کی پشیمانی گویا ایک پھانس تھی جو علاؤالدین کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی ——— وہ اپنی دُھن کا پکّا اور ارادہ کا مضبوط تھا۔ سنہ ۱۳۰۳ء میں طوفان کی طرح اُٹھا اور ایسے جوش وخروش سے چلا کہ فوج کی نقل وحرکت سے راستہ کے جنگل وبیابان متزلزل ہو گئے ——— جس وقت علاؤالدین ملک میواڑ کے حدود میں پہنچا تو لشکر کے تلاطم سے دشمنوں کے قلوب تو درکنار زمین بھی ہل رہی تھی!

(۱۱)
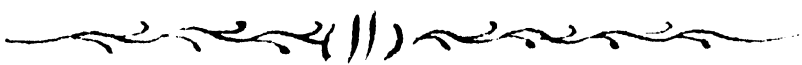
چیتوڑ گڈھ کی خندق لاشوں سے پٹ گئی۔ اگرچہ پہلے حملہ میں قلعہ مفتوح ہونے سے بچ گیا تھا لیکن یہ کامیابی اس قدر گراں قیمت پر حاصل ہوئی تھی کہ دشمن کے ہاتھ سے چیتوڑ کے باغ کے بیشتر خوشبودار پھول ضائع ہو چکے تھے اور فوج کا بہترین حصہ ختم ہو چکا تھا۔ رانا بھیم سنگھ محصور ہو کر مقابل ہوا۔ مگر اُس کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ دوسرے حملہ کا مدافعانہ مقابلہ نہ کر سکا۔ علاؤالدین کی فوج بالکل تازہ دم تھی۔ اُمید کامل تھی کہ رانی پدماوت کے حُسنِ عالم سوز سے دلّی کا ظلمت کدہ روشن ہو جائیگا۔ مددگار راجاؤں کی

افواج حمایت کے لئے آئیں مگر مقابلہ میں بیکار ثابت ہوئیں۔
رانا جنگ کے انجام پر نظر کر کے عالم بیقراری میں اپنے دل سے اس طرح باتیں کرتا ہے۔ "آج کی شام میری اور میری فوج کی حیاتِ مستعار کی آخری شام ہے! آج سورج کا درشن آخری درشن ہے!! اُف چند گھڑیوں میں چتوڑ گڈھ کا لہلہاتا ہوا سدابہار باغ غنیم کے پیروں سے مسلا جائیگا! —— میں ہی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہوں —— کیا بے گناہ خون کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ ——؟ صرف پردۂ شب درمیان ہے۔ صبح ہوتے ہی یہ عورتیں آٹھ آٹھ آنسو روئیں گی اور غم والم میں مبتلا ہو کر اپنی جانیں دیں گی —— کیا اب بھی دشمن کی اطاعت قبول کر لوں؟ —— کیا رانی پدماوت کو دلّی کی سنگھاسن پر حکومت کرتے دیکھوں؟ —— نہیں —نہیں ہرگز نہیں —— ہرگز نہیں —— ہرگز نہیں! اس خیال کے آگے زندگی ہیچ ہے" ——

(۱۲)

اللہ اکبر —— اللہ اکبر —— اللہ اکبر —— اللہ اکبر کی پُرہیبت تکبیروں سے ارض چتوڑ گونج رہی ہے —— علاؤالدین نے قلعہ کی فصیل پر قبضہ کر لیا ہے قلعہ کے بہادر سپاہی آخری کوشش کے لئے سرکف ہیں —— چیخ چیخ کرتی ہوئی تلواروں کی جھنکار نے اعلان کیا کہ قلعہ فتح ہو گیا! —— اور علاؤالدین کی فوج قلعہ میں گھس آئی —— شیر صفت رانا بھیم سنگھ کے لبوں پر یہ الفاظ جاری تھے

"پیارے بھائیو۔ میری فکر نہ کرو۔ دشمن کا مقابلہ کئے جاؤ۔ تمہارے خونِ پاک کے قطرات سے چتوڑ کی عظمت کی تاریخ لکھی جائیگی۔ دیکھو کہیں مورخ لکھتے لکھتے قلم نہ روک لے۔ خبردار! ابھی موقع

عزت وآبرو کا ہے۔ چتوڑ کی آن پر قربان ہونے والے بہادرو! کیا دیکھتے ہو!! محل کے پھاٹک پر جو فوج ہے اُسکا قلع قمع کردو"۔

یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ چتوڑ کی شجاعت و مردانگی کی ضو افگن "شمع" ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

(۱۴)

آہ! اس محاصرہ کا دردناک انجام لکھنے کیلئے فسانہ نویس کا قلم جگر چاک ہے! رانی پدماوت شوہر پرستی کے قابلِ قدر و پاک جذبہ سے متاثر ہوکر چھتری برن کی آن پر راجپوت قوم کی تیرہ ہزار (۱۳۰۰۰) سہیلیوں کے ہمراہ اپنی عزیز جان کو نذرِ آتش کرچکی ہے۔ فاتح علاؤالدین قلعہ کے معائنہ میں مصروف ہے۔ جس وقت رانی پدماوت کے محل میں داخل ہوتا ہے وہاں بجائے پدماوت آگ کے بلند شعلے اُس کا استقبال کرتے ہیں اور وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک!

سرزمین راجپوتانہ کا چپہ چپہ تاریخ کا زرین ورق ہے جس میں شجاعت اور دلیری کی بہترین اور دیرپا تصویریں موجود ہیں ... چتوڑ کا نامور قلعہ اور اُسکی سر بفلک شاندار عمارتیں آج تک عہد قدیم کے حُسن و رعنائی، تہذیب و تمدن اور شجاعت و مردانگی کے غیرفانی مجسموں سے معمور ہیں۔ آہ یہی وہ قلعہ ہے جسکی پری تمثال رانی پدماوت نے شہنشاہ علاؤالدین خلجی کو مدت تک مضطرب و دیوانہ بنایا — اور آہ یہی وہ سرزمین ہے جسکے ذرہ ذرہ میں حسین پدماوت کے خون کے قطرے پنہاں ہیں!!!

آگرہ کی تاریخی حیثیت

از

جناب مولوی محمد حسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔

اس قدیم دار السلطنت اور اُسکی بے نظیر اور بے بہا عمارات پر متعدد کتابیں مختلف اوقات اور زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ اور اُس تعریف اور توصیف میں سیکڑوں اور ہزاروں صفحات رنگین ہیں۔ اور کسی مزید بیان کی محتاج نہیں۔ چنانچہ میرا یہ مضمون بھی کسی اضافہ کا مدعی نہیں بلکہ اُنہی خیالات اور الفاظ کا ایک مرقع ہے۔

دنیا میں ہر ملک، شہر، قصبہ، گاؤں حتیٰ کہ چپہ چپہ زمین علیٰ قدر مراتب کسی نہ کسی واقعہ سے وابستہ ہے۔ اور انہیں واقعات کی نظام اور ترتیب کو تاریخ کے نام سے منسوب کرتی ہیں۔ اس اصول کی بنا پر تاریخ اگرہ ابتدائی آفرینش سے شروع ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ دورِ اسلام سے پہلے ہمیں اسکی تاریخ جزوی محض قصے اور افسانہ کی صورت میں ملتی ہے۔ اور چونکہ میں زبانِ سنسکرت اور بدیں وجہ تاریخ ازمنہ ہنود سے کما حقہٗ واقف نہیں ہوں اس لئے اُس پر میرا بحث کرنا میرے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہوگا۔

دور ہنود ۔ از روئے روایت اگرہ مشہور مصنف "ویاس" کا مولد یا پیدائش کی جگہ ہے۔ اور اسی بزرگ سے ویدوں کی تنظیم اور مہابھارت اور پورانوں وغیرہ کی تصنیف منسوب ہے۔ ابتدائی زمانہ ہنود میں اگرہ کا تعلق سلطنتِ متھرا سے تھا اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کرشن جی کے متبرک قدموں سے اگرہ کو فیض

حاصل ہوا ہے۔ اور اسی نواح میں اُس مقدس ہستی ذنے نوازی کی ہے جس کا راگ آجتک یہاں کی بڑی آبادی کو سرشار بنائے ہوئے ہے۔ متھرا کی قربت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس شہر کو ازمنہ برہمن اور بدھ میں ایک خاصی وقعت اور عظمت حاصل ہوگی۔ اور پُرانے بُت اور مجسمے جو اُسکے نواح اور کھنڈرات سے وقتاً فوقتاً برآمد ہوتے ہیں ہیں اسکی قدامت اور عظمت کے خیال کو مزید تقویت پُہنچاتے ہیں۔

دور اسلام۔ عربوں کی فتوحات کو قطع نظر کرکے جو پہلی صدی ہجری کی اواخر یعنی آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں سندھ پر واقع ہوئیں ہیں دورِ اسلام میں اگرہ کی اطلاع محمود کے حملے سے ملتی ہے جس نے قریباً سنہ ۱۰۲۲ عیسوی میں اگرہ کے قلعہ کو مسمار کیا۔ غزنی کا مشہور شاعر سلمان اگرہ اور اُسکے قلعہ کے متعلق تحریر کرتا ہے کہ اس شہر کا قلعہ عظمت اور شان میں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا ایک سر بفلک پہاڑ ریگستان کے درمیان واقع ہو۔ اور اُسکے کنگرے مثل قلعہ پہاڑ کے معلوم ہوتے ہیں۔ محمود کے حملہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر اگرہ پھر سرسبز نہ ہوا۔ اگرچہ کہ اُس گردو نواح میں چوہانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم ہوگئیں۔ دورِ اسلام میں سب سے پہلی جو اگرہ کو عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ سلطان سکندر لودی کے ہاتھوں ہوئی۔ یعنی اُسنے متذکرہ بالا راجپوتوں کو زیرنگیں کرنیکے لیے اپنا دارالسلطنت دہلی سے اگرہ کو تبدیل کرلیا۔ چنانچہ موضع سکندرہ جہاں اب اکبر کا مقبرہ واقع ہے اُسی کے نام سے موسوم ہے۔ سلطان سکندر لودی کی تبدیل دارالخلافت اور اگرہ کو بسانے کا حال بہت وضاحت کے ساتھ نعمت اللہ صاحب تاریخ خانجہاں لودی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ لیکن میں بخیال طوالت اُس سے درگزر کرتا ہوں اور یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ سکندر شاہ لودی اپنے آخری زمانہ تک

یہیں مقیم رہا۔ اور یہیں ۱۵۱۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ لیکن اُسکی لاش بغرض دفن دہلی لیگئے
جہاں وہ ایک وسیع مقبرہ میں مدفون ہے۔ یہ مقبرہ موضع خیر پور میں واقع تھا۔ موضع مذکور
نئی دہلی میں آجانیکی وجہ سے اب مسمار ہوگیا ہے لیکن مقبرہ ابتک استادہ ہے اور مقامات
محفوظ میں شامل ہے۔

سلطان سکندر کے انتقال کے بعد لودیوں کی سلطنت میں زوال آگیا اور ۱۵۲۶ء میں ایک
نئے حملے اور نے ابراہیم لودی کو پانی پت کے میدان میں شکست دیکر ایک دوسرے خاندان
کی حکومت کی طرح ڈالی۔ اس خاندان کے سلسلہ نے آگرہ کو ایسی اہمیت دی کہ اُس کا
نام تاریخ کے لازوال صفحہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ثبت ہوگیا۔ فتح پانی پت کے بعد بابر نے
اپنی فوج کے دو حصے کیئے۔ جن میں سے ایک دستہ اُسکی کمان میں دہلی کو روانہ ہوا۔ اور دوسرا
دستہ بسرکردگی ہمایوں آگرہ کو چلا۔ جہاں اُسکو بغیر کسی مزاحمت کے شہر پر قبضہ مل گیا۔ اس زمانہ
میں آگرہ پر راجہ بکرماجیت والی گوالیار شاہان لودی کی طرف سے متصرف تھا۔ جو میدان پانی پت
میں داد شجاعت دیکر کام آچکا تھا۔ ہمایوں نے آگرہ پر قبضہ حاصل کرکے اولاد و ازواج بکرماجیت
سے نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا جس احسان کے بدلے میں راجہ متوفی کے پس ماندگان نے
کچھ جواہرات شاہزادہ کو بطور نذر گزرانے۔ یہاں پر یہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جواہرات
میں دنیا کا مشہور و معروف کوہ نور بھی شامل تھا۔ جو زمانہ کے متعدد انقلاب دیکھنے کے بعد اب
اپنی اصلی جگہ پر یعنی ہمارے بادشاہ ذیجاہ کے تاج میں متمکن ہے۔ کچھ دنوں بعد بابر نے بھی دہلی
سے آگرہ کو مراجعت کی لیکن ابھی اُسکو ایک بہت بڑا مرحلہ طے کرنا باقی تھا جسکے سر کرنے پر
اُسکے قیام ہندوستان کا انحصار تھا۔ بابر کی اہم جنگ رانا سنگرام سنگھ سے نواح آگرہ فتحپور
سیکری کی قریب واقع ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مشیت ایزدی ہی یہ تھی کہ خاندان مغلیہ

ہندوستان پر حکمرانی کرے ورنہ راجہ موصوف کے مقابلہ میں ظاہری اسباب تمام بابر کے خلاف تھی۔ علاوہ اس کے کہ اُسکی فوج تعداد میں راجہ کی فوج کی عشر عشیر بھی نہ تھی۔ ملک مفتوحہ اُس کے لئے بالکل نیا تھا اور کوئی نظام ابھی تک قایم نہ ہوا تھا۔ لودی افواج و سردار اُسکے خلاف سازش کر رہے تھے اور سب سے زائد مصیبت یہ تھی کہ خود اُسکی فوج بہکی ہوئی اور دل برداشتہ تھی لیکن اس شیر دل بادشاہ نے کسی بات کی پرواہ نہ کی اور رانہ سنگھ کے مقابلہ کیواسطے خدا کے بھروسہ پر چل کھڑا ہوا۔ اس واقعہ کو بابر نے اپنی تزک میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ جب میں نے اپنے سرداروں کی پست ہمتی دیکھی تو میں نے اُن کو سرزنش کی اور صاف یہ کہدیا کہ جس کا جی چاہے کابل واپس چلا جائے۔ اور اسی موقع پر میں نے دختِ رز سے تائب ہو کر ۔۔۔۔۔۔ شراب کو جو حال ہی میں کابل سے آئی تھی نمک ڈال کر سرکہ میں تبدیل کر دیا۔ اور بقیہ شراب جو ذخیرہ میں تھی اُسکو زمین کی نذر کیا۔ بہر حال جو کچھ ہو خواہ اُسکو بابر کی توبہ کا اثر کہئے یا راجپوت افواج کی بزدلی، مغل افواج کی بہادری ہے بابر کو فتح ہوئی اور فتح بھی مکمل۔ اس فتح کے بعد بابر نے غازی کا خطاب اختیار کیا۔ اور مقتول غنیم کی افواج کے سروں کا ایک مینار بنایا گیا۔ آگرہ واپس آکر اُس نے ایک نئے شہر کی بنا ڈالی۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ہندوستان کی تین چیزوں سے نہایت بیزار ہوں یعنی گرد، گرما، باد تند۔ بابر ایک سرد ملک کا رہنے والا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً آگرہ کی گرمی ایک بارد ملک کے رہنے والے کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اُس نے اپنے نئے شہر کو اپنے جبلی ذوق اور قدیمی ملک کے دستور کے مطابق باغات، تہ خانوں اور حمام سے مزین کیا۔ اور نہروں اور مصنوعی آبشاروں سے آبیاری کا بندوبست کیا۔ اس امر میں اُسکے اُمرا نے بھی اُس کا اتباع کیا۔ اور ایک تھوڑے عرصہ میں آگرہ شہر

باغات بن گیا۔ افسوس ہے کہ اب اُن باغات کی نمود باقی نہیں رہی۔ اور محض چند کے نام
کتب قدیمہ میں یا اُنکے آثار کہیں کہیں ملتے ہیں۔ غالبًا بابر ہی نے ہندوستان میں رہٹ کو
رواج دیا جسکو انگریزی میں Persian Wheel کہتے ہیں۔ ہندوستان پر
حکومت کرنا بابر کو کچھ زیادہ دنوں تک نصیب نہیں ہوا۔ یعنی اُس نے ۱۵۳۰ء میں انتقال کیا
اور اُس کی وفات کے متعلق ایک عجیب روایت کتب تواریخ میں درج ہے۔ جو کم و بیش عامًا
طور پر مشہور بھی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ شاہزادہ ہمایوں اپنی جاگیر واقع سرکار سنبل میں بعارضہ
تپ مبتلا ہوا۔ بیماری نے ایسا طول کھینچا کہ اُس کو بغرض علاج اگرہ آنے پڑا اور یہاں حکیم
اُسکی زندگی سے ایک حد تک مایوس ہو گئے۔ اُس وقت یہ کہا گیا کہ شہزادہ پر سے ایک
عزیز ترین چیز نثار کی جائے۔ اور بعض بعض نے ہیرہ کوہ نور کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بابر نے
یہ کہا کہ میرے نزدیک شاہزادہ کے بعد میری زندگی مجھے سب سے عزیز ہے۔ اور وہ
میں اُس پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ اُس شاہزادہ کے بستر علالت کا تین بار طواف کیا
اور اپنے نزدیک اپنی جان کو اُس پر نثار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اُسی لمحہ سے شہزادہ پر آثار صحت
اور بابر پر آثار علالت رونما ہونے لگے۔ اور چند ہی روز بعد فوت ہو گیا۔ بابر کی وفات
اُسکی بنا کردہ چار باغ میں واقع ہوئی۔ کچھ دنوں اُسکی لاش کو امانتًا سپرد خاک کیا گیا اور
اور بعدہٗ کابل میں لیجا کر دفن کیا۔ یہ عارضی مدفن ابتک جمنا کے شرقی کنارہ پر قایم ہے۔

ہمایوں ۔ ہمایوں نے اگرہ سے کچھ زائد تعلق نہ رکھا، اُس نے اپنا دارالسلطنت دہلی
کو منتقل کر لیا۔ ۱۵۴۰ء میں ہمایوں کو شکست دینے کے بعد شیر شاہ نے اگرہ پر قبضہ کیا
مگر وہ بھی یہاں پر مقیم نہیں رہا۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد اُسکے دونوں بیٹے عادل شاہ
و سلیم شاہ کی تخت نشینی کی کمیٹی اگرہ میں ہوئی۔ اور یہ طے پایا کہ سلیم شاہ فرزند دوم

تخت نشین ہو لیکن سلیم شاہ کو اطمینان نہیں ہوا اور اس نے فیصلہ قطعی کرنیکے لئے عادل شاہ کو مقید کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۴۵ء میں آگرہ کے محاذ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ واقع ہوئی اور فتح سلیم شاہ کے ہاتھ رہی۔ سلیم شاہ کے آثار میں سے ایک مقام اب تک سلیم گڈھ کے نام سے قلعہ آگرہ میں باقی ہے۔ ان خانہ جنگیوں نے سوری خاندان کو کمزور کر دیا تھا اُدھر ہمایوں ایران کی مدد سے کافی طاقت مہیا کر چکا تھا۔ چنانچہ ہمایوں کے حملہ کی ابراہیم شاہ تاب نہ لا سکا۔ اور سلطنت دہلی اور آگرہ پر خاندانِ مغلیہ کا پھر تسلط ہو گیا ہمایوں کے انتقال کے بعد ہیموں بقال نے جو آخری شاہانِ سوری کا وزیر تھا آگرہ پر یورش کی اور مغل سردار حاکم آگرہ سے جو اسکے واسطے تیار نہ تھا چھین لیا۔ لیکن ہیموں بقال شاہانِ مغلیہ کے روز افزوں اقبال کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا ۱۵۵۶ء میں کمسن بادشاہ اکبر کے ہاتھوں میدانِ پانی پت میں کام آیا۔ اس فتح کے بعد آگرہ کا دور زریں پھر شروع ہوا اور اکبر نے اپنا دار السلطنت بنا کر ہندوستان کے دیگر مقامات پر افتخار بخشا۔ ابوالفضل اکبر نامہ میں موجودہ آگرہ کی بنا کی تحت میں یوں تحریر کرتا ہے "حضرت جہاں پناہ نے آگرہ کو اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا اور تیسرے سال جلوس کو اُس قلعہ میں جو ابتدائً بادل گڈھ کے نام سے موسوم تھا رہائش اختیار کی اور امراء کو مختلف محلے بغرض بود و باش عطا کئے۔ اور اس صورت سے آگرہ دولت و راحت و انبساط کا مرکز ہو گیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں آگرہ اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اُسکا نظیر ہفت اقلیم میں کوئی دوسرا شہر نہ تھا۔ آگرہ کی ہوا معتدل، زمین زرخیز، اور دریائے جمنا جس کا پانی مزہ اور ہلکا ہونے میں لاثانی ہے۔ اس شہر کے بیچ میں ہو کر بہتا ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر امرا اور اراکین سلطنت نے ایسی خوبصورت اور نفیس عمارات تیار کی ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ آگرہ حقیقتاً اکبر ہی کا بسایا

ہوا ہے۔ اور اُسی کے زمانہ میں انتہائی عروج پر پُہنچا۔ اس وجہ سے شاہجہاں نے اپنے عہد
سلطنت میں اگرہ کو اکبر آباد کے نام سے موسوم کیا۔ ویسے تو بیشمار آثار دور اکبری کے اس
شہر میں اور اُسکے نواح میں موجود ہیں لیکن خاص طور پر قابل ذکر قلعہ اور فتحپور سیکری اور
سکندرہ ہیں۔ اکبر ایک نہایت با اقبال بادشاہ تھا اور اُسکو اعظم کے خطاب سے ملقب
کرنا بجا اور درست ہے۔ اُسکی پالیسی صلح کل تھی۔ اور ہر مذہب سے یہانتک رواداری
جائز رکھتا تھا کہ ہر مشرب کا متبع یہی خیال کرتا تھا کہ وہ اُسی عقیدہ کی طرف مائل ہے۔
لیکن اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ اُسکا مذہب پالیسی تھا۔ اور وہ صدق دل سے غالباً
کسی طریقہ کا بھی پیرو نہ تھا۔ چنانچہ اُسکا ایک نیا مذہب، مذہب الٰہی جسکا معبود وہ خود
تھا میرے اس دعوی کے لئے کافی ہے۔ اس مضمون میں اکبر کے مذہب سے بحث کرنا
میرا مطلب نہیں تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندو مذہب کو اکبر نے اسلئے نقصان
پُہنچانیکی بنیاد ڈالی تھی کہ اگر اُسکا اتباع دو تین صدی اوسی پالیسی کے ساتھ اُسکے جانشین
کرتے رہتے تو غالباً اس آریہ ورت میں ہندو مت اور برہما اور رام کا نام لیوا حقیقی طور پر ایک بھی نہ ملتا۔ رواداری
اور غیر تعصبی کے پردہ میں اُسنے ہندو مسلم کے درمیان ازدواج کی بنا ڈالی اور ظاہر ہے کہ ہندو بیوی مسلم شوہر سے
یا ہندو خاوند مسلمان بیوی سے چھوت جو کہ ہندو مذہب کا جزو ہے کہانتک قایم رکھ سکتی۔ یہ ابتدا خاندانِ شاہی
میں ہوئی تھی۔ امرا میں رواج پاکر اگر عام رعایا میں رائج ہو جاتی تو جو کچھ نقصان ہندو
مذہب کو پُہنچتا وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندو رانیوں کیلئے محلات میں بند رہنا یہ صرف وقت کی
پالیسی تھی ورنہ مذہب الٰہی کو جسکی اُسنے بنا ڈالی تھی مسجد مندر اور کلیسا سے کیا سروکار تھا
اُس کا مذہب تو State religion تھا جس سے تاج و تخت کی پرستش منظور
تھی۔ اس رواداری اور ہندو مسلم مذہب کا ادغام اُسکے زمانہ کی صناعی اور تعمیرات

میں بھی رونما ہے۔ یعنی اگر اُس کی تعمیر کردہ عمارات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک خذنگ ہندو Architect کے زیر اثر ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں گنبد اور محرابیں مسلمانی جھلک بھی دکھاتی ہیں۔ یہی حالت نقاشی اور منبت کاری سے بھی عیاں ہوتی ہے اس موقعہ پر مجھے یقین ہے کہ میرے حاضرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ ہندو Architecture کا اثر اس وجہ سے تھا کہ اس وقت کی صناع ہندی تھی اور انہوں نے اپنے طور طریقہ پر عمارات کی ساخت کی ہوگی اس لئے میں یہیں اُس کو واضح کئے دیتا ہوں کہ اسکی وجہ میری رائے میں سوائے اسکے اور کچھ نہ تھی جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ ورنہ اکبری زمانہ سے قبل پٹھان بادشاہوں کے دور میں انہیں ہندو صناعوں نے اپنے مسلمان شاہوں کے لئے عمارات تعمیر کیں اور خود اکبر ہی کے زمانہ کی کچھ عمارات مثلاً جامع مسجد، فتحپور اور بلند دروازہ مسلمانی وضع کا تعمیر کردہ موجود ہیں۔ بہر حال اکبر نے قریب قریب ۵۱ برس نہایت کامیابی اور اقبال کے ساتھ سلطنت کی اور اس شہر آگرہ میں پندرہ روز تک بستر علالت پر رہ کر انتقال کیا۔

جہانگیر۔ جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کی طرح آگرہ سے دلچسپی نہ لی وہ زیادہ تر کشمیر کا دلدادہ تھا۔ اور اس لئے اپنے بیشتر زمانہ سلطنت میں لاہور مقیم رہا۔ دور جہانگیری کے آثار مقبرہ اعتماد الدولہ اور قلعہ آگرہ میں جہانگیری محل ثمن برج اور محل نور جہاں ہیں۔ اول الذکر یعنی جہانگیری محل قطعی ہندو وضع کا ہے لیکن ثمن برج اور محل نور جہاں مسلمانی طرز پر تعمیر ہیں۔ دور جہانگیر میں ایک خاص واقعہ جسکا آگرہ سے تعلق ہے وہ شاہ جہاں کی بغاوت ہے۔ کہ اُس نے نور جہاں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر اپنے باپ جہانگیر کے خلاف علم بغاوت سنہ ۱۶۲۳ء میں بلند کیا۔ اور مانڈو قدیم دار السلطنت مالوہ سے کوچ کر کے آگرہ پر قبضہ کر لیا۔

مگر قلعہ پر جس میں شاہی خزانہ محفوظ تھا اُسکی دست برد سے محفوظ رہا۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں اور اُسکی سپاہ نے باشندگانِ شہر سے جبراً ایک کثیر تعداد روپیہ کی وصول کی جہانگیر کے مرنے پر اُس کا چھوٹا لڑکا شہریار جو نورجہاں کا داماد تھا لاہور میں تاج شاہی زیب سر کیا ادہر آصف خاں برادر نورجہاں اور خسر شاہ جہاں نے شہزادہ داور بخش کو جو جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا۔ یہ صرف پالیسی تھی ورنہ آصف خاں کی اصل خواہش شاہجہاں ہی کو تخت پر بٹھانے کی تھی اور یہ اُسی کوشش کا پیش خیمہ تھا۔ آصف خاں داور بخش کو جسکا عرف بلاقی بھی تھا لاہور لیگیا۔ جہاں تھوڑی ہی جنگ کے بعد شہریار مقید کرکے اندھا کر دیا گیا۔ وہاں سے داور بخش کو اگرہ لایا گیا۔ اور آصف خاں کی وزارت میں تمام امورِ شاہی طے پا گئے۔ اب آصف خاں نے جس کے ہاتھ میں حقیقتاً باگ تھی یہ چال چلی کہ شاہجہاں کی اولاً بیماری کی خبر مشہور کرکے بعدہٗ خبر اڑا دی کہ وہ مرگیا۔ اور داور بخش سے جو ابھی نہایت خورد سال اور ناتجربہ کار تھا اُس سے شاہ جہاں کی یہ وصیت بیان کی کہ متوفی کو اکبر کے مقبرہ میں دفن کی اجازت دی جائے۔ کم عقل بادشاہ شاہ جہاں کی موت کی خبر سے خوش ہوکر آصف خاں کی تجویز پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ ایک جماعت خالی جنازہ لیکر سکندرہ کو روانہ ہوئی۔ اس جماعت میں شاہ جہاں بھی بھیس بدلے ہوئے شامل تھا۔ اور اثنارِ راہ میں موقع پاکر خالی صندوق میں داخل ہوگیا۔ آصف خاں نے داور بخش کو یہ بھی صلاح دی کہ قاعدہ کے مطابق بادشاہِ وقت کو بھی شاہزادہ کے دفن میں شریک ہونا چاہیئے۔ ناتجربہ کار بادشاہ نے اسکو بھی منظور کرلیا۔ اور مع چند خدام کے بدیں غرض سکندرہ کو روانہ ہوگیا۔ اس مصنوعی جنازہ کو لیجا کر ایک خیمہ میں رکھا گیا۔ جہاں خاص خاص امرا جو آصف خاں کی اس کارروائی میں شریک تھے جنازہ کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔

آصف خاں نے صندوق کا پٹ کھول کر شاہ جہاں کو باہر نکالا اور تمام امراء حاضر الوقت
اسکو بطور بادشاہ کورنش بجالائے۔ داور بخش ابھی تک راستہ میں ہی تھا کہ اسکو اس
واقعہ کی کسی طرح اطلاع ملی اور اسکو اپنے بچاؤ کی سوائے اسکے اور کوئی صورت نظر نہیں
آئی کہ لاہور کو فرار ہو جائے۔ شاہ جہاں کی تخت نشینی فوراً عمل میں آئی اور وہ نہایت
تزک و احتشام سے داخل قلعہ آگرہ ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۶۲۸ء میں ہوا۔ اسکے دو برس بعد
جب کہ شاہجہاں خان جہاں لودی کا دکن میں پیچھا کر رہا تھا اسکی عزیز بیوی ارجمند
بانو بیگم المخاطب بہ ممتاز محل کا برہانپور میں انتقال ہوا۔ متوفیہ کو اولاً برہانپور میں امانتاً
چھ ماہ کے واسطے سپرد خاک کیا اور بعدہٗ زیر نگرانی شاہ شجاع آگرہ کو روانہ کیا۔ یہاں پہنچکر
نعش مذکور پھر ایک جگہ عارضی طور پر دفن کی گئی۔ اور تاج گنج کی بنیاد پڑی پھر اپنی اصلی
جگہ پر منتقل کر دی گئی۔

مثل اکبر کے شاہ جہاں کی بھی اکثر عمارات آگرہ میں موجود ہیں۔ اُن میں خاص طور پر
قابل ذکر تاج محل ہے۔ جو بلحاظ وضع تعمیر اور پچیکاری اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اور
آگرہ کے لئے تمام دنیا میں باعث شہرت ہے۔ اسکی ابتدا سنہ ۱۶۳۱ء میں ہوئی اور یہ
عدیم المثال عمارت سنہ ۱۶۵۳ء میں تکمیل کو پہنچی۔ مشہور ہے کہ اس پر بیس ہزار مزدور روزانہ
کام کرتے تھے۔ اسکے صناعوں اور نقشہ نویسوں کے متعلق مختلف روایات مشہور
ہیں۔ یورپین مورخوں کا خیال ہے کہ ایک Venice کے شخص مسمی Gero
نے اس کا نقشہ تیار کیا تھا۔ لیکن معصر
مورخین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ محض ایشیائی صنائی اور دستکاری کا نتیجہ ہے
اسکی تعمیر مکرمت خاں اور میر عبدالکریم کی زیر نگرانی ہوئی۔ محمد عیسیٰ آفندی باشندہ

ترکی اور اسکا بیٹا محمد شریف Architect تھے۔ جنہوں نے نقشہ تیار کیا ہوگا۔ اسمٰعیل خاں باشندہ ترکی نے گنبد کی تعمیر کی ہے اور امانت خاں شیرازی نے کتبہ تحریر کئے ہیں۔ پچیکاری کا کام قطعاً ہندوستانیوں کے ہاتھ سے عمل میں آیا ہے۔ اور کلس کاظم خان لاہوری کا بنایا ہوا ہے۔ اس روضہ کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ غالباً دنیا کی کسی عمارت کو نصیب نہیں۔ سیاحوں کا قول ہے کہ اگر دنیا کی عمارتوں میں خوبصورتی کے لحاظ سے تمام دنیا سے رائے طلب کی جائے تو سب سے زائد رائے تاج کی موافقت میں ہونگی۔ سنہ ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں نے دارالسلطنت آگرہ سے دہلی کو تبدیل کرلیا۔ اور اسی وقت سے آگرہ جو سلطنت مغلیہ میں سب شہروں میں تفوق رکھتا تھا انحطاط پذیر ہوگیا۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں شاہجہاں یک لخت بیمار ہوگیا۔ اور دارا شکوہ اس خیال سے کہ بادشاہ کا یہ آخری وقت ہے حالتِ علالت میں دہلی سے آگرہ کو لایا۔ شاہجہاں کی علالت کے دوران میں تمام امور سلطنت اپنی ہاتھ میں لے لئے۔ اور شاہجہاں اگرچہ رو بصحت ہو چلا تھا مثل عضو معطل کے رہگیا۔ دارا شکوہ تخت و تاج کے لالچ میں یہ چاہتا تھا کہ شاہجہاں کی دورانِ علالت میں ہی اپنے بھائیوں کو جو رقیب سلطنت تھے کسی نہ کسی طرح برطرف کردے اور اس کارروائی کا جو نتیجہ لابد تھا وہ وقوع پذیر ہوا یعنی خانہ جنگی۔ شاہ شجاع مراد اور اورنگ زیب نے یہ خیال کر کے کہ شاہجہاں کی وفات ہوگئی آگرہ پر یورش کی۔ شاہ شجاع کو جسکے ہمراہ بنگال کی کمزور اور بزدل سپاہ تھی سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ کے مقابلہ میں ہی شکست ہوگئی۔ لیکن اورنگ زیب نے چالاکی سے مراد کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اور اُسکے مقابلہ کو دارا شکوہ خود مع اپنی ذاتی اور شاہی سپاہ کے میدان سموگڈھ نواح آگرہ میں نبرد آزما ہوا۔ اور چونکہ بذات خود غیظ پسند اور ناتجربہ کار تھا شکست کھا کر آگرہ سے

دہلی کو فرار ہوگیا۔ شاہجہاں غریب جسکی حالت دارا شکوہ کی زیر نگرانی بھی قیدی سے بہتر نہ تھی واقعی قلعہ میں قید ہوگیا اور اُس کی کل سپاہ زمانہ کی رفتار کے مطابق فاتح شہزادہ کی جانبدار ہوگئی۔ کچھ دنوں تک تو شاہجہاں چالاکی اور پالیسی سے اورنگ زیب کا مقابلہ و مدافعت کرتا رہا۔ لیکن آخر کار قلعہ اور اپنی ذات کو اورنگ زیب کے سپرد کر دیا۔ افسوس ہے کہ اس ہر دل عزیز بادشاہ نے جسکے زمانۂ سلطنت میں ہندوستان میں چین و امن کا دور دورہ تھا اپنی زندگی آخری سال قید میں بسر کرکے سنہ ۱۶۶۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اُس کا انتقال آگرہ کے قلعہ میں واقع ہوا اور اُس کا جنازہ مغربی دروازہ سے لیجاکر مقبرۂ تاج محل میں جو اُس* نے اپنی عزیز بیوی کے واسطے تعمیر کیا تھا دفن ہوا۔ آگرہ کی تاریخ زریں شاہجہاں کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

اور اُس کے بعد جاٹوں کی لوٹ مار اور غدر کے کشت و خون کا تذکرہ مذکورۂ بالا واقعات بیان کرنے کے بعد کچھ زائد دلچسپ معلوم نہ ہوگا۔ مزید براں خوفِ طوالت بھی مجھے اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ میں دورِ شاہجہاں کے اختتام کے ساتھ اس مضمون کو بھی ختم کر دوں۔

ٹھگی اور اُسکا انسداد

از

حسن عابد جعفری صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع

لفظ ٹھگ، اب بھی زبان زد خلائق ہے لیکن اب اسکا مفہوم مختلف ہوگیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا بڑا حصہ ٹھگوں کا بیرحمی اور شقاوت کے ہاتھوں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اور کوئی صورت پناہ یا امن کی نظر نہ آتی تھی۔ اِکّے دُکّے کا کیا ذکر ہے۔ دن دہاڑے قافلے اور براتیں لُٹ جاتی تھیں۔ اور اُن مظلوموں میں سے شخص واحد بھی اپنی جان بچاکر نہیں نکل سکتا تھا۔ کیونکہ ٹھگی کے اصول کے موافق پہلے آدمی کو جان سے مارنا ضروری تھا۔ اسکے بعد اُسکے مال واسباب سے ہاتھ لگانیکی اجازت تھی۔ یہ فرقہ یا غول ایسی طاقت پکڑ چکا تھا کہ باوجود طرح طرح کی احتیاط اور کوشش کے دن رات کشت وخون اور لوٹ مار کا بازار گرم رہتا تھا۔ دریا اور جنگل۔ آبادی اور ویرانہ غرض کہیں پناہ نہ تھی۔ ٹھگوں کا ذریعہ معاش قتل وغارتگری تھا۔ کسی مذہب یا فرقہ کی تخصیص نہ تھی۔ ہندو مسلمان مل جل کر اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے۔ لکھے پڑھے، جاہل، شریف، رذیل، امیر فقیر، غرضکہ ہر قسم کا آدمی اس پیشہ کو اختیار کرتا تھا۔ اور انسان کا شکار، اپنا مقصدِ زندگی قرار دیتا تھا۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، اپاہج، دیوانے، بلکہ بعض اوقات جانور تک انکے ہاتھوں سے فنا ہوتے تھے۔ عمر کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ مقتول مالدار ہو۔ فاقہ کش تک اُنکے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

کالی کی پوجا ہر ٹھگ پر فرض تھی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان جو لوگ اس حلقہ میں شامل ہوتے تھے انکی پوری طرح جانچ پڑتال کر لی جاتی تھی اور جب وہ ہر امتحان میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اور طاقتِ جسمانی کے علاوہ تیز فہمی، پھرتی، چالاکی اور رومال پھینکنے میں کافی قابلیت کا اظہار کر دیتے تھے۔ اُس وقت گروجی کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ گروجی رومال میں گرہ لگا کر ان کو دیدیتے تھے اور کامیابی کی دعائیں دیکر رخصت کرتے تھے اس وقت سے اُنکا شمار ٹھگوں میں ہونے لگتا تھا۔ اور وہ حسب حیثیت جلسے اور دعوت دیکر خوشیاں مناتے تھے۔

ٹھگی کو اگر ایک فرقہ قرار دیا جائے تو نامناسب نہو گا۔ کیونکہ اس فرقہ کے پابند اپنے پیشہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اپنے آپ کو ثواب کا مستحق سمجھتے تھے قتل و غارتگری نہ صرف جائز تھے بلکہ واجبات سے تھے۔ ان عقاید نے گہرا مذہبی رنگ اختیار کر کے اس فرقہ کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ اور خون کی چاٹ لگتے ہی شدید سے شدید مظالم کا ارتکاب اُن لوگوں کے لئے موجب تعریف و تحسین ہوا کرتا تھا۔

ٹھگی قدیم پیشہ تھا۔ یونانی کتب میں اس کا ذکر ہے۔ تھیونیو نے اپنے سفرنامہ ہندوستان میں اس کا ذکر کیا ہے وہ سترھویں صدی میں ہندوستان آیا تھا۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان سفر کے حالات کو اس طرح بیان کرتا ہے "سڑک بہت اچھی ہے، مگر دشواریاں بھی بہت ہیں۔ راہ میں چیتے، تیندوے، اور شیر بکثرت ملتے ہیں اور خاص قسم کے قزاق بھی تاک میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس صرف رسی ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راہ چلتے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالتے ہیں"۔ ٹھگی کے دفعیہ میں انگریزی حکومت نے سخت محنت کی۔ اور اُسی کا دم تھا کہ اُسکو مع بیخ و بُن کے ہندوستان کی زمین سے اکھاڑ پھینکا۔ شروع حکومت سے انگریزوں کو ٹھگی کے حالات معلوم ہونے شروع ہو گئے تھے۔

لیکن ابتدا میں اُن پر پوری توجہ نہ کی گئی - اور چونکہ ٹھگ کبھی انگریزوں پر حملہ نہ کرتے تھے
اسلئے شروع میں اُنکے قصوں پر اعتبار نہ کیا گیا - مسٹر رائٹ سابق کلکٹر فرخ آباد کی رپورٹ
مورخہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۱۰ء ابتک موجود ہے جس میں ٹھگی کے متعلق مفصل طور پر بحث کی گئی ہے -
وہ لکھتے ہیں "حصول مقصد کی خاطر یہ ٹھگ طرح طرح سے بھیس بدلتے اور نت نئے سوانگ
بھرتے ہیں اور ایک ہی دن میں فقیر کی صورت بنا لیتے ہیں اور پھر فوراً ہی ساہوکار بنجاتے ہیں
کہیں بہروپیہ کا پارٹ لے لیتے ہیں، تو کہیں عالم و فاضل یا برہمن بن جاتے ہیں - اور کبھی
مقطع ڈاڑھی لگاکر مولوی ہوجاتے ہیں - مالدار مسافر کی اطلاع پاتے ہی اپنی وضع و قطع ایسی
بنا لیتے ہیں جو اُس سے میل جول پیدا کرنے میں آسانیاں پیدا کرے، اور منصوبوں کو کامیاب
بنائے - اپنے شکار سے راہ میں یا سرائے میں اسطرح دوچار ہوتے ہیں کہ گویا محض اتفاقیہ
ملاقات ہوگئی ہے - اور اُلٹ پھیر کے سوالات کرکے اُنکی مالی حالات و دیگر ضروری واقعات
دریافت کرلیتے ہیں - اپنا اطمینان کرکے انکو پھر یہ فکر ہوتی ہے کہ کس طرح اس آدمی کا خاتمہ
کردیں - کبھی دھتورا دیکر، کبھی رومال کے ذریعہ سے، کبھی تلوار سے - غرض جیسا موقع
ہوتا ہے اُسکا خاتمہ کردیتے ہیں - ایسا بھی ہوتا ہے کہ کنوئیں کے سہارے بیٹھے باتیں
کررہے ہیں - پیٹ میں چھری مار کر مقتول کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا - اور اُسکا مال واسباب
لیکر چمپت ہوئے - چھری کا مارنا اور کنوئیں میں ڈھکیلنا اس سرعت کے ساتھ ہوتا ہے
کہ جسم سے خون نکلنے سے پہلے پہلے مقتول پانی میں پہنچ جاتا ہے۔" رائٹ کا خیال تھا کہ
بڑے بڑے زمیندار ٹھگوں کو پناہ دیتے تھے اور اُنکی لوٹ میں اپنا حصہ لیتے تھے - اس
رپورٹ کا اقتباس صوبہ کے کلکٹروں کے پاس منجانب گورنمنٹ بھیجا گیا - اور چند دنوں
کے بعد پیری مجسٹریٹ اٹاوہ نے ۶۰ ٹھگ گرفتار کیے لیکن صوبہ کی عدالتِ بریلی سے

وہ اس بنا پر رہا کر دیئے گئے کہ اُن کا اقبال قابل اعتبار نہ تھا۔ اس فیصلہ کے دو افسوسناک پہلو تھے۔ یعنی حکام بالا کے خیالات ٹھگوں کی طرف سے نسبتاً اچھے ہوگئے اور ٹھگوں میں جرأت بڑھ گئی۔ اس صوبہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر شیکسپیر نے ۱۸۱۶ء میں ایک اور تحریر بھیجی اور ان الفاظ میں گورنمنٹ کی توجہ مبذول کی۔ "ٹھگوں کے متعلق بہت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن میری تحقیقات ظاہر کرتی ہے کہ کمپنی کی حدود کے اندر ایسے لوگ آباد ہیں جو ٹھگی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور میرے دفتر میں اقبال جرم سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف سوسائٹیاں قایم ہیں۔ جو باہمی تعلقات قایم رکھتی ہیں اور اوقاتِ معینہ پر جرایم کرتی ہیں۔ اور لوٹ کے مال کو تقسیم کرکے اپنے خرچ میں لاتی ہیں"۔ شیکسپیر نے متعدد مثالوں کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی ریاستوں میں ٹھگی کے لئے سخت سزائیں مقرر ہیں اور مرہٹہ ریاستوں میں ٹھگ دیواروں میں زندہ چنوا دیئے جاتے ہیں امیر خاں والیٔ ٹونک ٹھگوں کے ہاتھ اور ناک کٹوا دیا کرتا تھا۔

۱۸۲۹ء میں کپتان بارتھوک نے ایک فوجی دستہ کی امداد سے ۴۶ ٹھگ گرفتار کئے اور مبلغ بارہ ہزار کی لوٹ کا مال اُنکے قبضہ سے برآمد کیا۔ یہیں سے ابتدا ہوتی ہے گورنمنٹ کی کوششوں کی جن کے ذریعہ سے ٹھگی کو سرزمین ہند سے نیست و نابود کیا گیا۔ چار ٹھگوں نے اقبال جرم کیا جسکو عدالت نے مانا اور اسی وقت مجسٹریٹان ضلع کے نام احکام صادر ہوگئے کہ وہ ٹھگوں کی طرف پوری توجہ کریں۔ اور اگر اُنکے علاقہ میں موجود ہوں تو اُن کو سزا دی جائے۔

سلی مین ساگر اور نربدا کے گورنر جنرل کا معتمد تھا۔ اسنے اس معاملہ میں خاص طور پر دلچسپی لی۔ بہت سے ٹھگ گرفتار کئے۔ اور جرائم کا اقبال کراکر مجسٹریٹوں کے پاس بطور اطلاع بھیجے۔

اسکا بیان ہے کہ فرنگیا، ایک مشہور ٹھگ نے وعدہ کیا کہ اگر اسکی جان بخشی کر دی جائے تو وہ بہت سے ٹھگوں کا سراغ لگا دیگا۔ سلی مین نے اس وعدہ کو مشتبہ خیال کیا۔ مگر فرنگیا سلی مین کو ایک موضع سلو ہولا نواح ساگر میں لیگیا۔ اور دوسرے دن صبح کو اس زمین کو کھدواکر جسمیں سلیمن صاحب کی گھوڑی رات بھر بندھے رہے تھے کئی لاشیں برآمد کرا دیں۔ اسکے پاس کی زمین کھودکر بھی کئی لاشیں برآمد ہوئیں۔ ساگر اور نربدا کے ٹھگوں کی ایک فہرست سلیمن صاحب نے تیار کرکے مجسٹریٹوں میں تقسیم کرا دی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں ولسن اور سکلوڈ شمالی ہندوستان میں تعینات کئے گئے کہ وہ ٹھگوں کے مقدمات فیصل کریں ۳۷-۱۸۳۰ء کے درمیان جو کوشش اس پیشہ کو مٹانے کی منجانب گورنمنٹ کی گئی تھی اسکا اندازہ ذیل کی فہرست سے ہو سکتا ہے۔

سزاو عبور دریائے شور	۱۰۵۹	قید	۶۹
پھانسی	۴۱۲	رہا	۳۲
حبس دوام	۸۷	جیل سے فرار ہوئے	۱۱
قید بوجہ عدم ادائگی ضمانت	۲۱	جیل میں مر گئے	۳۶
		میزان	۱۷۲۷
اقبالی			۴۸۳
مجرم قرار دیئے گئے مگر کسی وجہ سے سزایاب نہ ہوئے			۱۲۰
جیل میں موجود ہیں اور جن کا مقدمہ ہوگا			۹۳۶
		میزان کل	۲۲۶۶

اس میزان کے علاوہ ۱۸۳۸ء میں ۱۸۰۰ مشہور ٹھگ اور موجود تھے جو گرفتار نہ ہو سکے تھے لیکن انکے نام و پتے گورنمنٹ میں درج تھے۔ اور وہ اپنی جان کو لئے ہوئے منتشر

حالت میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

۱۸۳۸ء تک ٹھگی کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ مسافروں کو دلجمعی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ایک اور طبقہ مجرمان کا پیدا ہو گیا تھا یہ لوگ مسافروں کے ساتھ مل جل کر اُنکے کھانے پینے کی چیزوں میں منشی اشیا ملا کر اُن کو کچھ عرصہ کے لئے فاتر العقل کر دیتے تھے۔ اور اُن کا مال و مطاع لوٹ لیتے تھے۔ اسکے بعد "تسمہ بازی" کو رواج ہوا۔ سڑکوں پر چند آدمی جمع ہو کر جوا کھیلتے تھے جس کا نام تسمہ تھا۔ اکثر راہ گیر آکر شامل ہو جاتے تھے۔ دورانِ جوئے میں یہ لوگ پتہ لگا لیتے تھے کہ نوواردوں میں کس کے پاس سب سے زیادہ مالیت ہے اُسی کو کسی نہ کسی ترکیب سے دھتورا دیدیتے تھے۔

ٹھگوں کی بول چال بھی مختلف تھی۔ سلیمن نے ۱۸۳۶ء میں ایک کتاب موسومہ "راما سیانا" شائع کی تھی جس میں ٹھگوں کی بولیاں، اُن کے طور وطریق اور عادات و تعلقات کا مفصل ذکر تھا۔ یہ کتاب کلکتہ میں چھپی تھی۔

(ماخوذ از انگریزی)

نمبر ۶ — فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء — جلد ۲

تصاویر۔ چغتائی۔ تاج۔ مظفر علی خان

اطلاع

بعض معاونین شمع کا سالانہ چندہ اس ماہ میں ختم ہوتا ہے ہم اُن کی اعانت اور علمی ہمدردی کے شکر گذار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ از راہ کرم اس سلسلۂ اعانت کو قائم رکھیں گے۔ ان میں زیادہ تر وہ بزرگ ہیں جنہوں نے محض 'شمع' کا نام سُنکر ہماری استدعا کو منظور فرمایا اور خریداری قبول فرمالی۔

اگرچہ شمع نے اُن کی توقعات اور ہماری امیدوں کو پُورا کیا۔ پھر بھی انکی عنایتوں کا شکر یہ ہم پر فرض ہے کیونکہ بغیر اُن کی اخلاقی امداد اور اعانت کے ابتدائی دشواریوں پر قابو پالینا ہمارے لئے بہت دشوار تھا۔ یقین ہے کہ وہ سالانہ چندہ ارسال فرماکر تجدید کرم فرمائیں گے۔ یا ہم کو اجازت دیں گے کہ آئندہ نمبر جو جنوری ۱۹۲۶ء کا ہوگا اُن کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی روانہ کیا جائے۔

الحمدللہ وقت پر رسالہ کی اشاعت کا معقول انتظام ہوگیا ہے۔ اور رسالہ وقت پر حاضر ہوتا رہے گا۔ لیکن ڈاکخانہ میں تلف ہوجانے سے اگر کسی صاحب کے پاس رسالہ نہ پہونچے تو وہ از راہ عنایت دوبارہ طلب فرمالیا کریں۔ تاخیر اشاعت کی شکایت نہ فرمائیں

خاکسار

حسن زاہد جعفری۔ منیجر 'شمع'

رسالہ

شمع

بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء

سلطان محمود غزنوی

(مصنفہ پروفیسر جناب محمد حبیب صاحب بی۔ اے (آکسن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)
بیرسٹر ایٹ لا

باب اوّل

دنیائے اسلام دسویں صدی میں

جان اسٹورٹ مِل کا قول ہے کہ "تقریباً تمام مسائل اخلاقی اور عقاید مذہبی اپنے بانیوں اور ان کے پیرؤوں کے نزدیک گنجینہ معانی اور قوت روحانی سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جس وقت تک کسی مسئلہ یا عقیدہ کو دوسروں پر فوقیت دینے کی جد و جہد جاری

رہتی ہے ان معانی کا احساس بھی بلا کم و کاست برقرار رہتا ہے، بلکہ شاید اور اچھی طرح
دل نشین ہو جاتا ہے، بالآخر وہ عقیدہ غالب آ کر یا تو زبان زد خلایق ہو جاتا ہے یا اسکی
ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ جس حد تک وہ اپنا اثر کر چکا ہے قائم رہتا ہے مگر آگے نہیں
بڑھتا۔ عام طور پر یہ وقت اس عقیدہ کی ذی روح قوت کے زوال کا کہا جا سکتا ہے
کیونکہ جب وہ عقیدہ موروثی ہو گیا اور بجائے گرم جوشی کے مردہ دلی سے قبول کیا جانے
لگا، یعنی جب دماغ اعتقادی سوال و جواب پر حسب سابق قادر نہ رہے، تو اس عقیدہ
کے متعلق سوائے چند رسوم کی پابندی کے اور تمام باتوں کے بھولنے کا میلان بھی بڑھ جاتا ہے
یا بغیر اس کے علم رکھنے کی ضرورت محسوس کئے محض اعتبار پر بے حسی اور بے اعتنائی سے
اسکو تسلیم کر لینے کی عادت پڑ جاتی ہے"

یہ ضعف جوش روحانی تمام مذاہب میں مختلف مواقع پر نمودار ہوا ہے تاریخ اسلام میں
اس کا دردناک نظارہ نویں صدی عیسوی میں خلافت عباسیہ کے زوال سے تیرہویں
صدی عیسوی میں مغلوں کے ہاتھوں اسلامی ایشیا کی بربادی تک دیکھنے میں آیا ہے۔
اسی دور میں تصوف کو عروج ہوا۔ اس زمانے میں حکمت، ادب اور فنون میں کارہائے
نمایاں ہوئے، اور ان علما کی بدولت جنھوں نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کا مطالعہ
کیا تھا انسانی معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا۔ یہ عجیب سیاسی ہل چل کا دور تھا، جس میں
سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں، شہر بسے اور اجڑ گئے۔ لیکن یہ زمانہ دلفریب مادی تہذیب
اور شائستگی کا تھا اور مذہبیت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ ابتدائی مسلمانوں کا تبلیغی
جوش اپنی عظیم الشان کامیابی کی وجہ غائب ہو چکا تھا اور وہ مذہب جو دنیا میں ادنیٰ
طبقے کے لوگوں کو ابھارنے کے لئے آیا تھا سالہا سال کی بدنظمیوں کو جاری رکھنے اور

ذاتی اغراض کی حفاظت کے لئے مستقل طور پر پشت و پناہ بنا لیا گیا۔ ہندی کی چندی نکالنے والے مسائل دینیات ضرورت سے زیادہ تھے اور فرقوں کے باہمی تعصب سے جو ان مسائل مختلف فیہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ پشتہا پشت کے دامن آلودہ ہیں۔ اس عہد میں "اہل سُنت" اور "ملاحدہ" نے جس بے رحمی سے ایک دوسرے کو ایذائیں دیں ہیں وہ انہوں نے کبھی کافروں کے ساتھ بھی روا نہ رکھیں، کیونکہ غیر مسلم پھر معزز جنگ کے معزز دشمن شمار کئے جاتے تھے۔ اسلام کے معنی رسوم و روایات کی پابندی کے ہو گئے تھے اور وہ ہر فرد کو نجات دلانے کا ذریعہ خیال کیا جانے لگا تھا۔ اسلام جمہوری بیداری کی عالمگیر قوت نہیں رہا تھا۔ لوگ حالانکہ اب بھی اسی عقیدتمندی سے نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے، قرآن کی تلاوت کرتے، اور اپنے نقطۂ نظر سے احکام شرع کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے، مگر اس نئی دنیا اور نئے آسمان کا خواب بھی ان کو نظر نہ آتا جس نے عجم کے عربی فاتحین کے دلوں میں ولولہ پیدا کیا تھا۔ ان میں سے مذہبی تبلیغ کا جوش جاتا رہا تھا اور وہ اپنے دین کو صرف اپنے ہی تک محدود رکھنے پر قانع تھے۔ اسلامی دنیا کے حدود اس سے زیادہ بڑھنے نہ پائے جہانتک خلفائے بنی امیہ نے ان کو پہنچا دیا تھا اور کسی نئے ملک یا قوم کا اضافہ نہیں ہوا۔ اندرونی حالت کے لحاظ سے بھی اسلامی دنیا کی سیاسی، مذہبی اور نسلی یک جہتی کا بتدریج شیرازہ بکھر رہا تھا۔

(الف) سیاسی تقسیمیں خلافت کا زوال

یہ خیال کہ ساری حقیقی معنوں میں اسلامی آبادیاں خلیفہ کے ماتحت ہونی چاہئیں، کبھی مسلمانوں کے دماغوں سے مفقود نہیں ہوا۔ لیکن خلافت کے مقبوضات اس قدر وسیع

ہو گئے تھے کہ ان پر ایک مرکز سے حکومت کرنا محال تھا، اور گذشتہ دو صدیوں کے دوران میں خلیفہ کی سیاسی اور انتظامی قوت بھی رفتہ رفتہ متزلزل ہو چکی تھی۔ مقامی حاکموں نے سر اٹھایا اور بغداد کے فرامین جن کی تعمیل ہارون رشید کے شاندار عہد ماضیہ میں بے چون و چرا ہوتی تھی اب اپنا وقار کھو بیٹھے تھے۔ اسپین آزاد ہو چکا تھا، مصر کے فاطمیوں نے ایک متضاد خلافت کی بنیاد ڈال دی تھی، اور عراق، ایران اور ترکستان کی چھوٹی چھوٹی ہمسایہ خاندانی حکومتوں نے خلیفہ کی قوت کو مفلوج کر دیا تھا۔ لیکن اپنے ہم ملت لوگوں کی نظروں میں خلیفہ کا اخلاقی اقتدار بدرجہ اتم تھا۔ وہ جانشین پیغمبر تھا اور رعایا کو اس کے احترام کا بڑا خیال تھا۔ وہی تمام سیاسی اقتدار و اختیارات کا سرچشمہ تھا۔ بادشاہ اور قبیلوں کے سردار اصولاً اس کے ماتحت تھے اور صرف اسی کی منظوری پر ان کی جائز قوت کا انحصار تھا۔ سیاسی من چلوں میں نڈر سے نڈر بھی خلیفہ کے اقتدار کا برملا استرداد کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیتا۔

چھوٹی خاندانی حکومتیں

چھوٹی خاندانی حکومتوں میں جو ایران اور ترکستان میں ایک دوسرے کی بیخ کنی میں مصروف تھیں سب سے مشہور اور طاقتور خاندان سامانیہ تھا جس کی بنا ۲۹۱ھ میں امیر اسمٰعیل سامانی نے ڈالی۔ بخارا ان کا دارالسلطنت تھا اور ان کی غیر مستقل حکومت ماوراالنہر اور خراسان پر تھی۔ باغی صوبوں کے حاکم اور سرکش عہدہ دار بہم ان کی قوت کا مقابلہ کرتے رہتے۔

دریائے جیحون کے اس پار ترک و تاتاری تھے جو اب تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔ ان پر ان کے قبیلوں کے سردار حکومت کرتے تھے جن میں سب سے طاقتور خان کاشغر تھا۔ مشرقی ایران میں رکن الدولہ دیلمی نے ۳۳۹ھ میں شیعہ خاندان بویہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

ان کا دارالسلطنت رے تھا۔ ان کی قوت رفتہ رفتہ عراق میں بڑھتی گئی یہانتک کہ بغداد بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔ خلیفہ کو محل میں خواب غفلت میں پڑے رہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ محض ایک واجب التکریم ڈھکوسلا رہ گیا تھا اور بویہ حکمران جنہوں نے "سپہ سالاری" کا لقب اور اختیارات حاصل کر لئے تھے دارالسلطنت کے دنیوی معاملات کا انتظام کرتے تھے۔ دیگر خاندانی حکومتیں اتنی بے شمار اور ادنیٰ درجہ کی ہیں کہ ان کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔

(ب) مذہبی تقسیمیں سُنّی، شیعہ اور مُلاحدہ

نہ صرف یہ سیاسی قوت کی تقسیم ہی مومنین کے زور کو برباد کر رہی تھی بلکہ اس کے علاوہ اعتقادی مسائل پر اس قدر سخت اختلاف پیدا ہو گیا جس کو آجکل کے مسلمان مشکل سے محسوس کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی شیعہ سُنّیوں میں تقسیم بہت پہلے ہو چکی تھی۔ شیعہ اس کے دعویدار تھے کہ پیغمبر خدا کے چچا زاد بھائی اور داماد علیؓ کو ان کا پہلا جانشین ہونا چاہئے تھا؛ برخلاف اس کے سنّی خلافت کی علی الترتیب جانشینی کو برحق تصور کرتے تھے، یعنی اول ابوبکرؓ پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ، پھر علیؓ۔ رفتہ رفتہ اس سیاسی اختلاف نے ایک اہم صورت اختیار کر لی۔ پیغمبر خدا کی تعلیم ایرانی نقطۂ نظر سے شیعیت کہلانے لگی اور عربی نقطۂ نظر سے سنیت[۵]

---

[۵] یہ بات کسی قدر وضاحت سے بیان کرنے کی محتاج ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں: سامی (یہودیت، نصرانیت اور اسلام)؛ آریا (ہندومت، جین مت اور بدھ مت) اجمالی طور پر سامی مذاہب عقیدہ کے، اخلاقی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور آریا الٰہیات (مابعد الطبیعات) پر۔ عربوں کی فتح ایران کے بعد ایرانیوں نے فطرۃً اس نئے مذہب کو اپنے موجودہ مابعد الطبیعی تصورات کی

(بقیہ آئندہ صفحہ میں)

باوجود اس کے ابھی تک جمہور اہل سُنّت و اہل تشیع کے درمیان اس قدر شدید اختلاف نہیں ہوا تھا جتنا کہ آگے چل کر واقع ہوا۔ ایک فرقہ دوسرے میں نامعلوم طور پر بتدریج جا ملتا تھا اور یہ کہنا دشوار تھا

(بقیہ نوٹ صفحہ) روشنی میں دیکھا جو ہندوؤں سے بہت کچھ مشابہ تھے ان تصورات میں سب سے مشہور اوتاری نظریہ تھا یعنی ذات اعلیٰ کا شکل انسانی میں نمودار ہونا۔ ہر مذہب نے کسی نہ کسی طور پر حقیقی اور حسی دنیا کے مابین تعلقات کا ذریعہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اسلام میں جبرئیل فرشتہ ایک عالم کا پیغام دوسرے عالم میں لے جاتا ہے۔ آریا مذاہب اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ خالق اوتاروں کے بھیس میں نازل ہو کر مخلوق کو قانون کی تلقین کرتا ہے۔ مذہب اسلام میں شیعی فرقہ آریوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ انتہائی صورتوں میں شیعہ پیغمبروں اور اماموں دونوں کو اوتار الٰہی سمجھتے ہیں۔ اہل سنت اس اعتقاد کو بت پرستی کے مطابق خیال کرتے ہیں، مگر قیاساً شیعت اور سنیت دونوں کو ایک مشترک عقیدہ کی جائز تاویلیں سمجھنا چاہیے، اور اس کے ثبوت میں بھی کوئی معقول وجہ نہیں دی جاسکتی کہ زندگی پر عربوں کا مطمح نظر ایرانیوں کی نسبت حقیقت سے قریب تر کیوں شمار کیا جائے ایک اور ہندی آریا عقیدہ "وحدانیت" (ہمہ اوست) کا تھا۔ اس اعتقاد کے بموجب کل کائنات کا ثبوت ایک ہی "کون" سے ہوا ہے اور تمام تغیر و تبدل ایک کائناتی مقصد کی دلیل ہے سامی تعقل کے خلاف جو قانون کو ایک بیرونی حکم تصور کرتا ہے آریا یہ عقیدہ پیش کرتے ہیں کہ قانون خود نفس کی باطنی آرزو ہے۔ اسلامی تصوف جس کا نام ہے وہ اصل میں ہندی، ایرانی، وحدانی سانچہ میں ڈھلا ہوا اسلام ہے جس میں خدا بندہ سے کوئی جدا ہستی نہیں رکھتا اور نہ قانون باہر سے نافذ کیا ہوا حکم ہوتا ہے۔

مسلمان صوفیوں نے ہمیشہ اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ان کے اعتقادات قرآن پر مبنی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ حالانکہ اس اعتقاد کو وہ لوگ کتنا ہی بُرا اور مذموم کیوں نہ سمجھیں جن کا خیال ہے کہ مذہب بغیر مابعد الطبیعی وضع اختیار کیے بھی بہت عرصہ تک برقرار رہ سکتا ہے (بقیہ حاشیہ آیندہ)

کہ سنیت کا اختتام کس جگہ ہوتا ہے اور شیعت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے بہت لوگوں سے لوگوں نے یہ فیصلہ کرنے میں دقت محسوس کی ہوگی کہ وہ اصل میں کون سے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن سخت ترین دشمنی اور مخاصمت کٹر سنیوں اور شیعوں کے اس متعصب گروہ کے درمیان تھی جو بارہ میں سے صرف سات اماموں پر ایمان رکھتا تھا اور عام طور پر ملاحدہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ متعصب گروہ اگرچہ بہت سی ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا جن میں عرب کے اسمٰعیلی اور ملتان کے قرمطی سب سے زیادہ بدنام تھے لیکن اہل سنت کی مشترکہ منافرت کی وجہ سے متفق ہوگیا تھا کیونکہ موخرالذکر (اہل سنت) آنکھیں بند کئے بلا لحاظ اس کے کہ وہ الحاد کی مختلف صورتوں میں امتیاز کریں ایک سرے سے تمام ملاحدہ کو سخت سزائیں دیتے تھے۔ اہل سنت کے نقطۂ نظر سے ملاحدہ کی بڑی بھاری اصولی غلطی یہ تھی کہ وہ آل رسول کے اوتار الٰہی ہونے کا یقین رکھتے تھے، لیکن ہر طرح کے عیب ان کو لگائے گئے۔ ان کے مذہبی اعتقادات سے زیادہ ان کا مفروضہ چال چلن سنیوں کی مجنونی آتش تعصب کو بھڑکاتا تھا۔ وہ ناجائز تعلقات رکھنے اور ممتنع حدود میں شادیاں حلال قرار دینے کے مورد الزام ٹھہرائے جاتے تھے اور ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) لیکن مسلمان صوفیوں کا یہ اصرار اس واقعہ کی بالکل مطابقت کرتا ہے کہ اسلام میں تصوف کا ظہور ایرانی حکما کا کام تھا جن کی رگ و پے میں وحدانیت کا اعتقاد سرایت کر گیا تھا، نیز یہ کہ مکمل صورت میں تصوف کی تعلیم اور جدید افلاطونیوں اور اپنشدوں کا فلسفہ اصل میں ایک ہیں لہٰذا مذہب اسلام کو اوتاری نظریہ کی روشنی میں دیکھنے سے شیعت وجود میں آئی جس کے راسخ الاعتقاد پیرووں کا دعویٰ ہے کہ علیؓ کو خلیفہ اول ہونا چاہیے تھا اور 'ملاحدہ' علیؓ اور اماموں کے اوتار الٰہی ہونے کے مدعی ہیں؛ اور اسلام کو آریا وحدانی، قالب میں ڈھالنے سے تصوف نکلا، جو دنیائے تخیل میں ہندی، ایرانی ذکاوت کا بہترین کارنامہ ہے۔

حد تک بجا طور پر ان پر یہ جرم عاید کیا جاتا تھا کہ وہ بطور سیاسی چال کے قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، نیز یہ کہ وہ بجائے دنیوی سلطنت کے ایک الحادی میراث قائم کرنے میں کوشاں تھے۔ جہاں کہیں کوئی ملحد نظر آتا فوراً قتل کر دیا جاتا۔ ملاحدہ کے لئے اصولاً ملکی سزا سیدھی سادی موت تصور کیجاتی تھی اور کوئی ملحد مغلوب الغضب عوام کے ہاتھوں پارہ پارہ ہونے سے بچ جاتا تو حکومت اس کو ایسی سخت سزائیں دیکر مرواڈالتی تھی جو ایک انسانی دماغ اختراع کر سکتا ہے۔ اس بے دردانہ ظلم کا جواب ملاحدہ ان ہتیاروں سے دیتے جو ہمیشہ ایک مستقل ملت کے پاس ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے خفیہ انجمنیں بنائیں جن کا پتہ سلطنت کا سارا بیڈ ہنگا نظام خفیہ پولیس بھی نہ لگا سکتا اور ان کے مبلغین (داعی) مختلف بھیسوں میں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے اور زیادہ بیباک ہو کر مصر کی متضاد 'خلافت' قائم کی، مقامات مقدسہ پر قابض ہو گئے، اور خانۂ کعبہ سے حجراسود لے گئے بالآخر اُنہوں نے ایران میں چند قلعوں پر قبضہ کر لیا جن میں الاموت خاص تھا۔ قتل و خونریزی کو ترقی دے کر اُنہوں نے فن لطیفہ بنا دیا، اور سنّی بادشاہوں، مدبّروں اور مولویوں کو ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا کہ کب خونی 'ملحد' کا خنجر ان کو ہلاک کر دے۔ بایں ہمہ یہ دیوانگی کا سماں تیرھویں صدی کے وسط تک بندھا رہا جب مغول فاتحین کے ڈنڈے کے نیچے 'اہل سنّت' اور (ملاحدہ) دونوں کو سرنگون ہونا پڑا۔[۱ے]

[۱ے] قرمطیوں اور اسمٰعیلیوں کا حال ہمارے مبحث سے باہر ہے۔ ان کے حالات اور ان کا نظام دونو اسی قدر دلچسپ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام انقلابی فلیتوں کی طرح ان میں بھی مختلف خیالات کے لوگ موجود تھے، حکیم ناصر خسرو جیسے صلح منش فلسفی سے لگا کر گلا کٹوں اور قاتلوں تک نظام الملک نے سیاست نامہ میں ان کو قبل اسلام ایرانی فرقہ بتایا ہے جس کی بنیاد رسول مقبول صلعم سے (باقی نوٹ آیندہ صفحہ میں)

(ج) نسلی تقسیمیں۔ ایرانی، عرب اور ترک

پیغمبر خدا نے مکہ میں اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا "اور یہ میری تم کو آخری نصیحت ہے کہ تم سب ایک برادری میں ہو" مسلمان اپنے مذہب کے کسی اور مدنی اصول پر اس سے زیادہ استقامت کے ساتھ قائم نہیں رہے ہیں۔ مذہبی اتفاق ہمیشہ تمام قبائلی اور نسلی اختلافات پر حاوی رہا۔ بایں ہمہ نسلی افتخار کی دیدہ و دانستہ کوششیں گو ناکام طور پر ہی کیوں نہ ہوئی ہوں۔ مگر ہوئی ضرور ہیں۔ اسلامی سرزمینوں میں بھی دیگر مقامات کی طرح نسلی تکبر فطرت انسانی کا ناگوار منظر رہا ہے۔ خلفائے بنی امیہ نے حکومت کو عربی امرا کی میراث بنانے میں جان توڑ کوشش کی۔ ایرانی انقلاب نے ان کو برطرف کر کے عباسیوں کو مسند خلافت پر لا بٹھایا۔ اس نے عربی دُر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰) ایک پشت پہلے مزدک نے ڈالی اور جو اسلام میں بھی جاری رہا۔ الاموت کے قلعہ اور اسکی (نقلی بہشت) پر ایک عجیب سِرّ مکتوم چھایا ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے "کوہستانی پیر مرد" اپنے نوجوانوں کو مخالفین کے قتل کرنے کی غرض سے بھیجا کرتا تھا۔ لفظ (Assassin) حشیش سے مشتق ہے یعنی "دارو جس کا نشہ بہشت میں لیجائے جانے سے قبل اس کے فریب خوردہ کو دیا جاتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بہشت کی حوروں کا اس کی قوت متخیلہ پر اتنا گہرا اثر ہوتا کہ اس کی روح کو اس بیرونی دنیا میں کوئی راحت نہ ملتی اور یہ وعدہ کہ وہ کوئی بہادری کا کام کر کے سیدھا بہشت میں داخل ہوگا اس کو قاتل کا خنجر تھامنے اور اہل سنت کے ہاتھوں ناگزیر سزا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کر دینے کو کافی تھا۔ اس قلعہ کو ہلاکو چنگیز کے پوتے نے برباد کر دیا اس مضمون پر مزید معلومات کے لئے علاوہ سیاست نامہ کے 'روضۃ الصفا' اور 'تاریخ گزیدہ' میں 'ملاحدہ' پر جو ابواب ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ جہاں گشائے علاء الدین عطا ملک جوینی کا تیسرا حصہ الاموات کے کتبخانہ کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

کا خاتمہ کردیا اور وہ فوقیت جو پہلے عربوں کو حاصل تھی ایرانیوں پر منتقل کردی - لیکن فوراً ہی ایک حریف نسل خلافت کے مالِ غنیمت پر ایرانیوں سے جدوجہد کرنے کے لئے نمودار ہو گئی - مغرب میں اناطولیہ کی دلدلوں سے لگا کر مشرق میں بحرالکاہل کے ساحل تک مغول نسل کے مختلف قبیلے، ترک، تاتاری، ترکمان، تبتی، چینی اور مغل پھیلے ہوئے تھے - ان کا رسم خط ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، سب اوپر سے نیچے کی طرف لکھتے تھے - ان کے قد پستہ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، اور آنکھیں چھوٹی تھیں، لیکن ان کے جسم گٹھیلے اور جنگ کی صعوبتیں جھیلنے کے عادی تھے، جوں جوں اسلامی سرحد ایران کے شمال اور مشرق کی طرف بڑھتی گئی یہ ترک قبیلے ایک ایک کرکے دائرہ اسلام میں آنے شروع ہو گئے - ترکوں نے اپنی مردوں کی قابل داد شجاعت اور اپنی عورتوں کے غیر معمولی حسن سے اپنے فاتحوں کو حیرت میں ڈالدیا بادشاہوں کی حفاظت کے لئے ترکی جمیعتہائے رکاب متعین کی جانے لگیں؛ ترکی کنیزیں شاہی حرم سراؤں میں سازشیں کرتی تھیں، اور رفتہ رفتہ کامل طور پر ترکی جانبازوں نے ایرانیوں کو تمام فوجی خدمات سے ہٹا دیا - دسویں صدی کے وسط تک یہ انقلاب پورا ہو چکا تھا - ترکوں کو مسلمانوں میں عام طور پر وہی اقتدار حاصل ہو گیا جو چھتریوں کو ہندوؤں میں تھا - ایک عام وطنی اس بات کو کہ صرف ایک ترک ہی اسلامی سرزمین پر حکومت کرنے یا میدان جنگ میں افواج کی کمان لینے کا مستحق ہے سیاسی اخلاقیت کا اٹل حکم سمجھتا تھا - اسلامی ایشیا پر جن مختلف خاندانوں نے حکومت کی ہے ان میں بڑی کثرت ان کی ہے جو ترکی نسل تھے [۵] - لیکن انتظامی خدمات اب بھی ایرانیوں کے پاس تھیں اور ادب وفنون میں

---

[۵] تاریخی غلطیوں میں سب سے فاش غلطی یہ ہے کہ نی زمانہ وسطائی ہندوستان کے بادشاہ پٹھان خیال کیئے جاتے ہیں - اس کی ابتدا جنرل برگز نے جو لغو ترین مترجم اور حد درجہ کا بڑھبولا مورخ ہے - (باقی آیندہ)

میں ان کا بلا شرکت غیرے اجارہ تھا۔ ترکوں کا اس طرف کوئی میلان نہ تھا۔ ایک ایرانی کو سُدر نہیں خیال کیا جاتا تھا اور نہ اس کے ساتھ زیر دستوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔

سلطنت میں اس کی خدمت جداگانہ تھی لیکن مدنی اعزاز میں وہ ایک ترک کا ہم پلّہ تھا۔ باوجود اس کے ترکی فوجی غلبہ کا ایک تاریک رخ بھی تھا۔ صلح پسند سے صلح پسند ترک فرمانروا کی حکومت بھی وقت ضرورت کے لئے پنجۂ فولادی کمیں میں رکھی تھی۔ ایرانی ادراک نے سیاسی میدان میں جب اپنے تئیں کمتر پایا تو ترکوں کے خلاف مذہبی شورش برپا کرنے کو اپنا آلہ حربی بنا لیا۔

سیّد جمیل حسین بی۔اے۔آنرز (علیگ)
حیدرآباد (دکن)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) خلجیوں کو چھوڑ کر جن کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون تھے، دہلی کے تمام خاندان، سیدوں، لودھیوں اور سوریوں کے علاوہ، ترکی نسل سے تھے۔ سلاطین غزنین و غور، شاہان غلامان و تغلق، اور شہنشاہان مغلیہ کے سب ترکی مغل نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ عہد احمد شاہ ابدالی سے پہلے خود افغانستان میں کسی افغان بادشاہ کا وجود بالکل خلاف قیاس ہے۔

زیب النسا بیگم اور اس کا مرتب کردہ "مرقع"

(از محمد محفوظ الحق صاحب ایم اے، لکچرر عربی و فارسی، پریسیڈنسی کالج، کلکتہ)

زیب النسا بیگم کے "مرقع" کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (بطور تمہید) میں چند باتیں ناظرین کے گوش گذار کردوں اور یہ بتادوں کہ ہمارے اردو میں اس بیگم کے متعلق اتنی غلط اور غیر محقق باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ کہ شاید ہی کسی دوسری زبان میں ہوئی ہوں، ہمارے یہاں پنجاب کی شائع کردہ زیب النسا بیگم کی "سوانح عمریاں" عام ہیں اور ان کے ذریعہ اتنے فسانے شائع ہو کر مشہور اور دلوں پر منقوش ہو چکے ہیں۔ کہ اگر ان کی تصحیح کی کوشش کی جائے تو یہ امر دشوار اور ایک حد تک محال نظر آتا ہے، میرا تجربہ ہے کہ اگر کسی اوسط درجہ کے (مشرقی یا مغربی) تعلیمیافتہ شخص سے کہا جائے کہ زیب النسا، اور عاقل خاں کی "داستان عشق" (جو بعض ادنیٰ درجہ کی سوانح عمریوں میں درج ہے) محض فسانہ ہے[1] تو وہ اسکے قبول

---

[1] اس موضوع پر، پروفیسر جادو ناتھ سرکار (مولف سوانح اورنگ زیب نے ایک محققانہ مضمون لکھا ہے، جس کے پڑھنے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ عاقل و زیب النسا کا "عشق" محض فسانہ ہے۔ یہ مضمون، پروفیسر سرکار کے "اسٹڈیز اِن مغل انڈیا" میں شائع ہوا ہے۔

اور اسی مضمون کا اقتباس بھوپال کے نگار میں مولوی نیاز فتحپوری کے نام شائع ہو چکا ہے۔

کرنے پر بشکل آمادہ نظر آئے گا، اور اگر اس سے یہ کہا جائے کہ زیب النساء بیگم کے "شاعرہ" ہونے کے متعلق کوئی "تاریخی" ثبوت موجود نہیں۔ اور مشہور دیوان[۵۱] مخفی جو اس کے نام منسوب ہے ہرگز اسکا کلام نہیں تو وہ فوراً اس دیوان کا یہ شعر پڑھکر آپ کو خاموش کرنے کی کوشش کریگا ؎

دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساست[۵۲]

لیکن جب اس کو "دیوان" مذکور کے وہ اشعار سنائے جائیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ یہ مخفی خراسانی[۵۳] ہے، اوس کا وطن باصطرخ[۵۴] ہے، وہ اپنے اغراض لیکر شاہجہاں کے دربار میں آیا

---

[۵۱] "دیوان مخفی اور زیب النساء بیگم" کے عنوان سے میرا ایک مفصل مضمون رسالہ معارف (بابتہ ماہ مئی ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا ہے جس میں مینے دیوان مخفی کی "اندرونی" شہادتوں سے ثابت کیا تھا کہ یہ "دیوان" ہرگز بیگم کا کلام نہیں اور خود اس دیوان سے بیسیوں ایسے اشعار نقل کئے تھے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ "مخفی" ہرگز زیب النساء نہیں بلکہ "مخفی رشتی" ہے جو شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا، نیز "بیرونی" شہادتوں سے میں نے دکھلایا تھا کہ تذکروں میں جو کلام اس مخفی رشتی کے نام درج ہے وہ اسی مطبوعہ دیوان میں پایا جاتا ہے؛ اسلئے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ظاہر ہے (مفصل بحث کے لئے معارف کا وہ پرچہ ملاحظہ ہو)

[۵۲] یہی شعر "حیات زیب النساء" کے ایک مؤلف نے بھی نقل کرکے ان لوگوں کے بیان کی تردید کرنا چاہی ہے، جو "دیوان مخفی" کو اس بیگم کے نام منسوب نہیں کرتے، لیکن مؤلف صاحب سے کوئی پوچھے کہ آخر اس غزل میں مخفی تخلص کیوں موجود نہیں اور کیا انہوں نے کسی مستند تذکرہ میں اس بیگم کا مخفی تخلص بھی دیکھا ہے یا محض سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرلیا ہے، اور پھر خود "دیوان" ہذا کے ان بیسیوں اشعار کا کیا جواب، جو انکے قول کی صریحی تردید کررہے ہیں۔

[۵۳] مثلاً یہ شعر ؎ دل غمدیدۂ مخفی لعین خود دارد سلوئیت نہد افتادہ است آنا خراسانست یونانش

[۵۴] " " ؎ تو از ملک خراسانی باصطرخ از دلم داری بخواب شب اگر دردو غم ہندوستاں بینی

ہے[۵۱]۔ اور یہاں دشمنوں کی سازش سے قید کرلیا جاتا ہے[۵۲] اور رہا ہوکر بنگالہ آتا ہے[۵۳]۔ اور آخر میں زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوتا ہے[۵۴] تو گو وہ خاموش ہو رہیگا لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوجائیگا کہ وہ اپنے "سابق خیالات" کو بدلنے کے لئے آمادہ ہے، اور نہ وہ اپنے "طلسم خیالی" کو توڑنا چاہتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک بحث پیدا ہوتی ہے کہ "دیوانِ مخفی" اگر زیب النسا کا نہیں تو اس کی کوئی دوسری "علمی یادگار" بھی موجود ہے یا نہیں، اس کے جواب میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس بیگم کے بعض آثار علمیہ کا پتہ تذکروں اور تاریخوں سے ملتا ہے، لیکن زمانۂ حال میں انکی موجودگی کا کہیں سراغ نہیں ملتا، مثلاً تذکرۂ مخزن الغرائب سے اوس کی تالیف زیب المنشآت کا حال معلوم ہوتا ہے، جو مؤلفِ تذکرہ کی نظر سے گذر چکی تھی لیکن اب وہ تالیف ناپید ہے[۵۵]۔ اسی بیگم کی ایک "بیاض" بھی تھی جس میں بہت ممکن ہے کہ اس کا کلام بھی درج ہو، لیکن وہ حوض میں گر کر ہمیشہ کے لئے

---

۵۱ مثلاً یہ شعر ؎
بوعلی روزگارم از خراساں آمدہ   از پئے "اعراض" بر درگاہِ سلطاں آمدہ
ثانیِ صاحبقراں بادشہ انس و جاں   آں کہ فلک سر نہد بر خطِ فرمانِ او

۵۲ " ؎ بہ تہمت کرد در زنداں مرا دشمن بحمد للہ   بزورِ صبر بشکستم کلید قفلِ زندانش

۵۳ " ؎ جستجو کردم بس مخفی دریں گردابِ ہند   نشۂ آسودگی جائے بجز بنگالہ نیست

۵۴ اس کا ثبوت مخفی کے ایک مسدس سے ملتا ہے جس کا صرف ایک مصرعہ اس وقت یاد ہے۔ شاعر رسول اللہؐ کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے ع

بامیدت ز کجا تا بکجا آمدہ است

۵۵ مؤلفِ تذکرۂ مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی) رقمطراز ہے: "زیب المنشآت کہ از تالیف آنجناب است فقیر آنرا زیارت نمودہ، اما دیوان اشعارش جائے بنظر نیامدہ" (نسخۂ قلمی موجودہ کتب خانہ مولوی خدا بخش خاں، ص ۳۱۴)

دنیا سے ناپید ہو گئی[51]۔ غرض یہ کہ بیگم کی تالیفات و تصنیفات کا آج ایک ورق بھی ہمارے سامنے موجود نہیں[52]، ممکن ہے کہ "مستقبل" میں اس کی کسی تالیف و تصنیف کا سراغ مل جائے۔

ان تمہیدی بیانات کے بعد اب میں ناظرین کو بیگم کی ایک اور معدوم علمی یادگار کا پتہ دیتا ہوں، اور وہ ایک "مرقع" ہے جس کو اس نے نہایت اہتمام سے تیار کرایا تھا۔

گو "مرقع" موجود نہیں لیکن اس کا "دیباچہ" جس کو ایک شاعر و نثار ملا رضا، راشد تخلص نے لکھا تھا میرے پیش نظر ہے، اس دیباچہ میں رنگین عبارت آرائی اور استعاروں اور تشبیہوں کے گورکھ دھندے زیادہ ہیں، لیکن اس میں بعض کام کی باتیں بھی ہیں جو یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

لیکن زیب النساء بیگم کے "مرقع" کا حال بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض سلاطین و شاہزادگان مغلیہ کے مشہور مرقعوں کے متعلق چند جملے لکھ دوں۔ یوں تو بابر و ہمایوں کو تصویرکشی کا بیحد شوق تھا، اور آخر الذکر بادشاہ نے "داستان امیر حمزہ" کا جو نسخہ اپنے دربار کے مصور سے خاص طور پر تیار کرایا تھا اس کے

---

۵۱ مقالات شبلی میں مولانا شبلی مرحوم نے اس واقعہ کو مفصل طور پر بیان کیا ہے اور ملا اشرف ماژندرانی نے اس موقع پر جو قصیدہ گذرانا تھا، وہ بھی مولانا نے نقل فرمایا ہے (ملاحظہ ہو مقالات ص ۱۱۸ و ص ۱۱۹)

۵۲ بجز ان چند خطوط کے جو بعض جگہ اس بیگم کے نام منسوب ملتے ہیں، مثلاً تذکرہ "ریاض الافکار" (مولفہ وزیر علی عبرتی عظیم آبادی) میں اس کے ایک خط کا کچھ حصہ درج ہے۔ وکٹوریا میموریل (کلکتہ) میں بھی اس کا ایک خط موجود ہے، ۱۲

اجزا اب بھی موجود ہیں[51]، لیکن تصویرکشی کا اصلی دور اکبر کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور اس زمانہ کی ہزاروں تصویریں اور چند بیش بہا مصوّر کتابیں مختلف کتبخانوں اور عجائب خانوں میں موجود ہیں، جہانگیر کو خود مصوّری کا بیحد شوق تھا اور یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مختلف حیوانات اور طیور کی تصویریں اس نے اپنے اہتمام سے کھچوائی تھیں، اس نے ایک خاص "مرقع" بھی تیار کیا تھا جس میں اس عہد کے بہترین مصوروں اور کاتبوں کے کمالات کے نمونے موجود تھے، شکر ہے کہ وہ "مرقع" اب بھی ولایت کے ساؤتھ کینسنگٹن میوزیم میں موجود ہے، اور اس کا فوٹو (جس کو اس میوزیم نے شائع کیا ہے) میرے پیش نظر ہے، اسی "مرقع" کو دیکھ کر ایک زمانہ میں مولف تذکرہ خوشنویساں[52] نے لکھا تھا۔

"مرقعی کہ جہانگیر بادشاہ از شوق خود درست کردہ بود، گویا باغ بہاری بود، سندی و صحیح مع کتبہ سید[53] ملاحظہ شد"

شاہجہاں کے عہد میں "مغلیہ مصوری" اپنی انتہائے کمال کو پہونچی، لیکن خود بادشاہ کے کسی "مرقع" کا پتہ نہیں ملتا، اورنگ زیب نے تو اس مصوری کا خاتمہ کر دیا، لیکن اس کے عہد میں بھی داراشکوہ[54] (جس کو صرف چند ماہ زندہ رہنے دیا گیا) اور زیب النسا نے "مرقع"

---

[51] یہ نایاب نسخہ لندن کے ساؤتھ کینسنگٹن میوزیم میں موجود ہے، اور اسی کا فوٹو اس میوزیم نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے جس کا ایک نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ [52] مولفہ مولانا غلام محمد ہفت قلمی ص ۱۵

[53] سید سے مراد میر علی الکاتب ہے۔

[54] داراشکوہ کو اورنگ زیب کے عہد میں شریک کرنا ایک حد تک صحیح نہیں۔ دارا نے اس مرقع کو اپنی چہیتی بیوی نادرہ بیگم کو تحفہ دیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ سے، جو تحریر لکھی تھی اسکا ترجمہ یہ ہے "یہ "مرقع" میں اپنی رفیق دلی نادرہ بیگم کو تحفہ دیتا ہوں۔ (از شاہزادہ محمد داراشکوہ بن شاہجہاں بادشاہ"

مرتب کئے تھے، اول الذکر یعنی دار اشکوہ نے جو "مرقع" مرتب کیا تھا وہ اب انڈیا آفس (لندن) میں محفوظ ہے، اور اس کے متعلق مبصرین کا خیال ہے کہ اس میں مغلیہ مصوری کے بہترین نمونے موجود ہیں، لیکن "زیب النسا" کا "مرقع" اب ناپید ہے صرف اس کا "دیباچہ" موجود ہے[۵]، جس سے اس کا دھندلا سا عکس ہماری آنکھوں کے سامنے آسکتا ہے۔

"دیباچہ" سے "مرقع" کی کیفیت کے علاوہ خود زیب النسا بیگم کی سخن سنجی اور سخن دانی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں اس "دیباچہ" کے مواد کو دو حصوں میں تقسیم کردونگا ایک وہ حصہ جس سے بیگم کے فضائل ذاتی پر روشنی پڑتی ہے اور ایک وہ جس سے اس "مرقع" کا حال معلوم ہوتا ہے۔

"دیباچہ" کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے، پھر اورنگ زیب بادشاہ کی تعریف ہے اور اس کے بعد بیگم کی تعریف و توصیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں اور کوئی کام کی بات مشکل ملتی ہے۔ یہاں کی عبارت کا اندازہ یہ ہے۔

"عفیفۂ کہ دست مریم بدامن عہد علیاشش نرسیدہ، و چشم بلقیس شہر سبا، پایۂ سریر والاش ندیدہ، کریمۂ کہ نقودِ احسان و اکرامش چوں سیم و زرِ مہر و ماہ شب و روز بخاص و عام دامن دامن حاصل و محصول دجوہ انعامش دُرہ گوہر چوں جیب و گریبانِ بحر و کان بخوشہ چینان خرمن خرمن حاصل ......"

یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہتا ہے اور اس کے بعد اکیس[۲۱] شعر آتے ہیں جن میں بھی وہی انداز قائم ہے، صرف یہ تین شعر کچھ کام کے ہیں۔

---

[۵] یہ دیباچہ، مولوی خواجہ بخش مرحوم کے کتبخانہ کی ایک قلمی بیاض میں موجود ہے، افسوس ہے کہ اس بیاض کا نمبر یاد نہیں، ورنہ ضرور لکھ دیتا۔ ۱۲

باہلِ فضل شامل جود خاصش — بعلم و شرع دایم اختصاصش
سخن سنجانِ معنی آفریناں — ز خرمنہائے فضلش خوشہ چیناں
سخن فہم و سخن سنج و سخنداں — سخنور را سنجہ جز بمیزاں

اس کے بعد پھر نثر شروع ہوتی ہے، اور اس کا نچوڑ ان اشعار میں ملتا ہے ؎

ز سرتا پا ہمہ روح مجسّم — مصوّر گشتہ عقلِ کلِّ عالم
بزورِ قوّت و تقویٰ و طاعت[لہ] — ربودہ از دو کون گوئی سعادت
ز خیلِ طبع و نفسِ اندیشہ کردہ — پری و دیو را در شیشہ کردہ
ز طبعش موج زن بحرِ معانی — بہ بحرِ شعر آب زندگانی
ز نطقش نثارِ معنیٰ زند جوش — شود سامع چو صورت محو و مدہوش
ز نظم و نثر نطقش آنچہ گفتہ
دُرِ ناسفتہ، گوہر ہائے سُفتہ

آخری شعر خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ زیب النسا کی "شاعری" کے متعلق اسکے کسی "معاصر" کا غالبًا یہ پہلا بیان ہے، یوں تو عالمگیر نامہ ماثرِ عالمگیری اور اس عہد کی دوسری تاریخوں اور تذکروں میں اس بیگم کی قابلیت اور خطِ نسخ و نستعلیق و شکستہ میں مہارت کا تذکرہ ہے، لیکن "شعر گوئی" کے متعلق اشارتًا بھی ایک لفظ موجود نہیں، اس لئے اسکے "معاصر" کا یہ بیان خاص وزن رکھتا ہے۔

اب مؤلفِ دیباچہ، بیگم کے اور کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے، اُس کی انشا، خوشنویسی اور شاعری کا تذکرہ کرتا ہے، لیکن عبارت آرائی کا وہی انداز قائم ہے، اسلئے "مبالغہ"

لہ اصل نسخہ میں "طاقت" درج ہے۔ ۱۲

اور "واقفیت" میں فرق کرنا دشوار ہو گیا ہے، بہرحال وہ عبارت یہاں درج ہے، ناظرین اپنا نتیجہ خود نکال سکتے ہیں۔

"بدیوانیکہ کلیات فضل و کمال کشادہ، ارباب دانش جزو دانش در بغل نہادہ، معلّم اوّل و معلّم ثانی متعلمانِ سواد خوانی، معنی آفرینانِ صاحب سخن خوشہ چینانِ خرمن انجمن منشیانیکہ منشور انشا بخط عطارد دست آویز آرند در پیشگاہ کلام بلاغت فرجام از حیرت چون قلم سر از زانو برنمیدارند، خوشنویسانیکہ در صف اہل قلم از خامہ علم افراشتہ اند در مقابلہ حسن خطش چوں رقم پشت دست برزمین گذاشتہ اند، شعرائیکہ در واموزون[1] الفاظ رسا و بستن معانی غرا چون قلم ید طولی دارند، خلاصہ و زبدۂ ذکر و فکر را بوسیلہ مدح و ثنا بعرض اصلاح درمے آرند، بانشاط ہر نامہ کہ مخدوم زماں خواجہ جہاں خط غلامی دادہ، در اصطلاح آن نامۂ نامہ چون مقراض انگشت بدیدہ نہادہ دستور العلی کہ در علم انشاگری عالم معنی مولانا ظہوری بر صفحۂ روزگار ثبت فرمودہ، در ہر کلمہ از کلام معانی بیانش کہ انگشت نتواں نہاد چون خامہ ناخن بند نمودہ، از قلمِ سواد کارش ہر قدم معجزۂ عصای موسیٰ ظاہر و از رقم معنی نگارشش ہر دم اعجاز ید بیضا باہر"

نثر کے بعد پھر نظم ہے، اور اس میں اس کی مجالس علمی کا حال اور اس کے ذوق ادبی کا تذکرہ ہے۔ دیباچہ نگار لکھتا ہے کہ بیگم کی مجلس میں کبھی نحو و ہندسہ و تنجیم و علم اعداد پر بحث ہوتی اور کبھی علم بیان، علم معانی، ہیئت اور علم مرایا کا دفتر کھلتا۔ طب روحانی میں تو

---

[1] کذا فی الاصل - ۱۲

وہ حاذق کا حکم رکھتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موسیقی کے لحنوں اور پردوں سے بھی واقف تھی۔ بیگم کی علم موسیقی سے واقفیت کے متعلق غالباً یہ پہلا بیان ہے جو کسی "معاصر" یا "غیر معاصر" کی زبان سے سنا گیا۔ اب خود مؤلف کے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں "مبالغہ" اور "واقفیت" دونوں موجود ہیں ۵

نہان بود آنچہ در آثار قدرت　　بفعل آوردہ دست او ز قوت
ملازم دارد آن علامۃ العصر　　ز اہل فضل و حق چون ابو نصر
سوال تسعہ را حاضر جوابی　　ز کلیات دانشش انتخابی
مقولاتی عشر عشری ز گفتار　　ز علم ظاہر و باطن خبر دار
گہی تفتیش علم صرف می شد　　سخن از اسم و فعل و حرف می شد
گہی در مجلسش از نحو ندکور　　ز مرفوع و ز منصوب و ز مجرور
گہی از ہندسہ میکرد تعداد　　ز قدر خط و سطح و جسم و ابعاد
گہی میرفت حرف از علم تنجیم　　ز اسطرلاب و استخراج و تقویم
گہی میکرد وصف علم اعداد　　صحیح و کسر و زوج و فرد تعداد
گہ از علم بیان کردی حکایت　　ز تلمیح و ز تشبیہ و کنایت
گہ از علم معانی بود گفتار　　ز اسناد و ز مسند ہا خبردار
گہ از آثار علوی یاد میکرد　　حدیث ابر و برق و باد میکرد
بہیئت مطلع از طبع دراک　　ز تسکین زمین و تحریک افلاک
شد از علم مرایا بسکہ آگاہ　　بذات شخص برد از سایہ اش راہ
بعلم طب روحانیہ حاذق　　بتہذیب است اخلاقش موافق

ز موسیقی و از الحانش آگاہ | بگوش از استماعش لیک اکراہ
بلفظِ مختصر معنی مطوّل | عبارت مجمل و معنی مفصّل،
بعلم اولی تر از ہر چیز دانی | نہ در اعمال گنجد حرف ثانی
دم از علمش زدن جہلِ مرکب | قلم را سر کنم از بہر مطلب
سواد نامہ ام چوں در نگین است | چو مشک سر قلم در آستین است
بمشکیں خامہ پردازم مرقّع | نگارستانِ چیں سازم مرقّع

بیگم کو سراہنے اور اس کے کمالات کی تعریف کرنے کے بعد دیباچہ نگار "مرقع" کی کیفیت بیان کرتا اور اس کی تصویر زبان قلم سے کھینچتا ہے، اور گو وہ "مرقع" ہمارے سامنے موجود نہیں لیکن دیباچہ نگار کی رنگیں بیانی سے اس کی ایک جھلک سی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ خود مؤلف کی عبارت نقل کردوں تاکہ ناظرین "مرقع" کی بہار بچشم خود ملاحظہ فرمائیں، اور اس دیباچہ نگار کے گل افشاں قلم کی داد دیں۔

"مرقعی کہ مشبہ بہ تشبیہ غریبہ و مقطعی بخطوط عجیبہ پرداختہ، ارباب معنیٰ را در لباس صورت جلوہ گر ساختہ؛ عالم صورت و معنی، کارنامۂ رنگین و زیبا، عجائبات مخلوقات، انتخاب عالم کائنات، فہرست مجموعۂ آفرینش، دیباچۂ دیوانِ بینش۔ نظم ؎

مرقع نگو عالم کائنات | جہانیست محفوظ از حادثات

برادر افتش انشار مروارید منتظم و بر صفحاتش خط یاقوت مرتسم، معانی از سلسلۂ الفاظ در زنجیر و صورت از بند و لبستِ ترکیب در تقریر، از سواد خطش نے

باب حیات معنی میرسد و از سیمائی صورتش نقائی خضر میدرخشد، از رشحاتِ قلمش نگارستان نمونهٔ و از لمعاتِ رقمش بهارستان گونهٔ تحریرش در متن ید بیضا نمود و تذہیبش به حاشیهٔ شمسیه املا کردهٔ در گلستان صفحاتش بلبلِ نطق نواساز و در بوستانِ اوراقش طوطیٔ بیان نغمه پرداز، فضلا غیر از نسخهٔ صورتش مطالعه نمی نمایند و علما جز سوادِ خطش نظر نمی کشایند، معنی از صورت مرتب و صورت از معنی مرکب۔ نظم ۔

بحسن صورتش دیوانه مانی	چو صورت محو در وصفش معانی
خطی بر سطحِ اوراقِ مجسّم	چو شکلِ ہندسی مشہور عالم
بیک سو قامتی چون سرو رعنا	به دیگر رو خطی چون زلف زیبا
زصورت ہم سیرت ہر شخص پیدا	چو عکس از روئے آئینه ہویدا
بخطش معنیٔ رنگین و جسته	چو صورت در مرقّع نقش بسته
شہانی را که عاریست ازمرصّع[له]	چو درویشان خزیده در مرقع

عروسی است که آئینه دیده رویش شاید، و شاہدیست که مشاہدہ اش نور باصرہ افزاید، بفروغ حسن و جمال خیرہ سازد، دیدهٔ وہم و خیال بحسن صورت مطلوب معنی و برنگینی معنی معشوق صورت، ہر صفحه از صفائی صورت با ورقِ آفتاب یکرو، و ہر منظر از ضیائے معنی با خطِ شعاع ہم پہلو در شاہراہ نگاہ از پرتو گلہاپائے انداز کف کشوده، و ہر ہفت پرده منظرِ دیده راه از عکس نقش و نگار ہر ہفت نموده۔

له کذا فی الاصل ۱۲

لعل و یاقوت و زمرد بیختند | رنگ طرح این مرقع ریختند
صفحهٔ اوراق رشکِ آسمان | لفظ و معنیٔ ثابت و سیارهٔ آن
جدول از خطِ شعاعِ آفتاب | لوح از زریں رقاعِ آفتاب
خوردهٔ گل کردهٔ تصویر او | لمعهٔ خور پرتو تحریر او

باغی است که از صرصرِ صرصری در گلزارش، نه از خزان آسیبی در بهارش، گل بویا، بلبل بنوا، غنچه در دمیدن، گلبن ببالیدن، بلبل چون گل ساکن بر شاخسار و رنگ چون بوی متحرک در گلزار۔

نظم

چه مرقع نمونهٔ گلزار | چار موسم گلِ همیشه بهار
نقشبندان کار آگاه قدر | متحیر ز کار صورت گر
کلک بهزاد، خامهٔ مانی | یک قلم منزِ عجیب حیرانی
در بهارش خزان ندارد بار | گلشن از نخل عمر بر خوردار
گر به تصویر بوئے معنیٰ داشت | بگلاب آب و رنگ دعویٰ داشت
گل صورت نه داشت پژمردن | انجم افروخت آسمانِ چمن
مرغزاری است رشکِ باغ ارم | صیدگاهی است سبز و بس خرم

طیور گوناگوں، اشجار بوقلموں، سیمرغ آشکار، عنقا نمودار، مرغ زریں بر شاخسار، سیمبر بال گستر و طاؤس رنگین بر بساطِ زمردین جلوه گر۔

نظم

بدیدی اگر باز این مرغزار | بیکدست سیمرغ کردی شکار

بارگاہی است وسیعتر از خرگاہ فلک، ومحشری است آرامگاہ انس وملک، شاہ وگدا جلوہ گر، خاص وعام در مد نظر، اسب وفیل از نظر میگذرد، دیو وپری جلوہ گر میگردد و دد ودام بآرام، وحش وطیر رام۔ نظم ؎

نازم بمرقعی کہ چوں لعبت باز — ہر لمحہ بصورتی شود چہرہ طراز

احسنت بکلک صنع صورتگراد، پردازندہٴ معنیٴ ناز ونیاز۔ صورتی چند بی مثل ومانند نقشی خاطر خواہ دلپسند، شبیہ باصل موافق، سایہ بذات مطابق، جمالی بکمال حسنی بے زوال نگاہے آشنا، زبانی گویا ابروئے برجستہٴ مژگانی بابرو پیوستہ، روئے بے نقاب چشمے بے حجاب، جبینی بے چین، نگاہی پاک بین، دست ہوس دامنش نکشیدہ و پای ہوا بخلوتکدہٴ اش نرسیدہ۔ نظم ؎

چہ صورت، پاکدامن تر ز مریم — بجسم او نباشد روح محرم

ببوئے او نباشد شانہ را راہ — زگیسوئے بلندش دست کوتاہ

[۱]

.. ..

.. ..

بیک جا عاشق ومعشوق دل خواہ — بکوزیہائے چشم ہجر جانکاہ

یکے با نیم رخ گرم اشارت — دو عالم را تماشے کردہ غارت

یکے مستقبل[۲] ناظر، نشستہ — مربع شکل را زانو شکستہ،

---

[۱] یہاں پر زیب النساء بیگم کے حسن کی تعریف میں چند اشعار ہیں جنکا نقل کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔۱۲

[۲] کذا فی الاصل۔۱۲

یکی استادہ ہمچون سرو آزاد | زقدش عالم بالا بفریاد
یکی بنشستہ بر بالائے مسند | برنگ مہر بر لوح زبرجد
یکی حیران کار صانع خویش | بجز دیدن سری افگندہ در پیش
یکی خطی بر ویش حلقہ بستہ | میان سنبلش گل دستہ دستہ
یکی در رقص پا کوبان و سرمست | یکی دف دیگرے طنبور در دست
یکی سرگرم در پیمانہ داری | یکی در سر ہوائے شانہ کاری
زسر وا کردہ گیسوئے پریشان | بسان پائے چون زنجیر پیچان
زسر تا پا کشیدہ چادر مو | کہ چشم بد نہ بیند آن پری رو
ز دوشش افتادہ گیسو تا بزانو | بجبین کاسہ پیدا شدہ مو
چو صیادان بنخچیر دل ہوش | کمند زلف و گیسو بر سر دوش
سیاہ حسن را موشد سرآمد | ز دامش ہیچ دل بیرون بیامد
حدیث زلف و گیسو چون نگارد | برنگ شانہ کلکم "ہو" بر آرد
بیا اے راشد بی رشد خاموش | بطبع فکر چون معنی مزن جوش
سخن کوتہ چہ جائے قیل و قال است | مرقع نی محل وجد و حال است

از آنجا کہ تعریف این سخن بگفتن و شنیدن راست نیاید، توصیف را بوا نمودن و دیدن مرقع حوالہ می نماید، و ختم کلام دیباچہ مرقع خجستہ آغاز فرخندہ انجام بنظم قطعہ مشتمل بر تاریخ چند، النسب و الی می نما۔ نظم۔

بحمد اللہ مرتب شد مرقع، | زکلک نقشبندان معانی
مرقع نیست نقش ہفت خلد است | بود دیباچہ اش سبع المثانی

مرقع نیست، دام انس و الفت | دو چشمش دام و طیرش آشیانی
بیک سو قطعهٔ بخط عارض | بیکر در قطعه هم نقش مانی
نگاه دیدن تصویر و تحریر | ره از صورت به معنی میرسانی
توان کردن نظر بر پشت کارش | ز حیرت محو اگر بر رو نمانی
نگردد خم قد صورت ز پیری | تمام عمر هنگام جوانی
ندیده رویش از پیری ضعیفی | بنازم قوت و زور جوانی
نمیدانم چسان تعریف گنجد | ز بس جا کرده در صورت معانی
مصور انتخاب کائنات است | تماشا کن تماشا تا توانی
ز توصیفش کلامم گشته رنگین | سزد دیباچه ترقیع خوانی
سه بیتم مشتمل بر سال ترتیب | بهر مصراع از آن تاریخ دانی
همه معدود از یک تا بشش سال | بترتیبی که در اعداد خوانی
نخستین سال دان از بیت اول | یکی افزود در مصراع ثانی
اگر بینی بچشم دل، مرقع | نیابی در دو کون مانند ثانی
ز حسن و نام این ترقیع زیبا | بمعنی محو چون صورت بمانی
بود بمثیل این زیبا مرقع | نمایان چون نگارستان مانی
مصور تا بود ترقیع عالم | بتصویر بر درج آسمانی

وجودش باد سالم از حوادث
بیکتائی که او را نیست ثانی

"مرقع" آپ کے سامنے آچکا، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس مرقع میں صرف قطعات ہیں

بلکہ تصویریں بھی تھیں، اور جہاں مشہور کاتبوں اور خطاطوں کے کمالات کے نمونے تھے وہاں نقاشوں اور مصوروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی بے مثل تصویریں بھی تھیں، کہیں باغ کے دلکش مناظر تھے، کہیں اشجار پر طیور نغمہ سرا تھے، کہیں آپس میں اشارے ہوتے تھے، اور کہیں حسین مصروف گلگشت نظر آتے تھے۔ کہیں مخلوق کا نظارہ اور کہیں نقش و سرود کا نقشہ پیش نظر ہوتا، کہیں جام صہبا کا دور چلتا ہوا نظر آتا اور کہیں صیدگاہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ غرض وہ مرقع عجیب باغ و بہار رہا ہوگا، اور اگر اب بھی موجود ہوتا تو امید تھی کہ ہندوستان کے بہترین "مرقعوں" میں شمار ہوتا، بہرحال یہ "دیباچہ" بھی ایک تاریخی یادگار ہے اور شکر ہے کہ اس سے زیب النسا کے بعض نامعلوم شعبہ جات زندگی پر روشنی پڑی، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اورنگ زیب جیسے متشرع کے محل میں بھی تصویریں بڑے شوق سے رکھی جاتی تھیں اور یہ "کفر" اس "کعبہ" میں بھی "عام" نہیں تو "خاص" ضرور تھا۔

قطعات

مولینا چراغ حسن صاحب حسرت منشی فاضل (شملہ)

سرو و گل قمری و بلبل کی حکایت نہ رہی حسن کا قصہ گیا عشق کا افسانہ گیا

جس کے ہنگاموں سے تھی درد کی دنیا آباد آج محفل سے تری وہ دل دیوانہ گیا

دل ہے اور شغل ماتم ہستی دیدہ ہے اور خونفشانی ہے

آپ اور داستان درد سنیں مہربانی ہے مہربانی ہے

راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

(از سید الشعرا جناب سید علی محمد صاحب مدظلہٗ خان بہادر شاد عظیم آبادی)

موجِ پیمانۂ تقدیر ہے گیسو تیرا ۔ طاقِ میخانۂ توحید ہے ابرو تیرا

مہک اٹھا چمنِ دہر کا پتا پتا ۔ راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

صفِ آخر میں ہوں میں وا اسفا یا قاتل ۔ کانپتا ہوں کہ تھکا جاتا ہے بازو تیرا

رُک رہی کیوں درِ جنت پہ بہشتی ساری ۔ کھل گیا ہو نہ مہکتا ہوا گیسو تیرا

کیسی وحشت نہ رہے ایک بھی ہوش بجا ۔ جو کڑی بھول کے منہ تکتے ہیں آہو تیرا

مانگنے کی نہ منگانے کی ضرورت اے مست ۔ شکر کر جامِ خدا ساز ہے چلو تیرا

سر جو باقی نہ رہا تن پہ سبک بار ہو میں ۔ ٹل گیا بوجھ سلامت رہی بازو تیرا

خم ہے لبریز سمجھ بوجھ کے پینا میخوار ۔ کوئی گرتے ہوئے پکڑیگا نہ بازو تیرا

دل الجھتا ہے کہ کیونکر نکل آؤں منہ سے ۔ تذکرہ سنتا ہی کانوں سے جو ہر سو تیرا

شاد کیا کیجئے دیکھا نہیں جاتا مجھ سے
چہرہ اترا ہوا ۔ ڈھلتا ہوا آنسو تیرا

بستر مرگ پر

(از جناب مولوی محمد حسین صاحب حسان - ندوی)

کئی برس ہوئے میں قاہرہ کی گلیوں سے گذر رہا تھا کہ ایک مکان کے پاس لوگوں کا اژدہام دیکھا کاندھے سے کاندھا چل رہا تھا پیر پر پیر پڑ رہا تھا پولس بھی موجود تھی مجمع میں کوئی شخص کہہ رہا تھا "ہائے کسقدر افسوس ناک خودکشی ہے" ایک دوسری آواز آرہی تھی "غالبًا یہ نوجوان غریب الوطن ہے کہ اسقدر اندوہناک حادثہ میں کسی کی آنکھیں پرنم نہیں"

اب مجھے تفصیلی حالات معلوم کرنیکا خیال دامنگیر ہوا اسقدر زبردست مجمع میں سے گذر کر مکان تک پہونچنا ناممکن تھا، میں انہی خیالات میں محو تھا کہ ایک واقف کار پولیس انسپکٹر آگیا اور میں اوس کے ذریعہ سے آسانی سے مکان میں داخل ہوگیا۔

ایک نوجوان تقریبًا ۲۰ برس کی عمر ریعانِ شباب کا عالم، نازک بدن، سنہرا رنگ، بسترِ مرگ پر دراز تھا موت کے ظالم پنجہ نے رنگینیٔ شباب کی رعنائیوں کو بالکل زائل نہیں کیا تھا۔

اس ہار کی طرح جس میں رات بھر مسلے جانے کے باوجود کچھ نہ کچھ تازگی وعطر بیزی باقی رہتی ہے۔

انسپکٹر نے خودکشی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے کپڑوں کا معائنہ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ موت کس چیز سے واقع ہوئی ہے خود جسم کی تفتیش شروع کی۔

میں علیحدہ ایک جانب محزون وغمگین اس کی اس المناک اور درد انگیز مصیبت پر غور کرنے اور اس کے حسن وجمال پر آنسو بہانے لگا۔

نعش کے گرد کچھ منتشر اوراق پڑے تھے میں نے ڈاکٹر اور انسپکٹر سے نظر بچا کر اُن کو جمع کرکے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ زہر کھانے سے موت واقع ہوئی ہے، انسپکٹر نے نعش کو شفاخانہ لیجانے کا حکم دیا۔

نعش اٹھالی گئی مجمع منتشر ہوگیا، پھر مجھے نہیں معلوم اس کے بعد کیا واقعہ ہوا۔

تنہائی میں بیٹھ کر میں نے ان منتشر اوراق کو ترتیب دینا شروع کیا۔ ہائے وہ ایک عاشق صادق کی محبت ناکام کا الم انگیز اور دردناک افسانہ تھا جس نے جام محبت کو پہلی ہی بار مونھہ سے لگایا تھا کہ اسُ کی حلاوت و شیرینی نے اس کو کچھ ایسا از خود رفتہ و مدہوش کردیا کہ وہ اسُی مونھہ سے نہ چھڑا سکا حتیٰ کہ وہ آخری جرعات میں اسُ سم قاتل کو بھی محسوس نہ کرسکا جو آخر میں اسُ میں آمیز ہوگیا تھا، جس نے اسُ کے افسانۂ زندگی کو تمام کردیا اور اسُے حسن و عشق کی قربانگاہ پر چڑھا دیا۔

میں نے اس تحریر کو اوّل سے آخر تک پڑھا۔ اور دیر تک آنسو بہاتا رہا، آخرش ان اوراق کو میں نے زمانہ کی غیر محدود دنیرنگیوں کے سپرد کردیا۔

ایک زمانہ دراز کے بعد میں پرُانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ یک بیک ایک چھوٹے سے پلندے پر میری نظر پڑگئی جو کہنگی کے باعث میّت کے کفن کے مثل بالکل زرد پڑگیا تھا میرا سارا بدن کانپ اٹھا جس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہائے یہ اسُی شخص کا مرقع ہے جسکا لکھنے والا آج قبر میں ہے۔

ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو میں نے پھر کھول کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا اسُ میں ایک

ایک عاشق کی دلی رنج و مسرت خوش بختی و بدنصیبی کی صحیح تصویر مرتسم تھی،
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے لئے جو اس منزل ہاں اس قاتل عشق کی
منزل پر گامزن ہیں اس کو شائع کر دیا جائے کہ اس دردناک انجام سے عبرت حاصل کریں۔

(۱)

"میں نے اُسے دیکھا اور محبت کے دام میں گرفتار ہو گیا، اس سے پہلے میں جانتا ہی نہ
تھا کہ محبت کیا شے ہے میرا دل ایک شدید تاریکی میں تھا حتیٰ کہ خود اپنے سے بھی بیگانہ
تھا، لیکن جب اس میں محبت کا نور داخل ہوا تو وہ جگمگا اُٹھا اس کا نور و جمال آفتاب جیسا
تھا لیکن اس کی حرارت و تپش کو آفتاب سے کوئی مناسبت نہ تھی۔
میں محسوس کرتا تھا کہ میرا دل اس زندگی کے سنسان صحرا میں ایک تن تنہا وحشی کی
طرح ہے جو اور دلوں کو پہچانتا ہی نہیں یا پہچاننے سے (انکار) کیا کرتا ہے لیکن جب
میں محبت کی رنگینیوں سے آشنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے دل سے ملا ہوا ایک اور
دل بھی ہے اور اس کی خفیف سی حرکت و سکون سے میرے دل میں بھی حرکت و سکون
ہوتا رہتا ہے میں اپنے دل کی گہرائیوں میں مسرت و ابتہاج لطف و رشک کے دلآویز
جذبات کا دریا موجزن پاتا تھا۔ جو اگر تمام دنیا کے دلوں پر تقسیم کر دیے جائیں تو یقین
ہے کہ وہ قیامت تک غم و الم سے روشناس نہ ہوں،
میں عام طور پر عیش و راحت اور خوش نصیبی کا نام سُنا کرتا تھا لیکن عام لوگوں کی
گفتگوؤں سے جو مطلب سمجھتا تھا وہ یہ کہ اس قسم کے تذکرہ پر بڑے بڑے شاندار محلات
و قصور پر شوکت اور سامان تعیش سے آراستہ باغات، سیم و زر عز و جاہ اور شہرت
و نمود کا ذکر کیا جاتا تھا۔ لیکن جب میں محبت سے روشناس ہوا تو یقین ہو گیا کہ دنیا کی زبردست

ترین مسرت و خوش بختی محبت اور صرف محبت ہے اور یہ بات بھی منکشف ہو گئی کہ لوگ جسمانی مسرت و خوش نصیبی کے طالب ہیں روحانی مسرت سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں اُن کی شان بالکل اُس میت کی سی ہے جو ریشم و زربفت کے کپڑوں میں ملبوس ہو لیکن کفن کے اندر کیڑوں کی خوراک ہو"

(۲)

"میں نے اُس سے تبادلۂ محبت کیا لیکن میں خود "اُس" سے ہنوز ناواقف تھا، میں نے اپنا دل اُس کی خدمت میں پیش کیا کہ وہ اس پیش کش میں سبقت کر چکی تھی، لیکن میری طرف سے تو یہ ایک حقیر ترین معاوضہ تھا اُس عظیم الشان اور زبردست پیش کش کے مقابلہ میں جس کا مجھے وہم و گمان، اور خواب و خیال بھی نہ تھا،

میں نے مدت دراز تک ایسے لوگوں میں زندگی بسر کی جن کو میری طرف کوئی توجہ تھی اور نہ میرے حالات کی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت، ہاں میں اسقدر مصائب و آلام میں مبتلا رہا کہ انسانی طاقت کی برداشت سے باہر ہے۔

بے شک لوگ میری مزاج پُرسی کرتے تھے بعض کہتے تھے کہ آپ کی تکالیف دلی اذیت کا باعث ہیں، بعض از راہ ہمدردی و محبت رو پڑتے تھے، لیکن کیا یہ سب کچھ، میرے لئے تھا، ہرگز نہیں، میں نے اپنے لئے کسی دل کو دھڑکتے اور کسی آنکھ کو پُرنم نہیں پایا۔

کیونکہ جسے میرے حسن سے محبت ہے گویا وہ ایک تمثال سے محبت کرتا ہے، جس میں بہترین صناعی کی گئی ہو میرے مال سے محبت کرنے والا۔ گویا اپنے ہی خزانہ سے محبت کرتا ہے، اور میری گفتگو سے محبت کرنے والا گویا بربیع الشال روایات کا شیدائی ہے لیکن خود مجھ سے کسی کو ذرا بھی محبت کا لگاؤ تک نہ تھا،

لیکن آج میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے ساتھ ایک دل ہے جو میرے لئے دھڑکتا اور مضطرب ہوتا ہے آنکھیں ہیں جو میری خاطر گنگا جمنا بہاتی ہیں، نفس ہے جس کا مطمح نظر صرف میری محبت ہے جو مجھ سے صرف میرے لئے محبت کرتا ہے۔ پس میں اس کی خدمت میں جان بھی پیش کروں تو یہ حقیر ترین معاوضہ ہوگا چہ جائیکہ دل کے ساتھ بخل کیا جائے"!

(۳)

"میں پہلی مرتبہ اس سے تنہائی میں ملا دل نے خواہش کی کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر سینہ پر رکھوں کہ سوز نہاں میں کچھ سکون ہو جائے۔

میں نے ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ اس نے ایک عتاب آمیز نظر ڈال کر کہا :-

'مرد بنو، یہ محبت کی منزل ہے، یہاں طفلانہ حرکات کا گذر نہیں اگر تمہیں میرے نفس سے محبت ہے تو وہ تمہارا اور صرف تمہارا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں اور اسمیں کوئی تمہارا شریک نہیں، لیکن اگر تمہیں میرے اس جسم کی وجہ سے مجھ سے محبت ہے تو تمہاری یہ دون ہمتی یہ پست خیالی اور تمہاری نفس کی یہ رذالت قابل شرم ہے،

کیا تم آنسوؤں کا دریا بہاتے، راتوں کی نیند حرام کرتے اور اپنا دل گھلاتے ہو محض ہڈی اور چمڑے سے مس کرنے کی خاطر

تم شریف ہو اپنی محبت میں بھی اسی طرح شریف رہو اور جس طرح میں تم سے محض تمہاری خاطر محبت کرتی ہوں اسی طرح تم مجھ سے بھی صرف 'میرے لئے محبت کرو' وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ میں اپنی نظروں میں خود حقیر ہو گیا۔ کاش! اس خیال فاسد کے آنے سے پہلے ہی زمین میں گڑ گیا ہوتا، میں نے معذرت کی معافی مانگی، اور اس نے ہاں اس ملائک صفت خاتون نے معاف کر دیا۔ اس کے بعد کبھی اس بدخیالی کو میں نے اپنے دل میں

جگہ نہیں دی،،

(۴)

"اس کی نصیحت و رہنمائی اور شریف و لطیف ترین محبت کی مجھے اب قدر ہوئی،
اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل ایک آئینہ ہے جو زنگ آلود ہو گیا تھا اور محبت
ایک صیقل ہے جو شیئاً فشیئاً اس کو جلا دے رہی ہے۔ میں دشمنوں کی جانب سے
دل میں سخت کینہ، و حسد رکھتا تھا مگر اب میرے صفحۂ دل سے یہ تمام خیالات بالکل محو ہو گئے
کیونکہ "محبت" اور اس کے اثرات نے اوس پر قبضہ اور اس کو پاک و صاف کر کے
اوس کو اپنے لئے خاص کر لیا اور دوسرے خیالات کے لئے اوس میں گنجائش ہی نہیں
رکھی۔"

"میں اپنے نقصان کے وقت تنگدل کسی مقصد کے فوت ہو جانے کسی کام کے بگڑ جانے
پر سریع الغضب تھا لیکن اب میں اسی قدر وسیع الاخلاق اور حلیم الطبع ہوں، کوئی خلاف
طبع امر اور کوئی بڑے سے بڑا نقصان میرے لئے غصہ اور تکلیف کا سبب نہیں بن سکتا
کیونکہ :-

میں مسرت کی مسرت و خوش نصیبی پر قانع ہو گیا ہوں اور اس کے مقابلہ میں تمام
مسرتوں اور خوش بختیوں سے بے تعلق،

میں سخت بے مروت اور سنگدل تھا کسی مظلوم سے ہمدردی تھی نہ کسی کمزور د
ضعیف پر رحم لیکن اب دوسرے کی مصیبت کے وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود
اس مصیبت میں مبتلا ہوں، کیونکہ،

محبت نے میرے دل میں داخل ہو کر اُس کو نور سے لبریز کر دیا ہے اس لئے وہ پردہ جو میرے اور دوسرے دلوں کے درمیان حائل تھا اُٹھ گیا، بہر حال میں ایک ضرر رساں وحشی تھا جس سے ایک عالم عاجز آیا ہوا تھا لیکن محبت نے مجھے ایک شریف انسان بلکہ فرشتہ بنا دیا"

(۵)

"ایک رات میں اُس کے ساتھ نہر کے کنارے نکل گیا۔ صاف و شفاف پانی، نکھرا ہوا آسمان تارے چھٹکے ہوئے، اور تاروں کا اس طرح پانی میں انعکاس کہ اصل و نقل میں تمیز مشکل، غرض کہ ان سب باتوں نے مل جل کر ایک دل گداز اور پر اثر منظر پیدا کر دیا تھا۔ ہم دونوں ایک طویل عرصہ تک یونہی بالکل خاموش چلا کئے، گویا رات کا سکون ہماری رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور اُس کے ہیبت و جلال سے ہماری زبانیں بند ہو گئی تھیں،

میں اس وقت اپنے جسم میں ایک عجیب لطافت اور ہلکا پن محسوس کر رہا تھا اس وقت میرے دل میں خیال آرہا تھا کہ میں چاہوں تو بغیر پروں کے اُڑ سکتا ہوں ہاں میں اپنی نظر سے آسمان کے پردوں کو چاک کر کے ملاء اعلیٰ پر پہونچ سکتا ہوں اور وہاں پھر ایسی چیزیں دیکھونگا جو لوگوں کی نظروں سے مستور ہیں،

کاش! نہر اپنا راستہ بھول جائے اور کبھی اپنے منبع تک نہ پہونچے۔ رات ایک طویل عرصہ تک اپنا دامن پھیلائے رہے اور فجر کو کچھ خبر نہ ہو اور جب تک تاریکی رہے نہر کے غیر محدود طول پر ہم چلتے رہیں۔

میں نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"کیا تم بھی اُس مسرت و ابتہاج اور خوش بختی کو محسوس کر رہی ہو جس کے احساس نے

بھی مجھے از خود رفتہ دبیخود کر دیا ہے"

جواب ملا :-

"نہیں کیونکہ میں زمانہ کی نیرنگیوں سے تم سے زیادہ واقف ہوں کیونکہ تم جس نظر سے دُنیا کو دیکھتے ہو میرا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ تم باطل امیدوں کی بنا پر اپنے کو خوش نصیب سمجھو لیکن میں حقیقت حال سے با خبر ہوں اور خود کو بدنصیب سمجھتی ہوں، ہاں تم خوش نصیب ہو کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہاری خوش نصیبی دائم اور غیر منقطع ہے اور میں بدنصیب کیونکہ ہر لمحہ اور ہر ساعت اس کے فنا و زوال کی متوقع ہوں،

اگر تم آفتاب کو نصف النہار پر ٹھہرا سکتے ہو زمین کو اپنی گردش سے روک سکتے ہو اگر تم حرکت کو سکون اور ساکن کو حرکت سے منع کر سکتے ہو تو بیشک تمہیں حق ہے کہ اس سے امیدیں قائم کرو!

اسقدر کہہ کر وہ بالکل خموش اور دیر تک سرنگوں رہی میں نے دیکھا اوس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں معلوم ہوتا تھا قیمتی موتیوں کا ہار ٹوٹ گیا ہے اور موتی بکھر رہے ہیں، میں اُسکی حالت دیکھ کر دل پر قابو نہ رکھ سکا بے اختیار رونے لگا، میں نے کہا :- آخر اس اشکباری کی کیا وجہ ہے" اُس نے کہا "فراق کا خوف" میں نے کہا "زندگی کا فراق یا موت کا" اُس نے کہا زندگی کا فراق نہیں کیونکہ اس کائنات میں جب تک خدا کو ہمیں اور تمہیں جمع رکھنا منظور رہے دنیا کی کوئی چیز ہمیں ملنے سے نہیں روک سکتی ہیں تو صرف موت کے فراق سے ڈرتی ہوں،

میں نے کہا "کیا تمہاری خواہش ہے کہ ہم ایک ساتھ زندہ رہنے اور مرنے کا عہد کریں"!

ہم دونوں نے معاہدہ کرلیا۔ اور وہیں سے واپس لوٹے رات دن سے بھاگنے کے لئے اپنے، دامن سمیٹ رہی تھی ہم دونوں بھی آیندہ ملاقات کا وعدہ کرکے ایک دوسرے سے

علیحدہ ہو گئے، اور ہر ایک اپنے راستہ پر ہو لیا۔"

(۶)

"کیا یہ غدار زمانہ ایک لمحہ کے لئے بھی انسان سے غافل نہیں ہو سکتا۔ کیا وہ ایک ایسا جام نہیں پلا سکتا جو کدورت سے مخلوط اور بدنصیبوں اور بدبختیوں سے ممزوج ہو۔

ہاں ہاں وہ ایسی مسرت و خوش نصیبی سے باز نہیں رکھہ سکتا جس کو وہ آج اس لئے دیتا ہے کہ کل چھین لے؟

ہاں انسان دائمی بدنصیبیوں تکلیفوں پریشانیوں کو برداشت کر سکتا ہے لیکن وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی مسرت و اطمینان کو چھین لیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ امید سے انسان کی زندگی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف امید ہی انسان کے قتل کا سبب ہے۔

اے کاش! میں کبھی خوش نصیب نہ ہوتا کیونکہ محض خوش بختی کے ہی سبب میں نے اس بدنصیبی کا منہ دیکھا، اے کاش! میں کبھی امید نہ کرتا کہ یہ قاتل مایوسی اسی باطل امید کے رستہ سے در آئی،

آہ آخرش اس کا اندیشہ پورا ہو کر رہا، اس نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا وہ میری زندگی کا آفتاب میری امیدوں کی شعاع اور میری خوش نصیبی و خوش بختی کا سرچشمہ تھی ہاں خاتون کا انتقال ہو گیا جس نے دنیا کو نور و جمال سے لبریز کر دیا تھا اس کی موت سے ساری کائنات پر موت طاری ہو گئی،

ہاں میں دیکھتا ہوں کہ اب نہ وہ زمین زمین ہے نہ وہ آسمان آسمان، پرندوں کا شور خاموشی سے بدل گیا ہے درخت دم بخود ہیں، آسمان پر ماہتاب یا ستاروں کا نام و نشان نہیں کلیاں

مرجھائی ہوئی ہیں غرضکہ بحر پر ایک مایوسی، اضمحلال، اور افسردگی کا عالم طاری ہے۔

معلوم ہوتا ہے دنیا اپنے عہد اولین کی جانب لوٹ گئی ہے جہیں نہ کہیں انسان کا پتہ ہے اور نہ حیوان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور میں گویا اس دنیا کا آدم ہوں جو جنت سے نکلنے پر سخت غمگین، افسردہ اور اپنی تنہائی کا شاکی ہے، جفاشعار دنیا! جو اپنے اندر ہزاروں غدّاریاں اور ستم کیشیاں پنہاں رکھتی ہے تو اس کو مجھ سے چھین لینے میں کامیاب ہو گئی، لیکن تو میرے اوپر غلبہ نہیں پا سکتی تو دنیا سے جس کو چاہے نکال سکتی ہے لیکن کسی کو واپس بلانا تیرے اختیار سے باہر ہے۔

اور اے روح لطیف قبر میں مضطرب نہ ہو اور جلدی نہ کر قسم بخدا میں عنقریب اپنے عہد کو پورا، اور تیری اس وحشت کو دور کرنے والا ہوں۔

اور یقیناً ہمارا یہ معاہدہ جو ہم نے محلات میں کیا تھا قبر میں پورا ہو کر رہیگا۔ ہمارا تعلق پہلے بھی روحانی تھا اور اب دوسری دنیا میں بھی یہ تعلق اسی طرح برقرار رہیگا۔"

(النظرات) (ترجمہ)

رباعی حضرت گرامی

ما واعظ شہریم چہ بالغ نظریم

از نکتۂ مرگ و زندگی با خبریم

منبر فریاد کرد و خلوت بگریست

بر منبر دیگر و بخلوت دگریم

یہ کیا تمہیں نیند آئی اور مجھ پہ بگڑتے ہو
دلچسپ نہ تھا قصہ تم نے نہ سنا ہوتا

محشر میں حجاب اُٹھے تو آپکا احساں کیا
کیا آج بھی دنیا کا وعدہ نہ وفا ہوتا

ہاں منصبِ گلچیں تھا کانٹوں کا جلا دینا
تنکا تو نشیمن کا دل میں نہ چبھا ہوتا

خود یاس بھی اک شے ہے میں کب کا چلا جاتا
اوروں پہ اگر یہ در پہلے نہ کھلا ہوتا

آخر تھی بہارِ گل مرتا نہ تو کیا کرتا
جب قید کی حاجت تھی اسوقت رہا ہوتا

پوچھا نہ گیا قصہ محشر میں کہ ظاہر تھا
اب اس سے زیادہ کیا اظہار جفا ہوتا

نالوں کے لئے ثاقبؔ آتیں نہ ملیں ورنہ
عالم جسے کہتے ہیں میری ہی صدا ہوتا

ضروری گذارش

ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ

(از جناب حافظ محمد حسن صاحب - بی - اے - ال ال - بی)

ہندوستان یوں تو ہمیشہ سے غیر اقوام کا جولانگاہ بنا رہا ہے اور کوئی قرن یا صدی مشکل ہی سے ایسی گذری ہوگی جس میں بیرونی حملہ آوروں نے یہاں آکر کشت و خون یا جور و تعدی نہ کیا ہو - لیکن تیمور اور نادر شاہ کے حملے سب سے زیادہ مشہور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں واقعے ہندوستان کے لئے نمونہ قیامت ہوئے ہیں، تیمور کے حملہ کو تو ایک عرصہ گزر گیا اور اس کے بعد زمانہ نے ایسے پلٹے کھائے کہ اس کی یاد اہل ہند کو اب بطور قصہ و کہانی کے باقی ہے لیکن نادر شاہ کا حملہ اب تک بطور تمثیل کے استعمال ہوتا ہے جس نے سلطنت مغلیہ کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ پھر نہ سنبھل سکی،

نادر شاہ نادر شاہ ملک ایران کا رہنے والا تھا اور نادر قلی خاں اور طہماسپ قلی خاں کے نام سے بھی مشہور ہے مورخین کا خیال ہے کہ دور آخر میں ایران نے اس سے بہتر سپاہی اور کوئی پیدا نہیں کیا، اسکا نسب ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہے اور یہ صحیح ہے کہ وہ ایک چرواہے کا لڑکا تھا سنہ ۱۶۸۷ء میں خراسان کی مضافات میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کی کچھ بھیڑ بکریاں فروخت کر کے چند جنگجو ساتھی جمع کر لئے اور لوٹ مار اور غارتگری اپنا پیشہ قرار دے لیا چند ہی روز میں اسکے ہمراہیوں کی جماعت چھ ہزار تک پہنچ گئی اور اس نے ایسا زور پکڑا کہ شاہ طہماسپ ثانی والئے ایران نے اشرف خاں ایک افغانی سردار کے مقابلہ کے لئے جس نے ملک ایران پر قبضہ کر رکھا تھا اس سے

مدد طلب کی ۔ نادر شاہ اشرف خاں کے مقابلہ میں اس بہادری اور جرأت سے لڑا کہ آخر الذکر ایک ہی حملہ میں پامال ہو گیا اور شاہ طہماسپ سنہ ۱۷۳۰ء میں اپنے آبائی ملک پر پھر قابض ہو گیا، نادر شاہ نے اشرف خاں کو شکست ہی دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اُس کے تعاقب میں قندھار تک گیا، جب ایران واپس پہنچا تو اُس کو معلوم ہوا کہ طہماسپ شاہ نے ترکوں سے ایک صلح کر لی ہے جس سے عوام میں بےچینی پھیلی ہوئی ہے ۔ وہ اس نادر موقع کو کب ہاتھ سے دینے والا تھا چنانچہ اوس نے فوراً شاہ طہماسپ کو تخت سے اُتار دیا اور اُس کے شش ماہہ بچے کو عباس شاہ ثالث کا خطاب دیکر تخت پر بٹھایا اور خود بطور اتالیق ایران پر حکومت کرنے لگا ۔ شاہ عباس کے انتقال کے بعد یہ پردہ بھی اُٹھ گیا ۔ ارکان دولت نے جو اُس کے مطلب سے واقف تھے اوس کو حاکم منتخب کر لیا اور اس طرح سنہ ۱۷۳۶ء میں نادر شاہ ایران کا بادشاہ بن گیا ۔ ملک فارس کی حکومت حاصل کرنے کے بعد نادر شاہ کی ملک گیری کی ہوس میں اور بھی ترقی ہو گئی جس کے پُورا کرنے کے لئے ہندوستان سے بہتر اور کون ملک ہو سکتا تھا جہاں محمد شاہ رنگیلے کی عیش پسندی اور امرا کی خانہ جنگیوں نے سلطنت مغلیہ میں گھن لگا رکھا تھا

نادر شاہ کی ہندوستان پر حملہ کی تیاری

جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کا ارادہ کر لیا تو اُس کے واسطے بہانہ تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہ تھا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے اشرف خاں افغان سے جنگ کے دوران میں شاہ طہماسپ صفوی والئے ایران نے علی مردان خاں نامی سفیر کو محمد شاہ کے پاس بطور ایلچی روانہ کیا تھا اور اُس کے بعد شاہ عباس ثالث کے زمانہ میں محمد علی خاں ترکمان ایلچی ایران سے بدیں غرض شاہ ہند کے

پاس بھیجا گیا تھا کہ وہ باغی افغانوں کو اپنے ملک میں پناہ نہ لینے دے اور یہ عرضداشت شاہ ایران کی محمد شاہ والئے ہند نے قبول کر لی تھی۔ ایلچی مذکور کو واپسی میں توقف ہوا اور نادر شاہ نے مزید سفیر اسی مضمون کے اعادہ کے لئے ہندوستان روانہ کئے۔ لیکن چونکہ افواج ہندوستان اس قابل نہ تھی کہ افغانوں کی صدراہ ہو سکے ایرانی ایلچی سرحد پر بدامنی کی وجہ سے ابھی ملک کو واپس نہ ہو سکے اور چنانچہ انہیں سے اکثر جلال آباد کے قریب باغی افغانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ نادر شاہ کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور ہندوستان کو تسخیر کرنے کی غرض سے چل کھڑا ہوا۔

تسخیر کابل

۱۱۵۱ھ میں وہ قندہار سے کابل کی طرف بڑھا اور پہلے ہی حملہ میں شہر پر متصرف ہو گیا۔ مگر شیرزہ خاں حارث قلعہ کابل نے بغیر جنگ قلعہ کو حوالہ نہ کیا۔

نادر شاہ نے قلعہ مذکور کا محاصرہ کر لیا اور بیس روز اُسے گھیرے پڑا رہا مگر چونکہ اقبال نادری اوج پر تھا صدمہ توپ سے قلعہ کا ایک برج گر پڑا اور افواج نادری قلعہ میں داخل ہو گئی۔ شیرزہ خاں قید ہو گیا اور قلعہ کے تمام خزائن و دفائن نادر شاہ کے ہاتھ آ گئے۔ پانچ ماہ کابل میں رہنے کے بعد ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ جلال آباد کی طرف روانہ ہوا۔ ناصر خاں کابل کا گورنر اس وقت پشاور میں تھا جب اُس کو نادر شاہ کی آمد کی خبر ہوئی تو اُس نے اوس کو جمرود اور علی مسجد کے درمیان روکنا چاہا اور اس ارادہ سے پشاور سے حرکت کی اُس کے ساتھ ہی اُس نے اس خطرہ کی خبر بادشاہ کو بھی دی اور تحریر کیا کہ میں بالکل مفلس ہوں فوج کی تنخواہ پانچ سال سے نہیں دی گئی ہے۔ اگر ایک سال ہی کی تنخواہ اسوقت مرحمت ہو جائے تو سپاہ کی کچھ اشک شوئی ہو جائے گی۔ درخواست مذکور حسب قاعدہ

کے مطابق ناصر خاں کے وکیل نے امیر الامرا خاندوراں خاں کی خدمت میں پیش کی اور ڈرتے ڈرتے کابل کے واقعہ کا ذکر کیا تو جواب ملا کہ اسے وکالت پناہ میں بہت تجربہ کار ہوں ایسی لاطائل قصے جو صرف روپیہ حاصل کرنے کے لئے تراشے جاتے ہیں میرے ناخنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں سطح زمین پر رہتا ہوں اور جو چیز مجھے نظر نہیں آتی میرے خیال میں بھی نہیں گذرتی۔ لیکن چونکہ تمہارا مکان بہو جلہ پہاڑی[۵۸] پر واقع ہے تم کو شاید قزلباشوں کی فوج نظر آ گئی ہو گی۔ بہرحال تم اپنے موکل ناصر خاں کو تحریر کردو کہ احکام جہاں مطاع ناظم بنگالہ کے نام صادر ہو چکا ہے وہ موسم برسات کے بعد روپیہ خزانہ شاہی میں داخل کرے گا جس میں سے ایک معتدبہ رقم اس کے پاس روانہ کردیجاوے گی۔

شاہ دہلی اور اس کے امرا کی آنکھوں پر تو یہ غفلت کے پردے پڑے تھے ادہر نادر شاہ مارا مار ہندوستان پر بڑہا چلا آرہا تھا۔ صوبائی جرگہ نے کچھ مدت اسے روکے رکھا مگر قزلباشوں نے جو بہت زیادہ چالاک و ہوشیار تھے ایک رات افغانوں کو غافل پاکر ان پر شب خون مارا اور ۱۱ شعبان سنہ مذکورۃ الصدر کو درخیبر سے گذر کر ناصر خاں کی فوج پر آ پڑے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اوس کو کاٹ کر پھینکدیا۔ ناصر خاں جو مثل اپنے نصیب کے بستر خواب پر پڑا سو رہا تھا اضطراب کی حالت میں چند ہمراہیوں کو ساتھ لیکر فرار ہو گیا۔

تسخیر پشاور

اس حملہ کے بعد جب نادر شاہ کے قبضہ میں ملک کابل و پشاور و اٹک آ گیا تو محمد شاہ اور اس کے امرا کی آنکھیں یکدم کھل گئیں لیکن کاہلی اور عیش پسندی نے اون کا ساتھ اب بھی نہ چھوڑا، اگر اب بھی چستی اور چالاکی سے کام لیا جاتا اور اعزاز الدولہ ناظم ملتان و لاہور کی خاطر خواہ امداد فوج و روپیہ سے کیجاتی تو اغلب ہے کہ تاریخ اس وقت کچھ اور

[۵۸] بہو جلہ پہاڑی دہلی میں ایک محلہ ہے۔ اور بہت بلندی پر واقع ہے۔ ۱۲

ہی قصہ بیان کرتی۔

الغرض جب سوانح نگاروں کے ذریعہ سے پادشاہ ہند کو یہ خبر پہونچی کہ قزلباشوں کی فوج اٹک تک آگئی ہے تو وکیل السلطنت آصفجاہ بہادر وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں بہادر وبخشی الممالک خاندوراخاں امیر الامرا بہادر کو اس امر عظیم کے سر کرنے کے لئے مقرر فرمایا اور یہ تینوں امیر شہر سے اسی روز روانہ ہو کر شالامار باغ میں جو متصل سرائے بادلی کے ہی خیمہ زن ہوئے۔ اگرچہ ان کے ہمراہ پچاس ہزار سوار اور بڑی تعداد توپوں کی تہی اور خرچ کے واسطے ایک کروڑ روپیہ عطا ہوا تھا لیکن وہ اس کو کام میں نہ لائے اور ایک مہینہ تک شالامار باغ میں ہی پڑے رہے۔ اس اثنا میں نادر شاہ ناصر خاں کو شکست دیکر پشاور میں مقیم ہو گیا اور وہاں کا انتظام درست کرکے پانچ رمضان کو اٹک پر خیمہ زن ہوا۔ چونکہ پل بندھنے میں دیر تہی ایرانی فوج نے اس نواح کو خوب تاراج کیا اعزاز الدولہ بہادر کو اگرچہ اس موقع پر بادشاہ کی بے پرواہی کی وجہ سے تساہل کا کافی عذر تھا مگر اُسنے زر کثیر صرف کرکے ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی جمع کی اور سات رمضان کو راوی کے کنارہ پر کیمپ ڈالا۔ مگر چونکہ بغیر مدد افواج شاہی کے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا ناچار توپوں کو مورچوں پر چڑھا کر اور خندقیں کھدوا کر وہیں بیٹھ رہا۔

تسخیر پنجاب

چار شوال کو ایرانی افواج دریائے اٹک اور آٹھ کو دریائے چناب عبور کر گئی اور نویں کو شاہ دولا کے پل کے متصل آپہنچی۔ ملک پنجاب اور راوی کے باشندوں کی تباہی کا حال تحریر سے باہر ہے۔ وزیر آباد امین آباد اور گجرات قطعی برباد ہوگئے اور اُن کے باشندوں پر کوئی بیداد ایسی نہ ہو گی جو نہ کی گئی ہو مال ومتاع کا تو کچھ ذکر ہی نہیں کہ کس بُری طرح برباد ہوا۔ دس شوال کو نادر شاہ معہ اپنی فوج کے شاہ دولا کے پل سے گذر کر اور اعز الدولہ کے توپخانہ کو جو دریائے راوی کے کنارہ پر لگا ہوا تھا اپنے دست چپ چھوڑتا ہوا تھوڑی

فاصلہ پر دریائے مذکور کو پایاب عبور کر گیا۔ اور شالامار باغ میں جہاں سے شاہجہاں آباد کو سیدھی سڑک جاتی ہے آکر مقیم ہوا۔ اس روز صبح سے شام تک اعزالدولہ کی فوج سے لڑائی ہوتی رہی جس کی حتی الوسع یہ کوشش تھی کہ شہر لاہور میں داخل ہو جائے۔ مگر افواج ایران نے اس کو راہ نہ دی۔ آخر الامر اعزالدولہ نے اپنا کچھ بس نہ چلتا دیکھ کر نادر شاہ سے صلح کر لی اور بیس لاکھ روپیہ پیش کش کر کے لاہور کو قتل و غارت سے بچا لیا۔ پندرہ شوال کو نادر شاہ شاہجہاں آباد کی طرف روانہ ہو کر ایک مہینہ بعد پندرہ ذیقعدہ کو کرنال کے قریب جہاں محمد شاہ کی فوج اس کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی آوارد ہوا۔

یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ آصف جاہ بہادر و وزیر الملک بہادر و امیر الامرا بہادر نادر شاہ کے مقابلہ کے واسطے روانہ ہو کر شالامار باغ میں ایک ماہ سے پڑے ہوئے تھے جب ان کو یہ خبر پہنچی کہ نادر شاہ دریائے اٹک کے کنارہ پہنچ گیا تو انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ بادشاہ سلامت بھی بذاتہ لڑائی میں شریک ہوں اور خود اوائل شوال میں آگے کو چل کھڑے ہوئے۔ حسب خواہش امرائے مذکور محمد شاہ معہ شہزادہ احمد شاہ کے اٹھارہ شوال کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۲۷ تاریخ کو پانی پت پہنچے۔ ہر سہ امرا آن کر شرف اندوز ملازمت ہوئے اور شاہی لشکر کے واسطے مخلص پور کے قریب جو کرنال میں واقع ہے ایک وسیع میدان جہاں سے نہر جمن گذرتی ہے تجویز کیا گیا۔ چونکہ نادر شاہ کی فوج کی آمد آمد کی خبر متواتر آ رہی تھی۔ یہ قرار پایا کہ افواج ہند تھیں پر توقف کرے لہذا میر آتش کے مشورہ سے لشکر کے گرد کچی دیواریں بنائی گئیں اور اس کی آڑ میں مورچہ قائم کر کے توپیں نصب کی گئیں، غرضکہ لشکر کی حفاظت اور مورچوں کی مضبوطی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ یہ تدبیر جو حقیقتاً عزم بادشاہی کے بالکل منافی تھی اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ برہان الملک بہادر ناظم اودھ جو حکم شاہی کے مطابق تیس ہزار فوج کے ساتھ شرکت جنگ کے واسطے آ رہا تھا شامل

لشکر ہو جائے۔ چنانچہ وہ بہادر سپاہی باوجود بیماری و طوالت منزل کے چودہ ذیقعدہ کو آ پہنچا۔ اس کی آمد سے لشکری ایک گونہ مطمئن ہو گئے اور صورت فتح آئینہ خیال میں دیکھنے لگے۔

اب یہاں سے نادر شاہ اور محمد شاہ کی فوج میں چپقلش شروع ہوتی ہے۔ ایرانی فوج ۱۵ ذیقعدہ کو کرنال پہنچی اور نادر شاہ کو برہان الملک کی معہ ایک لشکر جرار کے آنے کی خبر ملی اس نے یہ چاہا کہ ناظم اودہ کو محمد شاہ کے لشکر سے ملنے سے روکا جائے۔ اتفاق سے برہان الملک کی توپاہ ایران سے مڈبھیڑ ہوئی لیکن انہوں نے اس کے ہمراہیان کو جو عقب میں آرہے تھے روک لیا۔ جب برہان الملک کو جو خدمت شاہی میں حاضر تھا یہ خبر ملی تو وہ مع چند اپنے ہمراہیوں کے بغیر موجودگی بارود و امداد توپ اون کی اعانت کے لئے چل کھڑا ہوا اگرچہ دیگر امرائے شاہی اس کے اس امر میں مانع آئے برہان الملک کے پہونچنے پر ایرانی سپاہ نے یہ حرکت کی کہ ظاہراً پس پا ہو کر اوس کو تعاقب میں اپنے توپخانہ تک لگا لائے اور وہاں پر قایم ہو کر حملہ آور ہوئے۔ جب یہ خبر محمد شاہ کے لشکر میں پہنچی تو اس نے بخشی الملک امیر الامرا کو برہان الملک کی کمک پر معمور فرمایا۔ امیر الامرا نے ہرچند عرض کیا کہ سپاہی آج جنگ کرنے کے لئے قطعی آمادہ نہیں۔ کمک کا جانا بیکار ہوگا بلکہ اس امر کا احتمال ہے کہ کہیں لڑائی کا انتظام ہی نہ بگڑ جائے۔ کل باقاعدہ قلب میمنہ و میسرہ قائم کر کے اور اتواپ و آلات آتشی جن پر ہندوستان کی جنگ کا مدار ہے ترتیب دیکر جنگ کیجائے گی اور امید ہے کہ فتح ہماری نصیب ہوگی۔

پادشاہ کو یہ عذر پسند نہ آیا اور امیر الامرا کو خود را ئی سے مخاطب فرما کر برہان الملک کی کمک کے واسطے مزید حکم دیا۔ چنانچہ امیر الامرا اپنے بھائی مظفر خاں اور چند دیگر ہمراہیوں کو جو اس سراسیمگی میں جمع کر سکا میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گیا اور نہایت تیزی سے اپنے آپ کو برہان الملک تک پہنچا کر لڑائی میں شریک ہو گیا مگر جنگ نے اسقدر طول کھینچا کہ تیر و تفنگ

گذر کر دست بدست تک نوبت پہونچی - برہان الملک اور اوس کے ساتھیوں کی بہادری کچھ کام نہ آئی اور قزلباش جو ہندوستانیوں سے تعداد میں زیادہ تھے اور موقع سے کھڑے ہوئے لڑ رہے تھے انپر غالب آئے اور ہندوستانی فوج بھاگ کھڑی ہوئی - باوجود اس کے امیر الامرا نہایت استقلال کے ساتھ جنگ میں مصروف رہا یہاں تک کہ اس کے ایک کاری زخم منہ پر لگا جس کے صدمہ سے وہ بیہوش ہو گیا اس کا بھائی مظفر خاں اور محترم خاں بیٹا اور حامد خاں کوکہ داروغہ ہنر فیض اور عاقل بیگ کمبل پوش و میر کلو سپر میر مشرف و رتن رائے خوشحال چند پیشکار میر بخشی اس کا آخری دم تک ساتھ دیتے رہے - برہان الملک اور نثار محمد خاں قزلباشوں کے ہاتھ زندہ گرفتار ہو گئے - امیر الامرا کی باقی ماندہ ساتھیوں نے مجلس رائے کی سرکردگی میں امیر الامرا کی سواری کے ہاتھی کو اپنے دائرہ میں لیکر مصمم ارادہ کر لیا کہ یا تو اس کو نکال لیجائیں یا سب کے سب وہیں کھیت ہو رہیں - قریب شام کے امیر الامرا اپنے خیمہ پر پہنچا اور دوسرے روز زخموں کی وجہ سے جان بحق تسلیم ہو گیا -

دوسرے روز محمد شاہ مع نظام الملک آصف جاہ وزیر الممالک اعتماد الدولہ و عمدۃ الملک امیر خاں و موتمن الدولہ اسحق خاں و دیگر امرائے ذوالاقتدار و راجہائے نامدار اور قریب قریب ایک لاکھ فوج سوار و پیادہ کی نادر شاہ کے جنگ کے واسطے بڑھی - لیکن اتفاق سے اس روز لڑائی نہوئی، نظام الملک و اعتماد الدولہ بہادر نے یہ عرض کیا کہ برہان الملک تو قید ہو گیا اور امیر الامرا اور مظفر خاں نے شربت مرگ چکھہ لیا اور اس وقت شام بھی ہو گئی ہے - بہتر یہ ہے کہ لڑائی کے معاملہ کو کل پر رکھا جائے - چنانچہ بادشاہ نے اس صلاح کو منظور فرمایا اور فرودگاہ پر واپس آکر نہایت احتیاط کے ساتھ جا بجا مورچہ قائم کر دئیے لیکن اس معمولی سے شکست سے ہندوستانی سپاہ کے دل بیٹھہ گئے تھے اور اسی رات کو قریب قریب نصف فوج میدان کارزار سے فرار ہو گئی -

اسی سلسلہ میں برہان الملک کا واقعہ سنئے کہ جب اس نے محمد شاہ کے لشکر کی یہ حالت معلوم

کی تو نادر شاہ کو صلح پر راضی کیا کہ چند کروڑ روپیہ لیکر وہیں سے لوٹ جائے۔ محمد شاہ کو بھی یہ صلاح پسند آئی اور باوجود دیگر امرا اس امر سے اتفاق نہ کرتے تھے عمدۃ الملک امیر خاں و موتمن الدولہ اسحٰق خاں و چند خواجہ سراؤں کو ساتھ لے کر نادر شاہ کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ ناصر مرزا پسر نادر شاہ استقبال کے واسطے لشکر کے کنارہ تک آیا اور جب سواری خیمہ تک پہنچی تو خود نادر شاہ استقبال کے واسطے اوٹھے اور ایک ہی مسند پر دونوں بادشاہوں نے قیام کیا۔ نادر شاہ نے اس ملاقات کے موقع پر محمد شاہ کے ساتھ اسقدر عمدہ برتاؤ کیا کہ اوس کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور آخر الذکر نہایت شاد و فرحاں اپنے لشکر کو واپس آئے۔ اس اثنا میں لشکر شاہی میں گرانی غلہ اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ پانچ روپیہ میں ایک سیر چاول بھی میسر نہ آتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ محمد شاہ نے خلعت بخشی گری نظام الملک کو عطا کر دی۔ برہان الملک جو اس عزت کا امیدوار تھا بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوا اور مشہور ہے کہ نادر شاہ کو شاہجہاں آباد کے خزائن و دفائن کی تحریص دیکر وہاں جانے کی ترغیب دی۔ نادر شاہ نے نظام الملک کو بھی کچھ گفتگو کرنے کے بہانہ سے بلا کر قید کر لیا۔ اور آخر الذکر کے اس واقعہ کی محمد شاہ کی خدمت میں اطلاع کرا کر یہ درخواست کی کہ جہاں پناہ نادر شاہ سے دوبارہ ملاقات کر کے تمام معاملات کا فیصلہ کر لیں۔ اور حقیقتاً یہ بادشاہ کی گرفتاری کی چال تھی۔ محمد شاہ نے اپنی سادہ لوحی سے اس درخواست کو قبول کر لیا اور جب ملاقات سے واپس ہونے لگے تو نادر شاہ نے دبے لفظوں میں یہ کہا کہ وہ ایرانی لشکر میں ہی قیام کریں۔ بادشاہ کی گرفتاری سے ہندوستانی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور یہانتک بدامنی پھیل گئی کہ اکثر امرا کے خیمہ و خرگاہ اوباشوں نے لوٹ لئے مزید براں محمد شاہ کی طرف سے لشکر میں یہ اعلان کرا دیا گیا کہ فوج مطلق العنان ہے جس کا جی چاہے یہاں رہے یا شاہجہاں آباد چلا جائے۔ بادشاہ خود وہاں تشریف لاتے

لانے والے ہیں۔

چنانچہ سپاہی جوق جوق دار السلطنت کی طرف روانہ ہوگئے اور سوائے چند مخصوص امرا کے جن میں نظام الملک آصفجاہ و وزیر الممالک وعمدۃ الملک امیر خاں و اسحٰق خاں شامل تھے اور جو ایسے وقت میں پادشاہ کو چھوڑنا نمک حرامی سمجھے تھے محمد شاہ کے رکاب میں کوئی نہ رہا۔

نادرشاہ نے برہان الملک اور طہماسپ جلا تر کو جو اس کا مقدمۃ الجیش تھا شاہجہان آباد کی نظامت کا فرمان عطا کرکے روانہ کیا اور ایک شقہ دستخطی محمد شاہ بادشاہ کا الہ یار بیگ خاں قلعہ دار کے نام اس مضمون کا روانہ کیا کہ وہ قلعہ اور تمام کارخانجات کی کنجیاں بغیر پس و پیش طہماسپ خاں کے حوالہ کردے۔ الہ یار بیگ خاں جب اس رقعہ کو دیکھا تو دروازہ کھول کر طہماسپ خاں کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور اس کے حکم کے موافق دیوان خاص سے اسد برج تک نادرشاہ کی حرم سرائے کے لئے خالی کردیا اور حیات بخش باغ سے شاہ برج تک اعلیٰحضرت محمد شاہ کے خدام کے لئے مقرر کیا۔ ساتویں ذالحجہ کو محمد شاہ داخل قلعہ مبارک ہوئے اور دوسرے روز نادرشاہ لاہوری دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ برہان الملک جو اب نادرشاہ و محمد شاہ دونوں کی طرف سے وکیل مطلق تھے دفعتاً درد گردہ میں مبتلا ہو کر اوسی روز انتقال کر گئے۔

اگرچہ محمد شاہ بادشاہ اور اوس کے امرا نے کشت و خون سے بچنے کے لئے کوئی کوشش اوٹھا نہ رکھی لیکن مشیت ایزدی میں کوئی چارہ نہ تھا، جب دو روز نادرشاہ کو قلعہ میں گذر گئے تو چند کوتاہ اندیش اور خانہ برانداز وں نے یہ افواہ شہر میں اوڑادی کہ نادرشاہ کو قلعہ میں ترکی و حبشی کنیزوں نے تفنگ کے گلولے سے مار ڈالا اور اس خبر نے اسقدر شہرت پکڑی کہ بہت سے باشندگان دہلی ایرانی سپاہ کے قتل کے لئے تیار ہو گئے، چنانچہ شہر میں ایک ہنگامہ مچ گیا اور رسم عافیت یکقلم جاتی رہی اوباشان شہر نے دست تخت و تاراج دراز کیا اور قتل و غارت میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ تمام رات بان و بندوق چلتی رہیں اور رات کی تاریکی اور

دہلی کی پیچ در پیچ کوچوں میں سینکڑوں قزلباش قتل ہوئے۔

۱۱ تاریخ کی صبح کو جب یہ خبر نادرشاہ کو پہونچی تو وہ نہایت غیض و غضب میں آیا اور سُرخ لباس پہن کر سنہری مسجد میں جو کوتوالی کے قریب ہے آن بیٹھا اور قتل عام کا حکم دیدیا۔ قزلباش اور ترکمان افواج نے کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگا دیے اور کوچہ و بازاروں میں خون کی ندیاں بہادیں۔ قلعہ سے مسجد فتحپوری تک اور دہلی دروازہ سے کھاری باولی تک پچاس ہزار سے زاید آدمی قتل ہوئے، چاندنی چوک کٹرہ میوہ بازار دریبہ اور جامع مسجد کے گرد و پیش کی تمام محلّوں میں آگ لگادی اور جلاکر خاک سیاہ کردیا۔ سینکڑوں ہندوؤں نے رسم جوہر کو پھر تازہ کیا اور ہزاروں نے قزلباشوں کے جور و ستم سے بچنے کے لئے خودکشی کرلی، ایرانی سپاہ نے لوٹ مار میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا روپیہ پیسہ زر و جواہر مال و اسباب جو ہاتھ لگا سب لوٹ لیا یا تباہ و برباد کردیا۔ میر شرف الدین علی متخلص بہ پیام جو اس شورش کے زمانہ میں دہلی میں مقیم تھے اس واقعہ کو ذیل کے دو بیتوں میں خوب ظاہر کیا ہے۔ جو اس زمانہ کی شاعری کے نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

یہ کشت و خون کا ہنگامہ دوپہر تک گرم رہا اور آخر کار نظام الملک و اعتماد الدولہ نے سر برہنہ و دست بستہ نادرشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر نہایت منت و سماجت کے ساتھ رحم کی درخواست کی چنانچہ نادرشاہ نے فولاد خاں کوتوال کیساتھ چند نسقچی کردیئے اور منادی کرادی کہ ایرانی سپاہ لشکر کو لوٹ جائیں اور قتل و غارت سے باز رہیں۔ رفتہ رفتہ یہ آتش فساد منطفی ہوئی اور اہل شہر کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ اُدھر قلعہ میں قزلباشوں نے شاہی خزانہ و جواہر خانہ اور تمام کارخانجات

پر قبضہ کر لیا چند ہزار اشرفیاں اور ۶۰ لاکھ روپیہ خزانہ سے نقد نکلا اور قریب قریب ایک لاکھ روپیہ کے آلات طلائی برآمد ہوئے اور تقریباً پچاس کروڑ کے جواہرات اور دیگر اشیا جن میں کی اکثر دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھیں نادر شاہ کے ہاتھ آئیں انہیں میں شاہجہانی تخت طاؤس بھی تھا جو ایک کروڑ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ علاوہ اس کے پیلان کوہ شکوہ و اسپان نسیم خرام اور اعلیٰ اعلیٰ قسم کے کپڑے اور قیمتی اشیا کہ جن کی تفصیل ناممکن ہے داخل خزانہ نادری ہوئیں۔

غرضکہ شاہان مغلیہ کا دو برس کا اندوختہ ایک آن واحد میں ایک کی تحویل سے دوسری کی تحویل میں منتقل ہو گیا الحکم للہ والملک للہ۔ مگر یہ لاتعداد دولت بھی نادر شاہ کی آتش حرص کو نہ بجھا سکی شاہی خزانہ وغیرہ اپنے قبضہ میں کرنے کے بعد امرا کی دولت کیطرف دست ازبڑھایا چنانچہ ۳۰ لاکھ روپیہ ایک زنجیر فیل اور بیش قیمت جواہر نواب صاحب زیر الممالک سے وصول کئے اور اسی قدر یا اس سے کچھ کم و بیش نظام الملک سے چھینے۔ برہان الملک مرحوم کے تمام اثاثہ پر جو قریب قریب ایک کروڑ روپیہ کے ہوتا تھا اپنا قبضہ کیا۔ یکم محرم ۱۱۵۲ھ کو طہماسپ جلائر نے اہل شہر سے روپیہ وصول کرنے کے لئے نادر شاہ کے سامنے قزلباشوں کے نام پیش کئے لیکن محمد شاہ نے اس خیال سے کہ اہل شہر پر زیادہ جبر و تعدی ہو فرمایا کہ زرفدیہ کی تحصیل ہر دو سلطنت کے امرا اور خلق اللہ کے مواجہ میں ہونا چاہئے۔ اب شہر میں ایک اور ہی منظر نظر آنے لگا، پیادہ دستے گلی گلی اور محلہ محلہ لوگوں کو پکڑتے ہوئے اور ان کی جائداد اور اثاث البیت کی فہرست بناتے ہوئے پھرنے لگے۔ تاکہ ہر شخص سے اس کی استطاعت کے مطابق زر امان یا فدیہ وصول کیا جائے۔ شہر کا ہر صغیر و کبیر امیر و فقیر صبح ہی حاضر کیا جاتا تھا اور

کبھی شام اور کبھی ایک پہر رات گئے تک حاضر رہنے پر مجبور رہوتا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کل اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے بقول

آج آفت سے بچی جان تو کل خیر نہیں

میر وارث و خواجہ رحمۃ اللہ اور دو دیگر شخص تشخیص زر کے واسطے متعین ہوئے تھے اُنھوں نے اہل شہر کی تباہی کا بیڑا اٹھا رکھا تھا بغیر تحقیق و تدقیق جو جس پر چاہا لگا دیا آخر کار فہرست مکمل ہوئی اور دو کروڑ روپیہ میزان آئی۔ مگر نادر شاہ کے کان میں ان کی زیادتی کی بھنک پہنچ گئی تھی اور اُس نے رحم کھا کر روپیہ کی تحصیل کا کام نواب نظام الملک بہادر و نواب وزیر الممالک بہادر و عظیم اللہ خاں بہادر و مبارز الملک بہادر و مرتضیٰ خاں بہادر کو تفویض کیا چنانچہ شہر کو پانچ حصّوں پر تقسیم کیا گیا اور ہر حصّہ کے محلہ و باشندوں کے نام اور تعداد روپیہ لکھ کر پانچوں امراء میں سے ہر ایک کو تقسیم کر دیا گیا۔ نظام الملک و وزیر الممالک نے نہایت نرمی سے روپیہ کی تحصیل کی بلکہ وزیر الممالک نے تو ایک رقم کثیر رعایا کی طرف سے خود داخل کر دی مگر دیگر امراء خصوصاً مبارز الملک نے تحصیل وصول میں وہ ظلم و تعدی برتی کہ الامان و الحفیظ۔ سینکڑوں خاندان تباہ ہو گئے اور اکثر نے خود کشی کر کے اپنے تئیں مصیبت سے نجات حاصل کی۔ آنند رام مخلص جس کے تذکرہ سے اس مضمون کے لئے بیشتر مواد اخذ کیا گیا ہے اپنی کیفیت نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے وہ تحریر کرتا ہے کہ میرے اور میرے چچا زاد بھائیوں پر پانچ لاکھ روپیہ تجویز کیا گیا تھا مگر اُس کے بعد دو لاکھ روپیہ کی تخفیف ہو گئی باقی ماندہ تین لاکھ روپیہ کی وصولیابی میں یہ سختی برتی گئی کہ اُس کے مکان پر چوکی پہرہ بٹھا دیا گیا اور کل اثاثۃ البیت پر قبضہ کر لیا گیا اور اُس کے اکثر نوکروں کو کاٹھ میں کس دیا اگر اُس کا تعلق شاہی دربار سے نہ ہوتا تو غالباً اُس کی خود ذات بھی

محصلین کے دست ظلم سے محفوظ نہ رہتی۔

غرضکہ رعایا سے بھی زر فدیہ وصول ہوا اور نادر شاہ نے اپنے بیٹے ناصر مرزا کی شادی خاندان مغلیہ کے ایک شہزادی سے کر کے ایران کو معاودت کی۔ لوٹ کے روپیہ کا اندازہ جو وہ ہندوستان سے لے گیا مختلف طور پر کیا جاتا ہے یعنی ۴۰ کروڑ ۶۰ کروڑ و ۸۰ کروڑ۔ العلم عند اللہ۔

نیرنگ جمال

حضرت شوق قدوائی (مرحوم) کی وہ معرکۃ الآرا نظم ہے جس کی نظیر زبان اردو میں نہیں ملتی۔ اس افسانہ کا ہر جزو شاعرانہ جدتوں اور نازک خیالیوں سے پاکیزہ بنا ہوا ہے۔ نو عمری کے حقیقی جذبات اور حسن و عشق کی نیرنگیوں کا یہ ایک ایسا فطری نقشہ ہے کہ طبیعت مسحور ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کی سلیس اور مستند زبان کا بہترین نمونہ ہے قیمت چار آنہ (۴؍) علاوہ محصول ڈاک۔

(یا چھ آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ ہو گی)

پتہ

مطبع یوسفی۔ فرنگی محل۔ لکھنؤ

ہوں راہ رو جادۂ تسلیم و رضا میں

(از جناب محمد حاذق صاحب ایم۔اے ال۔ال۔بی۔ حاذقؔ)

ہوں راہرو جادۂ تسلیم و رضا میں ہر حال میں کرتا ہوں ترا شکر ادا میں

میں اور کروں شکوۂ بیمہری قاتل جیتا ہوں اسے دیکھ کے سرگرم جفا میں

دیکھے کوئی وارفتگی شوق کا عالم جو تیر خطا ہوتے ہیں لیتا ہوں اٹھا میں

دیکھا انہیں بے پردہ یہ آنکھوں کی خطا تھی اور جرم میں پکڑا گیا ناکردہ خطا میں

اللہ رے تاثیر محبت کے کرشمے، پابند جفا تم ہوئے پابند وفا میں

وہ اور بھی کچھ ہو گئے خودبین و خود آرا کس درجہ پشیمان ہوا کرکے وفا میں

ہوتی ہیں عطاؤں پہ عطا تیری طرف سے ہر چند کہ کرتا ہوں خطاؤں پہ خطا میں

وہ پوچھتے تھے کون ہی جانباز محبت شامت جو مری آئی تو "میں بول اٹھا میں"

کیا بھول گئے تم نے جو حاذق سے کہا تھا

آئے مرے آگے جو کروں تم سے دغا میں

عہدِ اکبری کے معاشرتی حالات

عہد اکبر کے معاشرتی حالات پر قلم اُٹھانے کے لئے ہم کو مجبوراً پُرانی تاریخوں اور سفرناموں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے اور تاسف محسوس کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے قدیم مورخین نے صرف اُن باتوں پر قلم اُٹھایا ہے جن سے خود اُن کو دلچسپی تھی۔ اُمرا کے شاندار محلات - فیاضیاں ۔فضول خرچیاں ۔ دسترخوان ۔ لباس ۔ انعام وغیرہ وغیرہ کے تذکرے تو بہت موجود ہیں لیکن متوسط طبقوں اور غربا کا کہیں ذکر نہیں ہے ۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے مکانات غریبانہ مہانداریاں - پھٹے پورانے کپڑے ۔ اور جوار باجرے کی روٹیاں عہد مغلیہ کے پُر تمکنت مورخین کے قلم کو اپنی طرف نہ کھینچ سکیں۔ مجبوراً ہم کو بھی بُرو سار کے حالات پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے اور اُن کے متعلق واقعات پڑ بکر غربا کی بھی دھندلی تصویر کھینچ سکتے ہیں مگر ایسی تصویر تاریخی حیثیت سے قابل وقعت نہیں ہو سکتی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عہد اکبری میں فارغ البالی اور آرام و آسایش کی دریا لہریں مارتا تھا اور بقول حضرت حالی مرحوم۔

کہ راجہ سے پرجا تلک سب سُکھی تھے

مگر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امرا کے عیش و عشرت اور دربار کی چہل پہل کو چھوڑ کر تمام ملک عسرت اور افلاس میں گرفتار رہتا۔ علم عام نہ تھا۔ صنعت و حرفت کی قدردانی ضرور تھی مگر وہ خوش نصیب اور خوشحال امرا کے لئے کام کی چیزیں تھیں مطمح نظر وسیع نہ تھا اور اگر درباروں میں جشن و شادیاں رہتی تھیں تو آئے دن خون خرابے ہوتے تھے، سڑکیں اور گلیاں خون کے فواروں سے لال ہو جاتی تھیں اور بغاوتوں کے جھنڈے بلند ہو کر نت نئے میدان گرم رہتے

تھے۔ بہرکیف اس قدر تمہید کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد اکبری کے معاشرتی حالات کا
مختصراً ذکر کیا جائے۔

عہد اکبری کے امراء

عہد اکبری میں بنک موجود نہ تھے۔ روپیہ گھروں میں رہتا تھا یا سوداگروں و سیٹھ ساہوکاروں کے
پاس رکھوا دیا جاتا تھا۔ امراء کو تجارت کی طرف رغبت نہ تھی اکبر کے خاندان کے شاہزادوں نے
تجارت شروع کی تھی بلکہ خود شہنشاہ کی ماں نے بیانہ سے نیل خرید کر کے ۱۶۱۱ء میں موچا بھیجا تھا
شاہزادوں کے دیکھا دیکھی امراء میں بھی اس کے چرچے ہوئے اور تجارت کی طرف کچھ توجہ ہوئی
عام رغبت اسراف کی طرف تھی دولت جمع کرنے کا شوق کم تھا۔ شہنشاہی طمطراق سے متاثر
ہو کر امراء اور درباری بھی فضول خرچیوں اور شان و شوکت کا شکار ہو رہے تھے۔

چونکہ ملکی صنعت و حرفت زیادہ منافع کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ہندوستان کے
سوداگر بڑے نہ تھے۔ امراء غیر ممالک کے صنعت و حرفت پر جان دیتے تھے غیر ملکی تجار خوش
حال اور فارغ البال تھے۔ برف اور میوہ جات کا بہت استعمال تھا۔ ابوالفضل نے برف
سازی کی مفصل ترکیب لکھی ہے۔ غرباء گرمیوں میں اور امراء کے یہاں بارہوں مہینہ برف
استعمال ہوتی تھی،

بابر میوہ جات کی شناخت میں ماہر تھا۔ اکبر کے پھل خاص طور پر نجی انتظام سے پیدا کئے
جاتے تھے اور جہانگیر کا یہ حال تھا کہ خوشرنگ اور لذیذ ذائقے کے میووں کی ٹوکریاں دیکھکر
خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ دور دور مقامات سے پودے آتے تھے اور ترکیبوں کے
ساتھ اُن کو ہندوستان کی آب و ہوا کا عادی بنایا جاتا تھا اکبر کے لئے بدخشاں سے خربزے

ہتے تھے جن کی قیمت [illegible] فیصدی ہوتی تھی آجکل کے حساب سے [illegible] ہوتے ہیں۔ دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے چنے جاتے تھے اور ملک ملک سے تلاش کرکے باورچی بلائے جاتے تھے۔ ہر امیر حوصلے کے مطابق اپنے دسترخوان کو چنتا تھا، لباس کا بھی یہی حال تھا۔ بہترین قسم کے کپڑوں کے خوش وضع لباس تیار ہوتے تھے۔ فیضی کا خیال ہے کہ اکبر کو غذا سے زیادہ کپڑوں کی طرف رغبت تھی۔ اکبر نے مختلف قسم کی اختراعات کی تھیں اور طرح طرح کے نام دیئے تھے۔ اور ہر سال ایکہزار جوڑے تیار کراتا تھا۔ ابوالفضل سال کے آخر میں اپنے سب کپڑے ملازمین میں تقسیم کر دیتا تھا۔ آئین اکبری میں کپڑوں کی قیمتیں دی ہوئی ہیں، غیر ملکی کپڑے کی مانگ زیادہ تھی۔ سوتی کپڑے کے تھان [illegible]۔ اونی [illegible] اور ریشمی [illegible] تک کے ملتے تھے۔ کڑھی ہوئی مخمل اور زربفت کے تھان [illegible] سے لیکر [illegible] تک میں ملتے تھے۔ ایک تھان میں پورا لباس تیار ہوتا تھا۔ کپڑے پہننے میں شان امتیاز قائم رکھنے کی کوشش کیجاتی تھی۔ جواہرات بکثرت استعمال ہوتے تھے۔ اور بیش قیمت جواہرات کی مانگ رہتی تھی۔

جواہرات کے بعد اصطبل کا نمبر تھا۔ عزت و وقار کی زندگی کے واسطے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا رکھنا لازمی تھا۔ اور اس مد میں اخراجات کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک لاکھ روپیہ سے لیکر [illegible] تک کا ہاتھی ملتا تھا۔ اور شرفا کی سواری کے واسطے [illegible] سے [illegible] تک کی قیمت کے گھوڑے خریدے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ چارہ اور غلہ ضرور سستا تھا۔

ہاتھی کی زنجیریں لوہے۔ چاندی اور سونے کی بنتی تھیں۔ غرض کہ اس مد میں اخراجات کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔

کھیل اور شرطوں میں بڑی بڑی رقمیں خرچ ہوتی تھی اور عہد اکبری میں یہ باتیں شان امارت میں شمار ہوتی تھیں۔

مکانوں کی تزئین و آراستگی میں درباریوں کو زیادہ سر نہیں مارنا پڑتا تھا کیونکہ دربار کسی مقام پر مستقلاً نہیں رہتا تھا۔

شامیانے۔ ڈیرے۔ تمبو وضع قطع کے بنائے جاتے تھے اور اُن کی زیبائش اور تیاری میں جی کھول روپیہ صرف ہوتا تھا۔ مخمل اور زربفت کے شامیانے بھی ہوتے تھے جن میں ریشمی پردے پڑے رہتے تھے۔ قالین۔ تخت۔ آئینہ وغیرہ وغیرہ بھی مختلف قسموں کے استعمال ہوتے تھے۔

خانگی ملازموں کی تعداد کثیر ہوتی تھی۔ اُورامرا کے یہاں ان کی تعداد سینکڑوں کی ہوا کرتی تھی۔ ایک ہاتھی کے واسطے چار۔ گھوڑے کے لئے دو یا تین ملازم ضروری تھے۔ باورچیخانہ اور ڈیرے لگانے والوں کی تعداد دوگنی رکھنی پڑتی تھی تاکہ کوچ سے پہلے خیمہ نصب ہوجائیں اور کھانا تیار ملے اور دوسرا دستہ پس ماندہ خیموں کو اُکھاڑدے اور اگلے پڑاؤ پر پہنچ کر خیمہ زن ہوجائے۔

شہنشاہ کو بکثرت تحفے تحائف دیے جاتے تھے اور آداب دربارداری میں داخل تھے۔ ہر امیر اپنے حوصلہ کے مطابق روپیہ صرف کرتا تھا۔ رشوت کی بھی گرم بازاری تھی۔ تحفہ جات کھلم کھلا دیئے جاتے تھے اور بسا اوقات تزک و احتشام سے دربار تک پہنچائے جاتے تھے، بڑے آدمیوں کے پاس بغیر تحفہ لئے ہوئے چھوٹوں کا گذر نہیں تھا۔ اور ذاتی ترقیوں اور کامیابیوں کا ذریعہ مانا جاتا تھا۔ ملازمتوں اور عہدوں کے لئے سخت مقابلہ تھا۔ تحفہ جات کی گرانقدری یا کم مائیگی کامیابی اور ناکامیابی کا راز تھی، نتیجہ یہ تھا کہ امرا کی اندرونی حالتیں قابلِ رحم تھیں۔ صرف چند امرا دربار فارغ البال تھے۔ ورنہ ہر امیر قرضہ میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا ناگوار اثر غربا پر پڑتا تھا تنخواہیں دیر سے ادا ہوتی تھیں۔ صناع ایڑیاں رگڑکر

نیتیں وصول کر پاتے تھے۔ شاعر قصیدے خوانی کے بعد مہینوں ڈیوڑھی کی خاک چھان کر صلے
پاتے تھے۔

اُمرا کی وفات پر اُن کی جائداد اور اُن کے مال و دولت کا وارث شاہنشاہ ہوتا تھا۔ اس لئے
اکثر اُمرا اپنی دولت کو اپنی زندگی میں لُٹاتے تھے اور عجیب عجیب ترکیبوں سے اس شدید قانون
کی ضد سے بچنے کی فکریں کرتے تھے۔ بقول بدایونی راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی کی شادی
میں گھوڑوں کی کئی قطاریں۔ ایک سو ہاتھی، حبش۔ ہندوستان اور سرکیشیا کے غلام اور انواع
و اقسام کے جواہرات جڑا ہوا مال۔ اور سونے چاندی کے برتن اور بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں دے
ڈالیں۔ اسی خیال سے باغات، عمارات، مقبرہ جات میں زر کثیر لگایا جاتا تھا۔

اکثر اُمرا اپنی دولت سمیٹ کر ایران یا کابل، حج بیت اللہ کو چلے جاتے تھے شاہی
فرمان کی رو سے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔ ایسے رؤسا کم تھے جو خزانہ سرکاری کے
واسطے بڑی بڑی رقمیں چھوڑتے۔ عموماً اپنی زندگیوں میں خورد بُرد کر ڈالتے تھے اور اسقدر
قرضہ چھوڑ مرتے تھے کہ اُن کی عالیشان عمارتیں اور اُن کے ساز سامان سے قرضہ کی ادائیگی
ممکن نہیں ہوتی تھی۔

عہد اکبری کے متوسط طبقہ

عہد اکبری میں متوسط طبقہ محدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورانی کتابیں اُن کے بارے میں
خاموش ہیں۔ زیادہ تر یہ طبقہ ملازمت پیشہ تھا جو دربار کی ملازمتوں اور دیگر خدمات پر مامور
تھا۔ ان کی تنخواہیں معمولی تھیں۔ غذا کی ارزانی ان کی کفالت کرتی تھی تاجروں کا شمار بھی
اسی طبقہ میں ہونا چاہیے۔ ان میں بعض متمول بھی تھے۔ لیکن چلن سے رہتے تھے۔ سوداگر و

کے لئے شان و شوکت کی زندگی بسر کرنا خطرناک تھا ۔ کیونکہ علاوہ رؤسا کی ناراضگی کے قرضہ کی وصولیابی میں دقتیں پیدا ہو جاتی تھیں ۔ البتہ کالی کٹ کے سوداگر خوش پوش تھے ۔ بڑے بڑے مکانات بناتے تھے ۔ کثیر تعداد میں ملازم رکھتے تھے اور عیش و عشرت کی زندگیاں بسر کرتے تھے ۔ راندیر کے مسلمان سوداگروں کا بھی یہی حال تھا ، سورت میں بھی یہی کیفیت تھی تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ نسبتاً زیادہ آباد تھے ۔ اور آرام سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے کیونکہ بندرگاہوں کی تجارت ملکی تجارت سے مختلف تھی جہاں ہر وقت رؤسا کا سامنا اور دربار کا خوف گلوگیر رہتا تھا ۔

عہد اکبری کے غربا

اس طبقہ میں مزدور ، کسان ، دستکار ، اور مزدور شامل تھے ، ان کی طرز زندگی کا حال کسی کتاب میں درج نہیں ہے کہیں کہیں کسی واقعہ کی جھلک نظر آجاتی ہے ۔ وہی ہمارے قلم کو جولان کرنے میں معاون ہوئی ہے ، اس قسم کی جھلک صرف غیر ملکی سیاحوں کی تحریرات میں کبھی کبھی نظر آجاتی ہے ۔ قحط کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غربا کی عسرت کا یہ حال تھا کہ بچوں کو فروخت کر ڈالتے تھے اور خود غلام بن کر بک جاتے تھے ۔ پیداوار انکی زندگی کا سہارا تھی ۔ قحط کے زمانہ میں بعض مقامات پر آدم خوری کی وارداتیں بھی ظہور میں آتی تھیں ۔ بدایونی نے آگرہ اور دہلی کے بھی ایسے واقعات درج کئے ہیں ۔ یہ تو قحط کے ہولناک حالات ہیں جن سے ہندوستان اکثر متاثر ہوتا رہا ہے ان سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ عوام کی عسرت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو قحط کی بلا سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے ارزانی کے زمانہ میں بھی غربا کی حالت قابل اطمینان نہ تھی ان کے مکان جھونپڑیوں سے

بڑے نہ ہوتے تھے ۔ طرز زندگی نہایت غلیظ ۔ ضروریات زندگی تقریباً مفقود ۔ اور غذا تک خراب ملتی تھی ۔ اس حالت میں امرا کی دست ظلم سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتے تھے ۔ گوامیں ہندوستانیوں کے افلاس کی بابت ایک مصنف لکھتا ہے کہ " وہ اسقدر غریب ہیں کہ ایک پیسہ کے لئے چابک سے پٹنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور اس قدر قلیل غذا کھاتے ہیں کہ ان کے زندہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے " عہد اکبری میں ایک یوروپین مورخ کا بیان ہے کہ " آگرہ اور لاہور کے درمیان آبادی کی کثرت ہے اور کچھ مالدار لوگ بھی آباد ہیں لیکن زیادہ تر غریب لوگ ہیں جو ننگے پھرتے ہیں " (ہمارا خیال ہے کہ لنگوٹی اور دھوتی کو قابل مورخ نے تن پوشی کے لئے کافی خیال نہیں کیا ۔ سترھویں صدی میں ہندوستانی ہرگز ننگے نہیں پھرتے تھے ۔)

ایک دوسرا مورخ (یوروپین) لکھتا ہے کہ " عوام کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ ان کو قلیل مزدوری ملتی ہے دن بھر کام کرتے ہیں اور صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں ۔ مکان تنگ و تاریک ہیں جاڑوں میں بدن ڈھانکنے کا بھی سہارا نہیں ہے "

اس قسم کی شہادتیں اکثر کتابوں میں موجود ہیں جو ہم کو کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچاتی ہیں ۔ اور نہ ہم ان بیانات کی بنا پر عہد اکبری کے اور زمانہ موجودہ کے غربا کا صحیح طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ غالباً یکساں حالت رہی ۔ اور جب سے ابتک یہاں کی عام خلقت نے کوئی خاص ترقی نہیں کی ۔ یہ تحقیق دلچسپ ہے اور ایک یوروپین دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ ہم خوش ہونگے اگر "شمع" کے محترم قارئین اس مبحث پر قلم اٹھائیں گے اور تحقیق کی روشنی میں یوروپین کوتہ نظری ۔ کم واقفیتی یا تعصب کو ظاہر فرمائیں گے ۔ امید کہ احباب مکرم ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے ۔

(ماخوذ از مورلینڈ)

حسن عابد جعفری ایڈیٹر "شمع"

انتشار

(از جناب مجنوں صاحب گورکھپوری)

نمبر ۱

ہر امید ناروا سعیِ چارہ گر فضول! بے اثر دعائے شب گریۂ سحر فضول!

ہر نفس وبال تھا زندگی سے تنگ تھی کمسنی کی عمر میں زیست وجہ ننگ تھی
محوِ خواب ہو گئی جا کے عیش باغ میں جائے کوئی کس طرف اب ترے سراغ میں
ماں کی حسرتوں کا خون دل ہی دل میں کر گئی یوں نگاہ پھیر کر آہ تو کدھر گئی!!
محوِ ناز ہے کہاں ماں کی گود چھوڑ کر؟ بے نیاز ہے کہاں سب لگاؤ توڑ کر؟

جذب ہو کے رہ گئی منبعِ حیات میں روح بنکے مل گئی روحِ کائنات میں
عالمِ مثال میں اک خیال بن گئی عالمِ صُور سے دور بے مثال بن گئی

لکھنؤ کی یاد میں سر کو دھن کے کیا کیا! میں نے تیرے کھوج میں تنکے چُنکے کیا کیا!
ہوک اُٹھکے رہ گئی کچھ اثر نہ ہو سکا زندگی کے ہوش سے بے خبر نہ ہو سکا

بے حیا تھی زندگی جی رہا ہوں کیا کروں! خون ہو رہا ہے دل پی رہا ہوں کیا کروں!
جاگنا محال تھا اس جہاں کے خواب سے! ورنہ تجھ کو مانگتا جا کے ماہتاب سے!

— — — — — — — — — —

— — — — — — — — — —

شہر خموشاں

نمبر ۲

غفلتِ امیدِ فردا ہے کہ محوِ دوش ہو خفتگانِ خاک بولو کس لئے خاموش ہو؟
تھے کبھی دنیا میں تم بھی سرگرانِ زندگی! بھول بیٹھے آج ساری داستانِ زندگی!
زندگی قائم تھی جن سے وہ شرارے کیا ہوئے؟ منتشر ہو کر تمہارے برق پارے کیا ہوئے؟
چشمۂ فیضانِ فطرت ہر طرف جاری رہا بے حسی کا اک سماں پھر بھی یہاں طاری رہا!
بے خبر یوں ہو کے سونے کی جگہ دنیا نہیں یعنے تم کو یہ جمودِ ناروا زیبا نہیں
کارزارِ دہر میں آمادۂ پیکار ہو اے عدم کے سونے والو خواب سے بیدار ہو
حسن ہے بیتاب اپنی خودنمائی کیلئے عشق پھر تیار ہے آتش نوائی کیلئے
پھول بن جاؤ رگوں میں پھر لہو پیدا کرو اس گلستانِ جہاں میں رنگ و بو پیدا کرو
سازِ برگِ بوستاں کو یا جلا کے کرو خاک نعرہ زن ہو جاؤ بن کر عندلیب سینہ چاک

یا کسی کی چشمِ میگوں یا کسی کا دل بنو،
خاک کے ذرو تڑپ کر پھر کسی قابل بنو،

....

عہد مغل میں شاہی محلات کے حالات

منوچی کی زبانی

مترجمہ

(جناب نواب سید مظفر علی خاں صاحب۔ خان بہادر۔ رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر)

اکثر اہل یورپ یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کے اور بادشاہوں کی شان و شوکت اُن کے بادشاہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً فرانس اور اسپین کے بادشاہوں کو جو بات حاصل ہے اور کسی بادشاہ کو حاصل نہیں۔ لیکن شاہ چین کے سوا جس کے حالات سُن کر معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت با قوت ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ سلطنت مغلیہ میں امرا اور خصوصاً سلاطین ایسے تزک و احتشام کے ساتھ رہتے ہیں کہ دربار یورپ کی زرق برق اُن کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

شاہی محلات کے رسم و رواج اور طریق بود و باش

معمولاً محل میں مختلف نسلوں کی دو ہزار عورتیں رہتی ہیں جن میں سے ہر ایک کے ذمہ خود بادشاہ یا بیگمات، اُس کی دختروں یا مدخولہ عورتوں کی خدمات ہوتی ہیں۔ ان مدخولہ عورتوں کے انتظام کے لئے ان کے کمرے مخصوص ہیں اور ہر ایک کے یہاں ایک داروغہ عورت مقرر ہے۔ علاوہ اس کے ہر ایک کے پاس بارہ بارہ کنیزیں مقرر ہیں جو مذکورہ بالا عورات سے منتخب کیجاتی ہیں۔

داروغہ کی تنخواہ عموماً تین سو۔ چارسو۔ پانسو روپیہ ماہوار اس کے رتبہ اور جگہ کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے۔ جو کنیزیں اُن کی ماتحت ہوتی ہیں وہ پچاس روپیہ سے لیکر دو سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتی ہیں۔ علاوہ ان کے کچھ گانے والی عورتیں اور ایک ان کی افسر ہوتی ہے انکی بھی تنخواہیں کم وبیش اسی قدر ہوتی ہیں۔ انعامات جو انہیں بیگمات اور شہزادیوں سے ملتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں جن کا ذکر آیندہ ہوگا۔ کچھ عورتیں ایسی ہیں جو شاہزادیوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ ان کو عاشقانہ فقرے بطور املا لکھایا کرتی ہیں یا انہیں گلستان و بوستان مصنفہ شیخ سعدی شیرازی پڑھاتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور عشقیہ افسانے پڑھائے جاتے ہیں جو ایسے ہی ہیں جیسے ہمارے یہاں قصّے ہوتے ہیں مگر یہ اُن سے زیادہ مخرب اخلاق ہیں۔

جس طریقہ سے یہ عورتیں محل میں بادشاہ کے ہمراہ رہتی ہیں اوس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے کیونکہ جو عہدہ دار باہر ہوتے ہیں بعینہٖ وہی محل میں عورتیں عہدہ دار ہوتی ہیں۔ جب بادشاہ محل میں ہوتا ہے تو انہیں اندرونی عہدہ داروں کی معرفت احکام باہر آتے ہیں۔ جو عورتیں ان عہدوں پر مقرر کی جاتی ہیں اونکا ہوشیاری سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت صاحب عقل و فہم ہوتی ہیں اور جو کچھ سلطنت میں ہو رہا ہے اس سے بخوبی واقف کی جاتی ہیں۔ کیونکہ بیرونی عہدہ دار وہ تمام اطلاعیں ان کے پاس روانہ کرتے ہیں جن کا جاننا بادشاہ کو ضرور ہے۔ عورت عہدہ دار حسب ہدایت بادشاہ جواب لکھکر اس بیرونی افسر کے پاس روانہ کردیتی ہے۔ خواجہ سرا مقرر ہیں جو سربمہر لفافے ادہر سے ادہر لیجاتے ہیں۔

سلطنت مغلیہ میں یہ بھی مقررہ قاعدہ ہے کہ واقعہ نویس و خفیہ نویس ہفتہ میں ایک مرتبہ

تمام مشہور واقعات کی اطلاع ان اندرونی عہدہ داروں کے پاس روانہ کرتے ہیں - یہ محل میں نو بجے شب کو بادشاہ کی حضور میں پیش ہو کر پڑھی جاتی ہیں تاکہ اس ذریعہ سے بادشاہ کو ان واقعات کی اطلاع رہے جو سلطنت میں درپیش ہیں - ان کے علاوہ جاسوس بھی مقرر ہیں جو ہفتہ وار دیگر واقعات اور باتوں کی اطلاعیں ارسال کرتے ہیں - خصوصاً اس کی کہ شہزادیاں کیا کر رہی ہیں - ان تمام باتوں کی وہ تحریری اطلاع روانہ کرتے ہیں۔

بادشاہ بلاناغہ نصف شب تک ایسے ہی کاموں میں مصروف رہتا ہے وہ صرف تین گھنٹہ سونے کے بعد بیدار ہو کر معمولی نماز ادا کرتا ہے ایک سال بادشاہ چالیس روز تک اعتکاف میں بیٹھتا ہے - اس زمانہ میں وہ زمین پر سوتا ہے - روزہ رکھتا ہے خیرات تقسیم کرتا ہے - تاکہ خداوند عالم اُسے فتوحات اور اس کے ارادوں میں کامیابی عنایت فرمائے - لیکن بالفعل بوجہ ضعیفی اور نیز اس لئے کہ دشمن اس کے ہر کام میں مزاحم ہوتے ہیں بادشاہ اکثر آرام کرتا ہے - لیکن تاہم وہ اسپر بھی صبح کو تمام معاملات پر غور کرکے احکام جاری کرتا ہے کہ معاملات حاضرہ میں کیا کارروائی کرنی چاہیے۔

بادشاہ تین گھنٹہ سوتا ہے - سونے کے وقت کنیزیں پہرہ دیتی ہیں جو نہایت بہادر اور تیر و کمان و دیگر اسلحہ کے ہنر سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔

ایک ہزار روپیہ روزانہ شاہی باورچی خانہ کا خرچ ہے اور اس کے متعلق تمام اشیا کا انتظام کرنے کے لئے عہدہ دار مقرر ہیں - چینی کی رکابیوں میں جن کی طلائی بیٹھکیں ہوتی ہیں کھانا بادشاہ کے روبرو چنا جاتا ہے - بادشاہ اظہار نوازش کے طور پر ان کھانوں میں سے ...... ملکہ - شہزادیوں - یا سرداران فوج کو بھیجتا ہے - اس عزت کی مناسب قیمت ادا کی جاتی ہے کیونکہ جو خواجہ سرا یہ کھانا لے کر جاتا ہے اُسے خوب

انعام دیا جاتا ہے۔ جب بادشاہ دشمن کے ملک میں ہوتا ہے جہاں سامان رسد کم ہوتا ہے، تو اخراجات کی طرف سے بے پروائی کیجاتی ہے۔ کھانوں کی متعدد مقررہ اقسام تیار کیجاتی ہیں ایسا ہی حالت کوچ میں اخراجات کا کچھہ انتظام نہیں رہتا۔ لیکن محل میں ملکہ بیگمات اور دیگر عورتوں کو زاید رقم بطور بھتّہ دی جاتی ہے۔

میں نے اُن خطابوں اور خطابات کے لکھنے کا وعدہ کیا تھا جو سلاطین مغلیہ محل میں ملکہ۔ شہزادیوں۔ اپنی مدخولہ عورتوں۔ داروغہ۔ گائنوں۔ رقاصوں۔ کنیزوں، کو دیتے ہیں اب میں اونہیں لکھنا شروع کرتا ہوں[۵]۔

خاص خاص خطابات جو ملکہ اور شہزادیوں کو دئیے جاتے ہیں

تاج محل، نور محل۔ نور جہاں۔ فرزانہ بیگم۔ اکبرآبادی بیگم۔ اورنگ آبادی بیگم۔ نواب بائی جی۔ اودے پوری بیگم۔ کیسر۔ چتردتی۔ جانی بیگم۔ ماہ خانم۔ شاہ خانم۔ فرخندہ خانم۔ پُرانوار بیگم۔ عقیلہ بیگم۔ فاضلہ بیگم۔ شادماں خانم۔ نورالنسا خانم۔ نفیسہ خانم۔ دردانہ بیگم۔ نادرہ بیگم۔ جہان آرا بیگم۔ بیگم صاحبہ۔ روشن آرا بیگم۔

ملکہ اور شہزادیوں کے خطابات کے ساتھہ بیگم اور خانم ہوتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ شاہی خاندان سے ہیں۔ جب یہ ہاتھیوں پر سفر کرتی ہیں تو ہاتھی خیمہ کے دروازہ

---

[۵] اوپر جو نام لکھے ہیں مصنف نے ہر ایک نام کا ترجمہ بھی لکھا ہے اور مترجم انگریزی نے بھی ایسا ہی کیا ہے مگر میں نے اردو خواں حضرات کے لئے غیر ضروری خیال کرکے ترک کردیا۔ اور اکثر ناموں کے ترجمے بالکل غلط بھی کئے گئے تھے۔ ۱۲

تک لیجائے جاتے ہیں۔ فیلبان کا چہرہ موٹے اور عف کپڑے سے ڈھک دیا جاتا ہے
تاکہ وہ انہیں نہ دیکھہ سکے۔

مدخولہ عورتوں کے نام اور خطابات

بادام چشم۔ نازکبدن۔ مطلوب۔ سُکھہ دھن۔ سنگار۔ پیار۔ مہان۔

تمام خطابات اور نام فارسی ہوتے ہیں یا ہندی۔ کیونکہ شاہی محل میں چند ہندو راجاؤں کی بھی لڑکیاں ہیں اونہیں ہندی اور مسلمان عورتوں کو فارسی خطابات دیے جاتے ہیں۔ سلاطین اور مغلیہ شہزادوں کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ ان داروغہ عورتوں اور اُن خواجہ سراؤں کی بہت مدارات کرتے ہیں جوان بوڑھی عورتوں کو کسی خوبصورت عورت کی موجود گی کی اطلاع کرتے ہیں۔ لہٰذا داروغہ وعدوں کے ذریعہ سے یا دھوکا دیکر عورت مذکور کو بھگا لاتی ہے اور جس جگہ یا محل میں بادشاہ یا شہزادہ کا حکم ہوتا ہے وہاں پہونچا دیتی ہے اور وہاں وہ مدخولہ عورتوں میں شامل ہوجاتی ہے۔ جیسا میں نے پہلی جلد میں بسلسلہ حالات جہانگیر و شاہجہان بیان کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ ان عورتوں کو رکھنا نہیں چاہتا تو قیمتی تحائف دیکر انہیں رخصت کر دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ ذکر اس لئے کیا کہ مجھے ان تمام رازوں سے واقفیت ہے جن کا بیان کرنا میرے لئے ضروری ہے۔

داروغہ عورتوں کے نام

نیاز بی بی بانو۔ فہیم بانو۔ فلکی بانو۔ قادر بی بی بانو۔ نوشابہ بانو۔ گل سلطان بانو۔ دلبجو بانو۔ سیمتن بانو۔ دھرنگا بانو۔ نول بائی بانو۔ چترائی بانو۔ لال بائی بانو۔ ہیرا بائی بانو۔

مانک بانو - ماہ پیکر۔

ان داروغہ عورتوں کی کثیر تعداد ہے لیکن میں نے بہ نظر اختصار اُن کے چند نام لکھے ہیں جو تمام محل کا اختیار رکھتی ہیں۔ اور یہی مینے رقاصہ اور گانے والی عورتوں کی نسبت کیا ہے۔

اورنگ زیب نے باوجودیکہ موسیقی کی ممانعت کردی تھی تاہم اُس کی بیگمات اور دختروں کی دلبستگی کے لئے ایسی چند عورتیں ملازم تھیں۔ اور اُن کے افسروں کو خاص خاص خطاب بھی دیے گئے تھے۔ جو یہ ہیں۔

سندر بائی - سرد بائی - چھلا بائی - مرگ نین - لال بائی - ہیرا بائی - نینا بائی - جالیا بائی - راس بائی -

نین جوت بائی - مطلب بائی - اکاس بائی - اپسرا بائی - خال وار بائی - بیکنیٹھ بائی - خوشحال بائی - نہال بائی - فرخ بائی - گلال بائی - کستوری بائی - کار ثواب بائی - بسنا بائی - ادر بائی - کیسر بائی -

مذکورہ بالا نام اکثر ہندوؤں کے ہیں اور معمولاً یہ عورتیں نسلاً ہندو ہوتی ہیں جو حالت شیر خوارگی میں مختلف دیہات سے لائی جاتی ہیں اور یا اُن راجوں کے خاندانوں سے لی جاتی ہیں جو بغاوت کرتے ہیں۔ باوجود ہندی نام ہونے کے وہ مذہباً مسلمان ہوتی ہیں۔ ہر ایسی عورت کے ماتحت تقریباً دس عورتیں ہوتی ہیں اور وہ ان عورتوں کے ہمراہ ملکہ شہزادیوں مدخولہ عورتوں کی خدمات میں حاضر ہوتی ہیں۔ ہر ایک داروغہ ارباب نشاط کا اُس کے رتبہ کے موافق ایک درجہ ہوتا ہے۔ ملکہ اور شہزادیاں اپنے اپنے کمروں میں ان گانے والی عورتوں سے اپنا دل بہلاتی ہیں۔ ان کو کسی جگہ گانے کی اجازت نہیں ہے سوائے اُس جگہ کے جہاں سے یہ متعلق ہیں۔ البتہ بڑی تقریبات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جن میں یہ سب مل کر اُس تقریب سے متعلق کوئی چیز گاتی ہیں۔ یہ تمام عورتیں خوبصورت و خوش وضع ہوتی ہیں۔ یہ مستانہ چال

سے چلبتی اور آزادی سے فحش گفتگو کرتی ہیں۔ اپنے فرائض کے علاوہ یہ بدکاری میں بسر کرتی ہیں۔ ہندی زبان میں بائی عورت کو کہتے ہیں

محل کی لونڈیوں اور کنیزوں کے نام

گلال چمیلی۔ نرگس۔ کیسر۔ گل بادام۔ سوسن۔ یاسمین۔ کستوری۔ چمپا۔ بیلا۔ سیوتی۔ نیلوفر۔ گل عباس۔ گل فرنگ۔ رعنا گل۔ گل اندام۔ گلنار۔ انارکلی۔ سلونی۔ صبحتی۔ نیکی۔ خاص کار۔ دوستی۔ مادھومتی۔ سوگندرا۔ گیانی۔ کوئل۔ بنفشہ۔ گلرنگ۔ مہندی۔ صد برگ۔ خوش نگاہ۔ صندل۔ دلفروز۔ زندہ دل۔ کیتکی۔ نیاز بو۔ موتی۔ نیک قدم۔ اچانک۔ ناز بو۔ مرگ نین۔ نین سکھ۔ کنول نین۔ دل پسند۔ دلآرام۔ رنگ مالا۔ بسنتی۔ کاموری۔ ہیرا۔ خوش اندام۔ سرد گل۔ کشمش۔ پستہ۔

ان تمام ناموں میں بہ نسبت فارسی کے ہندی زیادہ ہے۔ بادشاہ انہیں مناسب حال ناموں سے نامزد کرتا ہے۔ ان کنیزوں کے جو نام رکھے جاتے ہیں اُن کو اُن کی رفتار کردار شکل وصورت سے کچھ نہ کچھ ضرور مناسبت ہوتی ہے۔ ان کو اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنائی جاتی ہے اور یہ مرصع زیورات سے مزین رہتی ہیں۔ انہیں وہی تنخواہ ملتی ہے جو غلاموں کو ملتی ہے۔ ہر ایک کے ماتحت دس عورتیں ہوتی ہیں جن کی وہ افسر شمار کیجاتی ہیں۔

محلات کے اخراجات غیر معمولی ہوتے ہیں اور ان کی تعداد ایک کروڑ روپیہ سے کم نہیں۔ سپہ سالاروں اور افسروں کو جو خلعتیں دیجاتی ہیں اُن کی رقم اسمیں شامل نہیں ہے۔ یہ رقم کچھ غیر معتبر معلوم نہیں ہوتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے

باشندے پھولوں اور خوشبوؤں کے بہت شایق ہوتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ رقم مختلف پھولوں کے عطریات اور عرق گلاب وغیرہ پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پانوں کا خرچ ہے جو ہر وقت اُن کے مُنہ میں دبا رہتا ہے۔ یہ تو روزمرّہ کے اخراجات ہیں مگر جواہرات کی خریداری کا سلسلہ جو رہتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اسی وجہ سے سُناروں کو زیورات بنانے سے فرصت نہیں ہوتی۔ ان سب میں بیش قیمت وہ زیورات ہوتے ہیں جو خاص بادشاہ ملکہ اور شہزادیوں کے واسطے بنائے جاتے ہیں۔

ملکہ اور شہزادیاں اپنے ان زیورات کو بطور تفریح دوسروں کو ملاحظہ کراتی ہیں۔ لیکن اس کی کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے خود اس کا تجربہ ہوا کہ جب کبھی میں ان بیگمات کے کمروں میں گیا اور انہیں مجھ سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہوئی تو اونہوں نے اکثر اپنے زیورات لانے کا محض اسلئے حکم دیا کہ اس طرح سلسلہ کلام شروع ہو جائے۔ یہ اشیاء طلائی کشتیوں میں لائی جاتیں اور وہ مجھ سے اُن کی قیمت و حالت وغیرہ کی نسبت سوال کرتیں۔ اس طرح مجھے بہ اطمینان ہر قسم کے جواہرات اور یکساں قد کے موتیوں کی لڑیاں دیکھنے کا موقع ملا جن میں سے بعض غیر معمولی طور سے بڑے تھے۔ اوّل ہی نظر کرنے پر مجھے اکثر یہ دھوکا ہوا کہ وہ مختلف اقسام کے پھل ہیں۔ کیونکہ سوراخ دار یاقوتوں کی لڑیاں تھیں جو مثل موتیوں کے پروئے جاتے تھے۔ اور قد میں وہ اخروٹ کے برابر تھے۔ جب ان کی سُرخی کی جوت موتیوں کی سفیدی پر پڑتی تھی تو مختلف رنگ کے پھل معلوم ہوتے تھے۔

بیگمات اپنے یاقوتوں کو اس طرح اس سلئے رکھتی ہیں کہ اُن کا وزن اور قد کم نہ ہو۔ کیونکہ اونھیں خوب معلوم ہے کہ انہیں سوائے اُن کے کوئی نہیں پہن سکتا اور نہ اُنہیں

فروخت کرنا ہے۔ اسی لئے ان یاقوں میں سوراخ کرانے سے کچھ اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ ان جواہرات کے ہاروں کو پہنتی ہیں جن میں ہر طرف موتیوں کی تین تین لڑیاں ہوتی ہیں۔ معمولی طور سے تین یا پانچ موتیوں کی لڑیاں گلے سے ناف تک لٹکتی ہیں۔ سر کے درمیان میں موتیوں کا ایک زیور پیشانی تک ہوتا ہے۔ جس میں بیش قیمت جواہرات جڑے رہتے ہیں جن کی شکل آفتاب۔ چاند۔ یا کسی ستارہ یا پھول کی ہوتی ہے اور یہ زیور نہایت موزوں ہوتا ہے۔ داہنی طرف ایک چھوٹا سا گول زیور ہوتا ہے جس کے بیچ میں دو موتیوں کے درمیان ایک یاقوت جڑا ہوا ہوتا ہے۔ کانوں میں قیمتی جواہرات اور گلے میں موتیوں یا جواہرات کا ہار رہتا ہے۔ اور ایک بیش قیمت زیور ہوتا ہے، جس کے بیچ میں بڑا ہیرا یا قوت یا زمرد یا نیلم اور اس کے گرد موتیوں کا جڑاؤ ہوتا ہے۔

بازوؤں پر دو ایک چوڑے مرصع بہ جواہر بازوبند ہوتے ہیں۔ کلائیوں میں قیمتی چوڑیاں یا موتیوں کے پہچے ہوتے ہیں جن کی دس بارہ لڑیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے نبض دیکھنے کی جگہ ایسی پوشیدہ ہو جاتی ہے کہ بعض مرتبہ مجھے نبض دیکھنے میں بہت دقت ہوئی۔ ان کی انگلیوں میں قیمتی انگشتریاں اور چھلے ہوتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے میں ہمیشہ آرسی رہتی ہے جس پر بجائے کسی جواہر کے چھوٹا سا گول آئینہ ہوتا ہے جس کے چاروں طرف موتی جڑے رہتے ہیں۔ اس آئینہ میں وہ اپنی ان حرکات و سکنات کو دیکھتی رہتی ہیں، جو اونہیں پسند ہوتی ہیں۔ علاوہ ان زیورات کے دو انگشت چوڑی ایک قسم کی طلائی پیٹی بندھی رہتی ہے جو سراپا جواہرات سے مرصع ہوتی ہے۔ جن کمر بندوں سے وہ پاجامہ باندھتی ہیں اون کے سروں پہ پانچ پانچ انگشت موتیوں کی لڑیاں اور مٹریں ہوتی ہیں پاؤں میں چھلے اور موتیوں کے پچھے پہنتی ہیں۔

ان تمام شہزادیوں کے پاس زیور چھ سے آٹھہ قسم تک کا ہوتا ہے - علاوہ اس کے وہ زیورات الگ ہوتے ہیں جو وہ اپنے مذاق اور پسند کے موافق تیار کرالیتی ہیں - ان کی پوشاک بھی شاندار قیمتی اور عطر گلاب سے معطر ہوتی ہے - حالت موسم کے موافق یہ دن بھر میں کئی مرتبہ لباس تبدیل کرتی ہیں - بیگمات کو اپنے جواہرات فروخت کرنے ناممکن ہیں - کیونکہ شہزادہ اکبر جب سیواجی کے علاقہ میں تھا تو روپیہ موجود نہ ہونے کے باعث سے اس نے پانچ یاقوت بغرض فروخت گوا روانہ کئے - یہ یاقوت بھی ویسے ہی تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے تاہم کسی نے ان کو اس وجہ سے نہ خریدا کہ قیمت زیادہ تھی اور ان میں سوراخ تھے -

ہندوستان کی تمام عورتیں ہاتھ پاؤں میں مہندی لگانے کی عادی ہیں - اس سے ہاتھ پاؤں کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ دستانے پہنے ہوئے ہیں - یہ عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ گرمی کی افراط کی وجہ سے وہ جرابیں اور دستانے نہیں پہن سکتیں - اور اسی لئے وہ ایسی باریک پوشاک پہننے پر مجبور ہیں جس میں سے بدن کا رنگ جھلکتا ہے - اسے ساری یا ململ کہتے ہیں - معمولاً یہ دو یا تین کپڑے پہنتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا وزن ایک اونس (ڈھائی تولہ) سے زیادہ نہیں ہوتا - اور جس کی قیمت چالیس سے پچاس روپیہ تک ہوتی ہے - اس میں طلائی گوٹہ و پلکہ وغیرہ کا وزن شامل نہیں جو اس لباس پر لگایا جاتا ہے - یہ اسی لباس میں آرام کرتی ہیں اور چوبیس گھنٹہ کے بعد تبدیل کر کے پھر کبھی اس پوشاک کو نہیں پہنتیں بلکہ اپنی کنیزوں کو دیدیتی ہیں - ان کے بال عمدہ طور سے گوندھے جاتے اور خوشبودار روغن سے معطر کئے جاتے ہیں - ان کا سر مطلا کپڑے سے ڈھکا رہتا ہے جو مختلف رنگوں اور وضع کا ہوتا ہے - سرد موسم یعنی کم گرمی میں (کیونکہ ہندوستان کے باشندے قطعی واقف نہیں کہ جاڑا کسے کہتے ہیں)

وہ اسی قسم کا لباس پہنتی ہیں اور تمام پوشاک کے اوپر اونی قبا ساختہ کشمیر رہتی ہے۔ اور ایک سُبک شال اوڑھتی ہیں جو ایسا باریک ہوتا ہے کہ انگلی کے چھلے سے نکل سکتا ہے۔

(۳) رات کے وقت عموماً یہ بطور تفریح مشعلیں روشن کرتی ہیں جن پر پندرہ لاکھ روپیہ سے زیادہ صرف ہوتا ہے۔ یہ مشعلیں چربی اور تیل سے بنائی جاتی ہیں۔ کچھ شہزادیاں بادشاہ کی اجازت سے سر پر پگڑیاں باندھتی ہیں۔ پگڑی پر قیمتی کلغی ہوتی ہے جو موتیوں اور جواہرات سے مرصع ہوتی ہے۔ ان کے سر پر یہ پگڑی موزوں اور اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ناچ وغیرہ کے جلسوں میں رقاصہ عورتوں کو بھی اس قسم کی پگڑیاں باندھنے کی اجازت ہے۔

ملکہ اور شہزادیاں اپنے رتبہ اور خاندانی درجہ کے لحاظ سے تنخواہیں پاتی ہیں۔ علاوہ اسکے کبھی کبھی بادشاہ پانوں اور عطریات کی خریداری کے نام سے انہیں زر نقد بھی عطا کرتا ہے۔ اور یہ اس طرح محل میں شان و شوکت کے ساتھ باطمینان رہتی ہیں۔ انہیں سوائے اس کے کچھ کام نہیں کہ دنیا بھر کی باتیں کر کے بادشاہ کو خوش رکھیں۔ ان کے دلوں میں حاسدانہ خیالات بھرے رہتے ہیں جنھیں مصلحتاً یہ پوشیدہ رکھتی ہیں۔

ایسی خوشی اور شان و شوکت و بیکاری کی حالت میں اُن کے دل خیالات فاسدہ و بدکاری سے پُر رہتے ہیں۔ انہیں کبھی موت کا خیال بھی نہیں آتا اور نہ محل میں اس قسم کی باتیں بیان کی جاتی ہیں اور نہ ایسے واقعات اُن کی نظروں کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ اتفاقاً جب کوئی بیگم یا شہزادی بیمار ہو جاتی ہے تو اُسے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے مکان میں لیجایا جاتا ہے جسے بیمار خانہ کہتے ہیں اور وہاں احتیاط کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر اُس کی تیمارداری کیجاتی ہے۔ اس مکان سے وہ یا تو شفا پاکر اور یا مر کر باہر نکلتی ہے۔ انتقال ہونے کی صورت میں اُس کی تمام دولت و املاک ضبط ہو کر شاہی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اگر مریضہ معزز

معزز ہے تو شروع علالت میں بادشاہ اسکی عیادت کو جاتا ہے۔ اگر اُسے کچھ شفا نہیں ہوتی تو پھر بادشاہ کبھی نہیں جاتا صرف کنیزوں کی معرفت دریافت حالات کرکے مزاج پرسی کی جاتی ہے۔

اگرچہ محل کی مستورات اسی زرق برق اور شاندار طریقہ سے رہتی ہیں جیسا میں نے بیان کیا۔ مگر اورنگ زیب کے نزدیک اس سے کچھ نقصان نہیں۔ کیونکہ تمام مسلمان عورتوں کے بہت شایق ہوتے ہیں اور عورتیں ہی اون کی تفریح ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہانِ مغلیہ کا یہی طریقہ ہے۔ بادشاہ حال ایسے شاندار طور سے نہیں رہتا جیسے اُس کا باپ شاہجہاں رہا کرتا تھا۔ اس کا لباس بالکل سادہ ہوتا ہے اور صرف چند زیورات پہنتا ہے یعنی دستار پر چھوٹا سا طرّہ اور گلے میں ایک بڑا جواہر ہوتا ہے۔ اوس کے گلے میں موتیوں کا ہار نہیں ہوتا جیسے اُس کے مورث اور بزرگ پہنا کرتے تھے۔ ہمیشہ کم قیمت کپڑے سے اس کا لباس تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی قبا کی قیمت دس روپیہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ خاصہ کے جواہرات اکثر ستاروں کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ جیسے چاند، سورج وغیرہ یا اور کوئی نام رکھا جاتا ہے بادشاہ جواہرات کو انہیں ناموں سے طلب کرتا ہے مثلاً وہ حکم دیتا ہے کہ چاند، سورج لایا جائے۔

جواہرات کی کچھ مقدار ایسی بھی ہے جو تیمور لنگ یا اور بزرگوں سے وراثتاً پہونچی ہے۔ انہیں میں وہ جواہرات بھی شامل ہیں جو فتح بیجاپور و گولکنڈہ کے وقت ہاتھ آئے۔ علاوہ ان کے ہمیشہ خریداری رہتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آجکل وہ ہیروں کی کانوں کا مالک ہے۔ بڑے اور عمدہ ہیروں کی کوئی حد نہیں۔ کیونکہ اگرچہ شیر شاہ کی وجہ سے ہمایوں کو تخت چھوڑ کر اس ملک سے جانا پڑا لیکن اُس نے اپنے جواہرات کو یہاں نہ چھوڑا بلکہ ادہنیں وہ اپنے ساتھ لے گیا

اور واپس لایا۔

جب محل میں کسی شاہزادی کے بچہ پیدا ہوتا ہے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اگر لڑکا ہوتا ہے تو تمام درباری اس خوشی میں حصہ لیتے ہیں اور حسب تجویز بادشاہ کئی روز تک جشن رہتا ہے۔ باجے بجتے ہیں۔ محفل رقص و سرود قائم ہوتی ہے۔ تمام امرا مبارکباد دیتے بادشاہ کی حضور میں حاضر ہوتے ہیں اور جواہرات۔ زر نقد۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کی شکل میں نذر پیش کرتے ہیں۔ اسی روز مولود کا نام تجویز کر کے اوسکی تنخواہ مقرر کر دی جاتی ہے۔ ہمیشہ یہ تنخواہ سپہ سالار کی تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے اسی وقت وہ افسر بھی منتخب کر دیے جاتے ہیں جو اس اراضی وغیرہ کی خبر رکھیں جو بچہ کو بطور جاگیر عطا ہوئی ہے۔ سال کے آخر میں اس طرح جو روپیہ پس انداز ہوتا ہے وہ اس شہزادہ کے نام سے خزانہ شاہی میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ جب اس شہزادہ کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے محل میں سکونت کر لیتا ہے تو یہ جمع شدہ روپیہ اُسے دیدیا جاتا ہے۔

کسی شہزادہ کی تنخواہ پنجاہ ہزاری منصب دار سے زیادہ نہیں ہوتی جو عموماً بڑے بیٹے کو دی جاتی ہے۔ اس وقت شاہ عالم کی یہ تنخواہ مقرر ہے جس کی آمدنی دو کروڑ روپیہ ہے۔ اس شہزادہ کے محل میں دو ہزار عورتیں ہیں۔ اور اس کا ایسا ہی دربار ہے جیسا اُس کے باپ کا ہے۔ جب یہ شہزادے شاہی محل کو چھوڑ کر علیحدہ رہنے لگتے ہیں، تو منصوبہ بندی کر کے اپنے دوستوں کی تعداد زیادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خفیہ طور سے ہندو راجوں اور مسلمان سپہ سالاروں سے خط و کتابت کر کے اُن سے یہ وعدے کرتے ہیں کہ بادشاہ ہونے پر وہ اُن کے منصبوں اور تنخواہوں میں ترقی کرینگے۔ اگر ان شہزادوں میں سے کوئی تخت نشین ہو گیا تو وہ ان راجوں اور افسروں کی نسبت

خیال کرلیتا ہے کہ وہ وفادار ہے۔

جب کسی شہزادے کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو دادا اُس کا نام تجویز کرکے اپنے فرزندوں کے علاوہ دو سو یا تین سو روپیہ روزانہ بچّہ کی تنخواہ مقرر کرتا ہے۔ بچہ کا باپ بھی اپنی آمدنی کے موافق کچھ رقم بچّہ کے نام فرد کردیتا ہے۔ جب یہ بچّہ قابل شادی ہوجاتا ہے تو اس کے اردلی کا جلوس زیادہ کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے فرزند شاہزادے اور پوتے شہزادے کہلاتے ہیں اور ان کے نام کے ساتھ لفظ سلطان کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

جو تحائف پیش کئے جاتے ہیں وہ بادشاہ قبول کرلیتا ہے یعنی شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو ان نذروں اور تحائف کا جائز مستحق خیال کرتا ہے۔ یہی حال اُن تحائف کا ہے جنھیں سفرا پیش کرتے ہیں۔ بادشاہ کے خیال کے بموجب اُن کا قبول کرنا ہی عین عنایت ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تصور کرتا ہے۔ اسی لئے جب وہ کسی دوسرے بادشاہ کو خط لکھتا ہے تو اُسے منتظم حاکم یا صدر نشین کے خطابات سے مخاطب کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص دربار میں کوئی تحفہ کسی نوکری یا صلہ پانے کی غرض سے پیش کرتا ہے تو اُسے کچھ نہیں دیا جاتا اور اُس کا پیش کردہ تحفہ بیکار جاتا ہے۔ میں نے خود ایسا واقعہ دیکھا ہے جو مانسیور ریزن (Monsieur Raisin) ایک فرانسیس کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے ایک زمرد پیش کیا جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ نذر پیش کرنے سے بادشاہ وہ تمام جواہرات خرید لیگا جو اُس کے پاس تھے۔ لیکن بادشاہ نے اونھیں نہ خریدا۔ فرانسیسی بہت رنجیدہ ہوا اور ملتفت خاں[۵] سے

[۵] غالباً ملتفت خاں کا بھائی فتاد خاں یہاں مراد ہے۔ کیونکہ سنہ ۶ جلوس (۶۴-۱۶۶۳ء) میں وہ خانساماں مقرر کیا گیا تھا۔ (مآثر الامرا)

سے عرض کیا جو اُس وقت داروغہ توشہ خانہ تھا کہ وہ اپنے ذاتی اثر سے اُس کا زمرد واپس کرادے۔ اُسے زمرد تو مل گیا مگر اُس کی نصف قیمت رہ گئی۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے یہ مہربانی اسلئے کی کہ وہ غیر ملک کا باشندہ تھا۔

تمام ہندوستان میں یہ بات رائج ہے کہ بغیر فائدہ یا دوستوں کی امداد کے کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ یہانتک کہ شاہی خاندان کے شہزادوں کا جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو بغیر کچھ ادا کئے وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ لینا دینا عام طور سے ایسا مروّج ہے کہ جب کبھی کوئی شہزادہ یا خواجہ سرا بادشاہ سے کسی افسر وغیرہ کی ترقی یا تقرر وغیرہ کے لئے بطور سفارش کچھ عرض کرتا ہے تو بادشاہ بلا تامل یہ بات دریافت کرتا ہے کہ اسے اس سفارش کے لئے کیا وصول ہوا ہے۔ یہ بھی پوشیدہ نہیں کرتا اور ٹھیک ٹھیک تعداد اُس رقم کی ظاہر کر دیتا ہے۔ اس رقم میں سے کچھ حصّہ درمیانی آدمی کا ہوتا ہے اور باقی رقم شہزادہ نذکر اپنے خزانہ میں داخل کرا دیتا ہے۔

لیکن جعفر خاں وزیر کے ساتھ بادشاہ کا یہ طرز عمل نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص افسر مقرر ہے جو ان تقررات وغیرہ کی رقومات جمع کرتا ہے۔ اور اُسے ہدایت ہے کہ جو کچھ وصول ہو اُس کا روزانہ حساب مرتب رکھے۔ اگر یہ کل رقم پچیس ہزار روپیہ یا اس سے زیادہ ہو تو درج حساب کی جائے اور کم ہو تو داخل حساب کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک روز فدائی خاں[۱] جو الہ آباد سے واپس ہو کر حاضر دربار ہوا تو ایک روز اُس نے اپنے دوست کو کسی عہدہ پر مقرر کرنے کے لئے بادشاہ کی حضور میں پیش کیا۔ چونکہ فدائی خاں اور جعفر خاں کے تعلقات اچھے

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ فدائی خاں (اعظم خاں کوکہ) برادر بہادر خاں (خانجہاں بہادر کوکلتاش) مراد ہے جس کا کئی جگہ ذکر ہوا ہے۔ ۱۲

نہ تھے لہٰذا اُس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "ان ناچیز باتوں کی قیمت کے بابت جعفر خاں کو بارہ ہزار روپیہ دینے پڑے ہیں۔" یہ سُنکر بادشاہ بہت برافروختہ ہوا اور اس کے بعد فدائی خاں کو لاہور کا گورنر مقرر کرکے روانہ کردیا۔

سالگرہ اور دیگر جشنوں کے موقعوں پر عموماً اور نوروز کو خصوصاً بادشاہ اور شہزادے وزن کئے جاتے ہیں جس کا ذکر آئندہ ہوگا۔ اس موقع پر ضرور ہے کہ خاص خاص درباری عورتیں محل میں حاضر ہوکر ملکہ اور شہزادیوں کو مبارکباد دیں۔ اس قاعدہ سے افغان سرداروں کی بی بیاں مستثنٰی ہیں۔ یہ عورتیں اس موقع پر کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتیں بلکہ کچھ نہ کچھ ہدیہ پیش کرتی ہیں۔ اور برابر حاضر جشن رہتی ہیں جو چھ یا نوروز تک رہتا ہے۔ رقاصہ اور گانے والی عورتوں کو شہزادیاں اور یہ عورتیں کثیر انعام دیتی ہیں۔ یہ یا تو سالگرہ کی مبارکباد گاتی ہیں اور یا نوروز کی مبارکباد گاتے وقت وہ ان شہزادیوں کی تعریف کرتی ہیں۔

ان تعریفوں کا جو یہ گانے والی عورتیں کرتی ہیں اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ شہزادیاں طلائی ونقرئی سکّوں کی بھری ہوئی تھالیاں اُن کی طرف پھینکتی ہیں تمام واردغہ عورتوں کو سراپا خلعت عطا کرکے اُن کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ معزز عورتوں کا بھی دھوم دھام سے استقبال ہوتا ہے اور انہیں بھی بیش قیمت سراپا خلعتیں مع جواہرات مرحمت ہوتے ہیں۔ جب یہ معزز عورتیں رخصت ہوتی ہیں تو اُن کے دونوں ہاتھ کھچڑی سے پُر ہوتے ہیں۔ یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کھچڑی سے یہ نہ سمجھیں کہ یہ وہ کھانا ہوتا ہے جو کئی چیزوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان شہزادیوں اور بیگمات کی کھچڑی کا یہ مطلب ہے کہ نقرئی وطلائی سکے۔ ہر قسم کے جواہرات اور چھوٹے بڑے موتی ملے ہوئے ہوتے ہیں۔

جس روز کوئی شہزادہ یا شہزادی پیدا ہوتی ہے تو زرد دھاگہ میں ایک گرہ لگا دی جاتی

ہے جو اُس روز کی علامت ہے جس روز وہ بچہ دُنیا میں آیا۔ سال بھر بعد اسی روز پھر ایک اور گرہ لگا کر جشن کیا جاتا ہے اور آخر عمر تک یہ سالگرہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پیدائش کے دن ہی بچہ کی آنون نال کاٹ کر ایک چھوٹی تھیلی میں رکھ کر اوس کا مُنہ دھاگے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ چالیس روز تک یہ معہ ایک تعویذ کے بچہ کے سرہانے تکیہ کے نیچے رکھی رہتی ہے۔ اس عرصہ کے بعد یہ بچہ کے گلے میں ڈالدی جاتی ہے۔ خاندان مغلیہ میں یہ رسم کبھی ترک نہیں کی جاتی۔

جن خطابات سے رعایا بادشاہ کو یاد کرتی ہے وہ یہ ہیں۔

حضرت سلامت۔ قبلۂ دین و دُنیا۔ قبلۂ دو جہاں۔ عالم پناہ۔ اورنگ زیب کو علی العموم پیر دستگیر کہا جاتا ہے۔

جب وہ بچہ جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے پانچ برس کا ہوتا ہے تو اُسے مادری زبان یعنی تاتاری سکھائی جاتی ہے اس کے بعد وہ فاضلوں اور درباری خواجہ سراؤں کے سپرد کیا جاتا ہے جو سختی سے اُسے فن سپہ گری کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ اُستاد شہزادوں کو بُری عادات سے روکتے ہیں۔ اُن کی تفریح طبع کے لئے اُن کے سامنے خوش آیندہ نقلیں کی جاتی ہیں اُستادان کے سامنے قانونی بحث یا پیچیدہ معاملات کا ذکر کر کے آخر میں بطور فیصلہ اُن کے نتائج سُناتے ہیں۔ ان شہزادوں کو لڑائیوں کا تماشہ دکھایا جاتا ہے اور یہ امر پیش نظر رہتا ہے کہ اگر وہ تخت سلطنت پر متمکن ہوں تو او نہیں دُنیا کے تمام کاموں کا تجربہ ہو اور وہ بلا تکلف ہر امر کا فیصلہ کر سکیں۔

اسی کے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ میں سلطان معزالدین کے ایک بچہ کا علاج کر رہا تھا کہ جس کے سر میں پھنسی تھی ایک روز مرزا صاحب نے کہا کہ جو تکلیف ہے اُسے بھول جاؤ، اور

ناراض نہ ہو" خواجہ سراؤں اور ماماؤں نے یہ غیر معمولی بات سُن کر مجھے جواب دیا کہ مغلیہ شہزادوں کا دل کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ جو ان کی حرکات ہوتی ہیں وہ مصنوعی نہیں ہوتیں اور پیش بینی پر مبنی ہوتی ہیں۔

جب بادشاہ شکار یا مسجد کو جاتا ہے تو ان چھوٹے شہزادوں کو اپنے ہمراہ لیتا ہے۔ اور سولہ برس کی عمر تک یہ اسی طرح محل میں لائے جاتے ہیں۔ اسی عمر پر ان کی شادی ہو جاتی ہے اور اُستاد تمام عمر محل میں رہکر معقول پنشن پاتے ہیں۔ شادی کے بعد بادشاہ شہزادے کو علیحدہ محل معہ ساز و سامان عنایت کرتا ہے۔ لیکن اس کے پاس لائق استاد اور ہوشیار جاسوس رہتے ہیں جو ہر معاملہ سے بادشاہ کو مطلع کرتے رہتے ہیں۔

جب یہ شہزادے علیحدہ محل میں رہنے لگتے ہیں تو یہ خود اپنی سالگرہ وغیرہ کا جشن کرتے ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کے افسر وغیرہ اپنی دولتمندی کے لحاظ سے انہیں تحایف نذر کرتے ہیں۔ اسی معاملہ کی نسبت ۱۶۷۹ء[۵] میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جب احمد آباد میں شاہ عالم اپنی سالگرہ کا جشن منا رہا تھا تو اس کی والدہ بھی ہمراہ تھی اور اس نے پچاس ہزار روپیہ کے قیمتی تحائف اس کے پاس روانہ کئے۔ مگر شاہزادہ ان سے مطمئن نہ ہوا اور شکایت کی کہ بمقابلہ پہلے سالوں کے اس کی والدہ نے بخل سے کام لیا۔ اس لئے ملکہ موصوف نے اس کے پاس اور تحائف روانہ کئے۔ خاندان کی دیگر شہزادیوں نے بھی اپنی وسعت اور رتبہ کے موافق ہدیہ نذر کئے۔ ایسے موقع پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا یہ ضروری ہے کہ اپنی حیثیت و رتبہ کے موافق نذر پیش کرے۔

---

[۵] ۲۰ رجب ۱۰۹۰ھ ہجری کو جو شاہ عالم کی سالگرہ واقع ہوئی تھی وہ ۲۶ ستمبر ۱۶۷۹ء سے مطابق ہے جبکہ اس کی عمر ۳۷ سال کی تھی۔ ۱۲

۲۲ مارچ سے ان کا نیا سال شروع[۵] ہوتا ہے اور اس موقع پر بڑے پیمانہ پر جشن نوروز کیا جاتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ تمام محلات اندر باہر سے اس قیمتی سامان سے آراستہ کئے جاتے ہیں جو شاہجہاں کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ تخت طاؤس بھی ہوتا ہے۔ یہ بڑا بیش قیمت تخت ہے جس پر اس کے بنوانے والے کو کبھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ اورنگ زیب ہی پہلا شخص تھا جو اپنی تخت نشینی کے دن اس تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک بلند خیمہ میں رکھا جاتا ہے اور جشن کے موقع پر اورنگ زیب اوس پر متمکن ہوتا ہے

اس تخت کے پہلوؤں میں کیقدر نیچے وہ تمام تخت بچھائے جاتے ہیں جو بادشاہان سابق استعمال کیا کرتے تھے۔

قدیم دستور کے موافق اسی روز شہزادے مختلف طریقوں سے وزن کئے جاتے ہیں۔ یعنی اوّل مرتبہ سات قسم کی دھاتوں مثل لوہا۔ تانبا۔ سونا۔ چاندی وغیرہ سے اور پھر اتنی ہی مرتبہ سات قسم کے اناج مثل گیہوں۔ چاول۔ جو وغیرہ سے وزن کئے جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ پچھلے سال سے اس وقت تک کا فرق معلوم ہو سکے جن اشیا سے وزن کیا جاتا ہے وہ فقیروں کو تقسیم کر دی جاتی ہیں اور بطور یادگار ایک کتاب میں وزن درج کر لیا جاتا ہے۔

اس روز بادشاہ کو بہت حاصلات ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص متعلق محل اور تمام دربار میں امرا نذریں اور تحائف پیش کرتے ہیں۔ یہ دن نوروز کہلاتا ہے۔ اس روز بادشاہ بھی رعایا وغیرہ کے ساتھ اظہار عنایت کرتا ہے۔ جواہرات۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ خلعت دیکر

---

[۵] یہ ایرانیوں کا قدیم سال ہے جو آفتاب کے برج حمل میں داخل ہونے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۲

صوبہ وار ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کئے جاتے ہیں۔ جب بادشاہ باہر لشکرگاہ میں ہوتا ہے تو یہ تقریب ایسی شان و شوکت کے ساتھہ نہیں منائی جاتی اور نہ تخت استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ قلعہ دہلی سے باہر نہیں جا سکتے۔

ایک اور جشن عید قربان کا کیا جاتا ہے۔ جو مسلمانوں کی لینٹ ( ) کے بعد ہوتا ہے[لے]۔ اس روز نو بجے بادشاہ نہایت شان و شوکت اور تزک احتشام کے ساتھہ محل سے برآمد ہو کر بڑی مسجد میں جاتا ہے جہاں قاضی سات زینہ کے ممبر پہ بادشاہ کا منتظر ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں ایک غلام ننگی تلوار لئے کھڑا رہتا ہے۔

پہلی رسومات کے بعد قاضی تیمور لنگ سے لیکر اس وقت تک کے تمام سلاطین مغلیہ کے نام معہ اُن کی مدت سلطنت لیتا ہے۔ جب موجودہ بادشاہ کا نام آتا ہے تو قاضی اوس کی تعریف کرتا ہے جو مبالغہ سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ اُسے شائع کنندہ و محافظ اسلام کے خطاب سے مخاطب کر کے اس کے تمام افعال شجاعت۔ عدل و انصاف کی مدح سرائی کرتا ہے۔ اس وقت قاضی نہایت ہوشیاری سے ہوش و حواس درست رکھتا ہے کیونکہ اگر اُس سے کچھ غلطی ہو جائے یا کوئی بات چھوٹ جائے تو اس کا سر قلم کرنے کے لئے جلاد آمادہ و مستعد ہے۔

جب خطبہ ختم ہو جاتا ہے تو بادشاہ کی طرف سے قاضی کو سات خلعت دیئے جاتے

لے مصنف نے یہاں غلطی کی ہے۔ لینٹ ( ) رومن کیتھولک عیسائیوں کا ایک تہوار ہے جس میں روزے رکھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں رمضان کے بعد جو عید ہوتی ہے وہ عید الفطر کہلاتی ہے۔

عید قربان ذی الحجہ کی ۱۰ ر کو ہوتی ہے۔ ۱۲

ہیں۔ مسجد سے روانہ ہونے کے بعد زینوں کے نزدیک قربانی کے لئے ایک اونٹ موجود رہتا ہے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر اونٹ کی گردن پر نیزہ مارتا ہے۔ یا اگر کسی وجہ سے بادشاہ قربانی کرنی نہیں چاہتا تو اپنے فرزندوں میں سے کسی کو ایسا کرنے کے لئے حکم دیتا ہے۔ اکثر شاہ عالم یہ قربانی کرتا ہے۔ قربانی کرنے کے بعد غلام اونٹ کو زمین پر ڈال کر اس کے گوشت کو بطور تبرک آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

چونکہ میں نے محلات کی عورات کے نام لکھے ہیں لہٰذا مناسب ہے کہ خواجہ سراؤں کے نام بھی تحریر کروں جو اندر یا ہر کام کرتے ہیں یا بیگمات کے پیامبر ہیں۔ ان خواجہ سراؤں میں ایک خواجہ سرا سب کا افسر ہوتا ہے جو محل کی ہر بات کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ ایک معزز عہدہ ہے اور بادشاہ اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ اس کی بڑی تنخواہ ہوتی ہے۔ اس کی تحویل میں خزانہ بھی رہتا ہے اور یہ داروغہ توشہ خانہ بھی ہوتا ہے۔ تمام سراپا خلعتیں اسکی معرفت تیار کی جاتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ تمام محل کا سامان جواہرات۔ کپڑے وغیرہ اسکی تحویل میں ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو محل میں آئے یا جائے اس کا اسے علم ہونا چاہئے۔ ہر خواجہ سرا کا علیحدہ نام ہوتا ہے جس سے بادشاہ اسے نامزد کرتا ہے۔

خواجہ سراؤں کے نام

نادر۔ دانیال۔ دانش۔ دولت۔ مطلب۔ یوسف۔ یعقوب۔ الماس۔ زمرد۔ نیلم۔ مرجان۔ مقبول۔ میوہ جان۔ عنایت۔ نیکنام۔ فیروز۔ ہمت۔ فتح۔ فہیم۔ مہابت۔ سعادت۔ سلامت۔ حیات۔ دائم۔ ہلال۔ انوار۔ آبنوس۔ محرم۔ امرت۔ خواجہ سرا۔ المعنت۔ معقول۔ صادق۔ مصلحت۔ اصالت۔ امانت۔ اعتبار۔

یہ تمام خواجہ سراجن کے نام بیان کئے گئے ناظر کہلاتے ہیں۔ بادشاہ ۔ شہزادوں ۔ ملکہ ۔ شہزادیوں کو اُن کی ذات پر بڑا اعتماد ہوتا ہے ۔ ہر ملکہ یا شہزادی یا دیگر ذی عزت بیگم کے یہاں ایک ناظر ہوتا ہے جو اوس کی تمام ملکیت ۔ اراضی ۔ اور آمدنی کی نگرانی کرتا ہے ۔ تمام ملازم و عہدہ دار و غلام ناظر کو تمام حسابات دیتے ہیں ۔

ناظر کے ماتحت بوڑھے اور جوان دیگر خواجہ سرا ہوتے ہیں جو یا تو رقعے اور پیامات محل میں لیجاتے ہیں یا حسب ضرورت اور خدمات انجام دیتے ہیں ۔ کچھ دروازوں پر اس بات کے دیکھنے کے لئے متعین ہیں کہ محل میں کون آتا جاتا ہے ۔ وہ نہایت ہوشیاری سے تلاشی لیتے ہیں تاکہ بھنگ ۔ شراب ۔ افیون یا دیگر منشیات داخل محل ہونے پائیں کیونکہ محل کی تمام عورتیں ان کی بہت شایق ہوتی ہیں ۔ نہ وہ محل میں مولیاں ۔ کھیرے یا اسی قسم کی ترکاریاں داخل ہونے دیتے ہیں جس کی وجہ میں بیان نہیں کرسکتا ۔

جب کوئی ایسی عورت بغرض ملاقات یا کسی اور وجہ سے داخل محل ہونا چاہتی ہے جس سے یہ واقف نہیں تو اُس کی تلاشی لیجاتی ہے اور اُس کے مرتبے یا عزت کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا ۔ خواجہ سرا یہ سختی کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ اُنہیں خوف رہتا ہے کہ کوئی مرد عورت کے بھیس میں داخل محل نہ ہو جائے ۔ جب کبھی کسی کام کے لئے معمار یا نجار وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے تو جن جن دروازوں سے وہ گذرتے ہیں اُن کے نام اور حلئے درج کئے جاتے ہیں ۔ ایک کاغذ پر یہ تمام نشانات وغیرہ لکھ کر دوسرے خواجہ سرا کے حوالہ کئے جاتے ہیں جو اُنہیں اسی طرح نشانات کی مطابقت کرکے باہر نکالتا ہے ۔ یہ انتظام اس اندیشہ سے کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص اندر نہ رہجائے ۔

دروازوں پر کشمیری عورتیں ہیں جن کا یہ کام ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو اُسے

لیجائیں یا لائیں ۔ یہ عورتیں کسی سے پردہ نہیں کرتیں ۔ محل کے خاص خاص دروازے آفتاب غروب ہونے پر بند کر دیے جاتے ہیں ۔ صدر دروازہ پر سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے جو اسی غرض سے مامور ہوتے ہیں ۔ قفل پر مہر لگا دیجاتی ہے ۔ تمام شب مشعلیں روشن رہتی ہیں ۔ ہر بیگم کے پاس ایک کاتب عورت رہتی ہے جس کا فرض ہے کہ ہر بات جو محل میں واقع ہو اُس کی ناظر سے اطلاع کرے ۔

جب کوئی حکیم داخل محل ہوتا ہے تو خواجہ سرا سر سے کمر تک اُسے ڈھانک کر لیجاتے اور باہر لاتے ہیں ۔ تمام امرا اپنی عورتوں کی اُسی قاعدہ سے پردہ داری کرتے ہیں جو بادشاہ کے محل میں جاری ہے ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی عورتوں کا اعتبار نہیں کرتے ۔ جو بات قابل اظہار ہے وہ یہ ہے کہ بھائی بھائی کا بھی اعتبار نہیں کرتا اور اپنی زوجہ کو بوجہ حسد اُس کے سامنے نہیں آنے دیتا ۔ اس طرح عورتیں سختی سے محبوس رکھی جاتی ہیں اور ہمیشہ اُن کی نگرانی کیجاتی ہے ۔ اُنہیں آزادی نصیب نہیں ہوتی ۔ اس حالت میں سوائے بناؤ سنگار کرنے کے اونہیں اور کوئی کام نہیں ۔ اُن کے دلوں میں بدکارانہ شہوانی خیالات بھرے رہتے ہیں ۔ انہیں بیگمات میں سے ایک بیگم نے خود مجھ سے ان باتوں کا اظہار کیا ۔

یہ بیگم اسد خاں وزیر کی زوجہ تھی جس کا نام نول بائی تھا ۔ اوس نے مجھ سے بیان کیا کہ اُسے صرف اپنے شوہر کی خوشنودی کا خیال اس غرض سے مد نظر رہتا ہے کہ وہ دوسری عورت کے پاس نہ جائے ۔ اس وجہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ تمام عورات کو یہی خیال رہتا ہو گا ۔ اگر اُنہیں کوئی خیال ہے تو وہ پر تکلف کھانا کھانے ۔ پوشاک و جواہرات وغیرہ کے ذریعہ سے اپنے آپکو آراستہ کرنے ۔ عطر سے بدن کو معطر کرنے کا ہے ۔

یہ بھی واضح ہو کہ انہیں گانا سُننے ۔ ناچ دیکھنے ۔ عشقیہ قصے سُننے ۔ پھولوں کی سیج پر

سونے ۔ باغ میں چل قدمی کرنے ۔ اور آب جاری کا تماشہ دیکھنے اور اسی قسم کی سیر و تفریح کی اجازت ہے ۔

کچھ ایسی بھی ہیں کہ جو وقتاً فوقتاً اس وجہ سے بیماری کا بہانہ کرتی ہیں کہ جو حکیم نبض دیکھنے آئے اس سے انہیں گفتگو کرنے کا موقع مل جائے ۔ جب حکیم پردہ کے اندر ہاتھ لیجاتا ہے وہ اُسے تھام کر چومتی ہیں اور آہستہ کاٹتی ہیں اور بعض ہاتھ کو اپنی چھاتی پر رکھ لیتی ہیں ۔ مجھے بھی کئی مرتبہ ایسا موقع پیش آیا ۔ لیکن مینے خواجہ سراؤں اور ماماؤں سے چھپانے کی غرض سے ان باتوں پر کچھ توجہ نہ کی ۔

یہ بیگمات حکیموں کے ساتھ بہ عنایت پیش آتی ہیں ۔ حکیم بھی عقل و شعور کے ساتھ علاج اور گفتگو کرتے ہیں ۔ اکثر درباری امرا کو بھی یہ بیگمات تحائف دیتی ہیں اور جس امیر کی یہ جانب دار ہوتی ہیں اس کے تقرر وغیرہ میں بہت امداد کرتی ہیں ۔ یہ گھوڑے سراپا خلعتیں ۔ کلغیاں اور اسی قسم کی چیزیں امرا کو بطور تحفہ دیتی ہیں ۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ کسی امیر نے کوئی ان کی خدمت کی ہو اور انہوں نے اُسے محسوس کرکے کسی نہ کسی طرح اس کے مرتبے کے موافق بدل نہ کیا ہو ۔ میں نے دیکھا ہے کہ دختر اورنگ زیب کس طرح ذوالفقار خاں اور اس کے باپ کے ساتھ پیش آئی ۔

اس نواب کو بادشاہ نے کرناٹک کا صوبہ دار مقرر کیا ۔ قبل از روانگی یہ شہزادی سے رخصت حاصل کرنے حاضر ہوا ۔ کیونکہ شہزادی کی عزیزہ سے اس کی شادی ہوئی تھی ۔ شہزادی نے پان رکھنے کے لئے طلائی ڈبیہ اور ایک مرصع طلائی پیکدان عنایت فرمایا ۔ ایک سال بعد بادشاہ نے اپنے فرزند کام بخش کو زیر نگرانی اسد خاں وزیر وہیں روانہ ہونے کا حکم دیا ۔ اسد خاں نواب موصوف کا باپ تھا ۔ جب وزیر رخصت حاصل کرنے کے لئے شہزادی موصوف کے حضور میں حاضر ہوا تو اس نے وزیر کو ایک نقرئی ڈبیہ عنایت کی جس پر میناکاری ہو رہی تھی ۔ اسد خاں

نے اس کو لیکر شکایت کی کہ کم سے کم یہ ہدیہ اُس قدر قیمت کا ہونا چاہیئے جیسا اُس کے فرزند
کو عنایت ہوا تھا۔ کیونکہ علاوہ اُس کے باپ ہونے کے اس کا منصب اور رتبہ بھی زیادہ
ہے کیونکہ وہ سلطنت کا وزیر اعظم ہے۔ شہزادی نے جواب دیا کہ دونوں میں ضرور فرق ہے
اُس کا فرزند تو شہزادی کا رشتہ دار ہے اور باپ صرف ملازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس
جواب سے ساکت ہوکر وزیر آداب شاہی بجا لاکر رخصت ہوا۔ تمام شاہی خاندان کے
لوگوں کے ساتھ یہی کیا جاتا ہے۔

ان بیگمات سے رخصت حاصل کرنے کا وہ طریقہ نہیں ہے جیسا گمان کیا جاسکتا ہے۔
کیونکہ کوئی شخص انہیں بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے محل کے دروازہ
پر خواجہ سرا سے حاضری کا مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اُس بیگم
سے حاضری کی اطلاع کردے جس سے رخصت حاصل کرنی منظور ہوتی ہے۔ خواجہ سرا
جواب لاتا ہے جیسا کہ بیان ہوا کوئی بیگم باہر نہیں آتی۔ سوائے اُس موقع کے جب وہ
پردہ دار سواری میں بیٹھ کر باہر جاتی ہیں۔ سواری میں ایک مورچہ ہوتا ہے جس پر طلائی
تار لگے رہتے ہیں اُس کے ذریعہ سے یہ ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اون کے شوہر
اور اطبا کے سوا کوئی ان کے نزدیک نہیں آسکتا۔

امرا سواریوں سے اترکر دور ہی سے آداب بجا لاتے ہیں۔ جو بیگمات اعلیٰ رتبہ
کی خیال کیجاتی ہیں اُن سے امرا نزدیک سے تسلیم کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اور خود
آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر آگے بڑھکر آداب بجا لاتے ہیں۔ جب وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے
تب وہ آگے بڑھتے ہیں تو سواری سے خواجہ سرا کی معرفت چند پان بطور اظہار عنایت
اُس امیر کو بھیجتی ہیں۔ پان لیکر وہ پھر سلام کرکے رخصت ہوجاتا ہے۔ یہ ایک عزت خیال

کی جاتی ہے جو چند موقعوں پر مجھے خود بھی حاصل ہوئی ہے۔

منجملہ اور موقعوں کے ایک موقع یہ تھا کہ جب ملکہ یعنی مادر شاہ عالم نے براہ نوازش اسیطرح مجھسے اظہار خوشنودی کیا کہ میں گوا سے دربار شاہی تک اُس کے فرزند کے ہمراہ رہا۔ یہ ملکہ مجھ پر بیحد مہربان تھی کیونکہ کئی مرتبہ میں نے اُس کی فصد کی تھی، علاوہ اس کے چونکہ وہ مرض نقرس میں مبتلا تھی مجھے اکثر طلب کر لیا کرتی تھی۔ اور میں بھی اُس کے لئے نسخہ تجویز کرتا تھا۔ وہ اکثر اظہار عنایت کے طور پر مجھے لذیذ کھانے بھیجتی جیسا کہ دستور ہے۔ جب میں فصد کرنے کے واسطے حاضر ہوتا تو یہ اپنا بازو پردہ سے باہر نکال دیتی تھی جو کسی کپڑے سے پوشیدہ ہوتا تھا اور صرف وہ حصہ کھلا رہتا تھا جہاں فصد کیجاتی۔ یہ کھلی ہوئی جگہ دو انگشت سے زیادہ چوڑی نہ ہوتی تھی۔ مجھے چار سو روپیہ معہ سراپا خلعت بطور انعام دیے جاتے تھے۔ سال میں دو مرتبہ اس ملکہ کے فصد کھولی جاتی تھی۔

یہ بھی واضح رہے کہ قبل اس کے کہ کوئی اہل یورپ ان شاہزادوں کے یہاں اطبا میں ملازم ہو ایک عرصہ دراز تک اُسے اپنا اعتبار جمانا چاہئے۔ کیونکہ اس قسم کے معاملات میں وہ اکثر غیر مطمئن ہوتے ہیں۔ ہر ماہ میں کسی نہ کسی شہزادی یا بیگم کے فصد کی جاتی ہے جو مذکورہ بالا طریقہ سے ہوتی ہے۔ اور یہی طریقہ پاؤں کی فصد یا کسی پھوڑے یا ناسور کے مرہم پٹی کرنے میں برتا جاتا ہے۔ کبھی بدن کا کوئی حصہ بے پردہ نہیں کیا جاتا۔ سوائے ماؤف جگہ یا اُس رگ کے جہاں فصد کرنی منظور رہے۔ جب میں شاہ عالم کی بیگمات یا دختروں کی فصد کرتا تھا تو ہر ایک مجھے دو سو روپیہ معہ سراپا خلعت عطا کرتی تھی۔ لیکن جب خود شاہزادہ یعنی اپنے آقا کی اوس وقت فصد کرنی چاہتا جب وہ دار السلطنت میں ہوتا تو میں بغیر شاہی اجازت کے ایسا نہ کر سکتا تھا۔ اس فصد کے صلہ میں مجھے چار سو روپیہ معہ سراپا خلعت و اسپ

کے ملتے تھے ۔

فصد کرنے کے بعد مجھے بادشاہ کو یہ اطلاع کرنی ہوتی تھی کہ کسقدر خون نکالا گیا ۔ کس خلط کا غلبہ تھا ۔ اور بادشاہ کے اور سوالات کے جواب دینے ہوتے تھے جو اسی کے متعلق کئے جاتے تھے اس کے بعد خلعت دیکر بادشاہ مجھے رخصت کردیتا تھا ۔ جب کبھی میں شہزادہ کے کسی فرزند کی فصد کرتا تو مجھے دو سو روپیہ معہ سراپا خلعت واسپ عنایت کئے جاتے ۔

مینے حکیموں کا ذکر کرکے یہ بیان کردیا ہے کہ شہزادے اور شہزادیاں اُن کے ساتھ کس طرح پیش آتی ہیں ۔ یہ ظاہر کرنا بھی ضرور ہے کہ خود بادشاہ اطبا کے انتخاب کرنے میں بہت محتاط ہے ۔ ہمیشہ ذی علم و تجربہ کار حکیم مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اُس کے بچوں کی صحت کی حفاظت کرسکیں ۔ چونکہ شاہی محل اور دربار میں بکثرت اشخاص ہوتے ہیں لہٰذا متعدد اطبا ہوتے ہیں جن کے مفصل ذیل خطاب ہوتے ہیں جو علم یا علاج یا مہارت کے مناسب ہوتے ہیں ۔

خطاباتِ اطبّا

حکیم بزرگ ۔ حکیم الملک ۔ حکیم بینا ۔ حکیم محسن ۔ حکیم جان بخش ۔ حکیم مومن ۔ حکیم مزیں ۔ حکیم فاضل ۔ حکیم عبد الفتح ۔ حکیم تعزب خاں ۔ حکیم صالح ۔ حکیم نبض ۔ حکیم الہ یار ۔ حکیم نادر ۔ حکیم خدا دوست ۔ حکیم فرح بخش ۔ حکیم بدن ۔ حکیم بے خطا ۔ حکیم مقرب خاں ۔ افلاطون الزماں ارسطو الزماں ۔ جالینوس الزماں ۔ بقراط الزماں ۔ بوعلی الزماں ۔

تمام مذکورہ بالا اطبّا ایرانی النسل ہیں جن کے نام کے ساتھ خاں ہے ۔ ان کے بڑے وظیفے ہیں ۔ بیس ۔ تیس پچاس ہزار روپیہ سے لیکر ایک لاکھ دو لاکھ روپیہ سالانہ تک ان کی تنخواہیں مقرر ہیں ۔ مینے ان میں ایسے حکیم دیکھے جو گرم مرضوں کا علاج سرد دواؤں سے

کرتے تھے اور مریض شفایاب ہوتے تھے ۔ چند ایسے بھی ہیں جو سنگ مثانہ ۔ فالج ۔ مرگی ۔ استقا
کمی خون ۔ مہلک بخار ۔ اور دیگر پیچیدہ امراض کا علاج کر سکتے ہیں ۔ یہ کتب قدیم پر عمل کرتے ہیں
جن میں مختصر طور سے بہت کچھ لکھا ہوا ہے ۔ حالانکہ سلطنت مغلیہ میں علاج کرنا بہت آسان ہے
کیونکہ بوجہ گرمی پسینہ جلد آجاتا ہے اور مریض کو شفا ہو جاتی ہے ۔

جب یہ اطبّا محل میں جاتے ہیں تو خواجہ سرا اُن کے سروں پر موٹا کپڑا ڈال کر لیجاتے ہیں
جو سر سے شکم تک لمبا ہوتا ہے اور اسی طریق سے واپس لاتے ہیں جیسا میں نے پہلے بیان کیا ۔

ان بادشاہوں کی عادت ہے کہ مختلف نسلوں کے سات ہزار غلام رکھتے ہیں انہیں
میں سے افسر بھی ہوتے ہیں جن کے ماتحت باقی غلام ہوتے ہیں ۔ بادشاہ انہیں بھی خطابات
دیتا ہے ۔ میرے وقت میں غلاموں کے افسر مفصل ذیل ناموں سے پکارے جاتے
تھے ۔

غلاموں کے افسروں کے نام

غیاث بہادر ۔ فرادہ ۔ نیک روز ۔ نیک قدم ۔ نیک دل ۔ نیک نیت ۔ سرانداز ۔ الائچی ۔
مبارک ۔ بختاور ۔ اشارہ ۔ فہیم ۔ زیرک ۔ خوشحالا ۔ چلاوا ۔ دولت ۔ سلامت ۔ جہاما ۔
نظر بہادر ۔ جمشید ۔ حیا ۔ اسلم ۔ اللہ وردی ۔ فریدوں ۔ مطلب ۔ مامور ۔ مشہور ۔
حاضر ۔ نعمت ۔ تارا ۔ خورم ۔ دلاور ۔ حاتم ۔ سبحان ۔ محرم ۔ مقبول ۔ ہلال ۔ بلال ۔
قمر ۔ نظر ۔

یہ خاص خاص شاہی غلاموں کے نام ہیں ۔ یہ سب کے سب سپاہی ہیں اور
معقول تنخواہ پاتے ہیں ۔ ان کے اوپر دو سردار ہیں تین ہزار سوار اور چار ہزار پیدل

بھی انہیں میں سے ہیں - ان کے متعلق محل کی اور باہر کی مختلف خدمات سپرد ہیں -
جب کوئی مہم پیش آتی ہے تو ان سے کام لیا جاتا ہے - یہ تحریری اطلاع کرتے ہیں اور
شاہی احکام کی تعمیل کرتے ہیں - اس کے علاوہ ان سے جاسوسی کا بھی کام لیا جاتا ہے -
جس طرح ملکہ - شہزادیوں - بیگمات وغیرہ کو بادشاہ خطاب دیتا ہے اسی طرح
وہ ان چیزوں کے بھی نام رکھتا ہے جو اس کے ذاتی استعمال میں رہتی ہیں - مثلاً
تلواریں - ڈھالیں - گھوڑے - ہاتھی - توپیں - سپہ سالاران و افسران فوج وغیرہ - ان
سب کے ناموں کی فہرستیں میں الگ الگ لکھوں گا - ان میں چند راجے اور اسی
نسل کے چند دیگر اشخاص بھی شامل ہیں -

کٹاروں کے نام

دشمن کش - وار پار - بجلی - بے خطا - دشمن ستان - بیقراری - عالم ستان
آب دار - فتح لشکر - تمقام - کافر کش - شاہ عنایت - دشمن پے - ہنر قاتل -
خدا بخش - اللہ مدد - تہی یار - دم دار - فارق دوتا - کمر زیب - عالم گیر -
یار وفادار - جوشن گذار - زور ضرب - ظالم کش - زہر آب - فتح عالم -

بادشاہ تلواروں کی بہت قدر کرتا ہے - ان کے مرصع طلائی بنام ہوتے ہیں
کٹاریں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں - ان کی تین قسمیں ہیں جو خنجر - بانک اور کٹار کہلاتی
ہیں - ان کے بھی مثل تلواروں کے نام ہوتے ہیں - ہر جمعہ کی صبح کو بادشاہ انکا
معائنہ کرکے خدا سے دعا کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے دشمن پر ظفر حاصل ہو یہ
تلواریں اور کٹاریں پہلے قدیم بادشاہوں سے وراثتاً پہونچی ہیں - بادشاہ انہیں

کسی کو یہاں تک کہ اپنے فرزندوں کو بھی نہیں دیتا ۔ سپہ لاروں یا افسروں کو جو تلواریں دی جاتی ہیں ۔ وہ یا تو خاص طور سے تیار کرائی جاتی ہیں یا خریدی جاتی ہیں اور زیادہ وہ ہوتی ہیں جو کسی ملک کے فتح ہونے کے وقت بطور غنیمت ہاتھ آتی ہیں ۔

شاہی ڈھالوں کے نام

آفتاب عالم ۔ مہتاب عالم ۔ سایہ عالم ۔ روشنائی عالم ۔

علاوہ ان ڈھالوں کے گینڈے کے چمڑے سے بھی ڈھالیں بنائی جاتی ہیں جن پر بندوق کی گولی رک سکتی ہے اور اسی قسم کی ڈھالیں افسروں کو عطا ہوتی ہیں ۔

اسپان خاصہ کے نام

بادرفتار ۔ خوش رفتار ۔ شاہ پسند ۔ دلربا ۔ صورت سیرت ۔ خوش اندام ۔ کوہ طلا ۔ کوہ نقرہ ۔ زمین دوز ۔ کشادہ رفتار ۔ راہدار ۔ فرحبہ ۔ سربلند ۔ ترکی گرد ۔ ہنس ۔ مانک ۔ لعل بے بہا ۔ ہیرا جوت ۔ پھلواری ۔ گل دار ۔ ابلق ۔ زود رس ۔ بزدل ۔ دلاور ۔ سینہ زور ۔ شاہ رفتار ۔ باز ۔ ہرن ۔ بے آرام ۔ ارام ۔ آب رواں ۔ تیز راں ۔ سمندر ۔ سنجاب ۔

یہ تمام گھوڑے خاص بادشاہ کی سواری کے ہیں ۔ انکی رفتار ۔ قد ۔ اور عادت سے یہ نام مناسبت رکھتے ہیں ۔ یہ عربی ۔ ایرانی ۔ اور ترکی ہیں ۔ بقیہ گھوڑوں کے نام امتحان لینے کے بعد رکھے جاتے ہیں ۔

اون کے کسی حصۂ جسم پر (۹) نشان لگایا جاتا ہے ۔ ہوشیار سائیس

اُن پر مقرر ہوتے ہیں اور خوب نگرانی کی جاتی ہے اور خوراک بھی بافراط ملتی ہے۔ صبح کو روٹی کا مالیدہ، شام کو پختہ چاول اور گائے کا دودھ دیا جاتا ہے جس میں مرچ سیاہ - زیرہ - سونف ملی ہوئی ہوتی ہے - یہ اس لئے دیے جاتے ہیں کہ وہ زیادہ موٹے نہ ہوں۔

بادشاہ کے سوار ہونے سے دو گھنٹہ پہلے داروغہ اصطبل بغیر پاپوش پہنے اس گھوڑے پر سوار ہوتا ہے - بہ نظر تعظیم ایسا کیا جاتا ہے اور اس گھوڑے کو ادہر اودہر گشت کراتا ہے تاکہ اس کا معدہ خالی ہو جائے - سوار ہونا بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہے - اسی لئے وہ اپنی سواریاں بتدیل کرتا رہتا ہے - کبھی ایک گھنٹہ تخت رواں پر سوار ہوتا ہے کبھی دوسرے گھنٹہ ہاتھی پر، خاصہ کے گھوڑے اس طرح تعلیم دیئے جاتے ہیں کہ آگ یا کسی اور چیز سے نہ بھڑکیں - تیمورلنگ کے عہد سے اس وقت تک یہ دستور ہے کہ چار زین بستہ گھوڑے غسل خانہ کے دروازہ پر تیار کھڑے رہتے ہیں تاکہ وقت ضرورت فوراً کام آسکیں - جب بادشاہ اپنے کسی فرزند سے خوش ہوتا ہے تو اُسے خاصہ کا ایک گھوڑا معہ بیس پچیس دیگر معمولی گھوڑوں کے عطا کرتا ہے۔

تبصرہ جات

جدید مطبوعات پر تبصرہ کرنا رسالہ شمع کا ضروری مقصد ہے ہم چاہتے ہیں کہ بذریعہ تبصرہ و تنقید اپنے ناظرین کو ملک کی دماغی محنتوں کے نتائج سے ہر ماہ مطلع کرتے رہیں تاکہ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے ہمارے ناظرین واقف رہیں اور ان کوششوں کے ساتھ خریدیں اس لحاظ سے کہ اس رسالہ میں نہایت توجہ کے ساتھ تبصرے لکھے جاتے ہیں رسالہ کے پڑھنے والے ملک کے بہترین حضرات ہیں ہم کو اُمید ہے کہ حضرات مصنفین و اہل مطابع اپنی مطبوعات ہمارے پاس بھیجنا اپنا ضروری فرض تصور فرمائیں۔

(مینیجر)

گلے میں گیروا کفنی۔ کھلے سر ہاتھ میں مالا

(از جناب سید محمود الحسن صاحب صوفی۔ مرحوم و مغفور۔ بی۔ اے سٹیلمنٹ آفیسر بھوپال)

بہ صد ناز و نعم ہمنے جسے آغوش میں پالا
اسی دل نے جوانی میں ہمیں برباد کر ڈالا

وہی چاہا ہمیشہ جو نہ لکھا تھا مقدر میں
کوئی مجھ سا بھی ہوگا بادۂ حسرت کا متوالا

غضب پُر مغز ہیں ان میکشوں کی اصطلاحیں بھی
جو کھو دیتا ہے مت اپنی اُسے کہتے ہیں متوالا

جو اہل فیض ہیں وہ بھی سزا دیتے ہیں موذی کو
سحر کا نور کرتا ہے شب فرقت کا منہ کالا

عجب حالت میں دیکھا آج اک ناکام الفت کو
گلے میں گیروا کفنی۔ کھلے سر۔ ہاتھ میں مالا

خطا میری نہ تھی واعظ غلط فہمی تھی ساقی کی
وہ ساغر بھر کے لے آیا میں کہتا ہی رہا لا۔ لا

کلیجہ ہے کہ سینہ میں ہے اک انبار خاکستر
دل پُر غم ہے پہلو میں کہ سوز غم کا اک چھالا

نہ بیدادی میں کم صحرا نہ میں صحرا نوردی میں
اُدھر کانٹے پہ ہے کانٹا اِدھر چھالے پہ ہے چھالا

چمک بھی درد کی تلووں میں خوں کی سرخ دھاریں بھی
ستارہ یہ کوئی ٹوٹا کہ میرے پاؤں کا چھالا

ملائے اب جو دشت نجد کے بچھڑے ہوئے میں نے
بہت رویا گلے مل مل کے نوک خار سے چھالا

بچا کر آج تک رکھا تھا ہمنے دین و ایماں کو
تجھے اب بھی ہے ضد ساقی مہوش تو اچھا لا!

کیا رام اُن کو قید زلف میں سرگوشیاں کر کے
دل محمود بھی نکلا بڑی آفت کا پرکالا

....

شذرات

شمع کے دسمبر نمبر کی حاضری اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی بارہ منزلیں ختم کرلیں اور جو وعدے ہماری جانب سے ہوئے تھے اُن کی تکمیل ہوتی رہی۔ پابندیٔ اقرار کے مقابلہ میں ہم نے اخراجات کا مطلق خیال نہ کیا۔ لیکن حجم میں اضافہ کرنے کے بعد بھی ہم کو افسوس رہا کہ بعض قابل قدر مضامین نظم و نثر کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت نے امیدوں سے زیادہ ہماری قلمی اعانت فرمائی۔ اور بزرگانِ ملک و ملت نے ایسے حوصلہ افزا اور شاندار الفاظ میں ہمت بڑھائی کہ ہم حیران ہیں کہ ان عنایتوں اور مہربانیوں کا شکریہ کس طرح ادا کریں ملک کے جرائد اور رسائل نے بھی معاصرانہ اخلاص کے ساتھ شمع کا خیر مقدم کیا۔ جس کے لئے ہم بہ دل ممنون ہیں۔

ہر رسالہ کی عمر میں پہلے بارہ مہینے سخت آزمائشوں کے ہوتے ہیں لیکن اس مبارک موقع پر جب کہ یونیورسٹی کی جوبلی کا جشن ہو رہا ہے۔ ہم قصداً اس ذکر کو نظر انداز کرتے ہیں، کیونکہ تلخ تجربوں کی تہ میں مفید سبق بھی پنہاں تھے۔ جو ہمیشہ کام آتے ہیں۔
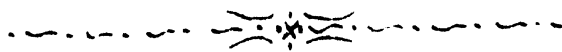
شمع کے اجرا کا خیال مسلم یونیورسٹی میں پیدا ہوا۔ یہیں اس کا نام تجویز ہوا اور یہیں اس کی ابتدا رہوئی۔ جو عقیدت مدیرانِ شمع کو مسلم یونیورسٹی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہے، اور جو نمایاں سرگرمی اُردو کے فروغ اور اُس کے ادب کے احیاء میں یونیورسٹی کے نونہالوں سے ظہور میں آئی ہیں، اُن کا یہ ہی اقتضا تھا کہ شمع کی ابتداء

یونیورسٹی کی فضاریں اور اس کی نشو نما ارض تاج میں ہو۔ یونیورسٹی کے فرزندان معنوی نے شمع کو دل آویز اور کامیاب بنانے میں جو حصہ لیا ہے۔ وہ لایق صد تشکر ہے۔ اور اس مبارک موقع پر بھی ان کی، اور نیز، دیگر بزرگان ملت کی پرخلوص کوششوں اور بلند ہمتوں سے، پوری توقع ہے کہ وہ شمع کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ ہونے دیں گے۔

ایک سال کی مدت میں شمع نے کس قسم کے مضامین کی اشاعت کی اس کے لئے ایک طویل فہرست کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم قلت گنجایش کی وجہ سے صرف ایک خاکہ پر قناعت کرتے ہیں۔

مضامین	تعداد	مضامین	تعداد
(۱) تصاویر	بارہ	(۱۲) مضامین سائنس	تین
(۲) تاریخی مضامین	بیس	(۱۳) مضامین علم نباتات	دو
(۳) ادبی مضامین	پندرہ	(۱۴) مضمون عربی	ایک
(۴) افسانے	گیارہ	(۱۵) مذہبی مضمون	ایک
(۵) تنقیدی مضامین	دس	(۱۶) قصاید و مثنوی	تین
(۶) سیاسی مضامین	نو	(۱۷) نظمیں	بیس
(۷) مضامین معلومات	چار	(۱۸) غزلیں	پچاس
(۸) تجارتی معاشرتی و تعلیمی مضامین	چار	(۱۹) تبصرے	تفصیل بہت طولانی ہے
(۹) مضامین متعلق فنون لطیفہ	تین	(۲۰) شذرات	
(۱۰) اقتصادی مضامین	تین	(۲۱) علمی نوٹ	
(۱۱) فارسی مضامین	تین		

پورے سال کا حجم تقریبًا تیرہ سو ۱۳۰۰ صفحات ہے ۔ لیکن چونکہ اب حجم چھ ماہ سے مستقلًا ایک سو بارہ صفحات ہے ۔ اس لئے سال آئندہ سے رسالہ کا حجم تقریبًا چودہ سو ۱۴۰۰ صفحات ہوگا تصاویر اس کے علاوہ ہیں ۔ اور قیمت صرف لعہ ۔

ہمنے جدید انتظامات کے تحت میں یہ مرحلہ بھی طے کرلیاہے کہ رسالہ پابندی اوقات کے ساتھ حاضر ہوتا رہے گا ۔

یہ ہے ہماری ایک سال کی ابتدائی کوششوں کا نمونہ ۔ اگرچہ شمع کی ترقی کی رفتار نہایت قابل اطمینان رہی ہے ۔ پھر بھی جو ہماری توقعات ہیں اُن کا پورا ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب کہ معاونین شمع اس کی اعانت پر کمر بستہ ہو جائیں ۔

جنوری سنہ ۱۹۲۶ء سے شمع کی دلچسپیوں میں بہت اضافہ ہوگیا ہے ۔ نہایت پاکیزہ مضامین نظم ونثر شائع ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ پہلا مضمون توزک جہانگیری کے متعلق نہایت لطیف اور محققانہ ہے اور ایسے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے کہ زبان اُردو میں ایک بالکل نئی چیز ہے تصاویر کا بھی خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے اور یقین ہے کہ علمی دلچسپیوں کی تصاویر کے علاوہ عہد مغل کی بہترین مصوری کے نمونے بھی پیش کش ناظرین ہوتے رہیں گے ۔

اگرچہ شمع کا حجم ۱۱۲ صفحات ہے ، لیکن ہماری خواہش ہے کہ شمع ۱۵۰ صفحات پر شائع ہو ۔ بہترین قسم کا کاغذ اور اعلیٰ قسم کی لکھائی چھپائی کے علاوہ اس میں متعدد تصاویر ہوں جو دنیا کی جدید ترین انکشافات علمی کو پیش کرکے قارئین کرام کی مستقل دلچسپی کا باعث ہوں اور مشرقی مصوری کے کمالات کے ایسے نمونے حاضر کئے جائیں جو بلحاظ فن اپنے عہد کے بہترین کارنامے

ہیں ہمارے پاس یہ سب مسالہ موجود ہے۔ اسی طرح نظم و نثر کی اعلیٰ ترین تحریرات اور سیاسی تاریخی۔ معاشرتی اور سائنٹیفک مضامین کی اشاعت نہ صرف جاری رہے گی بلکہ اس کا معیار معبد ہوتا رہے گا لیکن یہ سب باتیں اُسی وقت ممکن ہیں جب ہمارے معاون اپنی ہمدردی اور دلچسپی کا کم از کم اسقدر اظہار فرما دیں کہ اپنے حلقہ اثر میں **شمع کا صرف ایک قدردان پیدا فرما کر،** اور اُن سے چندہ وصول کر کے دفتر شمع میں وسط جنوری تک ارسال فرماویں۔

باور فرمائیے کہ آپ کی ذراسی توجہ سے شمع آپ کی دلچسپیوں کا مستقل ذریعہ بنجائیگا۔

قارئین کرام یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ منوچی کی مشہور و معروف تاریخ عہد مغل یعنی اسٹوریا ڈو موگور کی دونوں جلدوں کا ترجمہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شمع بک ڈپو شائع کر رہا ہے۔ اس کے مترجم ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور سحر البیان شاعر عالیجناب خان بہادر نواب مولوی سید **مظفر علی خاں صاحب قبلہ رئیس جانسٹھ ضلع** مظفر نگر ہیں۔ تصاویر براہ راست یورپ سے منگائی ہیں جو کثیر تعداد میں ہیں۔ یقین ہے کہ دونوں جلدیں بہت جلد شائع ہو جائیں گی۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ بہترین کاغذ۔ اور نہایت نفیس جلدبندی کا انتظام کیا گیا ہے۔ جو حضرات جنوری سنہ ۱۹۲۶ء سے شمع کی خریداری قبول فرمائیں گے اُن کو کتب مذکور خاص رعایتی قیمت پر دیجائیں گی۔ جو معاونین شمع کی خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں گے اُن کے ساتھ بھی یہی رعایت کیجائیگی لیکن شرط یہ ہے کہ شمع کا چندہ بابتہ سنہ ۱۹۲۶ء وسط جنوری سنہ ۲۶ تک دفتر شمع میں وصول ہو جائے۔ اُمید کہ معاونین اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور خریداری

میں سبقت فرمائیں گے۔

نواب صاحب موصوف کے پاکیزہ ترجمہ کا کچھ حصّہ ہدیہ ناظرین ہے اور عکسی تصویر اس نمبر کی زینت کا باعث ہے۔

محترمی جناب سر تیج، بہادر صاحب سپرو ام اے۔ ایل۔ایل۔ڈی۔ کے۔ سی آئی۔ ای سابق ممبر قانونی ایگزیکیوٹو کونسل آف وائسرائے اپنے مکرمت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اردو رسائل سے "ایک شکایت ضرور ہے اور وہ یہ کہ نہ تو یہ رسالے دیرپا ہوتے ہیں (چند ماہ سے زیادہ ان کی حیات نہیں ہوتی) اور نہ ان میں مضامین امتیاز کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اردو اشعار کے مذاق میں بھی کوئی خاص ترقی نمایاں نہیں ہے۔ نہ تو پرانے طریقہ کا کلام ہوتا ہے نہ موجودہ مذاق کے مطابق۔ مجھے معاف فرمائیگا میں نے جو کچھ عرض کیا ہے آپ کے رسالہ کو مدنظر رکھ کر نہیں بلکہ اکثر رسالوں کے متعلق ہے۔ بلکہ آپ کے رسالہ کی نسبت تو یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی ذات سے توقع ہو سکتی ہے کہ اس رسالہ (شمع) کا معیار اوروں سے اونچا ہوگا...... ممکن ہوا تو مضمون بھیجونگا"

حقیقت میں قریب قریب ہر شہر سے اردو رسائل کا جاری ہونا اور پھر فوراً ہی بند ہو جانا بین ثبوت اس امر کا ہے کہ عام طور پر ایڈیٹران رسائل اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے ہیں۔ اسی باعث پبلک بھی بدظن ہے اور سنجیدہ رسائل کو بھی اپنا اعتبار قائم کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اب تو عموماً رسائل کا طریقہ تاجرانہ ہے۔ یہانتک بھی کوئی عیب نہیں لیکن جس بدعت کا ذکر علامہ موصوف نے فرمایا ہے واقعی سخت شرمناک ہے۔ شکر ہے کہ شمع کا مسلک تجارتی بھی نہیں ہے۔ بلکہ محض علمی مشغلہ ہے۔ مدیران شمع پہلے ہی اپنی کمائی

کا معقول حصہ کتابوں کی خریداری میں بگاڑتے تھے اب شمع کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ہم کسی ذاتی نفع کے نہ متمنی ہیں اور نہ خواہشمند۔ آرزو ہے تو یہ کہ شمع روشن رہے۔ اور لطف صحبت تادیر قایم رہے۔

حشرات الارض قسم کے رسائل نے اچھے لکھنے والوں کو بھی بددل کردیا ہے اور وہ مشکل سے مطمئن ہوتے ہیں کہ کوئی جدید رسالہ اپنی ہستی کو وقار کے ساتھ قایم رکھہ سکیگا کیونکہ بقول جناب اکبر مرحوم ؎

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے　　ہر سمت سے سیکڑوں رسالے نکلے

افسوس کہ بے زری نے چھاپہ مارا　　اکثر احباب کے دوالے نکلے

الحمد للہ کہ شمع کا حجم ہندوستان کے کل ماہوار اردو رسائل سے زاید ہے ہر ماہ تصاویر شائع ہوتی ہیں اور اطراف و جوانب سے مضامین بھی آجاتے ہیں پھر بھی کارکنان شمع عمدہ مضامین کے واسطے معاوضہ دینے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ مضامین چوٹی کے ہوں اور محنت اور تحقیق سے لکھے جائیں کیونکہ شمع کے اجرار کا اصل مقصد یہی ہے۔

اس نمبر کے ساتھ اکثر حضرات کی میعاد خریداری ختم ہوتی ہے۔ ہم نہایت ممنون ہونگے اگر ہمارے معاون، اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمادیں گے۔ اگر وسط جنوری سنہ ۱۹۲۶ء تک انکی جانب سے کوئی اطلاع نہ آئی تو جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کا پرچہ انکی خدمت میں حسب قاعدہ بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگا۔ امید ہے کہ معاونین شمع خریداری کو قائم رکھیں گے۔ کیونکہ علاوہ اس علمی رعایت کے جس کا اعلان اوپر درج ہے آپ کی دلچسپیوں کا ایسا معقول انتظام کیا گیا ہے کہ آپ ہماری کوششوں

سے ضرور متاثر ہوں گے۔

آہ! کیا جانئے محفل میں یہ کس کی خاطر،
شمع روتی ہے جُدی - جلتا ہے پروانہ جُدا
(میر حسن مرحوم)

"مدیران شمع"

اِعْلَان

ناظرین شمع یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ قلمی تصاویر کے بلاک بنوانے اور رنگین تصاویر کے چھپوانے کا ہم نے براہ راست یورپ سے انتظام کرلیا ہے ان تصاویر میں عہد مغلیہ کی مصوری کے نہایت نفیس نمونے ہیں۔ حصول تصاویر و نیز انگلستان میں بلاک بنوانے اور چھپوانے میں ہم کو سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ عنقریب اِن تصاویر کا سلسلہ شمع میں شروع ہوگا۔ اور چونکہ رسالہ سختی کے ساتھ خریداران رسالہ کی تعداد کے مطابق شائع ہوتا ہے اس لئے قدر دانان آرٹ کو فوراً رسالہ کا خریدار ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ پھر یہ تصاویر کسی قیمت پر بھی نہ مل سکیں گی۔

منیجر "شمع"

تبصرے

شاہانِ مالوہ

مختصر تقطیع کے ۱۶۰ صفحات کی کتاب کے مؤلف ہمارے کرم فرما جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ ڈسٹرکٹ جج و مجسٹریٹ نیمچ چھاؤنی ہیں جو سرکاری کاموں کی زیادتی سے بالکل نہیں گھبراتے ہیں اور باوجود سخت قیود و پابندیوں کے جو سرکاری ملازمتوں کے لئے لازمی ہیں اپنے علمی مشاغل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کی زندگی میں اُن کی یہ علمی "یکسوئی" ہم کو بہت پسند ہے۔ "شاہان، مالوہ کا دیباچہ اور پہلا باب شمع میں شائع ہو کر ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہو چکے ہیں۔

اب پوری کتاب چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس میں سلاطین مالوہ و گجرات کے حالات خاندان تغلق کے آخری زمانہ سے شہنشاہ اکبر کے عہد تک یعنی ۸۰۴ھ لغایتہ ۹۶۸ھ درج ہیں۔ لایق مؤلف ہندوستان کے مشہور اہل قلم ہیں۔ اور تاریخی مضامین سے آپ کو خاص شغف ہے، ظاہر ہے کہ تاریخی تحقیقات اور تاریخ نویسی کے موجودہ اصول پر اگر سلاطین مالوہ و گجرات کی تاریخ لکی جائے تو اُس کے لئے ایک عمر درکار ہے اور کئی ضخیم و حجیم کتابیں بھی پورے مواد اور مسالے کی حامل نہ ہو سکیں گی۔ لیکن مولوی صاحب نے جس اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب تالیف فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ سلیس زبان میں ابتدا سے انتہا تک کے حالات مسلسل بیان کئے جائیں اور ضروری و دلچسپ تاریخی واقعات کو تحقیق کی روشنی میں ایسے دل آویز طریقہ سے پیش کیا جائے کہ بڈھے اور جوان۔ عالم اور معمولی لکھے پڑھے اشخاص بھی اس کا

معالعہ کرسکیں۔ اور طالب علموں کے تاریخی تحقیقات کے شوق میں ترقی ہو۔ قابل مؤلف
نے تاریخی واقعات کو روایات سے علیحدہ رکھا ہے، یہ ایک تاریخی سلوک ہے جس کے
ہم بہ دل ممنون ہیں۔

بہرکیف پوری کتاب مستعدی سے لکھی گئی ہے۔ طرز بیان نہایت دلکش ہے اور
طرز استدلال بہت دل آویز ہے لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ البتہ کہیں کہیں کتابت
کی غلطیاں ہیں، کاتب کی غلطیوں پر صاحب تصنیف کو مطعون کرنا یقینی طور پر سخت
بے انصافی ہے۔

قیمت صرف عہ ہے جو کتاب کی خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ جناب
مؤلف سے مندرجہ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

تاریخ اندور

اس کتاب کے مؤلف "خافی خاں" ہیں۔ لیکن طرز بیان اور انداز تحریر سے ظاہر
ہوتا ہے کہ جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے ہیڈ چھاؤنی کا قلم اس کو عالم
وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانہ سے ۱۹۲۴ء
تک کے واقعات درج ہیں۔ بارہ والیان ملک کے حالات ہیں جو شرح و بسط کے
ساتھ لکھے گئے ہیں اور جابجا ضروری حواشی کا اضافہ کرکے اور ماخذ سے لفظ بہ لفظ
حالات نقل کرکے تاریخی حیثیت سے کتاب بہت قابل قدر بنا دی گئی ہے۔

عہد مغل میں مرہٹوں اور مغلوں کے تعلقات۔ کمپنی اور انگریزوں کے تاریخی